چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

MEMBER
APNS
CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

بانی ——— محمود بابر فیصل
نگران ——— محمود ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
مدیر اعلیٰ ——— عامر محمود
نائب مدیرہ ——— شعاع عمیر
مدیرہ خصوصی ——— امت الصبور
اشتہارات ——— خالدہ جیلانی
قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

حمد، دلاور عباس دلاور 9

نعت، حافظ طارق محمود 9

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

واٹس ایپ
0317 2266944

ناولٹ

افسانے

جولائی 2021

جلد 43 شمارہ 04

قیمت 80 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) .... -/960 روپے
ایشیاء افریقہ، یورپ .... 18,000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ... 20,500 روپے

سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں

subscriptions@khawateendigest.com

کرن کتاب

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: [illegible]

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

خوشیوں کی سوغات لیے عیدالاضحیٰ کا تہوار دستک دے رہا ہے۔

یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو آپ خوب زور وشور سے عیدالاضحیٰ کی تیاریوں میں مصروف ہوں گی اگر چہ کہ ان دنوں گرمی کی شدت عروج پر ہے اور سورج پوری آب وتاب کے ساتھ آگ برسا رہا ہے۔

دنیا کی ہر قوم اور ہر مذہب میں کچھ دن مخصوص ہوتے ہیں جس میں اس کے پیروکار اپنے اپنے طریقوں کے مطابق خوشیاں مناتے ہیں۔ امت مسلمہ کے لیے سال میں جشن کے دو دن ہیں۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ۔ یہ ہمارے مذہبی تہوار بھی ہیں۔ ان کے پیچھے جو فلسفہ ہے، وہ بہت اعلا وارفع ہے۔ عیدالفطر پر فطرے کی ادائی فرض کی گئی ہے تاکہ غریب بھی عید کی خوشیوں میں شامل ہو سکیں۔ عیدالاضحیٰ میں گوشت میں غریبوں کا حصہ مقرر کر کے اللہ پاک نے ان لوگوں کو بھی خوشیوں میں شامل ہونے کا موقع دیا ہے جو قربانی کی استطاعت نہیں رکھتے۔

عیدالاضحیٰ کا تہوار ایک عظیم قربانی کی یاد میں مناتے ہیں۔ جب ایک باپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ پاک کے حکم کی تعمیل میں اپنا فرزند قربانی کے لیے پیش کر دیا۔

عید کا دن خوش گوار اور خوشیوں بھری مصروفیت لیے طلوع ہوتا ہے۔ جہاں ایک طرف قربانی کا اہتمام ہوتا ہے تو دوسری طرف خواتین گوشت سنبھالنے اور گھر والوں کے ساتھ ساتھ مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے لذیذ کھانوں کے اہتمام میں مصروف ہوتی ہیں۔ دوست احباب، عزیز واقارب کی دعوتیں ہوتی ہیں بچے، بڑے، بزرگ سب جوش وخروش سے یہ خوشیوں بھرا تہوار مناتے ہیں۔

خوشیوں سے دمکتے چہرے، خوب صورت لباس اور صاف ستھرا نکھرا نکھرا گھر ہر طرف خوشی کا سماں ہوتا ہے۔

اپنی خوشیوں میں ان لوگوں کو ضرور یاد رکھیں جو آپ کی اعانت کے منتظر اور مستحق ہیں۔

قارئین کو ہماری طرف سے عیدالاضحیٰ مبارک۔

دعا ہے کہ یہ عید ہم سب کے لیے حقیقی معنوں میں مبارک وسعد ثابت ہو۔ آمین۔

اس شمارے میں

☆ اداکار محسن عباس حیدر سے ملاقات ☆ اداکار سید عارض الدین کہتے ہیں "میری بھی سنیے"

☆ اس ماہ بشریٰ رضوان کے "مقابل ہے آئینہ" ☆ "دامن سحاب" مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول

☆ آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" ☆ "نمکین پانیوں کا سفر" منعم ملک کا مکمل ناول

☆ ام اقصیٰ کا مکمل ناول "ذات عورت" ☆ "جنہیں راستے میں خبر ہوئی" نازیہ کنول نازی کا ناولٹ

☆ منشا محسن علی کا ناولٹ "یاقوت" ☆ "بری عورت" ام ہانی کا ناولٹ

☆ کنیز زہرا کا ناولٹ "سنگ تراش"

شمائلہ دالعباد، قرۃ العین خرم ہاشمی، زارا ہنجرا، حوریہ بتول، ہاجرہ عمران اور سیدہ عروج فاطمہ کے افسانے اور مستقل سلسلے۔

کرن کتاب: عیدالاضحیٰ کے پکوان اور دیگر سلسلے۔

تُو ظاہر تُو باطن تُو اوّل تُو آخر
تری شان اونچی تو یکتا ہے مولا

خطا وار انساں کو تُو نے ہی بخشا
جہنّم سے تُو نے بچایا ہے مولا

گناہوں کے ملبے میں دبتا رہا جو
تری اک نظر نے نکالا ہے مولا

ہمیں ہر بلا سے بچایا ہے تُو نے
مصیبت میں تُو نے سنبھالا ہے مولا

یہ سب جانتے ہیں کہ دُنیا ہے فانی
تُو ہی لافنا ہے تُو اعلیٰ ہے مولا

نبیؐ کو ہمارے ہے معراج بخشی
انہیں عرشِ اعظم دکھایا ہے مولا

تری حمد کرتا رہے گا دلاور
قلم تیری خاطر اُٹھایا ہے مولا

دلاور عباس دلاور

حبیبِ خدا ہے حبیبِ ملائک
حقیقت میں دونوں جہانوں پہ فائق

محبت تیری جان سے بھی زیادہ
تیرے نام پر جان دیتے ہیں شائق

تیرے دم سے رونق ہے کون و مکاں میں
ہے الطافِ باری سے روشن خلائق

تیری ذاتِ اقدس پہ قربان جاؤں
تیری ذات سے ہیں منوّر حقائق

جسے آپؐ کے دَر سے نسبت ہوئی ہے
کھلے اس پہ ارض و سما کے دقائق

ملے گا مقام اس کو عرشِ بریں پر
ہمیشہ رہے آپؐ جس کے بھی نائک

نہ حدِ نظر میں تیری شان آئے
نہ درویش ہے نعت خوانی کے لائق

حافظ طارق محمود درویش

محسن عباس حیدر سے ملاقات

شاہین رشید

بہت سے فنکار ایسے ہیں جن سے میری ملاقات نہیں ہے۔ مگران سے جتنی بھی بار گفتگو ہوئی ہے میں نے انہیں اچھا ہی پایا ہے۔ انہی میں ایک ''محسن عباس حیدر'' ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب یہ شوبز میں اور ریڈیو کی فیلڈ میں آئے تھے تو سب سے پہلے میں نے ہی ان کا انٹرویو لیا تھا۔ بہت ہی باصلاحیت ہیں۔ بہترین سنگر، بہترین گیت نگار اور بہترین اداکار ہیں اور ان تینوں شعبوں میں یہ ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کے دو سیریلز ''دل تنہا تنہا'' اور ''گھمنڈی'' اختتام پذیر ہوئے ہیں ...... اور کچھ ڈرامے اور سیریلز اور فلمیں انڈر پروڈکشن ہیں۔

☆ ''کیا حال ہیں محسن؟''

❂ ''اللہ کا شکر ہے۔''

☆ ''فیلڈ میں واپس آئے، بہت مبارک ہو؟''

❂ ''بہت شکریہ۔''

☆ ''کچھ اپنے کام کے بارے میں بتائیں کہ کیا کیا کر چکے ہیں؟''

❂ ''یہ تو بہت مشکل سوال آپ نے پوچھا...... کیونکہ میں اس فیلڈ میں 2004ء سے ہوں۔ بے شک آہستہ آہستہ ترقی کی مگر کام کی فہرست لمبی ہے۔ تاہم مختصراً بتا دیتا ہوں آپ کو...... ویسے آپ تو میرے تمام کاموں سے واقف ہیں۔''

☆ ''چلو پھر میں ہی بتا دیتی ہوں۔ لیکن یہ تو بتائیں کہ آپ اکثر کہتے ہیں کہ میری چار مائیں ہیں۔ یہ کیا سین ہے؟''

❂ ''کہانی کچھ یوں ہے کہ میری دو بہنیں ہیں۔ ''مہ وش نگار'' اور ''مہتاب کوثر'' اور دونوں مجھ سے بڑی ہیں۔ میں گھر کا واحد اکلوتا بیٹا اور بھائی ہوں اور ہم تینوں میں بے حد پیار ہے تو چار مائیں اس طرح ہوئیں کہ میری ماں جس نے مجھے جنم دیا اور میری خالہ معصومہ نواز جنہوں نے مجھے گود لیا اور میری دو بہنیں جنہوں نے مجھے ماں جیسا پیار دیا...... تو اس طرح ہو گئیں نا چار مائیں۔ اللہ میری ان ماؤں کو سلامت رکھے اور لمبی عمر عطا فرمائے آمین۔ میں اگرچہ اپنی بہنوں سے چھوٹا ہوں لیکن وہ مجھے درجہ بڑے بھائی والا ہی دیتی ہیں۔ ہر بات میں میری رائے ...... میرا مشورہ ضرور شامل ہوتا ہے۔''

☆ ''چلیں پھر اپنے بارے میں بھی ہمارے قارئین کو کچھ بتا دیں۔ کیونکہ آپ کا انٹرویو شائع ہوئے کافی ٹائم گزر چکا ہے؟''

❂ ''جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میرا تعلق پنجابی فیملی سے ہے۔ ہم فیصل آباد کے رہنے والے ہیں۔ میرے والد کا تعلق سرگودھا سے اور میری والدہ کا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔ میرے والد ساجد حسین اور والدہ کوثر شادی کے بعد مستقل طور پر فیصل آباد شفٹ

ہو گئے اور جہاں میں نے اور میری بہنوں نے جنم لیا۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر گریجویشن تک فیصل آباد سے ہی تعلیم حاصل کی، میں نے گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں گریجویشن کیا......اور پھر ''ناپا'' سے استاد سلامت علی کی زیرنگرانی تین سال تک میوزک کی تعلیم حاصل کی......''

☆ ''آپ گھر کے اکلوتے بیٹے، لاڈلے...... فائدہ اٹھایا؟''

♦ ''لاڈ اٹھوائے......کوئی بے جا ضد یا فرمائش نہیں کی کیونکہ میری فرمائش میرے کہنے سے پہلے ہی پوری ہو جاتی تھی......والدین کو اندازہ ہو جاتا تھا کہ مجھے کیا چاہیے۔ چونکہ مجھے بچپن سے ہی مطالعہ کا شوق تھا تو ہمارے گھر میں بچوں کے رسائل بہت آیا کرتے تھے اور یہی میری فرمائش ہوتی تھی......میں نے عام لڑکوں یا بچوں کی طرح گلی محلے میں کرکٹ یا گلی ڈنڈا یا کچھ نہیں کھیلے۔ البتہ میری تمام غیر نصابی سرگرمیاں میرے اسکول کالج تک محدود تھیں۔ جن میں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا تھا......شاعری کا بھی شوق تھا۔ شاعری اور گلوکاری کا ایک مقابلہ (جو یونیورسٹی میں ہی ہوا تھا) جیتنے کے بعد مجھے ''شام غزل سوسائٹی'' کا صدر بنا دیا گیا ساتھ ساتھ تھیٹر میں بھی کام کرنے کی آفر آتی گئی تو تھیٹر میں بھی اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔''

☆ ''گویا والدین نے بے جا پیار دے کر آپ کو بگاڑا نہیں؟''

♦ ''ہرگز نہیں......بلکہ بہترین تربیت سے معاشرے کا کارآمد مرزہ بنا دیا۔ بے شک بچوں کو ڈانٹ مار بری لگتی ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ بچوں کے لیے بے حد ضروری ہے۔ تب ہی تو بچے کسی قابل بنتے ہیں۔''

☆ ''فیوچر میں اپنے آپ کو کہاں دیکھتے ہیں؟''

♦ ''سچ پوچھیں تو میں ''حال'' میں جینے والا بندہ ہوں......میرا اللہ تعالیٰ پر توکل بے انتہا ہے اس لیے

کل کی فکر کر کے اپنا آج خراب نہیں کرتا۔''

☆ ''کراچی کب اور کیسے آنا ہوا؟ اپنا کیریئر بنانے کے لیے کراچی کا ہی انتخاب کیوں کیا؟''

♦ ''اس لیے کہ میری نظر میں کراچی پڑھے لکھے اور باادب اور سلجھے ہوئے لوگوں کا شہر ہے مجھے بے حد پسند ہے۔ کیریئر کا آغاز تو میں نے وائس اوور کے کیا۔ 2004ء میں بطور ''جوکی'' ریڈیو فیصل آباد سے منسلک ہو گیا......اور میوزک سیکھنے کے شوق میں میں 2005ء میں کراچی آ گیا......اور یہاں آ کر بھی میں نے بہ حیثیت ''جوکی'' کے ریڈیو ایف ایم جوائن کیا اور ''بی فور بھنگڑا'' کے نام سے ایک مکس پنجابی شو شروع کیا......اور پھر مجھے کہ راستے بننا شروع ہو گئے۔ قسمت کی دیوی مہربان ہونا شروع ہو گئی۔ کیونکہ ''بی فور بھنگڑا'' بے حد مقبول ہو رہا تھا...... اسی دوران ''بنانا نیوز نیٹ ورک'' پیش کرنے کا آفر ''جیو نیوز'' سے ہوئی......جسے میں نے فوراً قبول کیا۔ ''جیو تیز'' سے بھی بطور اینکر منسلک ہوا......اور ان سارے کاموں اور پروگراموں میں میرے دس سال بہت اچھے سے گزر گئے......پھر ایک دن ایک چینل سے ''مذاق رات''

پروگرام کی آفر ہوئی ...... جو کہ کئی سال کیے...... اس پروگرام سے کیوں علیحدہ ہوا یہ کہانی سب کو پتا ہے...... اب میں کراچی میں اور بہت خوش ہوں۔"

☆ "تو پھر بتائیں کہ آج کل کراچی میں کیا مصروفیات ہیں؟"

❀ "ایک ڈرامے کی شوٹنگ ہو رہی ہے...... ایک فلم "خبردار اندر جانا منع" کی شوٹ بھی جاری ہے ایک فلم Once upon a time in karachi 2020ء میں مکمل ہوئی مگر لاک ڈاؤن کی وجہ سے ریلیز نہیں ہوئی۔ دیکھیں کہ کب ریلیز ہوتی ہے۔ فلم بہت اچھی ہے۔ ریلیز ہوگئی تو بہت لوگوں کو پسند آئے گی۔ کیونکہ اس کی کہانی بہت مختلف ہے۔"

☆ "گزشتہ کچھ عرصہ قبل آپ کے دو ڈرامے تقریباً ایک ساتھ آن ایئر ہوئے "دل تنہا تنہا" اور "گھمنڈی" دونوں میں آپ کا عکس کہاں ہے؟"

❀ "دونوں میں نہیں ہے...... حقیقی زندگی میں میں ایک تنہائی پسند انسان ہوں...... اور کم گو بھی بہت ہوں۔"

☆ "لاک ڈاؤن میں کافی فارغ ٹائم ملا ہوگا...... کیسے گزارا کچھ کیا؟"

❀ "لاک ڈاؤن کے دوران انسٹاگرام پر لائیو کنسرٹ کیا اور اپنے چاہنے والوں کے بے حد اصرار پر کیا...... اور انسٹاگرام پر لائیو پروگرام کرنے کا مشورہ پرستاروں اور مخلص دوستوں کا تھا۔ اس کے علاوہ فیملیز کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا...... دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے ساتھ رہے اس وقت کو انجوائے بھی کیا۔"

☆ "لاک ڈاؤن میں لوگوں نے سوشل میڈیا میں خوب دل لگایا۔ آپ کیا کہیں گے اس بارے میں؟"

❀ "کچھ وجوہات کی وجہ سے سوشل میڈیا سے اپنا اکاؤنٹ ڈی ایکٹو کر چکا تھا۔ مگر دوستوں اور پرستاروں کی وجہ سے میں نے دوبارہ اکاؤنٹ کو ایکٹیو کیا...... تو بس ٹھیک ہے سوشل میڈیا...... زیادہ کیا کہوں۔"

☆ "ہر فن مولا فنکار ہیں آپ ...... کبھی کچھ لکھنے کا بھی خیال آیا آپ کو؟"

❀ "خیال؟ میں لکھ چکا ہوں۔ فلم "اندر آنا منع ہے" اور فلم "خبردار" کے سیکنڈ ہاف کے اسکرپٹ میں نے لکھے۔ ویسے مجھے اصلاحی موضوعات پر لکھنا پسند ہے اور ان شاء اللہ بہت جلد فلم کے لیے یا ٹی وی کے لیے کسی اصلاحی موضوع پر کچھ لکھوں گا۔"

☆ "ایک زندہ انسان کے لیے دنیا میں سب سے خوب صورت چیز کیا ہے؟"

❀ "ایک زندہ انسان کے لیے دنیا میں سب سے خوب صورت چیز اس کے والدین اور پھر ذہنی سکون ہے۔ والدہ کا ساتھ ختم ہوگیا ہے۔ بس ذہنی سکون کی تلاش ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ والدہ کی جدائی پر صبر آجائے تو پھر ذہنی سکون بھی مل جائے۔"

☆ "عورت کا سب سے خوب صورت روپ "ماں" ہے۔ کیا کہیں گے اس بارے میں؟"

❀ "اگرچہ عورت کا رتبہ بہت بلند ہے۔ مگر آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ سب سے خوب صورت روپ "ماں" کا ہے ماں کے روپ میں تو عورت اپنے معراج پر ہوتی ہے۔ میں جب گھر میں ہوتا تھا اور ماں کے روزانہ کے معمولات دیکھتا تھا تو سوچتا تھا کہ

یہ کیا "ہیں" کتنا کام کرتی ہیں ...... میرا یقین ہے کہ عورت ہم مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ وہ بیمار ہو لاغر ہو۔ جاب کرتی ہو۔ بچوں کا ساتھ ہو۔ وہ سب کا خیال رکھتی ہے اور کسی بات کو بہانہ بنا کر کسی کام سے انکار نہیں کرتی۔"

☆ "بالکل ...... ماں اور بیٹی کی جدائی نے یقیناً زندگی میں "خلا" پیدا کر دیا ہوگا؟"

◆ "خلا تو بہت چھوٹا لفظ ہے میں تو بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ صبر آتا ہی نہیں تھا۔ مگر پھر جب یہ سوچتا تھا اور ہوں کہ ہمیں بھی تو اس دنیا سے جانا ہے تو یہ سوچ کر کہ شاید ان سے ملاقات ہو جائے۔ تھوڑا سا اطمینان ہو جاتا ہے۔ پھر اگر میں اسی جدائی کو لے کر بیٹھ گیا تو دنیا کی اور اپنوں کی دیگر ذمہ داریاں کیسے نبھاؤں گا۔ میں اپنی روٹین لائف میں واپس آیا ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تنہائی میں جدا ہونے والے لوگ بہت شدت سے یاد آتے ہیں۔ بہت زیادہ ڈیپریشن ہوتا ہے۔"

☆ "سوشل ہیں؟"

◆ "نہیں زیادہ نہیں ...... میں جلدی لوگوں میں گھلتا ملتا نہیں ہوں۔ میرا حلقہ احباب اور حلقہ یاراں زیادہ وسیع نہیں ہے۔"

☆ "روٹین لائف اچھی لگتی ہے یا تبدیلیاں ہوتی رہنی چاہئیں؟"

◆ "تبدیلیاں ہر انسان کو پسند ہوتی ہیں ...... اور مجھے بھی ہیں۔ میرا تو کبھی کبھار دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں دور نکل جاؤں اور کچھ عرصہ اکیلے زندگی گزاروں ...... مگر ایسا ممکن نہیں ہے۔"

☆ "کیا اچھا ہے اس فیلڈ میں؟"

◆ "کوئی بھی فیلڈ ہو۔ سب کچھ اچھا نہیں ہوتا ہے یہ شوبز کی فیلڈ ہے اس لیے سب کچھ سامنے آ جاتا ہے۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ اس فیلڈ کو چھوڑ دوں۔ مگر خیر ......"

☆ "بہت سے اچھے اور سینئر فنکاروں کے

ساتھ کام کیا۔ ابھی بھی کوئی خواہش ہے؟"

◆ "ابھی بہت سے سینئر فنکار ہیں جن کے ساتھ کام نہیں کیا اور کرنے کی خواہش ہے۔ سب سے زیادہ خواہش تو نعمان اعجاز کے ساتھ کام کرنے کی ہے دیکھیں کہ ان کے ساتھ کام کرنے کی خواہش کب پوری ہوتی ہے۔"

☆ "کچھ پرسنل سوال ...... مزاجاً تو آپ نرم ہیں۔ مگر آپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ غصے کے بھی تیز ہیں ...... ایسا ہے؟"

◆ "اب نہیں میں ہمیشہ سے ہی مزاج کا نرم ہوں غصہ ایک فطری عمل ہے۔ پہلے بہت غصہ آتا تھا، اب کم آتا ہے۔ شاید وقت اور حالات انسان کو بدل دیتے ہیں۔ تو میں بھی بدل گیا ہوں اور غصہ اسی وقت آتا ہے جب کوئی منہ پر جھوٹ بولے ......"

☆ "اور آخری سوال ...... اپنے بارے میں کیا کہیں گے؟"

◆ "میں ایک محبت کرنے والا انسان ہوں ...... میرا فن میرے لیے سب کچھ ہے اور میرا فن ہی مجھے سب سے منفرد رکھتا ہے۔"

میری بھی سنئے

سید عارض الدین احمد

شاہین رشید

1 ''میرا نام؟''
''سید عارض الدین احمد۔''
2 ''پیار سے بلاتے ہیں؟''
''اجی۔''
3 ''دنیا میں آیا؟''
''7 نومبر 1991ء کو اور میرا ستارہ ''اسکارپیو'' ہے۔''
4 ''مادری زبان؟''
''پنجابی۔''
5 ''بہن بھائیوں میں میرا نمبر؟''
''سب سے چھوٹا ہوں گھر میں۔''
6 ''میرا بچپن؟''
''بہت مزے کا گزرا...... بہت شرارتی تھا مگر تیز طرار بھی بہت تھا۔ سب کو اس طرح ڈیل کرتا تھا کہ کوئی میری شکایت گھر والوں سے نہیں کرتا تھا۔ تو بس شرارت بھی ہو جاتی تھی اور بچ بھی جاتا تھا۔''
7 ''مار پڑی؟''
''بہت کم ڈانٹ پڑی...... مار تو کھائی ہی نہیں۔''
8 ''صبح اٹھ جاتا ہوں؟''
''تقریباً ساڑھے نو بجے...... دیر تک سونے کی عادت نہیں ہے۔ بس ایک عادت ہے کہ جب تک صبح چائے نہ ملے طبیعت سے سستی ختم نہیں ہوتی۔''
9 ''کورونا نے سکھایا؟''
''کہ دوست احباب اور رشتے دار بہت اہم ہوتے ہیں ان کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ سب سے تعلق رکھنا چاہیے کہ یہی اصل زندگی ہے۔ لاک ڈاؤن میں گھر بیٹھنا پڑا تو ان باتوں کا احساس ہوا۔''
10 ''زندگی گزارنے کے کچھ اصول ہیں؟''
''اصولوں سے زندگی نہیں گزرتی...... انسان کا جس طرح دل چاہے زندگی گزارے...... غلطیاں بھی کرے تاکہ سیکھنے کا موقع ملے۔ ایک بار محبت بھی کرے تاکہ جب دل ٹوٹے تو احساس ہو کہ دکھ درد کیا ہوتا ہے۔''
11 ''کس کی خاطر کیا چھوڑا؟''
''پڑھائی کی خاطر کرکٹ چھوڑی کرکٹ میرا پسندیدہ کھیل ہے۔ مگر جب رزلٹ تھوڑا سا برا آیا تو کرکٹ چھوڑ دی۔ اگر نہ چھوڑتا تو آج ایک بہترین کھلاڑی ہوتا۔ اٹھارہ سال کرکٹ کو دیے میں نے۔''
12 ''پہلی ملازمت؟''

"دس ہزار کمائے تھے...... کسی کو نہیں دیے اپنی ہی ضرورتوں کو پورا کیا۔"

13 "پہلا ڈرامہ؟ شہرت حاصل ہوئی؟"

"پہلا ڈرامہ "وجودِ زن" اور "پہچان، بھولی بانو" نے دی......"

14 "میرے ڈراموں کی تعداد؟"

"زیادہ نہیں کیے۔ اس لیے کیا تعداد بتاؤں۔ وجودِ زن تو پہلا ڈرامہ تھا۔ "یہ دل تنہا تنہا" ابھی حال ہی میں ختم ہوا ہے۔ کچھ انڈر پروڈکشن ہیں۔ یہی کوئی سات یا آٹھ سیریلز کیے ہیں۔"

15 "رول پسند کون سے ہیں؟ نیگٹو یا پوزیٹو رومانٹک رول؟"

"پسند ناپسند کچھ نہیں ہوتا...... بس نہ نگیٹو کو مانتا ہوں نہ پوزیٹو کو نہ رومانٹک کو...... بس رول اچھا ہونا چاہیے...... رول سمجھ میں آ جاتا ہے تو سب کچھ آسان ہو جاتا ہے، میں رول کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر اسے کرنے کی حامی بھرتا ہوں۔"

16 "گزرے وقت میں کون سا وقت مجھے واپس چاہیے؟"

"وہ وقت جب میں بھرپور طریقے سے کرکٹ کھیلتا تھا اور اچھا کرکٹر بننے والا تھا۔"

17 "ایک رول جو کرنا چاہوں گا؟"

"ایک نہیں دو رول کرنا چاہوں گا...... اور وہ بھی سیاست دانوں کے ایک تو "عمران خان" کا اور دوسرا "شیخ رشید" کا۔"

18 "کن لوگوں کو پتھر مارنا چاہوں گا؟"

"ان لوگوں کو جو سگنل توڑتے ہیں۔ جو قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔"

19 "پسندیدہ ترین کھانا جو جب ملے کھا لیتا ہوں؟"

"دال چاول...... اور چائے بسکٹ جب دل چاہے کھلا دیں۔"

20 "بچپن کی ایک عادت جو گئی نہیں؟"

قہقہہ...... "چھپ چھپ کر لوگوں کی باتیں سننا، بچپن میں تو بہت سنتا تھا۔ فارغ جو ہوتا تھا۔ اب ایسا نہیں ہے۔"

21 "گھر میں کھانے کی بہترین جگہ؟"

"ایک صوفہ ہے جو مجھے بہت پیارا ہے بس اسی پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہوں۔"

22 "اماں ابا کے لیے کچھ الفاظ؟"

"کچھ الفاظ؟...... الفاظ ہی نہیں ان کے لیے...... اور وہ میرے لیے سب کچھ ہیں۔ ہر اچھی بری خبر، بات، ترقی تنزلی کے لیے میرے والدین ہی میرے سامنے ہوتے ہیں۔ پہلے ساری باتیں ان سے شیئر کرتا ہوں پھر کسی اور سے۔"

23 "شادی کے لیے پسندیدہ رسم؟ شادی محبت کی یا ارینج؟"

"بات یہیں پر ختم ہو جاتی ہے کہ میں شادی کے خلاف ہوں۔"

24 "کیوں؟"

"مجھے تو شادی میں سوائے اولاد ہونے کے کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔"

25 ''ٹریفک جام ہو تو سوچتا ہوں؟''
''کہ یہ سب لوگ کہاں جا رہے ہوں گے۔''
ہنستے ہوئے...... عجیب عجیب خیالات آتے ہیں۔''
26 ''کون سے سین کرنا مشکل لگتے ہیں؟''
''ڈیتھ سین...... نہ صرف مشکل بلکہ بہت مشکل لگتے ہیں۔''
27 ''چائے یا کولڈ ڈرنک کیا پسند ہے؟''
''چائے...... نشے کی حد تک پسند ہے۔''
28 ''گھر میں کس کو بہت غصہ آتا ہے؟''
''یہ پوچھیں کہ کس کو غصہ نہیں آتا...... ماشاءاللہ گھر میں سب ہی غصے کے بہت تیز ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر۔''
29 ''غصے میں منہ سے کیا نکلتا ہے جھاگ یا برے الفاظ؟''
ہنستے ہوئے...... ''کچھ بھی غصے پر منحصر ہے کہ کس بات پر آ رہا ہے۔''
30 ''زیادہ سونا وقت کا کھونا...... ایسا ہے؟''
''بالکل ہے...... نیند صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس لیے بھرپور نیند لیں۔ کچھ لوگوں کو بلکہ اکثریت کو نیند بہت پیاری ہوتی ہے۔ جبکہ مجھے نیند پیاری نہیں ہے۔''
31 ''بچت کی بہترین شکل؟''
''ابھی تو بچت ہی نہیں ہو پا رہی۔''
32 ''خواتین رائٹرز میں کون پسند ہے؟''
''بانو قدسیہ۔''
33 ''حکومت کون سی اچھی تھی پہلے والی یا اب والی؟''
''اب والی تو بالکل بھی اچھی نہیں ہے۔ بالکل بھی مطمئن نہیں ہوں اور پچھلی حکومتوں نے بھی کچھ زیادہ اچھے کام نہیں کیے۔''
34 ''ملک سے باہر جانے کا موقع ملے تو؟''
''ملا تھا...... جاب کی بھی آفر آئی تھی اور کسی نے رشتہ بھی مانگا تھا۔ میں نے دونوں کو ہی منع کر دیا۔ میں پاکستان میں اپنوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔''
35 ''کبھی اپنے آپ کو نقصان پہنچایا؟''
''غصے میں اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچاتا ہوں۔ غصہ کے اظہار کا یہی طریقہ ہے میرے پاس۔''
36 ''ٹی وی کا کوئی ایسا شو جس کے ختم ہونے کا افسوس ہے؟''
''میں جب چھوٹا تھا تو مستنصر حسین تارڑ کے مارننگ شوز بہت شوق سے دیکھتا تھا...... اور جب وہ ختم ہوتا تھا تو مجھے رونا آ جاتا تھا کہ کیوں ختم ہو گیا ہے...... اور جب ویسے ہی ختم ہو گیا تو مجھے بہت افسوس ہوا۔''
37 ''ادب میں کس کو پڑھتے ہیں؟''
''مشتاق احمد یوسفی...... منٹو...... جون ایلیا، اشفاق احمد اور دیگر۔''
38 ''دعا میں کیا مانگتا ہوں؟''
''کم سے کم لمبی عمر کی دعا نہیں مانگتا...... زیادہ جینے کی خواہش نہیں ہے۔''
39 ''میوزک جو پسند ہے؟''

"مجھے سنجیدہ میوزک پسند ہے۔ غزلیں سنتا ہوں۔ سیڈ سونگ سنتا ہوں اور میری گاڑی میں زیادہ تر سجاد علی کے ہی گانے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔"

40 "ٹی وی پہ زیادہ کیا دیکھتا ہوں؟"

"ڈرامے ہی دیکھتا ہوں اور کچھ سیکھنے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔"

41 "اپنا کردار (ڈرامے میں) جو پسند آیا؟"

"بھولی بانو" اور "کہیں دیپ جلے" کا کردار مجھے لگا کہ میں نے اچھی پرفارمنس دی ہے۔"

42 "نصیحت یا نصیحت کرنے والا...... کیا برا لگتا ہے؟"

"نصیحت کرنے والا...... کوئی بزرگ ہے تو خیر ہے مگر کوئی اپنے جتنا ہو تو برا لگتا ہے۔"

43 "خودی یا خودسری کیا ہے مجھ میں؟"

"خودی...... بڑا ہوا تو دل میں خیال آیا کہ ابا سے ہر وقت مانگنا اچھا نہیں لگتا لہٰذا "سموسے اور چائے" پر گزارا کرتا تھا اس خودی کی وجہ سے تھوڑا غربت میں وقت گزرا۔ پھر اللہ کا کرم ہو گیا۔"

44 "کیمرے سے دوستی کب ہوئی؟"

"تھوڑی دیر میں ہوئی۔ شروع شروع میں تو ٹانگیں بھی کانپتی تھیں، زبان اور ہونٹ خشک ہو جاتے تھے اور دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ اب ایسا کچھ نہیں ہوتا۔"

45 "خوش کب ہوتا ہوں؟"

"جب نئے اسکرپٹ کے ساتھ شوٹ پر ہوتا ہوں۔ اگرچہ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے پہلے سین پر...... مگر پھر دھڑکنوں پر جلدی قابو پا لیتا ہوں۔"

46 "بچپن کے پسندیدہ فنکار؟"

"خیام سرحدی، راحت کاظمی، مرینہ خان اور اس وقت کے سب سینئر فنکار۔"

47 "کس کے لیے پہلے شاپنگ کرتا ہوں؟"

"اپنے لیے ہی کرتا ہوں۔ پھر پیسے بچ جائیں

تو گھر والوں میں کسی کے لیے کچھ لے لیتا ہوں۔"

48 "آنے والے کل کی فکر زیادہ ہوتی ہے یا آج کی؟"

"آج کی اور ابھی کی...... کل کس نے دیکھی ہے۔"

49 "آپ کی فیوچر پلاننگ؟"

"فیوچر پلان نہیں کرتا...... آج پر چلتا ہوں، کل کی فکر نہیں کرتا۔"

50 "جو دل سے اتر او ہ؟"

"وہ بس اتر گیا، پھر واپس نہیں آ سکتا۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

☆☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... زینب علی

میک اپ ...... روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ...... موسیٰ رضا

مقابل ہے آئینہ

بشریٰ رضوان

رِدارہ

س ''اصلی نام کیا ہے۔ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟''

ج ''اصل نام بشریٰ رضوان ہے مگر گھر والے اور خاندان والے سونو بلاتے ہیں یا سوئی۔''

س ''آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟''

ج ''آئینہ دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اللہ نے بغیر کسی نقص کے پیدا کیا اور خوب صورت ہوں۔''

س ''حسین صورتیں دیکھ کر کیا خیال کرتا ہے؟''

ج ''اللہ کی بنائی صورتیں اور چیزوں کی تعریف کرتی ہوں اور دل میں ماشاء اللہ کہتی ہوں۔''

س ''اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟''

ج ''پرس میں بہت کچھ رکھتی ہوں، کھانے کی اشیاء، پین پنسل، کام کی بہت سی چیزیں ڈائجسٹ، آئی ڈی کارڈ، پیسے اور خط لکھ کر ڈالنے کے لیے لفافہ ایڈوانس میں لیتی ہوں۔''

س ''بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟''

ج ''نہیں بھوتوں سے کبھی ڈر نہیں لگا کیونکہ ہماری طرح وہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔''

س ''مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟''

ج ''مہمان اللہ کی رحمت ہے اس لیے اچھے لگتے ہیں۔ مہمان نواز بہت ہوں، یہ عادت امی سے ملی ہے۔''

س ''کھانے میں کیا پسند ہے؟''

ج ''کھانے میں تہہ والی بریانی، اٹالین پیزا آئس کریم، چاکلیٹس، شوارمہ اور ڈرائے فروٹ میں اخروٹ اینڈ بادام میرے فیورٹ ہیں۔''

س ''اگر آپ کو حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟''

ج ''فرسٹ آف آل تو معصوم جانوں کے ساتھ کھیلنے والے شیطانوں کو سر عام پھانسی دوں گی ستر کوڑے مار کر اور غریبوں کو ان کا حق دوں گی۔''

س ''پسندیدہ شاعر؟''

ج ''ویسے تو سب ہی اچھے ہیں۔ اداس شاعری پسند ہے اور پروین شاکر، احمد فراز، وصی شاہ، جون ایلیا بہت پسند ہیں۔''

س ''مزاجاً لڑاکا ہیں؟''

ج ''نہیں برداشت بہت ہے مگر غلط ہونے پر بول دیتی ہوں، چاہے کوئی بھی ہو پھر حق تلفی برداشت نہیں ہوتی، چاہے وہ میری ذات کی ہو یا دوسروں کی۔ اس لیے امی سے ڈانٹ پڑتی ہے کہ ہر کسی کے معاملے میں مت بولا کرو، جب انسان خود نہیں اپنے لیے بول رہا تو تم بھی چپ رہو۔''

س ''اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟''

ج ''پانچ وقت نماز کے علاوہ قرآن کی تلاوت ذکر و اذکار نوافل ادا کرنے پر گناہوں کی معافی پر مگر سب سے بہترین وقت تہجد ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ میں اس تہجد سے غافل نہیں لازمی ادا کرتی ہوں۔''

س ''کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟''

ج ''مجھے کھرے اور سچے لوگ پسند ہیں جو حقیقت پسند ہوں، رشتوں میں عدل اور توازن قائم رکھیں، پولائٹ نیچر ہوں، باشعور لوگ متاثر کرتے ہیں۔''

س ''اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی تو؟''

ج ''اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی تو ہمیں ان لوگوں کا احساس کبھی نہ ہوتا جو گرمی سے بے حال اپنے بچوں کے لیے روزی و روٹی کا انتظام کرتے ہیں جن کے گھروں میں پنکھے نہیں ہیں، رات سڑکوں پر بسر کرتے ہیں۔''

س ''آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟''

ج ''میں بہت فضول خرچ ہوں اس بات پر تقریباً سب ہی ڈانٹتے ہیں کہ بچت کیا کرو مجھے تو سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ لوگ بچت کیسے کر لیتے ہیں۔''

س ''کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟''

ج ''جی کرتے ہیں نام اثر میں نے بہت سے لوگ دیکھے ہیں باہر بھی اور اپنے گھر میں بھی۔''

س ''وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے ہوئے خیال آتا ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟''

ج ''اس بات کی کبھی فکر نہیں کی کیونکہ دنیا کسی بھی حال میں جینے نہیں دیتی۔ یہاں جو ہے جیسا ہے چلنے دو بس۔ کیونکہ برے وقت میں انسان کا خود پر یقین ہونا ضروری ہے ورنہ دنیا کا بس چلے تو چلتی ہوئی سانس بھی روک دے دنیا کی پروا نہیں کرتی میں بھی۔''

س ''اگر آپ سنسان راستے سے گزر رہی ہیں اور کتا پیچھے لگ جائے تو؟''

ج ''بہت بار ایسا ہوا مگر مجھے جانوروں سے ڈر نہیں لگتا تو پتھر یا پاس پڑی چیز اٹھا کر مار دیتی ہوں''

س ''آپ کی نظر میں محبت؟''

ج ''محبت ایک عظیم رشتہ ہے اللہ اور اس کے رسول سے محبت ماں باپ کی محبت بہن بھائیوں کی محبت پاکیزہ رشتہ محبت ہی ہے۔''

س ''کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟''

ج ''سب سے پہلے والدین کی اساتذہ کی، فیملی ممبر کی، خالہ کی دوستوں میں کرن نساء صدف آپی باقی سب کی مگر ایک گمنام دوست بھی ہے جو ہر برے وقت میں ساتھ ہے اللہ سے دعا ہے کہ اسے کامیابی عطا کرے زندگی دے۔''

س ''اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے کیا؟''

ج ''نہیں بس زیادہ پسند نہیں تعریف کروانا مجھے ایسا لگتا ہے کہ لوگ بناوٹی اظہار کرتے ہیں۔ کیونکہ آج کل لوگ منہ پر کچھ کہتے ہیں اور پیٹھ پیچھے کچھ اور برائیاں کرتے ہیں۔

س ''ڈرامہ دیکھتی ہیں کیا؟''

ج ''جی نہیں ڈرامے بالکل نہیں پسند بس ڈائجسٹ پڑھتی ہوں شوق سے ہر ماہ انتظار ہوتا ہے اور ڈرامہ دیکھنے کا وقت نہیں ہوتا۔ ٹی وی نہیں ہے کمرے میں اس لیے مگر دادی چاچی والوں کے کمرے میں ہے ایل ای ڈی تو بہنیں وہاں دیکھ لیتی ہیں۔''

س ''اگر دوست ناراض ہو جائے تو کیسے مناتی ہوں؟''

ج ''مجھے منانا نہیں آتا مگر کوشش کرتے ہوئے بھی منا ہی لیتی ہوں مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے ویسے میں دوستوں کو ناراض کرنے والے کام نہیں کرتی۔''

س ''حقیقی خوشی کس وقت حاصل ہوتی ہے؟''

ج ''ہر وہ کام جس سے میری ماں کے چہرے پر خوشی نظر آئے سکون نظر آئے۔ دوسروں کے کام آ کر مدد کر کے، نمازوں کو مکمل کرنے پر خوشی ہوتی ہے کافی۔ ڈائجسٹ میں اپنا خط دیکھ کر ہوتی ہے۔''

س ''زندگی سے کیا سبق سیکھا؟''

ج ''زندگی میں ہم کسی کا برا کریں گے تو دنیا و آخرت دونوں میں جواب دہ ہیں، یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ یہاں کی زندگی کے لیے وہاں کی زندگی کو آزمائش میں نہ ڈالیں۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے مکافات عمل ہے۔ زندگی سمجھ میں نہ آنے والا معمہ ہے۔ برے وقت میں بہت سے لوگوں نے ساتھ چھوڑا ہے یہ زندگی ہی ہے کہ ہمیں انسان کا مقام بتا دیتی ہے کہ کون ہمارے ساتھ مخلص ہے کون نہیں۔''

س ''ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟''

ج ''نہیں رکھتی کیوں اللہ کی ذات صرف واحد ہے جو غیب کا علم رکھتی ہے۔''

س ''کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہے؟''

ج ''جب سب کچھ اس دنیا میں رہ جاتا ہے تو انسان میں اکڑ کس بات کی، خاک ہیں اور خاک میں مل جانا ہے۔''

س ''کوئی آخری بات؟''

ج ''اپنا اخلاق اچھا رکھو تا کہ لوگ مرنے کے بعد بھی تمہیں یاد رکھیں صلہ رحمی کرو لوگوں کو عزت دو تا کہ تمہیں بھی وہی کچھ ملے جو تم دوسروں کو دو گے جیو اور جینے دو لوگوں پر تنقید کرنا چھوڑ دو۔ اللہ نے ہر ایک کو جینے کا حق دیا ہے تو اپنے لفظوں سے دوسروں کی دل آزاری مت کرو ایسا رویہ رکھو کہ لوگ دعائیں دینے پر مجبور ہو جائیں اچھے لفظوں میں یاد رکھیں۔''

☆☆

مہوش افتخار

دامنِ سحاب

طیبہ کو آٹھ سال، دو ماہ اور تین دن بعد اس وقت اپنا گھر چھوڑنا پڑا جب ان کے ساتھ ان کا ہم سفر نہ رہا۔ نام نہاد اپنوں نے ان کی کم عمری کو بہانہ بنا کر ان کا مشترکہ سسرال میں رہنا غیر مناسب قرار دیا۔ ان کے بھائی خلیل غوری اپنی بہن اور بھانجی حیا کو اپنے گھر لے آئے۔

گردیزی ہاؤس میں شاہ مخدوم گردیزی اپنے دو بیٹوں حاتم گردیزی اور سبحان گردیزی اور بہوئیں زینب اور منیرہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی ”گردیزی کنسٹرکٹرز“ کے نام سے کنسٹرکشن کمپنی ہے۔ بنیادی طور پر ان کا تعلق ایک بڑے زمین دار گھرانے سے ہے۔

حاتم گردیزی کے دو بیٹے جرار اور ہادی اور ایک بیٹی خولہ ہے جبکہ سبحان گردیزی کی ایک بیٹی سلوئی ہے۔

زینب کو اپنے بیٹے جرار کے مغرورانہ انداز سخت ناپسند ہیں۔ وہ اپنے دادا کا بے حد لاڈلا ہے بلکہ عادت و اطوار میں بھی ان ہی کا پرتو ہے۔

عباس چچا کے بیٹے نصر نے جو منیرہ کا بھائی ہے، اپنے سالوں کے ساتھ مل کر شاہ مخدوم گردیزی کے آموں کے باغات پر قبضہ کرلیا ہے۔ شاہ مخدوم گردیزی نے اپنے بیٹوں کو عدالتی کارروائی کرنے کا حکم دے دیا ہے۔

حلیل غوری کے بے ہوش ہونے پر طیبہ ان کو ہاسپٹل لے کر گئیں تو ڈاکٹر نے بتایا کہ خلیل غوری کو برین ٹیومر ہے۔
جوانی میں حاتم غوری اور خلیل غوری میں گہری دوستی تھی۔ ہاسپٹل میں گیارہ سال بعد حاتم صاحب کو دیکھ کر طیبہ حیران رہ جاتی ہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔
نصیر اپنی بہن منیرہ کو فون کرتا ہے اور دھمکی دیتا ہے اگر ملک دلاور سے صلح صفائی نہیں کی تو اس کا خمیازہ دشمنی کی صورت میں بھگتنا پڑے گا۔
آقا جان فوراً گاؤں جانے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

ساتویں قسط

''چچ...... چچ...... غلطی کر گئے بزرگو۔ بہت بڑی غلطی۔'' شاہ مخدوم کی نظروں میں نظریں گاڑے وہ آگے کو جھک آیا۔ اس کے انداز میں اچانک ہی طوفان سے پہلے کا سکوت در آیا تھا۔
شاہ صاحب کو اتنی دیر میں پہلی بار اس کی آنکھوں کے رنگ پڑھنے میں دشواری ہوئی تھی۔ وہ کیا سوچ رہا تھا وہ سمجھ نہیں پائے تھے۔

''پتا ہے شاہ جی۔'' وہ مسکرایا تو مسکراہٹ میں عجیب سی وحشت ناچ رہی تھی۔ ''میرے اندر ایک جانور ہے اور میری کوشش ہوتی ہے کہ وہ جانور سویا ہی رہے۔ لیکن بعض اوقات میری اس کوشش پہ آپ جیسے کرم فرماؤں کا کوئی ایک لفظ، ایک جملہ ہی پانی پھیرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ جس کے بعد نہ تو میں اپنے کسی عمل کا ذمہ دار رہتا ہوں اور نہ ہی مجھے کسی نتیجے کی پروا رہتی ہے۔''
''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟'' شاہ مخدوم پیشانی پر بل لیے گویا ہوئے۔
''نہ...... نہ...... اب نہ کوئی دھمکی اور نہ کوئی بات چیت۔ اب صرف دشمنی ہوگی اور علی الاعلان ہوگی۔''
''دلاورے! کچھ خبر بھی ہے کہ کیا اول فول بکے جا رہا ہے تُو؟'' چوہدری حق نواز نے اسے لتاڑا۔
''اول فول تو اس سے پہلے بک رہا تھا چاچا۔ پتے کی بات تو میں نے اب کی ہے۔'' چوہدری کو جواب دیتا وہ شاہ صاحب کی جانب دیکھ کر بر فیلے انداز میں مسکرایا۔ ''ہاں تو شاہ جی سرکار! کیا کہہ رہے تھے آپ کہ میں کسی اصل نسل کا نہیں؟'' اس نے بے باکی سے شاہ مخدوم کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''اب میں آپ کو صحیح معنوں میں بتاؤں گا کہ میری نسل کیا ہے اور میرا اصل کیا ہے۔ بہت ناز ہے ناں آپ کو خود پر، اس نام و مقام پر۔ اب آپ دیکھیے گا کہ میں کیسے اسے نیست و نابود کرتا ہوں۔'' وہ چوٹ کھائے سانپ کی مانند پھنکارا۔ شاہ مخدوم کا خون جیسے کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔

''تو تو کرے گا ہمیں نیست و نابود؟'' سرخ چہرہ لیے وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھے۔ ماحول میں تناؤ بڑھتا دیکھ کر سبھی نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی تھی۔
''ہاں، میں کروں گا۔'' ملک دلاور تند لہجے میں کہتا ان کے روبرو آ کھڑا ہوا۔
اسے باپ کے مقابل آتا دیکھ کر حاتم اور سبحان برق کی سی تیزی سے اس کی جانب لپکے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس سے دو دو ہاتھ کرتے شاہ مخدوم نے سرعت سے اپنا بازو بیٹوں کی راہ میں حائل کر دیا۔
''تم دونوں میں سے کوئی اسے کچھ نہیں کہے گا۔ اس نے مجھے، شاہ مخدوم گردیزی کو للکارا ہے۔ لہٰذا اسے

جواب بھی میں ہی دوں گا۔" سخت لہجے میں بیٹوں کو تنبیہہ کرتے انہوں نے خون آشام نگاہوں سے اپنے سامنے کھڑے دلاور کو دیکھا۔

"میں اگر چاہوں تو تیری اس جرأت پہ ابھی اسی وقت تیری اور تیرے بھائی بندوں کی گردنیں اڑانے کا حکم دے سکتا ہوں۔ مگر اپنے گھر آئے دشمن پہ وار کرنا ہماری شان کے خلاف ہے۔ اس لیے میری بخشی گئی خیرات کو سمیٹ اور اپنے ان جعلی معتبروں کے ٹولے سمیت یہاں سے چلتا بن۔ تجھ جیسے گیدڑ کی گیدڑ بھبکیوں پہ سوچنا تو دور، میں ایک لمحے کو رک کر غور کرنا بھی اپنے وقت کا زیاں سمجھتا ہوں۔"

الفاظ تھے یا زہر میں بجھے تیر، ملک دلاور کا سارا خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا۔

"یہ تو تجھے وقت بتائے گا کہ کون گیدڑ ہے اور کون شیر، شاہ مخدوم۔" وہ ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے غرایا۔ "اور تو کیا ہماری جان بخشی کرے گا......؟ دنیا میں کوئی ایسا مائی کا لال پیدا نہیں ہوا جس کا ہاتھ ملکوں کی گردن کو چھو بھی سکے۔ اور تو نے کیا کہا تھا کہ مجھے اپنے ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے تیرے گھر کی عورتوں کی ضرورت ہے؟" طنزیہ لہجے میں کہتا وہ یک لخت اس زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا کہ شاہ صاحب لب بھینچ کر رہ گئے۔ جبکہ حاتم اور سبحان کا صبر اپنی آخری حد کو آ پہنچا۔

"نہیں بھولے بادشاہ! ملک دلاور تن تنہا تیرے پورے خاندان پر بھاری تھا، ہے اور ایسا بھاری رہے گا کہ تیرا سارا خاندان اس دن کو روئے گا جب تم لوگوں نے مجھے للکارنے کی غلطی کی تھی۔ تو نے مجھے بھری محفل میں بزدلی کا طعنہ دیا ہے ناں؟ تو لے، آج سب کے سامنے میں تیری زمینیں چھوڑنے کا اعلان کرتا ہوں۔ جا اور جا کر اب میری بخشی خیرات پر عیش کر۔ تو بھی کیا یاد کرے گا، کس سخی سے پالا پڑا ہے۔" ان کی آنکھوں میں جھانکتے وہ بھرپور انداز میں مسکرایا تو ہر شخص اپنی جگہ پر ساکت رہ گیا۔ یہ وہ کیا کہہ رہا تھا؟

بے اختیار شاہ صاحب نے الجھ کر اپنے مقابل کھڑے اس سنکی کو دیکھا جس کی آنکھیں اور تاثرات اس کی مسکراہٹ کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔

"دلاورے! ہوش میں تو ہے؟ یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟" ملک دلاور کے بھائی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو جھنجوڑا۔

"بالکل ہوش میں ہوں یار۔ بلکہ صد فیصد ہوش میں ہوں۔" وہ بھائی کو دیکھ کر مسکرایا۔ "میں خون کے بدلے خون اور عزت کے بدلے عزت لینے کا قائل ہوں۔ اور یہ جنگ اب میرے لیے چند ٹکوں کی زمین سے کئی گنا بڑھ کر اہم ہو گئی ہے۔ یہ اب میرے وقار اور میرے پندار کی جنگ ہے۔ جس پر وار کرنے کی جرأت ان گردیزیوں نے کی ہے۔"

وہ نگاہوں میں نفرت کے شعلے لیے ایک جھٹکے سے اپنے مقابل کھڑے شاہ مخدوم اور ان کے بیٹوں کی جانب پلٹا تو حاتم گردیزی غرا کر اس کی طرف لپکے۔ انہیں دلاور پر پلٹتا دیکھ کر قریب کھڑے لوگوں نے سرعت سے انہیں پکڑا اور زبردستی کھینچتے ہوئے پیچھے کیا۔

"تو ہماری عزت پر وار کرے گا؟ اوقات دیکھی ہے اپنی؟" خود کو چھڑاتے وہ حلق کے بل چلائے۔ دلاور نے کھولتی نظروں سے انہیں گھورا۔

"یہی...... یہی وہ اکڑ اور غرور ہے جس کے اگر میں نے پرخچے نہ اڑائے تو ملک دلاور نام نہیں۔ آج میں تجھے تیری چھت کے نیچے کھڑے ہو کر سارے علاقے کے سامنے کہتا ہوں حاتم گردیزی کہ اب سے اپنی دونوں نہیں بلکہ تیسری آنکھ بھی کھلی رکھنا۔ کیونکہ آج کے بعد مجھے زندگی نے جب بھی موقع دیا، میں نے تم لوگوں کے پیروں کے نیچے سے زمین ہی نہیں سر پہ سے آسمان بھی کھینچ لینا ہے۔" انگلی اٹھائے وہ چٹانوں سے مضبوط لہجے

میں کہتا ایک جھٹکے سے پلٹ کر باہر کی جانب بڑھ گیا۔
اسے نکلتا دیکھ کر اس کے خاندان کے باقی مرد بھی اس کے پیچھے لپکے تھے۔ ان سب کے ساتھ نصر بھی تیزی سے دروازے کی طرف بڑھنے کو تھا جب عباس گردیزی کی بلند پکار پہ اس کے ساتھ ساتھ وہاں موجود باقی افراد نے بھی بے ساختہ پلٹ کر ان کی جانب دیکھا۔
''نصر گردیزی! میں تجھ جیسی ناہنجار اور نابکار اولاد سے، آج سب کے سامنے اپنا ہر تعلق ختم کرتا ہوں۔ آج سے تو میرے لیے اور میں تیرے لیے اجنبی ہوئے۔ تیرا اور میرا معاملہ اب روزِ محشر میرے رب کے حضور ہی طے ہوگا۔''
ان کی بات پہ پل بھر کو وہاں سناٹا چھا گیا۔ سب کی نگاہیں میکانکی انداز میں نصر گردیزی پر آٹھہریں جو بت بنا ایک ٹک باپ کو دیکھے جارہا تھا۔ ایک لمحے کو بھی کو یہ گمان گزرا کہ شاید نصر اپنی آخرت سنوارنے کے اس آخری موقعے کو ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ مگر اس وقت ان سب کی حیرت اور دکھ کی انتہا نہ رہی جس وقت وہ بنا کچھ کہے، نظریں چراتا دروازے سے باہر نکل گیا۔
سچ ہے جن دلوں پر مہریں لگ جائیں ان سے پھر اللہ نیکی اور بھلائی کی ہر توفیق بھی چھین لیتا ہے۔ اور اس توفیق کا چھننا کتنا بڑا خسارہ ہے اس کا اندازہ نصر جیسے نادان شاید اس زندگی میں تو کبھی نہیں لگا سکتے۔

☆☆☆

وقت کی نبض کبھی اتنی دھیمی بھی ہو سکتی ہے اس بات کا اندازہ منیرہ کو آج سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک ایک پل جیسے گھنٹوں پر محیط ہو گیا تھا۔ ان کا سارا دھیان مسلسل گاؤں، حویلی، اور وہاں بٹھائی جانے والی پنچائیت میں اٹکا تھا۔ نجانے آج حالات کون سا رخ اختیار کرنے والے تھے؟ وہ تو فقط سوچ کر ہی پریشانی کے مارے ادھ موئی ہوئی جارہی تھیں۔ زینب الگ صبح سے اپنے کمرے میں بند پڑی تھیں۔ ایسے میں اردگرد پھیلا سناٹا ان کی اس وحشت میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ تھک کر انہوں نے اپنی سسرالی حویلی میں فون کیا تھا اور وہاں کام کرنے والی پرانی ملازمہ کو تاکید کی تھی کہ جیسے ہی اسے کسی فیصلے کی خبر ملے وہ انہیں فوراً فون کر کے مطلع کرے۔
لیکن اب تو اس بات کو بھی تین گھنٹے ہو گئے تھے اور وہاں سے تاحال کوئی خبر نہ آئی تھی۔ بے چینی اور گھبراہٹ کے باعث منیرہ کا برا حال تھا۔ وہ دوبارہ حویلی فون کرنے کا سوچ رہی تھیں جب اچانک فون کی گھنٹی کی آواز نے ان کا سارا دھیان اپنی جانب کھینچ لیا۔ بے قراری سے بھاگ کر فون تک آتے ان کا دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آنے پر تل گیا تھا۔
''ہیلو۔'' وہ کوشش کے باوجود اپنی آواز کو لرزنے سے روک نہ پائی تھیں۔
''ہیلو۔ ہیلو بی بی جی۔''
''ہاں۔ ہاں سکینہ، بول۔'' دوسری طرف سے سکینہ کی آواز سن کر منیرہ کا پورا جسم کانپ اٹھا تھا۔ ان کے ہاتھ یک لخت برف کی طرح ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ نجانے وہ کون سی خبر سنانے والی تھی؟
''مبارک ہو بی بی۔ رب نے بڑی خیر کر دی ہے۔ دشمنوں کا منہ کالا ہوا ہے جی۔ ملکوں نے ہمارے سرکار کے باغ چھوڑ دیے ہیں۔''
''کیا۔'' منیرہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ ''تو..... تو نے ٹھیک سے تو سنا ہے ناں؟'' انہوں نے بے اختیار اپنے بے قابو ہوتے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔
''بالکل جی۔ چھیمو کے نکے منڈے (چھوٹے بیٹے) کو ہم نے بیٹھک کے پچھلے دروازے کے پاس ہی کھڑا کر رکھا تھا۔ اس نے ابھی ابھی آ کر بتایا ہے کہ ملک دلاور نے ہمارے باغ چھوڑنے کا اعلان کیا ہے۔'' وہ

پرُجوش سی بولی۔ منیرہ کو لگا جیسے ان پر شادیٔ مرگ طاری ہو گئی ہو۔

''یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے مولا۔'' آنکھوں میں آنسو لیے وہ پورے جذب سے بولیں۔ یہ کیسی انہونی، کیسا معجزہ ہو گیا تھا؟ ''اف سکینہ! مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔'' لرزتے لبوں پر کانپتی مسکراہٹ لیے انہوں نے بے یقینی سے سرد ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھوا۔ ان کی بات پر سکینہ ہنس پڑی۔

''او میری سوہنی بی بی! یقین تو ہمیں بھی نہیں آ رہا، مگر مزے کی بات یہ ہے کہ ایسا ہو چکا ہے۔''

''لیکن ان ملکوں نے اتنی آسانی سے ہماری زمینیں کیسے چھوڑ دیں؟'' وہ الجھن کا شکار ہوئیں۔ ''کیا انہوں نے بدلے میں کچھ نہیں مانگا؟''

''اب یہ نہیں پتا بی بی۔'' سکینہ معذرت خوانہ لہجے میں بولی۔ ''اصل میں چھیمو کا پتر بارہ، تیرہ سال کا معصوم سا بچہ ہے۔ وہ بتا تو رہا تھا کہ اندر بڑی گرما گرمی ہو رہی تھی پر پلے اس کے کچھ نہیں پڑا۔ صرف اتنا سمجھ میں آیا کہ ملکوں نے زمینیں چھوڑ دی ہیں۔ اس جھلے کے لیے بھی بس یہی کافی تھا، اتنا سنا اور ہمیں بتانے دوڑا چلا آیا۔'' سکینہ ہنسی تو منیرہ بھی اس کے ساتھ ہنس پڑیں۔

''یہ بھی ٹھیک ہے۔ سب سے اہم بات تو وہ نکال ہی لایا ہے۔''

''ہور نئیں تے کی۔ ایس توں ودکے ہور سانوں سنڑاں وی کی اے۔'' (اور نہیں تو کیا۔ اس سے بڑھ کے ہمیں اور سننا بھی کیا ہے۔) وہ مسکراتے ہوئے بولی تو منیرہ بھی مسکرا دیں۔ خوشی جیسے ان کے اندر سے پھوٹ رہی تھی۔

''اچھا اب میں فون رکھتی ہوں۔ رحمت کل تم سب کو تمہاری مٹھائی کے پیسے دے جائے گی۔'' انہوں نے اپنی والدہ کی ملازمہ کا نام لیا۔ سکینہ کی باچھیں یہاں سے وہاں تک کھل گئیں۔

''سلامت رہوؤ بی جی۔ رب سوہنا سدا یونہی ہنستا مسکراتا رکھے۔''

''آمین۔'' منیرہ نے جذب سے کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ ہاتھ میں پکڑا کارڈلیس ایک طرف رکھتے ہوئے انہوں نے بے اختیار اپنا آنچل تشکرانہ انداز میں آسمان کی جانب پھیلا لیا۔ اور اپنے اللہ کا شکر ادا کیا۔

آج پورے ڈیڑھ سال بعد ان کے سینے اور خوشیوں پر دھرا یہ بوجھ کہیں جا کے سرکا تھا۔ جس کے بعد انہیں یک لخت ہی اپنا آپ بہت عجیب بہت ہلکا پھلکا سا لگ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے زندگی نے آج کتنے عرصے بعد کھل کر سانس لی تھی۔ خوشی اور بے یقینی کا ایک بے پایاں احساس تھا جو ان کا تن من بھگوئے دے رہا تھا۔ وہ سب کچھ بھلائے سیڑھیوں کی جانب بڑھیں اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی زینب کے کمرے کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔

''بھابھی۔'' بے صبری سے دروازہ بجاتے انہوں نے بے تابی سے انہیں پکارا۔ ''بھابھی دروازہ کھولیں۔'' ان کی بے تابانہ پکار پہ بیڈ پر لیٹی زینب تیزی سے اٹھ بیٹھیں۔ پریشان نظروں سے دروازے کو دیکھتے ہوئے وہ اگلے ہی لمحے سرعت سے اٹھیں اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''کیا بات ہے؟ سب خیر تو ہے ناں؟'' ان کی ساری خفگی، ساری ناراضی اس پل جیسے ہوا ہو گئی تھی۔

''خیر ہی خیر ہے بھابھی۔ ملکوں نے ہمارے باغوں کا قبضہ چھوڑ دیا ہے۔'' منیرہ چمکتے چہرے اور مسکراتے لبوں کے ساتھ بولیں تو زینب کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں۔

''کیا؟''

''جی ہاں۔ آپ کو بہت مبارک ہو۔'' خوش دلی سے کہتی منیرہ مسکراتے ہوئے ان کی جانب بڑھیں تو زینب نے بھی آگے بڑھ کر انہیں خود سے لگا لیا۔

"تمہیں بھی بہت مبارک ہو۔ مگر یہ سب ہوا کیسے؟" زینب کی حیرت دیدنی تھی۔

"اللہ جانے بھابھی۔ مجھے تو خود بھی ساری تفصیل نہیں معلوم۔ یہ تو میں نے سکینہ سے کہہ رکھا تھا کہ جیسے ہی کسی فیصلے کی سن گن ملے مجھے اطلاع کر دے۔ آپ یقین جانیں اس کا فون اب کہیں تین گھنٹے بعد جا کر آیا ہے۔ اس دوران مجھ پر کیا بیتی یہ میں جانتی ہوں یا میرا رب۔" منیرہ کی بات پہ زینب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بالکل ایسا ہی ہے۔ مجھے بھی کسی کل چین نہیں آ رہا تھا۔ ایسے ایسے وہم اور وسوسے ستا رہے تھے کہ خدا کی پناہ۔" اپنی دھن میں اپنے احساسات بیان کرتیں زینب پہ منیرہ کو بے اختیار پرانی زینب کا گمان ہوا تھا۔ جن کے منہ سے انہوں نے کبھی کوئی نفرت بھرا جملہ نہیں سنا تھا۔

"بھابھی۔" انہوں نے یک لخت ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما تو زینب نے چونک کر انہیں دیکھا۔ "آج صبح جو کچھ ہمارے درمیان ہوا ہے۔ میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ دوبارہ ایسے تلخ لمحات ہمارے بیچ آئیں۔" آنکھوں میں سچائی اور چہرے پر ملال لیے وہ بوجھل سے لہجے میں گویا ہوئیں تو زینب کے دل کو بھی احساسِ ندامت نے آن گھیرا۔ بگڑتے حالات سے گھبرا کر شاید وہ اپنے شوہر اور بچوں کے لیے کچھ زیادہ ہی حساس ہو گئی تھیں جبھی اس درجہ بدگمانی کا شکار ہو گئی تھیں۔

"صحیح کہہ رہی ہو۔ مجھے بھی اس تلخ کلامی پر افسوس ہے۔" دھیمی آواز میں کہتے ہوئے وہ پل بھر کو نظریں چرا گئیں۔ منیرہ کے لبوں پر اک نرم سی مسکراہٹ آ ٹھہری۔

"چلیں پھر مل کر اچھی سی چائے پیتے ہیں۔ آج صبح سے ہم دونوں نے کچھ بھی نہیں کھایا۔"

"تم چلو میں فریش ہو کر آتی ہوں۔ بچے بھی بس آنے والے ہی ہوں گے۔" زینب نے پلٹ کر گھڑی کی طرف دیکھا۔

"آپ بتائیں رات کے کھانے میں آج کیا ہو؟ منیرہ پلٹتے ہوئے لحظہ بھر کو رکیں۔

"آج تو کچھ خاص اہتمام ہونا چاہیے۔" زینب کی بات پر منیرہ مسکرا دیں۔

"ٹھیک ہے میں دیکھتی ہوں۔"

ان کے آگے بڑھنے پر زینب نے دروازہ بند کیا اور اپنے اندر سرایت کرتی خوشی اور اطمینان کی لہر کو محسوس کرتے ہوئے سکون بھری اک گہری سانس لی۔ کل سے چھائی اس اعصاب شکن پریشانی کا انجام اتنے خوش گوار اور حیران کن موڑ پر ہو گا انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے ایک مسکراتی نظر اپنے اردگرد ڈالی اور مسرور سی باتھ روم کی جانب بڑھ گئیں۔

☆☆☆

چوٹ کھائے قدموں کی دھمک اور گاڑیوں کے ٹائروں کی غصیلی چرچراہٹ کے حویلی سے نکلتے ہی ماحول پہ یک لخت سناٹا سا چھا گیا تھا۔ جانے والے جا چکے تھے مگر اپنے پیچھے نفرت، بدلے اور نافرمانی کی بڑی ناگوار سی باس چھوڑ گئے تھے۔ عباس گردیزی کی بے یقین نگاہیں دروازے پر جمی تھیں جہاں سے ابھی چند لمحے پیشتر ان کا لختِ جگر ان کی امیدوں کو ہمیشہ کے لیے چکنا چور کر کے انہیں ساری دنیا کے سامنے شرمسار کر گیا تھا۔

اپنے اندر اٹھتے درد کی شدید لہروں کو دباتے ہوئے انہوں نے اپنی آنکھوں میں اترتی نمی بڑے حوصلے سے اپنے اندر اتاری، اور بھرپور ہمت سے بڑے بھائی کی طرف پلٹے۔

"مبارک ہو بھا جی۔ اللہ نے آپ کو سرخرو کیا۔ آپ کے دشمن از خود اپنی پسپائی کا اعلان کر گئے، یہ آپ کے لیے بہت بڑی کامیابی ہے۔" متوازن لہجے میں بولتے وہ مضبوط قدموں سے شاہ مخدوم کی جانب آئے تو انہوں نے بھی آگے بڑھ کر چھوٹے بھائی کو گلے سے لگا لیا۔ جو خود کو لگنے والے اس شدید دھچکے کو پسِ پشت ڈالے

مردانہ واران کے ساتھ آ کھڑے ہوئے تھے۔

عباس گردیزی کے اس درجہ حوصلے اور اعلیٰ ظرفی پہ وہاں موجود ہر نگاہ میں ان کے لیے عزت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

"تمہیں بھی مبارک ہو عباس۔ یہ مجھ اکیلے کی نہیں ہم سب کی کامیابی ہے۔ یہ حق کی کامیابی ہے۔ جس نے بالآخر باطل کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر ہی دیا۔" شاہ مخدوم اس تمام عرصے میں پہلی بار مسکرائے تھے۔

"وہ تو ٹھیک ہے شاہ صاحب۔" چوہدری حق نواز متفکر سے آگے بڑھے۔ "لیکن ملک دلاور کے تیور مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔ اس کی دھمکی نظر انداز کیے جانے کے لائق نہیں۔"

"ماما جی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ ان ملکوں کو نہیں جانتے چاچا جی۔ یہ انتہائی کینہ پرور لوگ ہیں۔ ایک بار اگر کسی کی جان کو آ جائیں تو ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اوپر سے اخلاقی طور پر بھی بالکل دیوالیہ ہیں۔ میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ لوگوں کو پہلے سے بڑھ کر محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔" بخت نے بات کرتے ہوئے پریشانی سے حاتم گردیزی کی طرف دیکھا تو ان کی پیشانی کے بل گہرے ہو گئے۔

"فکر مت کرو۔ میں اس کی دھمکی کو نظر انداز کرنے والا نہیں۔ لیکن اگر اس شخص نے وار میں پہل کی تو آج میں بھی آپ سب کے سامنے حلفاً کہتا ہوں کہ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اور اس کے قتل پہ آپ میں سے کوئی مجھ سے سوال نہیں کرے گا کیونکہ ملک دلاور کسی نرمی، کسی انسانیت کا مستحق نہیں۔" وہ قطعی لہجے میں بولے تو علاقے کے بزرگوں میں سے ایک اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"بچہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اپنی جان، مال اور عزت کے دفاع کا حق سب کو ہے۔ اور دلاور کی دھمکی کے تو ہم سب گواہ ہیں۔ ویسے بھی ان ملکوں کی ہٹ دھرمی، اور سینہ زوری دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ سارا علاقہ ان کی منہ زوری سے تنگ ہے۔ میرا مشورہ ہے شاہ صاحب آپ اپنی حویلی اور زمینوں پہ پہرے دار بڑھا دیں۔ اور ایسے ہی چند ضروری حفاظتی اقدامات شہر میں بھی اختیار کر لیں۔ باقی اصل وارث تو اللہ ہے، اس کا فضل رہا تو ان شاء اللہ آگے خیر ہی ہو گی۔"

"ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔ رہی اس کل کے لڑکے کی دھمکی تو اکبر بھائی، میں نے اپنی زندگی میں اس جیسے ایک نہیں کئی آوارہ گرد اور غنڈے نبٹائے ہیں۔ اس لیے آپ سب بے فکر رہیں۔ اب کی بار اگر انہوں نے میرے گھرانے کی طرف میلی نگاہ سے بھی دیکھا تو میں ان کی آنکھیں نوچ لوں گا۔" شاہ مخدوم سرد لہجے میں بولے تو اکبر علی سمیت باقی سب بھی خاموش ہو گئے۔ وہ انہیں سمجھا سکتے تھے، صورتحال کی سنگینی کا احساس دلا سکتے تھے لیکن اس سے آگے ان کے اختیار میں کچھ نہ تھا۔

"جاؤ فضل داد! ہماری جیت اور دشمنوں کی شکست کا ایسا بھرپور اعلان کرو کہ اس کی گونج سن کر گھر کو لوٹتے دشمنوں کے دانت کھٹے ہو جائیں۔" شاہ صاحب ایک طرف کھڑے فضل داد کی جانب پلٹے۔ ان کے حکم پر فضلو اثبات میں سر ہلاتا تیز قدموں سے باہر نکل گیا اور اگلے چند ہی لمحوں میں پورا علاقہ فائرنگ کی زوردار آواز سے گونج اٹھا۔

☆☆☆

اگلی صبح طیبہ بچوں کے ساتھ ہی ان کی وین میں اسکول کے لیے نکل گئی تھیں۔ ان سب کے جاتے ہی گھر میں خاموشی سی چھا گئی تھی۔ مگر آج اس خاموشی میں ایک طمانیت، ایک سکون تھا۔ جس کے زیر اثر میمونہ مطمئن سی اردگرد پھیلا بکھرا سمیٹنے میں مگن تھیں۔

آج صبح تینوں بچوں کی خوشی اور جوش دیدنی تھا، خاص طور پہ بسیط کا۔ جو اپنی پھپھو کے یوں اچانک ہی اپنی

ٹیچر بن جانے پر پھولے نہ سما رہا تھا۔ اس کی ایکسائٹمنٹ یاد کر کے میمونہ بے اختیار مسکرا دی تھیں۔
''یہ اکیلے ہی اکیلے کس بات پر مسکرایا جارہا ہے؟'' خلیل صاحب کی آواز پہ میمونہ نے رخ موڑ کر کچن کے دروازے کی جانب دیکھا تھا جہاں خلیل غوری کہیں جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ان کی تیاری پہ میمونہ چونک سی گئیں۔
''آپ کہاں جارہے ہیں؟''
''میں......'' وہ لحظہ بھر کو رکے۔ ''میں آفس جارہا ہوں۔ تین چار دن میں میری چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں۔ اس لیے سوچا کہ آج ذرا چکر لگا کر سب سے حال احوال کر آؤں۔''
''مگر آپ نے تو مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا۔''
''ہاں میرا ارادہ بھی بس بیٹھے بٹھائے ہی بنا ہے۔'' ہلکے پھلکے سے لہجے میں کہتے وہ اندر چلے آئے۔ ''تم بتاؤ ایک دو دن پہلے کن دواؤں کے ختم ہونے کا ذکر کر رہی تھیں۔ میں واپسی میں لیتا آؤں گا۔''
ان کی بات پر میمونہ بے اختیار گڑبڑا گئیں۔ اب وہ انہیں کیا بتاتیں کہ ان کی صرف (دوا) نہیں بلکہ باقی ساری دوائیں مع گھر کی دیگر ضروری چیزوں کے، طیبہ اسی روز بینک سے پیسے نکلوا کر لے آئی تھیں۔
''وہ...... وہ تو میں نے اگلے دن ہی منگوالی تھیں۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولیں۔ کوشش کے باوجود وہ شوہر سے غلط بیانی پر زبان کو اٹکنے سے روک نہ پائی تھیں۔ ڈھیروں ندامت محسوس کرتے ہوئے انہوں نے دل ہی دل میں طیبہ کو کوسا، جن کی ضد نے آج انہیں اسی صورت حال سے دوچار کر دیا تھا جس کا انہیں ڈر تھا۔ اگر خلیل صاحب کو اس بات کی بھنک بھی لگ جاتی کہ طیبہ گھر کے خرچ اخراجات میں ان کی مدد کر رہی ہیں، وہ بھی حیا کے لیے پس انداز کی گئی رقم سے تو شاید آج انہیں، ان کے عتاب سے بچانے والا کوئی نہ ہوتا۔
''منگوالی تھیں؟'' خلیل صاحب نے الجھ کر انہیں دیکھا۔ ''لیکن تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمھارے پاس پیسے ختم ہوگئے ہیں؟''
''جی۔ جی ہاں پیسے تو ختم ہو گئے تھے لیکن پرسوں جب میں نے اپنا پرس کھولا تو اس میں چھ ہزار کے قریب رقم موجود تھی۔ میں نے طیبہ کو دے تو وہ جا کر آپ کی دوائیں لے آئی۔ ساتھ ہی ضرورت کی کچھ اور بھی چیزیں میں نے منگوالی تھیں۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولیں۔ خلیل غوری نے انہیں پرسوچ نظروں سے دیکھا۔
''اچھا۔ چلو ٹھیک ہے پھر۔'' اپنے دھیان میں کہتے وہ جانے کے لیے پلٹے تو میمونہ کو لگا جیسے کسی نے ان کے سر پہ تانی تلوار ہٹا دی ہو۔ انہوں نے اک گہری سانس لیتے ہوئے اپنے مخل ہوتے حواس قابو میں کیے۔ جان میں جان آئی تو انہیں خلیل صاحب کی واپسی کا خیال ستایا۔ وہ تیز قدموں سے ان کے پیچھے چلی آئیں۔
''کتنے بجے تک واپس آئیں گے؟''
''دیکھو کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' مبہم سے انداز میں جواب دیتے وہ لاؤنج کا داخلی دروازہ کھول کر باہر نکل آئے تو پیچھے آتی میمونہ نے الجھ کر انہیں دیکھا۔
''یہ کیا بات ہوئی؟ آپ نے آفس سے کہیں اور بھی جانا ہے کیا؟''
''جی ہاں۔ اب اگر آپ کی تفتیش مکمل ہو گئی ہو تو میں جاؤں بیگم صاحبہ؟'' وہ مسکراتے ہوئے پلٹے۔ میمونہ نے خفگی سے انہیں دیکھا۔
''جی، جیسے آپ یہاں بڑے میرے سوالوں کے جواب دے رہے ہیں۔'' ان کے تپے ہوئے انداز پہ خلیل غوری نے اک آہ سی بھری۔
''اوہو...... عمر گزر گئی آپ کی تابعداری میں، مگر آپ کی جبیں کے بل نہ گئے مونا بیگم۔'' وہ ڈرامائی انداز

میں بولے۔ان کی اداکاری پر میمونہ باوجود خفگی کے خود کو مسکرانے سے روک نہ پائیں۔
"کتنے بڑے ڈرامے باز ہیں ناں آپ۔کوئی تیسرا دیکھے تو سمجھے کہ نجانے کتنا سیدھا اور خدمت گزار شوہر ہے۔"
"اس میں کوئی شک ہے بھلا۔" گاڑی کا لاک کھولتے انہوں نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔میمونہ نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا اور سر پہ دوپٹا رکھتے ہوئے دعا پڑھ کر ان پر پھونکنے لگیں۔
"یہ تم کیا پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونکتی رہتی ہو؟" خلیل صاحب نے جان بوجھ کر انہیں چھیڑا۔
"آپ کے سدھر جانے کی دعا کرتی ہوں مگر افسوس کہ ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔" وہ جل کر بولیں تو خلیل غوری نے ہنستے ہوئے انہیں اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔
"اس کے لیے تمہیں چلہ کاٹنا پڑے گا۔کیونکہ ہم اتنی آسانی سے سدھرنے والے نہیں۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتے وہ ان کے چہرے کی جانب جھکے تو میمونہ نے بے اختیار انہیں پیچھے دھکیلتے ہوئے خود سے دور کیا۔
"آپ تو گھر سے باہر ہی بھلے۔جائیں جا کر اپنے کام نپٹائیں۔" انہیں گھورتے ہوئے وہ مصنوعی خفگی سے بولیں تو خلیل صاحب شرارت سے ہنستے ہوئے گاڑی میں جا بیٹھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر کے کمرے میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔صرف گھڑی کی ٹک ٹک اور صفحے پلٹنے کی آواز اس خاموشی میں ہلکا سا ارتعاش برپا کر رہی تھی۔ڈاکٹر صاحب پورے دھیان سے اپنی سامنے رکھی رپورٹیں دیکھنے میں مصروف تھے اور ان کے مقابل سر جھکائے بیٹھے خلیل غوری بڑی خاموشی سے اپنے ہاتھوں کی لکیروں پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔
کتنا فرق تھا اس خلیل غوری میں اور اس شخص میں جو ابھی گھنٹہ بھر قبل اپنی زندگی کو بانہوں میں سمیٹے اس سے اٹھکیلیاں کرنے میں مصروف تھا۔ان کا یہ بے فکری بھرا روپ، یہ جاندار ہنسی بس اسی چار دیواری تک محدود تھی جس کے اندر ان کی کل کائنات سمائی تھی۔جس کے اندر حقیقت ایک سہانے خواب میں تبدیل ہو جاتی تھی مگر جس کی دہلیز پار کرتے ہی حقیقت اپنی تمام تر سفاکی اور تلخی سمیت ان پر حملہ آور ہو جاتی تھی۔اور اس پل حقیقت یہی تھی کہ وہ پچھلے کچھ دنوں سے اپنی طبیعت بے حد گری گری سی محسوس کر رہے تھے۔انہوں نے اس بات کا ذکر میمونہ اور طیبہ سے نہیں کیا تھا، ورنہ وہ دونوں پاگل تو ان کے منہ سے طبیعت خرابی کا سن کر ہی ہلکان ہونے لگتی تھیں۔
انہوں نے بس خاموشی سے اپنے ڈاکٹر سے رابطہ کیا تھا اور ان کے کہنے پر اپنے چند ایک ٹیسٹ کروائے تھے۔اور آج وہ میمونہ سے جھوٹ بول کر اپنے انہی ٹیسٹوں کی رپورٹ لیے ڈاکٹر صاحب کے پاس آئے ہوئے تھے۔جو اس پل پوری توجہ سے ان کے رزلٹ دیکھنے میں مصروف تھے۔خلیل غوری کے لیے یہ وقفہ بے حد بھاری تھا۔انہوں نے اپنا جھکا سر اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا تھا جو اپنی نظر کا چشمہ اتارتے ہوئے سیدھے ہو بیٹھے تھے۔
"ایسا ہے خلیل صاحب! آپ کے ٹیسٹوں کی رپورٹ بہتر آئی ہے لیکن اتنی نہیں جتنی کہ مجھے امید تھی۔"
"مگر کیوں؟ میں نے تو آپ کی دی ہوئی کسی بھی ہدایت سے لاپروائی نہیں برتی ڈاکٹر صاحب۔" انہوں نے پریشانی سے ڈاکٹر اصغر کا چہرہ دیکھا۔
"ہو جاتا ہے۔بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے۔" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولے۔"بات دراصل یہ ہے کہ ایک ڈاکٹر اپنے مریض کے لیے بہتر سے بہترین دوا تجویز کرتا ہے مگر ہر مریض پر دوا یکساں طریقے سے اثر

اندازنہیں ہوتی۔ آپ کے کیس میں مجھے ان دواؤں سے جس نتیجے کی امید تھی اتنا بہتر رزلٹ نہیں آیا۔ اس لیے صورتحال تھوڑی سی بگڑی ہے۔ مگر آپ فکر نہیں کریں میں آپ کی دوائیں تبدیل کر رہا ہوں۔ اگر ان سے بھی بہتری نہیں آئی تو ہمیں آپ کا ایک چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑے گا۔'' نرمی سے کہتے ہوئے وہ ان کی طرف دیکھ کر پروفیشنل انداز میں مسکرائے تو خلیل غوری کو لگا جیسے کوئی بم ان کے اعصاب پر آ گرا ہو۔ ان کا دل اس تیزی سے ڈوب کر ابھرا کہ چہرے کی رنگت پل بھر میں متغیر ہوگئی۔

''آ......آپریشن؟''

''جی ہاں۔ لیکن صرف تبھی اگر ان دوسری دواؤں سے فرق نہ پڑا تو۔ آپ پریشان مت ہوں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر ہم سرجری کی طرف بھی جاتے ہیں تو یہ بھی آج کل کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔'' وہ انہیں حوصلہ دیتے ہوئے بولے۔ خلیل صاحب اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا گئے۔ کہنا ہمیشہ آسان رہا ہے لیکن سہنا......

''برین سرجری میں کامیابی کی شرح کتنے فیصد ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ دھیرے سے بولے تو ڈاکٹر اصغر ایک لمحے کو خاموش ہو گئے۔

''دیکھیں خلیل! آپ پڑھے لکھے بندے ہیں۔ سمجھ سکتے ہیں کہ سرجری کوئی بھی ہو کامیابی کی شرح ففٹی پرسنٹ ہی ہوتی ہے۔ یہ ٹیسٹ، یہ رپورٹیں ایک حد تک ہی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ مرض کی اصل صورتحال تو آپریشن ٹیبل پر ہی واضح ہوتی ہے۔ اس لیے میں آپ سے یہی کہوں گا کہ دل چھوٹا مت کریں۔ اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اور ہماری مدد فرمائے۔'' وہ رسان سے بولے۔ خلیل غوری اک گہری سانس لیتے اثبات میں سر ہلا گئے۔

ڈاکٹر اصغر کے کمرے سے نکل کر وہ بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے اسپتال کے وسیع لان میں آ بیٹھے۔ دل اتنا بھاری اور طبیعت اتنی مکدر ہو رہی تھی کہ گھر جانے کا سوچ کر ہی انہیں وحشت سی ہو رہی تھی۔ انہیں اس وقت ایک دوست، ایک مہربان ساتھی کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی کہ جس کے سامنے انہیں بہادری کا، مرد ہونے کا ڈھونگ نہ رچانا پڑتا۔ جس کے سامنے وہ بلا جھجک اپنی ہر کمزوری بیان کر سکتے۔ یہ اقرار کر سکتے کہ انہیں بھی اپنے مرض سے ڈر لگ رہا ہے، مرنے سے خوف آ رہا ہے اور یہ کہ وہ بھی جینا چاہتے ہیں۔ اپنے بچوں کے ساتھ۔ اپنی بہت محبت کرنے والی بیوی کے ساتھ۔

اپنی بے بسی اور تنہائی کا احساس بے اختیار ان کی آنکھیں نم کر گیا۔ اپنے آنسو انگلیوں پر سمیٹتے ہوئے انہوں نے خالی خالی نظروں سے اپنے اردگرد دیکھا اور جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے سگریٹ کی ڈبیا ٹٹولنے لگے۔ وہ کوئی عادی اسموکر نہ تھے۔ لیکن کبھی کبھار یہ شغل کر لیا کرتے تھے۔ مگر اب جب سے حالات نے یہ کڑا رخ اختیار کیا تھا وہ اکثر و بیشتر اپنے اعصاب کو پرسکون کرنے کے لیے اسموکنگ کا سہارا لینے لگے تھے۔

اس وقت بھی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا کے ساتھ ہی کتنے کاغذات باہر نکل آئے تھے۔ بے دھیانی سے انہیں واپس رکھتے ہوئے اچانک ان کی نظر بے ہاتھ میں پکڑے کریم کلر کے وزٹنگ کارڈ پر جا ٹھہری۔ جس پر سنہری الفاظ میں کندہ ایک بڑا جانا پہچانا اور بڑا پیارا نام درج تھا۔ آن واحد میں گزرا کل ان کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ کیا دور تھا وہ بھی جب وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ جب دل کی ہر بات ایک دوسرے سے کہے بنا انہیں چین نہ آتا تھا۔ تو کیا آج بھی وہ اس گزرے دور کو پکار سکتے تھے؟ نچلا لب دانتوں تلے دبائے انہوں نے خود سے سوال کیا۔

معاً اپنا ہر درد اپنے اس مہربان دوست کے ساتھ بانٹ لینے کی خواہش ان کے اندر بڑی شدت سے جاگی

تھی۔ انہوں نے شدید بے چینی کے عالم میں ساری چیزیں جیب میں ٹھونسنے کے سے انداز میں ڈالیں۔ اور ہاتھ میں کارڈ لیے تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں ایک بہت ضروری کال ابھی اور اسی وقت کرنی تھی۔

☆☆☆

اپنے آفس کا طول و عرض ناپتے حاتم گردیزی کی بے چینی اپنے عروج پر تھی۔ کچھ ایسی ہی حالت سبحان صاحب کی بھی تھی جو چپ چاپ صوفے پر بیٹھے ہوئے منتظر نظروں سے وقتاً فوقتاً گھڑی کی جانب دیکھ رہے تھے۔

''کتنا کہا تھا میں نے آقا جان سے کہ یہ کام ہمیں اپنی نگرانی میں کروانے دیں مگر مجال ہے جو وہ کبھی کسی کی سن جائیں۔'' حاتم صاحب نے غصے سے سر جھٹکا۔

کل پنچائیت کے بعد حاتم صاحب نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ دونوں بھائی رات گاؤں میں ہی گزاریں گے اور اگلی صبح اپنے آدمیوں کے ساتھ خود جا کر اپنے باغوں کا مکمل جائزہ لیں گے۔ اور اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ آیا ملکوں نے ان کی زمین خالی کی ہے یا نہیں۔ لیکن شاہ مخدوم نے نہ صرف ان کے اس فیصلے کو رد کر دیا تھا بلکہ اسی شام شہر واپسی کی بھی ٹھان لی تھی۔ شاہ صاحب کے اس فیصلے کو عباس گردیزی سمیت چوہدری بخت نے بھی سراہا تھا۔ ان سب کے نزدیک یہ سراسر غیر ضروری خطرہ مول لینے والی بات تھی جس کی اس وقت قطعاً کوئی گنجائش نہ تھی۔

شاہ صاحب نے منشی فضل داد سمیت، عباس گردیزی اور چوہدری بخت کے چند بندوں کو یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ آج صبح جا کر قبضہ کی ہوئی زمینوں کا جائزہ لیں گے اور پھر انہیں فون پر ساری صورتحال سے آگاہ کریں گے۔ لیکن اب دوپہر کے بارہ بجنے کو آئے تھے اور فضل داد کا تا حال کوئی فون نہیں آیا تھا جس کی وجہ سے حاتم اور سبحان صاحب کی پریشانی اور بے چینی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

''اور اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو آقا جان نے ہمیں اور عباس چچا کی فیملی کو کھل کر ساری بات گھر میں کرنے سے منع کر دیا ہے؟ کیا منیرہ اور بھابھی کو ملک دلاور کے ارادوں کا علم نہیں ہونا چاہیے؟'' سبحان صاحب نے سپاٹ سے لہجے میں سوال کیا۔

''ہونا چاہیے یار...... بالکل ہونا چاہیے۔ ان حالات میں ان کا ہوشیار ہونا بے حد ضروری ہے۔ مگر پھر آقا جان کا کہنا بھی درست ہے۔ اگر زینب اور منیرہ کو دلاور کی دھمکی کا پتا چل گیا تو وہ نہ صرف خود بھی مزید پریشان اور خوف زدہ ہو جائیں گی بلکہ بچوں کو بھی ہراساں کر دیں گی۔ ہمارے لیے تو پھر انہیں اسکول تک بھیجنا مشکل ہو جائے گا یار۔'' بھائی کی بات پہ سبحان گردیزی نے اک کوفت بھری سانس لی۔

''اُفف! کس مشکل میں پھنس گئے ہیں۔'' انہوں نے بے زاری سے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ تبھی فون کی گھنٹی نے دونوں کو چونکا دیا۔ حاتم صاحب تیز قدموں سے ٹیبل تک آئے اور ریسیور اٹھا لیا۔

''ہیلو۔'' ان کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے فضل داد کی آواز سنائی دی تو حاتم گردیزی نے پرسکون سانس لی۔

''کہاں رہ گئے تھے فضل؟ ہم کب سے تمہارے فون کا انتظار کر رہے تھے؟'' فضل کا نام سن کے سبحان صاحب بھی پوری طرح ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔

''سرکار، مجھے معلوم ہے۔ مگر ہم علاقے کا چپا چپا چھان رہے تھے۔ آپ کو بڑی مبارک ہو جی۔ ہماری زمین پہ ملکوں اور ان کے کارندوں کا سایہ تک نہیں رہا۔'' اس نے خوش گوار لہجے میں انہیں مطلع کیا تو حاتم گردیزی کے چہرے پہ بڑی بھرپور مسکراہٹ در آئی۔

''زبردست! یہ تو تم نے بڑی بہترین خبر سنائی ہے یار۔'' انہوں نے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے دائیں انگوٹھے سے سب ٹھیک ہو جانے کا اشارہ کیا تو سبحان گردیزی کے چہرے پر بھی اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔
''بس اب ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میری ہدایات پر عمل کرو۔ لیکن خیال رہے کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ ہو۔'' وہ تنبیہی لہجے میں بولے۔
''آپ فکر ہی نہیں کریں سرکار۔ ایسا پکا بندوبست کروں گا کہ اب کی بار ان کا باپ بھی ہماری کسی زمین پر، پر نہیں مار سکے گا۔'' فضل داد کی بات پہ حاتم صاحب کے چہرے پر گہرا اطمینان پھیل گیا۔
''شاباش! چلو اب میں فون رکھتا ہوں۔ کوئی بھی مسئلہ ہو تو فوراً سے پیشتر اطلاع کرنا۔''
''ٹھیک ہے سرکار! اچھا جی رب راکھا۔'' الوداعی کلمات کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ حاتم گردیزی فون رکھتے ہوئے خوشی سے بھائی کی طرف پلٹے جو اٹھ کر مسکراتے ہوئے ان سے بغل گیر ہو گئے۔
''مبارک ہو بھائی جان۔''
''تمہیں بھی بہت مبارک ہو۔'' انہوں نے ان کی پیٹھ تھپتھپائی۔ ''صد شکر ہے کہ اللہ نے ہماری اس مشکل کو باآسانی دور کر دیا۔''
''آپ دیکھیے گا ان شاءاللہ باقی سب معاملات بھی بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔'' سبحان صاحب ان سے الگ ہوتے ہوئے بولے۔ تبھی فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجی تو حاتم صاحب نے فضل داد کا سوچ کر سرعت سے ریسیور اٹھالیا۔
''ہیلو۔''
''ہیلو۔ حاتم صاحب سے بات ہو سکتی ہے؟'' دوسری طرف سے ایک اجنبی آواز سن کر حاتم گردیزی چونک سے گئے۔
''جی بات کر رہا ہوں۔'' ان کے جواب پر لائن پہ پل بھر کو خاموشی چھا گئی۔ حاتم صاحب کے چہرے پر الجھن در آئی۔
''ہیلو؟''
''میں خلیل بات کر رہا ہوں۔ خلیل غوری۔'' لمحے کے توقف کے بعد دوسری جانب سے اپنا تعارف کروایا گیا۔ حاتم صاحب کی ساری الجھن آنِ واحد میں ہوا ہو گئی اور اس کی جگہ بڑی واضح سی خوشی نے لے لی۔
''کیسا ہے یار؟'' ان کے پُرجوش انداز پہ پاس کھڑے سبحان نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔
''ٹھیک نہیں ہوں۔ کیا تو ابھی مجھ سے ملنے ہاسپٹل آ سکتا ہے؟'' وہ دل گرفتہ سے بولے تو حاتم گردیزی کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا۔
''کیا بات ہے سب خیر تو ہے ناں؟'' انہوں نے متفکر لہجے میں سوال کیا۔
''بظاہر تو خیر ہی ہے۔'' وہ زخم خوردہ سا مسکرائے۔ ان کا لہجہ چیخ چیخ کر کچھ غلط ہو جانے کا احساس دلا رہا تھا۔ حاتم صاحب سرعت سے سیدھے ہوئے۔
''میں۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔ تو اس وقت ہاسپٹل میں کہاں ہے؟''
ان کے منہ سے ہاسپٹل کا سن کر سبحان صاحب بھی پریشان ہو گئے۔ نجانے کس کا فون تھا؟
''مرکزی لان میں۔''

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی دس منٹ میں پہنچتا ہوں۔" تیزی سے فون رکھتے ہوئے وہ بجلی کی سی رفتار سے پلٹے تو پریشان کھڑے سبحان صاحب سرعت سے آگے بڑھے۔

"کس کا فون تھا بھائی جان؟"

"خلیل کا۔" انہوں نے بنا پلٹے ٹیبل پر سے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں۔

"خلیل؟" انہوں نے الجھ کر بھائی کی پشت کو دیکھا۔

"خلیل غوری۔" چابیاں لیے وہ تقریباً بھاگتے ہوئے دروازے کی طرف لپکے تھے۔ اور پیچھے کھڑے سبحان گردیزی اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے تھے۔

☆☆☆

ہوا کے ساتھ جھولتے درخت سائیں سائیں کی آواز بکھیر رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حاتم گردیزی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس خاموشی کو کیسے اور کن الفاظ میں توڑیں۔ آیا تسلی دیں یا افسوس کریں؟ اسپتال تک آتے آتے نجانے کتنے واہموں اور وسوسوں نے ان کا دامن تھاما تھا مگر ان میں سے کوئی ایک بھی انہیں اس دھچکے کے لیے تیار نہ کر سکا تھا جو یہاں ان کا منتظر تھا۔ ان کا تو جیسے ذہن ہی ایک پل کو ماؤف ہو گیا تھا۔

"تو......" انہوں نے اپنے خشک پڑتے لبوں پر زبان پھیری۔ "تو نے اس دن مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا؟" وہ یاسیت سے بولے۔

خلیل غوری کے لبوں پر اک پھیکی سی مسکراہٹ در آئی۔

"کیا کہتا؟" وہ نگاہوں کی سیدھ میں غیر مرئی نقطے پہ نظریں جمائے ہوئے بولے۔ "سالوں بعد ملنے والے یار سے کیا کہتا؟ یہ کہ میں یہاں کینسر کا علاج کروا رہا ہوں؟ خود کو موت کے شکنجے سے آزاد کروانے کی کوشش کر رہا ہوں؟" حقیقت اتنی تلخ اتنی اذیت ناک تھی کہ حاتم گردیزی چاہ کر بھی اس کی کڑواہٹ کو کم نہیں کر سکتے تھے۔ مارے اذیت کے وہ اپنا نچلا لب کاٹ کر رہ گئے۔

"پتا ہے حاتم۔" ان کی پکار پہ حاتم گردیزی نے رخ موڑتے ہوئے ان کی طرف دیکھا جو چہرے پر ایک عجیب کھویا کھویا سا تاثر لیے دور نظر آتے درختوں کے درمیان نجانے کیا تلاش رہے تھے۔ "جب میں نے ابا کی حیات میں گھر اور زندگی کی باگ ڈور سنبھالی تو مجھے ان کا اکلوتا بیٹا ہوتے ہوئے بھی کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ نجانے ان کے کمزور اور عمر رسیدہ وجود سے ہمت اور حوصلے کی ایسی کون سی شعائیں پھوٹتی تھیں جو مجھے کبھی کسی کمی، کسی کمزوری کا احساس ہی نہیں ہونے دیتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے میں بے حد مضبوط ہوں، مجھے اللہ کے بعد کسی دنیاوی سہارے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر ان کے دنیا سے جانے پر مجھ پہ یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ میں اپنے گھر اور اپنی ذات سے جڑے رشتوں کا واحد سہارا، واحد سائبان ہوں۔ اپنے گھر کا اکلوتا مرد! اس نئی آگاہی نے مجھے اندر ہی اندر سہما دیا، پریشان کر دیا۔ مگر میں نے اس خوف کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا اور زندگی کو اپنے بل پر آگے بڑھاتا رہا۔ لیکن آج سے چھ ماہ قبل جب ڈاکٹر نے مجھ پر یہ انکشاف کیا کہ میرے دماغ میں رسولی ہے تب......" ان کی آواز بے اختیار لرز گئی۔

"تب جیسے میری ساری ہمت، ساری طاقت جواب دے گئی۔ پتا ہے اس ساری صورتحال میں میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات کون سی ہے؟" وہ اچانک ان کی طرف پلٹے تو دکھ سے انہیں تکتے حاتم گردیزی کی آنکھوں میں خاموش سوال اتر آیا۔

"جب مونا اور پیا تنہا میرے لیے اسپتالوں اور لیباٹریوں میں خوار ہوتی ہیں۔ انہیں یوں مارا مارا پھرتا دیکھ

کر میرا دل درد سے پھٹ جاتا ہے۔ اس وقت میرا دل کرتا ہے کہ کاش میرا کوئی بھائی ہوتا جو انہیں یوں در در کی ٹھوکروں سے بچالیتا۔ جو اس کڑے اور سخت ترین وقت میں ان کا سہارا، ان کا سائبان......" وہ اچانک آنکھوں پر ہاتھ رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے تو حاتم صاحب کے لیے اپنے جذبات پر قابو پانا ممکن نہ رہا۔ بہتے اشکوں کے ساتھ انہوں نے آگے بڑھ کر انہیں خود سے لگالیا۔ خلیل غوری کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح ان کے سینے سے آ لگے۔

"بس یار بس۔ تُو تو بہت ہمت والا ہے۔" ان کی پشت سہلاتے ہوئے انہوں نے دوسرے ہاتھ سے اپنے آنسو صاف کیے۔ "دیکھ اللہ نے تیری دعا سن لی ہے۔ اب میں آ گیا ہوں ناں اب تجھے بالکل بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" انہیں شانوں سے تھامے انہوں نے نرمی سے انہیں خود سے الگ کیا۔ خلیل غوری نے اپنا بھیگا چہرہ اٹھایا۔

"تُو۔ تُو مجھے چھوڑ کر کہیں جائے گا تو نہیں ناں؟" بہتے اشکوؤں کے درمیان وہ بچوں کی سی معصوم آس لیے بولے۔ حاتم گردیزی کو اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

"نہیں۔ کبھی نہیں۔" اور خلیل غوری کو لگا جیسے تپتے، جھلسے صحرا میں اچانک ہی کوئی ابرِ مہرباں ان پر سایہ فگن ہو گیا ہو۔

☆☆☆

"بھابی! مجھے شدید پریشانی ہو رہی ہے۔ بھائی ابھی تک کیوں نہیں آئے؟" بے قراری سے گھڑی کو تکتی طیبہ روہانسی ہونے کو تھیں۔ گیٹ سے لاؤنج اور لاؤنج سے گیٹ تک وہ کتنے ہی چکر لگا چکی تھیں مگر انتظار تھا کہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ شام کے پانچ بجنے کو آئے تھے اور خلیل صاحب کا تا حال کوئی پتا نہ تھا۔ دونوں کی حالت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ غیر ہوتی جا رہی تھی۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" میمونہ سر تھامے بولیں۔ ان کا دل بیٹھے جا رہا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ انہیں صبح کہیں نہ جانے دیتیں۔

"اب تو ان کا آفس بھی بند ہو گیا ہوگا ورنہ وہاں فون کر کے پتا کر لیتے۔" طیبہ زرد چہرہ لیے میمونہ کے پاس آ بیٹھیں۔ تبھی گیٹ پر بیل ہوئی۔ طیبہ بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھیں اور بھاگتی ہوئی گیٹ تک آئیں۔ میمونہ بھی تیز قدموں سے ان کے پیچھے لپکیں۔ تب تک طیبہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول چکی تھیں۔ دوسری طرف موجود چہرے پر نظر پڑتے ہی جہاں ان کی جان میں جان آئی تھی وہیں ان کا غصہ بھی عود کر آیا تھا۔

"آپ کہاں رہ گئے تھے بھائی؟" پیشانی پر بل لیے وہ بے اختیار ایک قدم آگے آئیں لیکن جونہی ان کی نظر خلیل غوری کے برابر میں کھڑے شخص سے ٹکرائی تھی ان کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔

"کیوں ہو گئی ناں حیران؟ اب سامنے سے ہٹو اور ہمیں اندر آنے دو۔ حاتم بھی سوچے گا کہ تم شاید اب تک کوتوال بنی گیٹ پر تعینات ہو۔" انہوں نے مسکرا کر ماضی کا حوالہ دیا جب ہر آئے گئے سے تفتیش وہ اپنا فرض سمجھتی تھیں۔

طیبہ خفیف سی پیچھے ہٹیں اور بے اختیار پلٹ کر ایک طرف کو ہو گئیں۔ خلیل غوری حاتم صاحب کو لیے اندر داخل ہوئے تو میمونہ، جو اس دوران خود کو سنبھال چکی تھیں، سر پہ دوپٹے کا پلو رکھتے ہوئے آگے بڑھیں۔

کر میرا دل درد سے پھٹ جاتا ہے۔ اس وقت میرا دل کرتا ہے کہ کاش میرا کوئی بھائی ہوتا جو انہیں یوں در در کی ٹھوکروں سے بچالیتا۔ جو اس کڑے اور سخت ترین وقت میں ان کا سہارا، ان کا سائبان......" وہ اچانک آنکھوں پر ہاتھ رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے تو حاتم صاحب کے لیے اپنے جذبات پر قابو پانا ممکن نہ رہا۔ بہتے اشکوں کے ساتھ انہوں نے آگے بڑھ کر انہیں خود سے لگالیا۔ خلیل غوری کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح ان کے سینے سے آ لگے۔

"بس یار بس۔ تُو تو بہت ہمت والا ہے۔" ان کی پشت سہلاتے ہوئے انہوں نے دوسرے ہاتھ سے اپنے آنسو صاف کیے۔ "دیکھ اللہ نے تیری دعا سن لی ہے۔ اب میں آ گیا ہوں ناں اب تجھے بالکل بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" انہیں شانوں سے تھامے انہوں نے نرمی سے انہیں خود سے الگ کیا۔ خلیل غوری نے اپنا بھیگا چہرہ اٹھایا۔

"تُو۔ تُو مجھے چھوڑ کر کہیں جائے گا تو نہیں ناں؟" بہتے اشکوؤں کے درمیان وہ بچوں کی سی معصوم آس لیے بولے۔ حاتم گردیزی کو اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

"نہیں۔ کبھی نہیں۔" اور خلیل غوری کو لگا جیسے تپتے، جھلستے صحرا میں اچانک ہی کوئی ابرِ مہرباں ان پر سایہ فگن ہو گیا ہو۔

☆☆☆

"بھابھی! مجھے شدید پریشانی ہو رہی ہے۔ بھائی ابھی تک کیوں نہیں آئے؟" بے قراری سے گھڑی کو تکتی طیبہ روہانسی ہونے کو تھیں۔ گیٹ سے لاؤنج اور لاؤنج سے گیٹ تب وہ کتنے ہی چکر لگا چکی تھیں مگر انتظار تھا کہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ شام کے پانچ بجنے کو آئے تھے اور خلیل صاحب کا تا حال کوئی پتا نہ تھا۔ دونوں کی حالت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ غیر ہوتی جا رہی تھی۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" میمونہ سر تھامے بولیں۔ ان کا دل بیٹھے جا رہا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ انہیں صبح کہیں نہ جانے دیتیں۔

"اب تو ان کا آفس بھی بند ہو گیا ہو گا ورنہ وہاں فون کر کے پتا کر لیتے۔" طیبہ زرد چہرہ لیے میمونہ کے پاس آ بیٹھیں۔ تبھی گیٹ پر بیل ہوئی۔ طیبہ بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھیں اور بھاگتی ہوئی گیٹ تک آئیں۔ میمونہ بھی تیز قدموں سے ان کے پیچھے لپکیں۔ تب تک طیبہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول چکی تھیں۔ دوسری طرف موجود چہرے پر نظر پڑتے ہی جہاں ان کی جان میں جان آئی تھی وہیں ان کا غصہ بھی عود کر آیا تھا۔

"آپ کہاں رہ گئے تھے بھائی؟" پیشانی پر بل لیے وہ بے اختیار ایک قدم آگے آئیں لیکن جونہی ان کی نظر خلیل غوری کے برابر میں کھڑے شخص سے ٹکرائی تھی ان کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔

"کیوں ہو گئی ناں حیران؟ اب سامنے سے ہٹو اور ہمیں اندر آنے دو۔ حاتم بھی سوچے گا کہ تم شاید اب تک کوتوال بنی گیٹ پر تعینات ہو۔" انہوں نے مسکرا کر ماضی کا حوالہ دیا جب ہر آئے گئے سے تفتیش وہ اپنا فرض سمجھتی تھیں۔

طیبہ خفیف سی پیچھے ہٹیں اور بے اختیار پلٹ کر ایک طرف کو ہو گئیں۔ خلیل غوری حاتم صاحب کو لیے اندر داخل ہوئے تو میمونہ، جو اس دوران خود کو سنبھال چکی تھیں، سر پہ دوپٹے کا پلو رکھتے ہوئے آگے بڑھیں۔

"السلام علیکم، حاتم بھائی! کیسے ہیں آپ؟" اور حاتم گردیزی، جو طیبہ کو یوں اچانک اپنے سامنے پا کے ایک لمحے کو گڑبڑا گئے تھے، سرعت سے خود کو سنبھالتے ہوئے بولے۔

"وعلیکم السلام۔ میں بالکل ٹھیک ہوں بھابھی۔ آپ کیسی ہیں؟"

"اللہ کا کرم ہے۔ آیئے اندر آیئے ناں۔" میمونہ نے مسکرا کر آداب میزبانی نبھائے۔ لیکن حاتم صاحب کا ارادہ طیبہ کو دیکھ کر فی الفور بدل گیا تھا۔ وہ اب یہاں کسی صورت نہیں رکنا چاہتے تھے۔

"پھر کبھی بھابھی۔ آج مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ شائستگی سے مسکرائے۔ ان کی بات پہ خلیل صاحب نے خفگی سے انہیں دیکھا۔

"تو نے تو مجھ سے کسی ضروری کام کا ذکر نہیں کیا؟"

"ہاں تو باتوں میں یاد ہی کہاں رہا۔ وہ تو اب راستے میں یاد آیا کہ مجھے ایک بندے سے بہت ضروری ملنا تھا۔" وہ سٹپٹا کر بولے۔ خلیل غوری نے کان پر سے جیسے مکھی اڑائی۔

"ضروری یا نہیں۔ تو چائے پیے بنا کہیں نہیں جانے والا۔"

"مگر یار......"

"کوئی اگر مگر نہیں۔" قطعیت سے ان کی بات کاٹتے وہ میمونہ کی طرف پلٹے۔ "مونا! تم حاتم کو لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں ذرا گاڑی اندر لے آؤں۔" سرعت سے کہتے وہ گیٹ کی طرف پلٹے۔ "اور ہاں تم فٹافٹ چائے رکھو۔ آج ہم سب ایک زمانے کے بعد مل کر چائے پئیں گے۔" اپنی دھن میں بولتے وہ آگے بڑھے تو میمونہ ان کی خوشی دیکھ کر مسکرادیں۔

"آجائیں حاتم بھائی، آج یہ آپ کو کہیں نہیں جانے دیں گے۔"

ان کی بات پہ بے بس کھڑے حاتم گردیزی نے مسکرا کر اپنے ضدی دوست کی پشت کو دیکھا اور میمونہ کے ساتھ چل پڑے۔ جو انہیں لیے ڈرائنگ روم میں چلی آئیں۔ قرینے اور سلیقے سے سجا ڈرائنگ روم پہلی ہی نظر میں حاتم صاحب کو متاثر کر گیا۔

"بہت خوب بھابھی! ڈرائنگ روم تو آپ نے خاصے آرٹسٹک انداز میں سیٹ کر رکھا ہے۔" وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے ستائشی انداز میں بولے۔ میمونہ بے اختیار مسکرادیں۔

"میں نے کہاں۔ یہ تو طیبہ کا ذوق ہے۔ اسی کی دن رات محنت کا نتیجہ ہے یہ۔" ان کی بات پہ نشست سنبھالتے حاتم گردیزی ایک پل کو ٹھنک سے گئے۔ "یہ طیبہ یہاں کہاں سے آگئی؟" الجھ کر سوچتے انہوں نے ایک نظر میمونہ پر ڈالی اور خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"مجھے خلیل نے آپ دونوں کی ملاقات کے بارے میں بتایا تھا۔ بہت خوشی ہوئی آپ کی شادی اور بچوں کا سن کر۔ خیر سے کتنے بچے ہیں آپ کے؟" میمونہ ان کے مقابل بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"تین......دو بیٹے اور ایک بیٹی۔"

"ماشاءاللہ۔" میمونہ مسکرائیں۔ "کہاں تو آپ شادی کے لیے نہیں مانتے تھے اور کہاں اب خیر سے تین تین بچے۔ وقت بھی انسان کو کتنا بدل دیتا ہے۔"

ان کی بات پہ اک پھیکی سی مسکراہٹ حاتم صاحب کے لبوں پر در آئی۔ اب وہ انہیں کیا بتاتے کہ شادی سے کنی کترانا تو محض ایک بہانہ تھا۔ اصل میں تو وہ کسی مناسب موقعے کی تلاش میں تھے جب وہ اپنے گھر میں طیبہ کا ذکر کر سکتے۔ وہ الگ بات تھی کہ زندگی نے انہیں وہ موقع کبھی دیا ہی نہیں۔

"آپ بسیط اور ایلیا کو تو بلوائیں۔ مجھے خلیل نے دونوں شیطانوں کی ڈھیر ساری باتیں بتائی ہیں۔" وہ

ذہن کو جھٹکتے ہوئے بولے۔ میمونہ مسکراتے ہوئے اٹھنے لگیں۔ تبھی دروازہ کھول کر خلیل غوری تینوں بچوں کو لیے اندر داخل ہوئے۔

"لیجیے جناب آپ کے بھتیجا، بھتیجیاں۔" ان کے تعارف پہ حاتم صاحب نے مسکرا کر آنے والے پیارے پیارے چہروں پر نظر ڈالی۔

"ارے ماشاءاللہ! ادھر آؤ بیٹا۔" وہ شفقت سے بولے۔ میمونہ نے خاموش کھڑے بچوں کو ٹوکا۔

"انکل کو سلام کرو۔"

"السلام علیکم انکل۔" ان تینوں کے کورس میں کہنے پر بھی مسکرا دیے۔

"وعلیکم السلام۔ اب سارے میرے پاس جلدی سے آجاؤ۔" انہوں نے محبت سے بانہیں پھیلائیں۔ وہ تینوں بھاگتے ہوئے ان کے بازوؤں میں آسمائے۔

"اوہو آرام سے۔" خلیل صاحب ہنستے ہوئے ان کے برابر میں جا بیٹھے۔ حاتم صاحب نے مسکراتے ہوئے تینوں کے گال چومے۔

"اب ذرا تعارف ہو جائے۔ آپ تو ہو گئے بسیط۔" انہوں نے اپنے بیٹے جرار کے تقریباً ہم عمر بچے کے پیار سے بال بکھیرے۔ "اور آپ کا کیا نام ہے پرنسز؟" انہوں نے اپنے سامنے کھڑی بھولی سی گڑیا کو دیکھا جو ہو بہو میمونہ اور خلیل کا پرتو تھی۔

"ایلیا۔"

"واؤ۔ واٹ اے پریٹی نیم۔" ان کی تعریف پہ ایلی بے اختیار شرما سے گئی۔

"تھینک یو انکل۔"

"یو آر ویلکم مائی سویٹ ہارٹ۔" انہوں نے محبت سے اس کا چہرہ چوما اور اپنے پاس کھڑی دوسری بچی کی جانب متوجہ ہوئے۔

"ہاں تو جناب۔ آپ کا کیا......" جونہی ان کی نظریں اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں اور نازک سے نین نقش سے ٹکرائیں وہ بے اختیار خاموش ہو گئے۔

"یہ......" وہ خلیل صاحب کی طرف پلٹے جو ان کی ادھوری بات کا مطلب سمجھ کر مسکرا دیے۔

"یہ طیبہ کی بیٹی ہے حیا۔" اور حاتم گردیزی کی نگاہیں بے اختیار اس کے معصوم چہرے پر جا ٹھہریں جو اپنے اندر ان کی محبت کا عکس سموئے، ان کے دل کو کسی مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ انہوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر اسے بھرپور شفقت سے چوم لیا۔

"اور آپ اپنا تعارف نہیں کروائیں گے انکل؟" وہ اپنی چمکتی آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے بولی تو حاتم صاحب کے چہرے پر حیرت بھری بڑی خوش گوار سی مسکراہٹ در آئی۔

"میں؟ میں آپ کے ماموں کا دوست ہوں بیٹا۔"

"دوست ہیں تو پھر آپ کبھی ان سے ملنے کیوں نہیں آئے؟" اس نے بنا کسی پس و پیش کے انتہائی سنجیدگی سے اگلا سوال داغا تو حاتم صاحب کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اگلے ہی لمحے وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"یہ سچ میں طیبہ کی ہی بیٹی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے خلیل صاحب سے بولے۔ ان کی بات پہ خلیل غوری اور میمونہ دونوں ہنس پڑے۔ تبھی ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر طیبہ چائے کی ٹرالی لیے اندر داخل ہوئیں۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی جہاں حاتم صاحب کی مسکراہٹ سمٹ گئی وہیں خلیل صاحب مسکراتے ہوئے

بہن سے مخاطب ہوئے۔
"بیا! آج تمہاری بیٹی نے ایک بار پھر تمہاری لاڈلی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔"
"اچھا! اب کیا کیا ہے ان محترمہ نے؟" وہ بنا پلکیں اٹھائے دھیمی سی مسکراہٹ لیے آگے بڑھتے ہوئے بولیں۔
"حاتم کا ایسا انٹرویو لیا ہے کہ وہ بے چارہ دوسرے سوال پر ہی کہہ اٹھا ہے کہ یہ طیبہ کی ہی بیٹی ہو سکتی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولے۔
طیبہ کے لبوں پر اک پھیکی سی مسکراہٹ آ کر غائب ہو گئی۔ اب وہ بھلا آنے والے کو کیا بتاتیں کہ وہ جس طیبہ کا حوالہ دے رہے تھے اس سے ملے تو انہیں خود بھی ایک زمانہ بیت گیا تھا۔
"چلو بچو، اب آپ چل کر باہر کھیلو۔" وہ ٹرالی سینٹر ٹیبل کے پاس کھڑی کرتے ہوئے بچوں سے مخاطب ہوئیں۔
نا چاہتے ہوئے بھی حاتم گردیزی کی نگاہیں ان کے سراپے سے جا الجھیں۔ وہی ستارہ آنکھیں اور وہی چاند چہرہ۔ جس سے بالوں کی چند شرارتی لٹیں آج بھی انکھیلیاں کر رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ ان کے درمیان گیارہ سال کا طویل عرصہ حائل رہ چکا ہے۔ وہ بے اختیار اپنے دل میں اٹھتی درد کی لہر کو دبائے نظروں کا زاویہ بدل گئے۔
"آپ بھی بچوں اور بھابھی کو لائیے گا ناں حاتم بھائی۔" میمونہ اپنائیت سے بولیں۔ حاتم گردیزی لحظہ بھر کو گڑبڑا گئے۔ اور اک چور نگاہ سامنے کھڑی طیبہ پر ڈالی جو بنا کسی تاثر کے نظریں جھکائے خاموشی سے چیزیں ٹرالی سے میز پر منتقل کرنے میں مصروف تھیں۔
"جی۔ جی ضرور۔" انہوں نے دھیرے سے گلا کھنکارا۔
"بھابھی۔" طیبہ کے اچانک پکارنے پر سبھی نے بایک وقت ان کی طرف دیکھا۔ "آپ چائے سرو کریں۔ میں ابھی آتی ہوں۔" وہ بنا رکے دروازے کی طرف بڑھ گئیں تو اک ہوک سی حاتم صاحب کے دل سے اٹھ کر ان کے اندر ہی کہیں دم توڑ گئی۔ وہ جانتے تھے کہ طیبہ اب دوبارہ اندر نہیں آئیں گی۔ وہ خود کو سنبھالتے خلیل غوری کی طرف پلٹے۔
"طیبہ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟" ان کے اس اچانک سوال پہ جہاں خلیل صاحب ٹپٹا گئے وہیں پلیٹ ان کے آگے بڑھاتی میمونہ اپنے دھیان میں بولیں۔
"کرتے ہیں نہیں کرتے تھے۔"
"کیا مطلب؟" انہوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ میمونہ کے چہرے پر گہری افسردگی چھا گئی۔
"سکندر بھائی کا دو سال پہلے انتقال ہو گیا ہے۔"
"کیا؟"
حاتم گردیزی کو لگنے والا جھٹکا اتنا شدید تھا کہ ایک لمحے کو وہ اپنے گرد و پیش کا احساس بھی بھول گئے تھے۔ اور خلیل غوری کا دل کیا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔ طیبہ کی غلط بیانی نے انہیں حقیقتاً اپنے دوست سے نظریں ملانے کے لائق نہیں چھوڑا تھا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

شمائلہ دلعاد

عہد رفتہ

ماہین کی آنکھ کھلی تو دن کے دو بج رہے تھے۔ کسلمندی سے دیوار گیر کلاک دیکھتے ہوئے اسے ماضی یاد آ گیا ساتھ ہی لبوں پر جاندار مسکراہٹ اتر آئی تھی۔

یہ عہد رفتہ بھی کیا چیز ہے تقریباً انسانوں کے ساتھ ہی چلتا ہے۔ کبھی خوشی بن کر، کبھی درد بن کر۔

ان کے بچپن میں، چھٹی والے دن اماں دو بجے تک لنچ پروگرام جاری رکھنے دیتی تھیں۔ دو کے بعد وہ رات کے کھانے کی تیاری میں لگ جاتی تھیں چھٹی والے دن ڈنر بھی شاندار ہی ہوتا تھا لیکن ہوتی ایک ہی ڈش تھی۔ اب پوتے پوتیوں کی بدولت اماں کا ون ڈش پروگرام کالعدم ہو چکا تھا۔ ڈلاس سے آئے اسے دو ہفتے ہو چکے تھے ان دو ہفتوں میں اس نے اماں کے بہت سے تبدیل شدہ اصولوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ اسے تبدیلی اچھی لگی تھی۔

بالوں کو کیچر میں پھنسا کر وہ نیچے اتر آئی۔

اماں کے تخت پر رنگ برنگے کپڑوں کا مینا بازار لگا ہوا تھا پانچوں بھابیاں، تین بھتیجیاں آس پاس بیٹھی تھیں۔

"کیا ہوا بھابی، چوہا کپڑے کتر گیا کیا؟"

اس نے اشتیاق سے پوچھا تو اماں نے عینک کے اوپر سے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ایسے میں ان کی عینک مزید ناک کی نوک پر آ گئی۔

"تو لے (سفید بال) آ گئے بولنا نہ آیا۔"

بھتیجیوں کے سامنے ماہین نے کھسیا کر اس عزت افزائی کو گلے لگایا۔

"وہ طفیل کے پوتے کی شادی ہے، دینے دلانے کو کپڑے نکال رہے ہیں ہم۔" اماں نے پھر سے ایک سوٹ کا دوپٹا ہاتھ میں پکڑا۔

"شادی اور اس موسم میں؟" ماہین کی آنکھیں اچھی طرح کھل گئیں۔

"کیوں، اس موسم کی ناک بہتی ہے؟"

اماں کے جواب پر ساری قل قل ہنسنے لگیں۔

"اماں ساری دنیا کرونا کی لپیٹ میں ہے۔ اٹلی بند ہے، چائنا بند ہے۔ امریکا کی بعض ریاستوں نے فلائٹس بند کر کے لاک ڈاؤن لگا دیا ہے۔ مجھے خبر نہیں اپنے گھر واپسی کب نصیب ہوتی ہے ادھر طفیل چچا کو شادیاں سوجھ رہی ہیں۔ گیدرنگ سے کرونا کا خطرہ پتا کتنا بڑھ جاتا ہے۔"

"نا بی بی، ہمیں نہیں پتا۔" اماں نے حسب سابق کرونا کے ذکر پر ناک سے مکھی اڑائی۔ انہیں یقین تھا کرونا صرف کافروں کو ہوتا ہے۔

ماہین نے بے بسی سے ماں کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی دلائل دیتی بڑی بھابی نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

"لنچ کر لیا آپ لوگوں نے؟"

"نہیں۔ باقی سب مسجد گئے ہیں نماز پڑھ کر آئیں تو کھانا لگاتے ہیں۔ تمہیں زیادہ بھوک لگی ہے تو لا دیتی ہوں۔"

"نہیں، ساتھ ہی کھاؤں گی۔ ویسے بھابی، بھائی لوگ اور بچہ پارٹی پہلے بھی باجماعت مسجد کی طرف نکلتے ہیں یا یہ صرف اب کرونا کی انسلٹ کرنے نکلے ہیں۔"

"ابا جی کی پرانی عادت ہے اتوار کو سب کو لے کر مسجد جاتے ہیں۔ کہتے ہیں لڑکوں کی باجماعت نماز کی عادت بنے گی۔ باقی دن تو سب اپنے اپنے کام کی جگہ پر ہوتے ہیں وہیں پڑھ لیتے ہیں۔"

بھابی کے ساتھ کچن میں آ کر اس نے منہ پر چار چھپاکے مارے۔ پانی کا گلاس پیا اور چھوٹی کرسی

پر بیٹھ کر بھابھی کی کارکردگی دیکھتے بات آگے بڑھائی۔

"یہ طفیل چچا کو کیا مصیبت پڑی ہے وبا کے دنوں میں شادی کی؟"

"ماہین! آگے آگے گرمی آرہی ہے ابھی موسم نارمل ہے اس لیے کہتے ہیں، اگر اب نہ کی تو چھ مہینے آگے چلی جائے گی۔"

طفیل چچا ان کے پرانے محلے دار تھے اب پچھلی گلی میں نسبتاً بڑے گھر میں شفٹ ہو چکے تھے۔

"میں اتنی بور ہوگئی تھی شکر ہے کوئی شادی آئی، میں تو روز ڈھولک پر جایا کروں گی۔" ماہین کے کانوں میں شیزا کی آواز پڑی۔

میں رحمہ کے ساتھ ڈانڈیا کھیلوں گی تین نئے اسٹیپ سیکھے ہیں۔" حرا بھی بڑی پرجوش تھی۔ بڑی بھابھی نے ایک نظر ماہین کو دیکھا اور پھر مورچہ سنبھال لیا۔

"تمہارے باپ کی شادی ہے نا، جو لڈیاں ڈالنی ہیں۔ ذرا جو شرم حیا ہو۔"

"بڑی مما! اپنے پاپا کی شادی پر کون ڈانس کرتا ہے بھلا؟" حرا برا منا گئی۔

"ہوتی ہیں تم جیسی ناخلف اولادیں باپ کی شادی میں بھی ناچ لیتی ہیں۔ لڑکیوں! کان کھول کر سن لو، شریفوں کی بچیوں کی طرح شادی اٹینڈ کرنی ہے۔ یہ میراث پنے مجھے نہیں پسند۔"

ماہین نے بھابھی کے تابڑتوڑ حملوں کو بھنویں اچکا کر دیکھا پھر تالیاں بجائیں۔

"واہ اماں واہ...... چن کر جانشیں پکڑا ہے۔"

"کیا مطلب ہے؟" بڑی بھابھی تپی پڑی تھیں۔

ماہین اٹھ کر اماں کے تخت پر چلی آئی پیچھے پیچھے بھابھی تھیں۔

"مطلب یہ کہ آج سے چالیس سال پہلے آپ کی ساس، پھوپھو ساس اور تائی ساس بھی بالکل آپ جیسی تھیں۔ آج کمانڈر خاموش ہے جانشیں کسر نکال رہی ہے۔"

ماہین نے ماں کو بازو میں لے کر ان کے سفید براق بال چومے۔

"شادی ہو تو ہم پر پابندی، فوتی ہو تو...... ساری پابندیاں کیا ہم لڑکیوں کے لیے ہی ہوتی ہیں۔" حرا شدید ناراض تھی دوسری دونوں بھی منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔

"تتلیوں کے موسم میں نوچنا گلابوں کا، ریت

اس گھر کی ہے اور تمہاری پھوپھو کے زمانے سے ہے۔" بچیوں کو پھوپھو بہت پسند تھیں جبھی متوجہ ہو گئیں۔

"پھوپھو! آپ پر بھی پابندیاں تھیں؟" انہوں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"ایسی ویسی......" ماہین نے آنکھیں گھما کر ان کو مزید متجسس کیا پھر داستان گو کے انداز میں گویا ہوئی۔

☆☆☆

بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا ہوسٹل رہنے کی وجہ سے مہینے بعد گھر آتے تو ہر نئی فلم کے گیتوں والی کیسٹ لے کر آتے۔ کبھی کبھی تو وی سی آر کی فلم بھی نئی لے آتے۔ وہ تین دن گھر میں رہتے اور دبا کر ڈیک سنا کرتے تھے۔ ابا جی کے گھر آنے کا دھیان رکھنے کے لیے میں تھی ناں۔

جونہی گھڑی کی سوئی دو کے قریب پہنچتی میں بھائی لوگوں کو یاد کرواتی۔ ابا آنے والے ہیں یوں ہم گائیکوں کے خاندان سے نکل کر پھر سے اماں ابا کے کٹر راجپوت خاندان میں شامل ہو جاتے۔ یہ الگ بات ہے صرف وقتی طور پر شامل ہوتے ورنہ اندر سے موسیقی ہی ابل رہی ہوتی تھی۔

"اللہ پھوپھو، آپ کو اتنا شوق تھا گانے سننے کا؟" حرا نے ناک سکوڑی۔

"نہ صرف سننے کا، گانے کا بھی بلکہ ہیروئن بننے کا بھی کیونکہ مجھے لگتا تھا جو سامنے اسکرین پر گا رہی ہے بس وہی گا رہی ہے۔ تب، اب جیسے اداکار بھی نہیں ہوتے تھے، وہ اپنا گانا خوب رٹا لگا کر یاد کر کے یوں فلماتے تھے گویا وہی گا رہے ہوں۔"

"ایک منٹ، ایک منٹ...... پھوپھو! آپ نے کہا آپ کو ہیروئن بننے کا بھی شوق تھا مطلب آپ فلموں میں کام کرنا چاہتی تھیں؟" شیزا کی آنکھیں باہر نکل آئیں یوں کہ بالکل باپ جیسی ہونق دکھنے لگی۔

"شیزا! اپنی آنکھیں تو درست اینگل پر کرو بالکل چار، چھ جیسا منہ لگ رہا ہے۔ تمہیں تمہارے پاپا کی شکل ایسی مستوں والی ہوتی تھی ہمارے بچپن میں۔ تب ہی چھوٹے بھیا نے اس کا نام "ڈڈو" رکھا ہوا تھا۔ ایسی پھٹی پھٹی آنکھیں مینڈک ہی کی یاد دلاتی تھیں۔" شیزا صدمے سے مزید بھیانک شکل اختیار کر گئی تو اماں نے لاڈلی پوتی کی ہمدردی میں مورچہ سنبھال لیا۔

"مجھے اس وقت پتا چل جاتا تجھے گانے گانے کے ساتھ فلموں میں "ہیرو" بننے کا بھی شوق ہے چار ٹوٹے کر کے ڈنگروں والے احاطے کی دیوار نیچے دفنا دینی تھی۔"

"اووف...... اماں ہیرو لڑکے کو کہتے ہیں ہیروئن لڑکی ہوتی ہے۔ ویسے بھی میں لٹنے لپٹانے والی ہیروئن کی بات نہیں کر رہی، میں تو......"

بڑی بھابھی نے ماہین کے کندھے پر دھپ مار کر اس کی بات بیچ میں ہی روک دی۔

"ماہی! بچیوں کے سامنے کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"قسم لے لو بھابھی! گندی بات نہیں تھی پر اب آپ نے ٹوک ہی دیا ہے تو چپ کر جاتی ہوں۔ حالانکہ میں وہ ہیروئن بننا چاہتی تھی جس کے ایک اشارے پر ہر شے حاضر ہو جائے۔ جو پلک جھپکتے میں کوہ قاف پہنچ جائے، پلک جھپکتے قالین پر بیٹھ کر نیا گرا فال میں اتر جائے۔ ہارر ہیروئن۔"

"سیدھا کہو بارلی شے۔" (بھوت پریت، چڑیل وغیرہ)۔ اماں نے اجلے اجلے چہرے کے ساتھ نہایت سنجیدگی سے اضافہ کیا۔

"پھوپھو! چھوڑیں یہ جن پریوں کی ہیروئن، آپ پابندیوں والی بات بتائیں۔ جیسے مما لوگ ہم پر پابندیاں لگاتی ہیں اتنے پرانے دور میں آپ پر بھی تھیں؟"

"میں بڑی معصوم تھی۔" ماہین نے شرما کر دوپٹے کا کونا منہ میں لیا تو بڑی بھابھی اور اماں نے لاحول پڑھی۔ "چھوٹے بھیا کو نیا نیا "پہلا پیار" ہوا

اس گھر کی ہے اور تمہاری پھوپھو کے زمانے سے ہے۔" بچیوں کو پھوپھو بہت پسند تھیں جبھی متوجہ ہو گئیں۔

"پھوپھو! آپ پر بھی پابندیاں تھیں؟" انہوں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"ایسی ویسی......" ماہین نے آنکھیں گھما کر ان کو مزید متجسس کیا پھر داستان گو کے انداز میں گویا ہوئی۔

☆☆☆

بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا ہوسٹل رہنے کی وجہ سے مہینے بعد گھر آتے تو ہر نئی فلم کے گیتوں والی کیسٹ لے کر آتے۔ کبھی کبھی تو وی سی آر کی فلم بھی نئی لے آتے۔ وہ تین دن گھر میں رہتے اور دبا کر ڈیک سنا کرتے تھے۔ اباجی کے گھر آنے کا دھیان رکھنے کے لیے میں تھی ناں۔

جونہی گھڑی کی سوئی دو کے قریب پہنچتی میں بھائی لوگوں کو یاد کرواتی۔ ابا آنے والے ہیں یوں ہم گائیکوں کے خاندان سے نکل کر پھر سے اماں ابا کے کٹر راجپوت خاندان میں شامل ہو جاتے۔ یہ الگ بات ہے صرف وقتی طور پر شامل ہوتے ورنہ اندر سے موسیقی ہی ابل رہی ہوتی تھی۔

"اللہ پھوپھو، آپ کو اتنا شوق تھا گانے سننے کا؟" حرا نے ناک سکوڑی۔

"نہ صرف سننے کا، گانے کا بھی بلکہ ہیروئن بننے کا بھی کیونکہ مجھے لگتا تھا جو سامنے اسکرین پر گا رہی ہے بس وہی گا رہی ہے۔ تب، اب جیسے اداکار بھی نہیں ہوتے تھے، وہ اپنا گانا خوب رٹا لگا کر یاد کر کے یوں فلماتے تھے گویا وہی گا رہے ہوں۔"

"ایک منٹ، ایک منٹ...... پھوپھو! آپ نے کہا آپ کو ہیروئن بننے کا بھی شوق تھا مطلب آپ فلموں میں کام کرنا چاہتی تھیں؟" شیزا کی آنکھیں باہر نکل آئیں یوں کہ بالکل باپ جیسی ہونق دکھنے لگی۔

"شیزا! اپنی آنکھیں تو درست اینگل پر کرو بالکل چار، چھ جیسا منہ لگ رہا ہے۔ قسمیں تمہارے پاپا کی شکل ایسی مستوں والی ہوتی تھی ہمارے بچپن میں۔ تب ہی چھوٹے بھیا نے اس کا نام "ڈڈو" رکھا ہوا تھا۔ ایسی پھٹی پھٹی آنکھیں مینڈک ہی کی یاد دلاتی تھیں۔" شیزا صدمے سے مزید بھیانک شکل اختیار کر گئی تو اماں نے لاڈلی پوتی کی ہمدردی میں مورچہ سنبھال لیا۔

"مجھے اس وقت پتا چل جاتا تجھے گانے گانے کے ساتھ فلموں میں "ہیرو" بننے کا بھی شوق ہے چار ٹوٹے کر کے ڈنگروں والے احاطے کی دیوار نیچے دفنا دیتی تھی۔"

"اووف...... اماں ہیرو لڑکے کو کہتے ہیں ہیروئن لڑکی ہوتی ہے۔ ویسے بھی میں لیٹنے لپٹانے والی ہیروئن کی بات نہیں کر رہی، میں تو......"

بڑی بھابھی نے ماہین کے کندھے پر دھپ مار کر اس کی بات بیچ میں ہی روک دی۔

"ماہی! بچیوں کے سامنے کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"قسم لے لو بھابھی! گندی بات نہیں تھی پر اب آپ نے ٹوک ہی دیا ہے تو چپ کر جاتی ہوں۔ حالانکہ میں وہ ہیروئن بننا چاہتی تھی جس کے ایک اشارے پر ہر شے حاضر ہو جائے۔ جو پلک جھپکتے میں کوہ قاف پہنچ جائے، پلک جھپکتے قالین پر بیٹھ کر نیا گرا فال میں اتر جائے۔ ہارر ہیروئن۔"

"سیدھا کہو بارلی شے۔" (بھوت پریت، چڑیل وغیرہ)۔ اماں نے اجلے اجلے چہرے کے ساتھ نہایت سنجیدگی سے اضافہ کیا۔

"پھوپھو! چھوڑیں یہ جن پریوں کی ہیروئن، آپ پابندیوں والی بات بتائیں۔ جیسے مما لوگ ہم پر پابندیاں لگاتی ہیں اتنے پرانے دور میں آپ پر بھی تھیں؟"

"میں بڑی معصوم تھی۔" ماہین نے شرما کر دوپٹے کا کونا منہ میں لیا تو بڑی بھابھی اور اماں نے لاحول پڑھی۔" چھوٹے بھیا کو نیا نیا "پہلا پیار" ہوا

تھا اوپر سے نئی نئی "دل والے" فلم آئی تھی بس بھیا "دل والے" کا اجے بنے، سارا دن ابا جی کے جانے بعد اور آنے سے پہلے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق سنا کرتے۔

ساتوں جنم میں تیرے، ساتھ رہوں گا یار
مر بھی گیا تو میں تجھے کرتا رہوں گا پیار
سن میری شہزادی، میں ہوں تیرا شہزادہ
بانہوں میں لے کے تجھے، کرتا ہوں وعدہ

جیسے بھیا "بہک بہک" کر بانہوں کا ذکر کرتے میں ان سے دوگنا لہک لہک کر بانہوں کا ذکر گاتی۔ ہوا یوں ایک دن پھوپھو کو گانے کی سمجھ آ گئی۔ ماہین کا لہجہ دکھی ہو گیا، بڑی کوئی پکی داستان گو لگنے لگی۔ بچیوں کے چہرے پر دبی دبی شرمیلی ہنسی تھی۔ پانچوں بھابیوں کے ہونٹ چڑ کر باچھوں سے لگے ہوئے تھے اماں خواہ مخواہ منہ نیچے کیے چشمے کا شیشہ رگڑنے لگیں۔

"جیسے ہی پھوپھو کو سمجھ آئی، پھوپھو نے ڈیٹا تائی اماں اور اماں تک ٹرانسفر کر دیا۔" بچیوں نے کھل کر قہقہہ لگایا۔

"اب بھی ویسی ہی بے حیا ہے۔" اماں کی بڑبڑاہٹ میں محسوس کیا جانے والا پیار تھا۔

"بس جی ڈیٹا ٹرانسفر ہونے کے بعد ان معزز خواتین نے یہ والا گانا ایٹین پلس ڈکلیئر (18+) کر دیا۔ دو جھانپڑ میری گت پر پڑے چار گھونسے چھوٹے بھیا کو۔ یوں عشقیہ سرحدی گانے کا انجام بخیر ہو گیا پر تب تک مجھے زبانی یاد ہو چکا تھا۔ اصل میں بیٹا، پانچوں بھائیوں کی چوائس الگ الگ تھی۔ جس کو نیا نیا عشق ہوا ہوتا وہ رومانوی سنتا، جس کا بریک اپ ہوا ہوتا وہ دکھی روح بنا ہوتا دکھی سنتا۔"

"یہ مؤا سیون اپ...... حق ہا!!!!!! یہ جو ابھی تم نے بولا وہ کیا ہوتا ہے۔ کل میں نے ٹی وی پر بھی یہ سنا تھا۔" اماں نے ماہین کی روانی سے چلتی زبان روک کر اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہا۔

"اماں! چوٹ لگنے کو سیون اپ۔ میرا مطلب ہے بریک اپ کہتے ہیں۔" ماہین نے بردباری سے اماں کو پڑھا لکھا پنجاب تعلیم بالغان کا سرگرم رکن بننے پر ایک قسم کی مبارک باد پیش کی۔ سب دبی دبی ہنسی ہنسنے لگیں۔

اماں نے مدبرانہ انداز سے سمجھ کر پھر سے سنہرے دوپٹے پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا تو ماہین نے سلسلہ کلام آگے بڑھایا۔

"پانچوں بھائیوں کی چوائس کی وجہ سے کبھی کبھی تو ایک ہی دن میں، مجھ پر پانچ پانچ طرح کے موڈ طاری ہو جایا کرتے تھے۔ سوچو کتنی مشکل صورت حال ہوتی ہو گی۔ نعت سے معاملے کا آغاز ہوتا، گھر کی معزز خواتین کی دیکھا دیکھی میں بھی اہتمام سے سر پر دوپٹا اوڑھتی اور جذب سے ساتھ نعت پڑھنے لگتی۔ اس کے بعد اللہ بخشے عزیز میاں فل جوش سے چنگھاڑ کر قوالی کرنے لگتے۔

میں شرابی، میں شرابی......

مجھے پتا ہی نہ چلتا خواتین کا موڈ بدل گیا ہے اب وہ قوالی کا احترام کرنے کے بجائے شراب کے ذکر پر لاحول پڑھ رہی ہیں۔ میں معصوم تو شرابی کی تان ہی اٹھا کر جھانپڑ کھا کر ہوش کی دنیا میں واپس آتی تھی۔

نعت، قوالی، عشقیہ، دکھیا...... اور آخر میں چودہ اگست یا چھ ستمبر کی وجہ سے "ملی نغمے" گا گا کر میرا حشر ہو جاتا تھا۔ گھر کا کام مجھے ایک نہ آتا تھا گانے ہر وقت زبان کی نوک پر مچلا کرتے تھے۔"

"پھوپھو! آپ پابندیوں کا بتانے لگی تھیں۔" منجھلے بھیا کی بیٹی! اسی کی طرح تنک چڑھی اور جلد باز تھی۔

"بیٹا! اسی طرف آ رہی ہوں، ذرا صبر رکھو مجھے بڑے زور سے عہد رفتہ یاد آیا ہوا ہے تفصیل کے ساتھ نہ سنایا تو نیند کیسے آئے گی۔

"جیسے ہی آج کل شادیوں پر تم لوگ ڈھولکی کا فنکشن رکھتے ہو نا تب گاؤں میں یہ فنکشن سمجھو ہر روز ہوتا تھا۔ جس گھر میں شادی ہوتی محلے کی عورتیں

رات کو کھا پکا کر سارے کام سمیٹ کر اس گھر میں چلی جاتیں۔ ڈھولکی تو نہ ہوتی لیکن تانبے کا تھال یا پرات کو دف کی طرح بجا کر شادی بیاہ کے گیت گاتیں، آخر میں مل کر گدا ڈالتیں، بتاشے کھاتیں واپس گھر آجاتی تھیں۔ یاد آیا معزز خواتین گدے میں ایک عورت کو پگڑی باندھ کر ڈانگ پکڑا کر مرد بھی ضرور بناتی تھیں۔ ہمارے محلے میں عورتا نہ مرد چچی نسیم تھیں۔ وہ تو اچانک ہی مجھ پر عقدہ کھلا ان کی مردانہ وار مونچھوں کی وجہ سے ساری عورتیں انہیں مرد بنا دیتی تھیں۔''

اماں پوپلے منہ سے قل قل کر کے ہنسیں تو ماہین کو لگا اس کے بولنے کی قیمت وصول ہو گئی۔ فرط محبت سے ماں کے چہرے سے نظر ہٹالی مبادا اس حسین منظر سے زبان نہ رک جائے۔

''پھوپھو! وہ تھریڈنگ کیوں نہیں کرتی تھیں؟'' بچیوں نے منطقی سوال کیا۔

''تب گاؤں میں عورتوں کا مونچھیں رکھنا بھی ثواب ہوتا تھا۔ اللہ کی بنائی چیزوں سے چھیڑ چھاڑ گناہ کے زمرے میں آتی تھی۔ وہ چیز بھلے عورت کے منہ پر مردانہ مونچھیں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ تو اب وقت بدلا ہے۔''

''ہاں جی، جبھی پارلر والیوں کے وارے نیارے ہوئے ہیں۔'' وڈے سے چھوٹے پائین سدا کے کنجوس۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے اس کی سن کر اپنے قیمتی خیالات ان تک پہنچا رہے تھے۔

بھاگم بھاگ خواتین کھانا دستر خوان تک پہنچانے لگیں۔ ماہین ٹھس بنی بیٹھی رہی۔ اماں نے ٹھوکا دیا کہ اٹھ کر کھانا لگانے میں مدد کر دے۔

''اماں! اکلوتی نند ہوں، کچھ تو رعب دبدبا رہنے دیں۔'' اماں اس کے ٹکا توڑ جواب پر کھسیا سی گئیں باقی سارا گھر مسکرانے لگا۔

''کیا باتیں ہو رہی تھیں بلی، تم نے بڑی تیز گام دوڑائی ہوئی تھی۔''

''ہمارے وقت کی باتیں بچیوں کو سنا رہی تھی۔'' بڑے بھیا کے استفسار پر اس نے پھر سے سلسلہ وہیں سے جوڑا۔

☆☆☆

''ہاں تو میں بتا رہی تھی گدے میں لالہ سدھیر بنتی چچی نسیم کا۔''

''اب یہ پوچھیں گے لالہ سدھیر کون تھا؟'' چھوٹے بھیا نے اپنی اولاد سمیت باقی بھائیوں کی اولاد کو بھی یوں دیکھا جیسے وہ سب کے سب مطلقاً جاہل ہوں۔

''لالہ سدھیر ماضی کا فلمی ہیرو تھا۔'' رافع نے چچا کی بات کا واضح برا منایا تو چھوٹے بھیا نے ناک سے مکھی اڑا دی جیسے صحیح جواب کی بھی کوئی اہمیت نہ ہو۔

''چچی کا حلیہ ویسے بالکل مردانہ وار حسین تھا۔ لال مہندی سے رنگے گھنگھریالے بال، صحت مند بھنوؤں کے ساتھ سیاہ سخت مونچھیں۔''

نئی نسل ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

''اگر یہ ویکس شیکس نہ ہوتی نا تو تم سب نے بھی نکی لالی سدھیریاں ہونا تھا۔'' ماہین نے کھی کھی کرتیں لڑکیوں کو گھرکا۔

''بلی! تمہیں یاد ہے ایک بار چچی نے قینچی سے مونچھیں کاٹ لی تھیں تو سب سے پہلے دادی (برکتے) برکت بی بی نے ہی نوٹ کیا تھا۔''

''آہو، میں اسکول سے آئی تو چچی نے اپنے کردہ جرم کی پاداش میں ڈھاٹا (نقاب) مارا ہوا تھا۔ سب سے پہلے تو چاچا نسیم ہی انہیں دیکھ کر بوکھلائے تھے۔ مجھے یاد ہے چاچے نے دیوانہ وار پوچھا تھا...... چھیم داڑھ پیڑ کر دی اے؟'' چچی نے ٹپ ٹپ آنسو بہا کر سر نفی میں ہلایا تو چچا مزید گھبرا کر بولے تھے۔ ''فیر کون مر گیا اے؟''

''سارے جیندے نے۔'' چچی مزید بھرائی آواز میں بولیں تو چاچے کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ دھاڑ کر بولے۔

''فیر سلطانہ ڈاکو کیوں بنی ہو؟''

اوبھئی بچو! چاچانسیم چاچی نسیم کے گھر والا تھا تب ایسے ہی آسان باش نام ہوتے تھے۔ اب کی طرح نہیں کہ نکاح پڑھاتے مولوی کو پہلے ناموں کا رٹا لگانا پڑے۔"

"یہ تو بڑا عجیب لگتا ہے دونوں میاں بیوی کا ایک ہی نام۔" رافع نے برا سامنہ بنایا۔

"لو اس سے عجیب تو دادی برکتے کے دونوں بیٹوں اور بہوؤں کے نام تھے بشیر، نذیر۔"

"چھوٹے چاچو! اتنے پیارے نام ہیں بشیر، نذیر، ان میں عجیب کیا ہے؟" رافع نے بحث کی۔

"برخوردار، عجیب بلکہ مہا عجیب بات اب بتانے لگا ہوں۔ چاچے بشیر کی بیگم کا نام نذیراں اور چاچے نذیر کی بیگم کا نام بشیراں تھا۔"

سارا گھر قہقہوں سے گونج اٹھا۔

"ہم بچے تھے اکثر سوچا کرتے دادی برکتے بشیر بشیراں اور نذیر نذیراں کے قافیے ہی ملا کر تذکیرو تانیث کا تو خیال کرلیتیں۔"

سب سے چھوٹے بھیا فلمیں دیکھ کر بچپن سے پچپن تک نوٹنکی ہی تھے۔ سارا گھر قہقہہ بار تھا۔ اباجی نے کھانسی کے پردے میں ہنسی چھپائی تو ماہین نے باپ کے کمزور کندھوں پر بازو پھیلا لیا۔

"اباجی! جس طرح عورتوں کے مونچھیں کلین کرنے پر گناہ نہیں ہوتا اسی طرح بزرگوں کے ہنسنے پر بھی نہیں ہوتا۔" اماں ابا اکٹھے ہنسے تو سارا لاؤنج روشن ہوگیا۔

"میں تھوڑی دیر قیلولہ کروں گا۔ سنت ہے دوپہر کو قیلولہ کرنا۔" اباجی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"میں بھی ذرا کمر سیدھی کرلوں ان کپڑوں کو آکر دیکھتی ہوں۔ بہو اٹھانا مت، کہیں کام سمیٹنے کے چکر میں سارے دینے دلانے والے کپڑے پھر سے صندوق میں بھر دو۔"

"نہیں بھرتی اماں جی، آپ کرلیں آرام۔" بزرگ لاؤنج سے اٹھے تو وہ سب مزید پھیل کر بیٹھ گئے۔ جب سے ماہین ڈلاس سے آئی ہوئی تھی گھر کا منظر ہی بدلا بدلا تھا۔ گھر کے در و دیوار میں سر مستی سی گھومتی رہتی تھی۔ چھوٹے بھائیوں سمیت بڑے بھائی بھی وقتاً فوقتاً ان کے ساتھ محفل جما کر عہد رفتہ کو آواز دیتے رہتے تھے۔

"پھوپھو بالوں کی غیر معمولی گروتھ تو ہارمونز کے توازن میں خرابی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ پاپا کہتے ہیں تب دیسی خوراکیں زیادہ تھیں تو پھر بھی اس قسم کی بات...... مجھے چچی نسیم پر ترس آرہا ہے۔" شیزا نہایت نرم دل تھی۔

"شاذو نادر معاملات تو ہر دور میں ہوتے ہیں۔ دُور کیا جانا میں تو خود اپنی میٹرک سے پہلے کی تصویریں دیکھ لوں تو تراہ نکل جاتا ہے۔"

"واقعی پھوپھو! اب تو آپ اتنی سفید ہیں تب تو میلا میلا سا رنگ لگتا ہے۔"

"میلا میلا نہیں کالا کالا، گھنی بھنویں ہلکی ہلکی سبز بھیگتی مسیں، بالکل چچی نسیم کا چھوٹو گینگ لگتی تھی یہ خود۔" سب سے چھوٹے بھیا کیوں پیچھے رہتے اس کا "نوجوانی" کا حلیہ من وعن بچوں اور بھابھیوں کے سامنے رکھ دیا تو وہ بھنا گئی۔

"رافع! اٹھ میرا پتر دادو کی صندوقڑی سے پرانا البم لے کر آ۔ میں تیرے چچاجی کو ان کا حلیہ یاد کرواؤں۔ مجال ہے کہیں جو گردن سیدھی ہو، گردن ٹیڑھی اس کی بیری سے گر کر ہوئی تھی انہوں نے خود کو اجے دیوگن سمجھ کر سدا کے لیے ٹیڑھی رکھنی شروع کر دی تھی۔ وہ تو اماں جی کے چمڑے کے کھسے کا کمال ہے، جو سیدھی ہے ورنہ اس عمر میں بابا ڈنگا کہلاتے پھرتے۔"

"اوہ چھوڑو، کن کاموں میں پڑ گئے ہو۔" بڑے بھیا صلح صفائی کرانے میدان میں اتر آئے تو بڑی بھابھی نے لڑکیوں کو کچن میں برتن دھونے بھیج دیا۔ اب وہ بہن بھائی بیویوں سمیت بیٹھے تھے۔ اتنے میں چوتھے نمبر کے بھیا کے فون پر میسج آگیا۔ انہوں نے بے چینی سے موبائل نکالا۔ آنکھیں

سکیڑیں، سکیڑ کر پھیلائیں پھر سکیڑ لیں۔ سارے ان کے تاثرات دیکھ رہے تھے۔ بلآخر چھوٹے بھیا نے موبائل پکڑ لیا۔

"جان! آپ کی صبح کب ہوگی؟ اب بیلنس بھیج بھی دیں میں نے یوٹیوب کا پیکج کرنا ہے۔"

چھوٹے بھیا کے با آواز بلند پڑھنے پر چوتھی بھابھی کا رنگ پیلا پڑ گیا ساتھ ہی ان کے میاں کا نیلا پڑ گیا۔ بھابھی نے جھپٹ کر موبائل پکڑا تھا تو بھیا تھرتھراتے ہوئے بول پڑے۔

"اوہ! پتا نہیں کون منحوس ہے ہر چوتھے دن اوٹ پٹانگ میسج کر دیتا ہے کوئی لڑکا ہی ہے۔ یہ لڑکے بہت کچھ کرتے ہیں۔"

"آپ کو کیسے پتا لڑکا ہے؟ تصویر پر لڑکی کا مہندی والا ہاتھ لگا ہوا ہے۔" بھابھی کے دھیمے لہجے میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ ماہین نے تصور کی نگاہ سے بھیگا بلا بنے بھائی کو دیکھا جو بیوی کو من من کر کے اپنے باکردار اور پاکیزہ ماضی و حال کی یقین دہانی کرا رہے تھے۔

"دنیا مکافات عمل ہے جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ کیوں چھوٹے بھیا؟"

ماہین نے ٹھنڈی سانس بھر کر حاضرین محفل کو دیکھا اور بھابھی کی طرف مڑی۔ "بھابھی! آپ کے میاں کا آپ کے ہاتھوں مکافات عمل شروع ہو چکا ہے۔"

"ہمارے گاؤں میں ماسٹر منیر صاحب ہوتے تھے اللہ زندگی دے اب بھی ہیں۔ انتہا کے ٹھرکی تھے۔"

چوتھے بھیا اور چھوٹے بھیا کے کان کھڑے ہو گئے انہیں بھی دھندلا دھندلا عہد رفتہ یاد آنے لگا۔

"جن دنوں موبائل کسی کسی کے پاس ہوتا تھا ماسٹر صاحب بھی لاہور سے خرید لائے۔ چلتا وہ کوٹھے کی چھت پر ہی تھا، سگنل جو نہیں آتے تھے۔ ہمارے گھر بھی تب تین موبائل تھے۔ بڑے بھیا کا، ان سے چھوٹے کا اور ایک گھر کا۔ جن دنوں بڑے بھیا چھٹی پر آتے، چھوٹی جوڑی بھیا کا فون اٹھاتی ماسٹر منیر کو مس کال کرتی آگے سے ماسٹر صاحب فٹ کال کر لیتے۔"

سب حیرت سے چوتھے بھائی اور چھوٹے بھائی کو دیکھنے لگے۔

"اوہ یار! نادان عمر تھی، ایسے ہی شغل لگایا کرتے تھے۔" چوتھے بھیا شرمندہ سے تھے۔

"اسی شغل شغل میں چار سوہن حلوے کے ڈبوں اور دو چوڑیوں والے فل بھرے ڈبوں کی گواہ تو میں خود ہوں۔"

"خواجے کا گواہ ڈڈو......" چوتھے بھیا تنک کر بولے۔

"بلی، جانے دو کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو......" چھوٹے بھیا بھی ٹپٹائے سے تھے۔

"نہ، نہ بھائی صاحب! بات تو پوری ہو کر رہے گی کیوں وڈے پائین؟" ماہین نے بڑے بھیا کو اٹوالوکیا۔

"اصل بات کیا تھی چھوٹے؟" اب وہ بھی متجسس ہو چکے تھے۔

"پائین بات کیا ہونی ہے۔ ماسٹر صاحب کا تو آپ کو پتا ہی ہے۔ ان کی شیخی خور طبیعت اور ٹھرکی پن کا مزا چکھانے کے لیے ہمیں گرمیوں کی چھٹیاں بڑی مناسب لگیں۔ ان دنوں یونیورسٹی بند تھی۔ آپ تینوں کی جاب ہو چکی تھی ہم تینوں گھر ہوتے تھے۔ ماسٹر صاحب کے نمبر کا پتا چلا تو میں نے ان کو تنگ کرنے کے لیے کال ملا لی۔ آگے سے وہ مجھے لڑکی سمجھے تو میں نے بھی ذرا آواز باریک کر کے بات چیت شروع کر دی۔" چوتھے بھیا شرما کر بولے۔

"لیکن قسم لے لیں سوہن حلوہ اور سمو سے منگوانے کا آئیڈیا ماہین اور چھوٹے کا ہی ہوتا تھا۔" وہ آخر تک آتے آتے روہانسے ہو گئے۔ "البتہ ست رنگی کانچ کی چوڑیاں وہ خود ملنگی چوک کی اینٹوں کے پیچھے رکھ کر جاتے تھے۔"

بھابھیاں بھی مسکرانے لگیں۔

''مطلب ماسٹر صاحب بیچ میں بے وقوف بن گئے تھے۔'' منجھلے بھیا اب تک حیران تھے۔
''لو وہ تو عشق میں نیل سے لے کر تا بہ خاک کا شغر تک جانے کو تیار تھے۔ ایک دن مجھ سے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھنے لگے ''کیا کر رہی ہو؟'' میں نے لڑکیوں والا جواب دیا۔ ''پھولوں کو پانی دے رہی ہوں۔'' اسی شام ماسٹر صاحب نے گلی کی نکڑ پر پڑی ٹوٹی کنالیاں اٹھائیں ان میں مٹی بھری اور لگے گیندے کی پنیری ڈالنے۔ میں نے پوچھا ماسٹر صاحب یہ کیا کر رہے ہیں تو فرمانے لگے۔ ''کاکا! بڑے نیم سے گھر میں پھول بیجنے کا سوچ رہا تھا آج بیج دیے ہیں۔ پھول بڑے خوب صورت ہوتے ہیں تم جیسے گھامڑوں کو کیا پتا، یہ تو ہم جیسے پڑھے لکھوں کی باتیں ہیں۔''
اب کے وہ سب قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔
''ملنگی چوک پر چیزیں کیوں رکھواتے تھے تم لوگ۔ منجھلے بھیا کی سوئی اب بھی وہیں اٹکی تھی۔
''ملنگی چوک سے تین سڑکیں نکلتی ہیں ناں تو اس لیے تا کہ ماسٹر صاحب کو پتا نہ چلے ان کی معشوق کس پنڈ کی مٹیار ہے۔'' ماہین نے تفصیل سے سمجھایا تو منجھلے بھیا کی تیوری پر بل پڑ گئے۔
''بڑی ہی فضول حرکتیں کرتے تھے۔ اس وقت پتا لگ جاتا نا تو ابا جی نے مار مار کے دنبہ بنا دینا تھا۔''
''لو کیا ہوا؟ بچے ہی تو تھے بڑی بھابھی چمک کر بولیں۔'' صاف لگ رہا تھا انہیں یہ ساری بونگیاں مزا دے رہی ہیں۔
''پھر آگے کیا ہوا؟ انہوں نے کبھی سوہن حلوہ اٹھاتے تم دونوں کو دیکھا نہیں؟'' وہ اشتیاق سے بولیں۔
''ہم اکثر چار چھ گھنٹے بعد اٹھایا کرتے تھے۔ اینٹوں کے نیچے دھاتی ڈبے کو کون سا کوئی فرق پڑتا تھا۔ ویسے بھی جب ماسٹر صاحب کی نگران آنکھیں وہاں سے ہٹتیں، ہم کارروائی ڈال دیتے تھے۔''

''چیونٹیاں نہیں چڑھتی تھیں۔'' چوتھی بھابھی بڑی لمبی خاموشی کے بعد اب بولی تھیں۔
''نہیں، تب چیونٹیاں بھی اتنی بے مروت نہیں تھیں۔ جیسے آج ہیں۔''
''اس کرنی کی بھرنی بھر رہے ہیں آپ کے شوہر نامدار۔ اب آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔''
ماہین نے محبت سے بھابھی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔
''بھلی لوک...... اب اس عمر میں، میں نے کیا کسی کو میسج کرنے، بیلنس ڈلوانے۔ بے فکر رہا کرو۔''
بچیاں ان سب کے لیے چائے لے آئیں تو سب نے اپنے اپنے کپ تھام لیے۔
''ویسے ماسٹر صاحب کو بعد میں پتا چل گیا تھا کیا؟''
''نہیں، ہم نے خود بتا کر معافی مانگی تھی، سوہن حلوے کے پیسے بھی دینا چاہے تھے۔ اپنے مزاج کی وجہ سے انہوں نے بھی ہماری بات کو خوب انجوائے کیا تھا پیسے بھی نہیں لیے تھے۔''
''یہ رنگ برنگے کپڑے کیوں نکالے ہوئے ہیں۔'' بڑے بھیا کی نظر اب تخت پر پڑی تھی۔ وہ چائے کی چسکی لے کر پوچھنے لگے۔
''چچا طفیل کے پوتے کی شادی ہے۔ اماں جی نے نکالے ہوئے ہیں لین دین کے لیے۔''
''بڑے پاپا، وہ لوگ گیت گانے کا بھی کہہ کر گئے ہیں، روز ڈھولکی بجائیں گی رحمہ اور شازیہ۔''
''تو ان کے بھائی کی شادی ہے بیٹا! وہ بھلے ڈھولکی کے بجائے ڈھول بجائیں ہمیں کیا۔''
''لیکن پاپا! ہم نے بھی روز جانا ہے۔ رحمہ شازیہ نے بار بار آنے کا کہا ہے۔'' بچیاں منہ بسور رہی تھیں۔
''روز جانا اور وہاں لڈیاں ڈالنی ہیں تا کہ کوئی ویڈیو بنائے اور سوشل میڈیا پر لگا دے۔''
''مما! سوشل میڈیا تو بہانہ ہے آپ ویسے ہی نہیں چاہتیں کہ ہم انجوائے کریں۔''
''بیٹا! ساری مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں بیٹیوں

کے لیے حساس تا کہ کوئی ان کی بیٹی کو کچھ الٹا سیدھا نہ بول دے۔ جب بھی محلے میں شادی ہوتی تھی میں خود بہت ایکسائیٹڈ ہوتی تھی کہ وہاں ہلا گلا ہوگا۔ ہم لڑکیاں مل کر ناچیں گی گائیں گی۔ لیکن ہوتا پتا کیا تھا مجھ پر تم لوگوں جیسی پابندیاں لگ جاتی تھیں۔ اماں لوگ شادی والے گھر جانے سے پہلے مجھے اس بات پر پکا کرتی تھیں کہ وہاں جا کر اونچا اونچا نہیں گانا، ڈانس کے تو نام پر ہی کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کرنے لگنا ہے۔ سب کو یہ باور کرانا ہے بچی نیک پروین ہے نماز روزے کے سوا دنیا کی خبر ہی نہیں ہے۔"

"مطلب سیم ہمارے والے حالات......

بچیاں تو غم کے بحر او قیانوس میں ڈوب کر ابھریں۔

"دنیا گول ہے بچوں۔" ماہین خوش دلی سے مسکرائی۔ "اتنی سخت گیر پابندیاں سن کر میں تو جانے سے ہی انکار کر دیتی تھی۔"

تائی امی کہتیں۔ "وہ لوگ ڈانس کا کہیں تو چھال مار کر انجمن نہ بن جانا۔ کوئی ضرورت نہیں ان کے صحن کی مٹی اڑاتے کی۔ ان کی لڑکیاں ہماری برادری کی فلاں شادی پر ٹھس بنے بیٹھی رہی تھیں۔ ہم نے بھی بدلہ اتارنا ہے۔"

اماں کہتیں۔ "ادھر منہ کھول کھول کر عابدہ پروین نہ بن جانا۔" عابدہ پروین کا ان دنوں میرے یار دی گھڑولی بھر دی پی ٹی وی پر بہت آتا تھا۔ اماں کو سخت ناپسند تھا۔

میں بگڑ جاتی کہ میں نہیں جا رہی کسی کے گھر خود جا کے چپ کر کے بیٹھ کر واپس آ جائیں۔ میرے دل میں ہوتا بعد میں، میں کوئی مووی دیکھ لوں گی بھائیوں کے ساتھ۔ یہ الگ بات کہ مووی کے نام پر صرف ایکشن ہی دیکھنا ہوتا تھا، بھائیوں نے میری نوجوانی کی عمر میں ہیرو ہیروئن کو کبھی ملنے ہی نہ دیا۔ ایکشن بھی غنیمت لگتا تھا۔ یوں لگتا میرے سنہرے خیال اڑ کر معزز خواتین تک پہنچ جاتے تھے جب ہی پھوپھو بھائیوں کی شان میں رطب اللسان ہو جاتیں۔

"یہ سارا قصور ان لفنگو کا ہے ارے کوئی بہن کو فلمیں دکھاتا ہے میچ دکھاتا ہے۔ یہ ہمارے "دانے بنے" دکھاتے ہیں۔ انہوں نے لڑکی کو کسی کام کا نہیں ہونے دینا۔ بشیراں کی بیٹی ایسی بی بی دھی، ایسی ٹھنڈی، سگھڑ، ہائے دل میں ٹھنڈ پڑ جاتی ہے۔ ایک یہ ہے......"

"جدھر سے گزرتی ہے نشان چھوڑ جاتی ہے۔" چھوٹے بھیا گرہ لگاتے تو میرے حصے کا دھموکا بھی کھاتے تھے۔

پھوپھو دھموکے سے فارغ ہو کر پھر سے سلسلہ کلام جوڑتیں۔

"پتا نہیں کیا کرے گی۔ ہر وقت ہبڑ دبڑ، افراتفری، ہاہاہاہا، ہوہوہویو، کوئی عقل ہی نہیں پتا نہیں کب دھیما پن آئے گا۔ قدسیہ کی بیٹی ایسی دھیمی ایسی سگھڑ......"

موازنے پر موازنہ دیکھ کر میرا ابھی پارہ ہائی ہو جاتا تھا۔ کوئی میرے برابر کی مثال تو لے آ ئیں۔ ان کو آتا کیا ہے سوائے ناڑے (آزار بند) بننے کے۔ جب دیکھو کھڈے پر اپنے جہیز کے لیے ناڑے بن رہی ہیں تسلیں باندھ رہی ہیں۔ "تائی اماں! مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا اتنے ناڑوں کا کریں گی کیا؟ سارے پنجاب کے لیے بنا رہی ہیں کیا؟"

"نہیں بلی۔ وہ لوگ اپنی شادی کی خوشی میں موتی چور لڈوؤں کے ساتھ ناڑے فری میں دیں گی۔" میں پھر سے ہاہاہاہاہا، ہوہوہوہو ہنسنے لگتی۔

اب معزز خواتین کو فکر پڑ جاتی کہ اگر گھر کی اکلوتی لڑکی محلے کے گیت رنگ میں نہ گئی تو کل ہمارے گھر کی شادیوں میں بھی کوئی اپنی لڑکیوں کو نہیں لائے گا۔ گاؤں والیوں کی یہ عادت مجھے بڑا سکون پہنچاتی تھی۔ نقد بدلہ لیتی تھیں۔ اسی لیے تو اب ہماری سگھڑ خواتین اپنی ٹون بدل لیتیں۔

"ہم تو اس لیے کہہ رہی تھیں بیگانی شادی میں اچھل اچھل کر آگے ہونا اچھا نہیں لگتا۔ لوگ کہیں گے ہم نے اپنی بیٹی کو عقل ہی نہیں سکھائی۔" میں بے

نیاز بنی کتابیں اٹھالاتی۔ حالانکہ اسکول کا سارا کام ختم ہو چکا ہوتا۔

اب ان معزز خواتین کو نئی فکر گھیر لیتی، اگر لڑکی نہ گئی تو سب کہیں گی ہم نے اپنی بیٹی پر بہت پابندیاں لگائی ہوئی ہیں۔ ہائے ہائے، یہ تو بہت بے عزتی والی بات ہو جائے گی۔ سب پابندیاں لگاتے تھے لیکن دوسروں کے سامنے ایکسپوز ہونے سے ڈرتے تھے۔ یہ بھی انسانی نفسیات کے عجیب رنگ ہیں۔"

بچیاں غور سے پھوپھو کو سن رہی تھیں۔

"پھر کیا ہوتا ماہین پھوپھو؟"

"خواتین کی عمر اور تجربہ مجھ سے زیادہ تھا دوسرا مجھے یہ امید ہوتی کوئی زبردستی مجھے ڈانس میں شامل کرے گی اس لیے امید کی ڈوری پکڑ کر میں ان کے وفد کے ساتھ شادی والے گھر جانے پر راضی ہو ہی جاتی تھی۔" ماہین بھی مسکرائی۔ "لیکن شادی والے گھر جا کر مجھے اچانک معزز خواتین کی زبانی پتا چلتا مجھے تو تین دن سے بخار ہے۔ میں تو کھڑی نہیں ہو سکتی۔ حکیم دارے نے روٹی چاول سے سختی سے منع کیا ہوا ہے۔ چائے پائے میں کھا نہیں رہی تو اب خواتین کوئی ڈش بتائیں جس کی بدولت میں تندرستی پکڑ سکوں۔

پھوپھو میرا سر گود میں رکھ کے مدھو بالا سے زیادہ رقت آمیز انداز میں دبانے لگتیں۔ تائی تالیاں پیٹے جاتیں۔ میں جھوٹ کی چلتی آندھی میں ہرا ہرا دیکھتی جاتیں۔ اچانک کوئی خاتون مجھے کھینچ کر گودی سے نکال دیتی اور پھر اسپیکر وجے ہی وجے۔"

"مطلب آپ کو اپنے ارمان نکالنے کا موقع مل ہی جاتا تھا۔" بچیاں مسکرائیں۔

"ارے کہاں، جو ٹپے ماہیے، گھوڑیاں ان کو آتی تھیں وہ مجھے نہ آتیں۔ جو گانے مجھے آتے تھے ایسے بے شرم گانے ان کو نہ آتے تھے۔ یوں گھر کی عزت بچ ہی جاتی تھی۔"

"پھوپھو! آپ بات کریں ناں۔ ہم نے شازیہ کے ساتھ انجوائے کرنا ہے وہاں کون سا کوئی لڑکا ہوگا۔"

"لڑکے گئے بھاڑ میں، یہ موبائل تو ہوگا۔ تم لوگوں کی یہی سہیلیاں ادھر ویڈیو بنانی ہیں ادھر اپنے واٹس ایپ اسٹیٹس میں ڈال دیتی ہیں۔ ناچتی پھرنا پھر سارے انٹرنیٹ پر۔" بڑی بھابھی آخری فقرہ سن چکی تھیں جبھی آگ بگولہ ہو گئیں۔

لڑکیاں بڑی مما کے اس قدر ریخ پا ہونے پر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی تھیں۔

"بڑی بھابھی! بچیاں ہیں، بچیوں جیسے ہی شوق ہیں کرنے دیں شوق پورے۔"

"ارے ماہی! مجھے بس یہ سوشل میڈیا کی ٹینشن رہتی ہے کل کو شادیاں کرنی ہیں۔ پرایا دھن ہیں مجھے ڈر لگتا ہے۔ ہر کوئی بات بعد میں کرتا ہے تصویر یا ویڈیو پہلے بنا لیتا ہے۔ جانے سب کچھ کیمرے کی آنکھ سے دیکھنا لوگوں کو کیوں اچھا لگنے لگا ہے۔ بعض مناظر کیمرے کی آنکھ کے بجائے حقیقی زیادہ اچھے لگتے ہیں۔" بھابھی آزردہ سی ہو گئیں

"ایسا کریں گے اماں جی کی گود میں ٹوکری رکھ دیں گے۔ وہ خود سب سے موبائل جمع کر لیں گی۔ ان کو ان کی عمر کی وجہ سے سب خواتین مارجن دیں گی۔ کمرہ بند ہوگا موبائل اماں جی کے پاس، تو ہم بھی ذرا دو ٹھمکے لگالیں گے۔"

ٹھمکوں کے ذکر پر بڑی بھابھی نے ناقابل یقین انداز میں اپنی کمرہ نما کمر دیکھی کچھ سوچا اور پھر مطمئن ہو کر گویا ہوئیں۔

"یہ ٹھیک ہے۔ میں نے ٹی وی پر سنا تھا ڈانس بڑی سخت ایکسرسائز ہے، فٹافٹ وزن کم ہو جاتا ہے۔"

"بھابھی ی ی ی......" ماہین کی لمبی سی چیخ پر باقی بھابھیاں اکٹھی ہو گئیں۔

بڑی بھابھی نے ایک نظر ان سب کو دیکھا پھر شرما کر گویا ہوئیں۔

"فٹ رہنے کا حق سب کو حاصل ہے۔" لڑکیوں نے پھوپھو کو دیکھ کر وکٹری بنا کر خوشی کا نعرہ لگا دیا۔

☆☆

اُمِّ ہانی

ناولٹ

"ایسی صبح اور ایسی چائے روز روز نہیں ملتی۔"
چائے کا پہلا گھونٹ بھرتے ہی اس کے منہ سے پٹاخے کی صورت میں ٹاخ نکلا۔ یہ مزیدار چائے اور آج کی چھٹی کی خوشی کا پٹاخا تھا جو منہ سے بے ساختہ چھوٹا تھا۔

اپنے بکھرے بالوں کو کھول کر بغیر کنگھی کیے اس نے پھر سے لپیٹ کر جوڑے کی شکل دے دی اور لاؤنج کے صوفے پہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ایک ہاتھ میں چائے کا کپ اور دوسرے میں ریموٹ اٹھائے وہ بنا آواز کے چینل سرچنگ میں مصروف ہوگئی۔ حالانکہ گھر کے کاموں، لیسن پلاننگ کے ساتھ ساتھ دو سوٹ بھی سلائی کے لیے رکھے پڑے تھے جو اسے اس ہفتے ہی مکمل کر کے دینے تھے لیکن کیا کرتی کہ آج تو دل چھٹی انجوائے کرنے کا کر رہا تھا۔

شاہد اپنی دکان پہ جا چکا تھا اور بچے اسکول۔ وہ گھر میں اکیلی تھی اور یقیناً سکون سے چھٹی کا مزا لینے کے چکروں میں تھی۔ کبھی کبھار دل کرتا ہے کہ بچوں، شوہر، گھر اور نوکری کی ذمہ داری سب سے دور بھاگ جائیں اور بس ہم ہوں اور کنواری زندگی جیسی آزادی ہو۔ کچھ پل، کچھ وقت اپنے لیے جینا بھی ضروری ہوتا ہے ورنہ ہم اندر سے بساندزدہ ہو جاتے ہیں، مرنے جیسے زندہ اور زندگی سے دور۔

کسی چینل پہ کوئی رومانٹک فلم دیکھ کر اس نے وہیں روک دیا اور مزے سے چائے اور فلم کا مزا لینے لگی ہی تھی کہ تبھی اس کا موبائل بجا تو وہ جو تسلی سے بیٹھی چائے پی رہی تھی، چائے کا کپ وہیں میز پہ رکھ کر شیلف تک آئی تاکہ موبائل اٹھا کر دیکھ سکے کہ میسج کہیں اسکول سے تو نہیں تھا۔ رات تک تو اسکول کے ٹیچرز گروپ میں یہی میسج آیا تھا کہ کل یعنی آج اس کا آف ہے لیکن پرنسپل کا کیا بھروسا تھا جو کسی وقت بھی گروپ میں میسج کر کے کہہ سکتی تھیں کہ میٹرک کے ٹیچرز کی چھٹی کینسل۔ ابھی کے ابھی سب ٹیچرز اسکول پہنچیں۔ بھلے کلاسز نہ لینا ہوں لیکن اور بڑی خواریاں تھیں جو ٹیچرز کا مقدر تھیں۔

"کہہ دوں گی کہ میں تو شہر سے باہر ہوں۔"
موبائل کا لاک کھولتے ہوئے ٹیچرز کا مشہور زمانہ بہانہ گھڑتے، خود کلامی کے انداز میں اس نے کہا۔ موڈ تو میسج ٹون نے ہی خراب کر دیا تھا۔ دل کو خدشہ تھا کہ میسج اسکول سے ہی تھا۔

"شہر سے باہر، شہر سے باہر۔" صحن میں لٹکے پنجرے میں قید مٹھو نے اس کی بات پکڑ کر زور زور سے گردان دہرائی۔

"شش۔" اس نے گھور کر مٹھو کو دیکھا اور لبوں پہ انگلی رکھ کر اسے خاموش کروایا۔ مالکن کا فرماں بردار ہرے رنگ کا توتا فوراً چپ ہو گیا۔ وہ بس اپنی مالکن کی ہی بات پکڑتا اور دہراتا جاتا تھا۔ کئی آئے گئے حتیٰ کہ دیگر مکینوں کی بھی کسی بات کو سالوں میں کبھی پکڑتا اور دہراتا۔

موبائل لے کر سکون سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے اس نے میسج پہ کلک کیا تو وہی انجان نمبر دیکھ کر موڈ مزید خراب ہو گیا۔ یہ نمبر اسے پچھلے کئی

دن سے تنگ کر رہا تھا۔ پہلے تو خالی میسج آتے تھے۔ اس نے کوئی رسپانس نہیں دیا۔ وہ عموماً انجان نمبر سے آنے والے میسجز کا کوئی جواب نہیں دیتی تھی۔ تھک ہار کر وہ خود ہی باز آجاتا۔ لیکن یہ بڑا مستقل مزاج تھا، خالی میسجز کے بعد پھر شاعری آنے لگی۔ چونکہ بے ہودہ نہیں تھی تو وہ بھی خاموشی سے پڑھتی اور ایک طرف ڈال دیتی لیکن پرسوں رات سے وہ شاعری کے بجائے ایک آدھ کوئی لفظ یا جملہ لکھ کر بھیج دیتا تھا۔ اب بھی یہی لکھا تھا جسے پڑھ کر اس کا برا موڈ مزید برا ہوگیا تھا۔

''مجھ سے بات کرلیں۔''

''میری ماسی کے پتر لگتے ہونا جو بات کر لوں۔'' منہ بناتے اس نے موبائل لاک کر کے صوفے پہ پاس ہی رکھ دیا اور پھر سے چائے پینے لگی۔

''ماسی کا پتر، ماسی کا پتر۔'' مٹھو نے پھر سے دہرایا تو اسے ہنسی آگئی۔ مٹھو اس کی ہنسی دیکھ کر اب سیٹیاں بجانے لگا۔ صلہ نے ایک نظر کھلے صحن میں لٹکے اس کے پنجرے کو دیکھا جو برآمدے نما لاؤنج کی جالی سے صاف دکھائی دیتا تھا پھر ٹی وی پہ نظریں جما لیں۔ دھیان بٹ چکا تھا۔ نجانے کون تھا اور اتنی مستقل مزاجی سے کیوں اس کے پیچھے پڑا تھا حالانکہ وہ تو اس کے کسی میسج کا جواب تک نہ دیتی تھی۔ مہینے سے اوپر تو ہو ہی گیا تھا اس کے میسجز آتے اور اسے نظر انداز کرتے۔

ساتھ ہی دوسری بار میسج ٹون بجی۔ اس نے پھر برا سا منہ بنایا۔ یعنی کہ ایک اور میسج۔ ایک اور جملہ۔ مزید موڈ خراب۔

''مجھ سے کیوں بھاگ رہی ہیں صلہ؟'' وہ بالکل شاکڈ سی ہو کر ٹھہر گئی تھی۔ کتنی دیر وہ میسج میں لکھا اپنا نام ہی غور سے پڑھتی رہی تھی۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ انجان نمبر اسے اس کے نام سے مخاطب کر رہا تھا۔

''وہ مجھے جانتا ہے۔ میرا نام جانتا ہے۔ تو کیا یہ کوئی جاننے والا ہے؟'' چائے وہیں پڑے پڑے بھاپ اڑا رہی تھی اور ایک نئی فکر صلہ کو ستا رہی تھی۔

وہ ہمیشہ یہی طریقہ اپناتی تھی کہ کبھی کوئی اجنبی اسے میسج کرتا، فیس بک پہ ریکویسٹ بھیجتا یا میسنجر پہ رابطہ کرنے کی کوشش کرتا وہ دیکھتی اور نظر انداز کر دیتی۔ اسے کسی اجنبی میں کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ وہ ایک شادی شدہ عورت تھی اور اسے اپنی اور اپنے شوہر کی عزت کی پروا تھی۔ عزت جیسی قیمتی چیز کو کبھی بھی وہ کسی دوستی کی نذر نہیں کر سکتی تھی۔ یہ اس کے کردار کی مضبوطی تھی، یہ اس کی شخصیت تھی، یہ اس کی زندگی کے اصول تھے یا جو بھی کہہ لیا جائے بس وہ ایسی ہی تھی۔

''اگر وہ کوئی جاننے والا ہے تو یہ پہیلیاں کیوں بوجھوا رہا ہے۔ کھل کر سامنے کیوں نہیں آتا؟'' اس کے پاس اہم رشتے داروں اور کولیگز کے نمبر ہی تھے کیونکہ وہ انہی سے رابطے میں تھی۔ رابطہ بھی کیا بس ضرورت کی ہی بات کرتی تھی۔ زندگی بے حد مصروف تھی اور اس مصروف زندگی میں اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ فالتو کی دوستیاں پالے یا کسی سے چٹ چیٹ کر سکے۔

''مجھے شاہد کو بتانا چاہیے؟'' خود سے سوال کر کے اس نے سر نفی میں ہلایا۔

وہ شاہد کو نہیں بتا سکتی تھی۔ ایک تو وہ پہلے سے شکی مزاج انسان تھا اور ایسی بات بتا دینا اس کے مزاج کو مزید برہم کر سکتا تھا۔ اس کے لیے سو مسائل کھڑے ہو سکتے تھے اور وہ جتنی بھی باہمت سہی اتنی تو نہیں تھی کہ نئے اور بڑے مسائل کو خود دعوت دے دیتی۔

''جو بھی ہے، ہوتا رہے میری بلا سے۔ میں نظر انداز کروں گی تو بھاگ ہی جائے گا۔ کتنے طرم خان آئے اور میری خاموشی کے آگے گھٹنے ٹیک کر بھاگ گئے۔'' اس نے بے نیازی سے ٹھنڈی چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگایا اور برا سا منہ بنایا۔ اب کیا اس ٹھنڈی چائے کو گرم کرنا۔ اس نے ایک طرف رکھ کر ٹی وی بند کر دیا۔ اچھی خاصی صبح کا سارا مزا کرکرا ہو کر

رہ گیا تھا۔
"لیکن وہ میرا نام بھی تو جانتا ہے۔" کچن تک جاتے جاتے اس نے ایک نظر موبائل پہ ڈالی اور ٹھنڈی سانس لی۔ جو بھی تھا اسے جواب نہیں دینا تھا۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا لیکن جلد ہی اس کا برسوں کا یہ اصول ٹوٹنے جا رہا تھا۔

☆☆☆

رات تک اس کا چھٹی سے بھرپور دن عام دن کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ عورت کی زندگی میں کبھی چھٹی نہیں ہوتی جب تک وہ زندہ ہے اور ہاتھ پیر ہلا سکتی ہے اسے چھٹی نہیں مل سکتی۔ دو آرڈر پہ آئے سوٹوں میں سے ایک اس نے شام تک سلائی کرلیا تھا۔ شام کی چائے پہ بچوں کے لیے پکوڑے بنا لیے جو انہوں نے کیچپ کے ساتھ خوب مزے لے کر کھائے۔ رات کے کھانے میں اس نے شاہد کی پسند کا گوبھی گوشت بنایا تھا۔ بچوں کے لیے اس نے پاستا بنادیا تھا۔ وہ گوشت خور باپ کی ویجی ٹیرین اولاد تھی، وہ نسل جو فاسٹ فوڈ زیادہ پسند کرتی اور روایتی کھانوں سے دور بھاگتی ہے۔ سادہ سا دسترخوان برآمدے میں چن دیا تھا۔ کھانا کھانے کے دوران وہ بچوں سے اسکول کی روٹین ڈسکس کر رہی تھی کیونکہ جب سے وہ اسکول سے آئے تھے وہ مصروفیت کی وجہ سے ان سے ڈھنگ سے بات ہی نہیں کر پائی تھی۔ کل ہفتہ تھا اور انہیں چھٹی تھی اور اسی لیے پوری شام انہوں نے اپنا ہوم ورک نہیں کیا تھا اور موبائل پہ گیمز کھیلتے رہے تھے۔ شاہد چپ چاپ کھانا کھا رہا تھا اور ساتھ اپنے موبائل پہ کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ اس نے دوسری بار سالن ڈالنا چاہا تو ڈونگے میں گوشت ندارد تھا۔ چمچ ہلا ہلا کر تھک گیا تو منہ بنالیا۔
"بس اتنا سا گوشت پکایا تھا۔ اتنے عرصے بعد اگر بنا ہی دیا تھا تو ڈھنگ کا تو بنادیتیں کہ جی بھر کر بوٹیاں ہی مل جاتیں کھانے کو لیکن نہیں جی۔ بس گوبھی کے ڈھیر میں چن کر تین بوٹیاں گوشت کی ڈال کر اسے گوبھی گوشت کا نام دے دیا جاتا ہے۔"
غصے سے پلیٹ پرے کھسکا دی۔ اب وہ بچوں کے لیے بنایا پاستا پلیٹ میں ڈال رہا تھا۔ تعریف تو کرنا دور اس نے الٹا شکوہ ہی کیا تھا۔ صلہ نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا اور کسی بھی ناخوش گوار تاثر کو چہرے پہ آنے سے روک دیا۔ بچوں نے پہلے باپ اور پھر ماں کے چہرے کو بغور دیکھا اور پھر سے اپنا من پسند پاستا کھانے لگے۔ صرف اور صرف بچوں کی موجودگی کی وجہ سے وہ خاموش رہی تھی۔
میاں بیوی کی 'تو تو میں میں'...... میں سب سے زیادہ نقصان بچوں کا ہوتا ہے اسی سوچ کے پیش نظر اس نے دس سال گزار دیے تھے۔ اپنے بچوں میں وہ کسی قسم کی احساس کمتری یا ابنارملٹی پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے وہ پوری کوشش کرتی کہ انہیں اچھا ماحول دے سکے جبکہ شاہد ایسی کوئی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اس کو گھر، بچوں اور خود اس کی ذات میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ شاہد کی کڑوی کسیلی باتیں بالکل خاموشی سے سن کر پی جاتی کیونکہ وہ لڑائی جھگڑا فساد ڈال کر اپنے بچوں کے معصوم ذہنوں کو پراگندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔
"فہد، فضا چلو بیٹا کمرے میں جاؤ اور کارٹون دیکھو۔ پھر ٹائم سے سونا بھی ہے۔"
بچوں کو اس نے طریقے سے کھانا کھلا کر اندر کمرے میں بھیج دیا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے وہ کارٹون دیکھا کرتے تھے۔ سو اب ان کے کمرے سے کارٹونز کی آواز آرہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے اب تک کے دبائے ہوئے ابال کو چہرے پہ امڈ آنے دیا اور تیزی سے اپنی جگہ آکر بیٹھ گئی۔
"یہ جو گوشت تم کھا رہے تھے نا اور جس پہ مجھے باتیں بھی سنا رہے تھے یہ تمہارے پیسوں سے نہیں آیا تھا۔ یہ میں اپنی حلال کمائی سے لائی تھی اور جتنا میں کماتی ہوں اس حساب سے اتنا ہی آسکتا تھا۔ جب خود کما کر اس گھر کا سارا خرچا اٹھاؤ گے نا تو بکرے ذبح کروا لانا۔ تب بنادوں گی تمہیں پوری پوری ران

اور پائے۔" چبا چبا کر کہتے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔ بالکل ایک بپھری ہوئی شیرنی بنی دھاڑ رہی تھی۔ شاہد نے بڑے سکون سے بلکہ مکمل ڈھٹائی سے اس کی بات سنی تھی اور پھر سے پاستا کھانے لگا تھا۔

"اس گھر میں لایا گیا راشن تمہارے نہیں میرے پیسوں سے آتا ہے۔ گھر کا کرایہ، بچوں کی فیس سب میں بھرتی ہوں اور تم کون سا فرض پورا کرتے ہو جو حق جتانے آجاتے ہو؟"

شاہد نے بڑے ٹھنڈے انداز میں اس کی جانب دیکھا اور گردن دائیں طرف ہلکا سا خم دیتے شانے اچکائے۔

"کوئی احسان نہیں کرتیں۔ اپنے بچوں کے لیے سب کر رہی ہو۔"

"میرے بچے۔ کیا میں جہیز میں لائی تھی انہیں؟ یا ابو نے تحفے میں دیے تھے۔ یہ تمہارے بھی بچے ہیں جن کی کوئی ایک ذمہ داری بھی تم پوری کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔"

"ہاں تو کہا تو ہے کہ جا کر اپنے ابو سے کہو کہ مجھے پیسے دیں۔ انویسٹ کرنے ہیں میں نے۔ لیکن تم ہو کہ مانتی ہی نہیں ہو۔ یقین جانو یار اس بار گاڑیوں کا شوروم کھولوں گا اور پھر دیکھنا چاندی ہی چاندی ہو جائے گی۔ میں اچھا کماؤں گا تو عیش تو تم اور بچے ہی کرو گے نا۔"

وہ ایسے خواب پہلی بار نہیں دکھا رہا تھا۔ ہر کاروبار شروع کرنے سے پہلے وہ ایسی ہی باتیں کرتا تھا۔ ایسے ہی شیخ چلی کا پلاؤ بناتا اسے منانے کی کوشش کرتا تھا۔ ایسے اچھے پیارے سپنے بنتا تھا کہ اگلا یقین کرتے ہی بنتا تھا۔ لیکن وہ بھی صلہ تھی جو گزشتہ دس سال سے اس کی ایسی باتیں سن سن کر اب ان باتوں پہ کان دھرنا تو دور سننا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔

صلہ کا دل کیا اس ڈھیٹ انسان کا سر پھاڑ دے جو گھر کی ساری ذمہ داریاں اس کے سر تھوپ کر بے فکری کی زندگی گزار رہا تھا۔ کاش کہ ایک قتل انسان پہ واجب ہوتا تو وہ اس انسان کو اپنے ہاتھوں سے خوشی خوشی قتل کر دیتی۔

"تم اس قابل ہو ہی نہیں کہ تم پہ اپنے الفاظ ضائع کیے جائیں۔ اور اپنے باپ کا پیسہ تو اب میں ایک چونی بھی تم پہ نہ لگنے دوں۔" اپنی کرسی پہ پیچھے ہوتے اس نے غصے سے دانت پیسے اور اسے دھکیل کی اٹھ گئی۔ وہ اب مزے سے اس کا بنایا پاستا باؤل بھر کر کھا رہا تھا۔

☆☆☆

"تم نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔ ایک دن بچے اس کے حوالے کرو کہ خود سنبھالے اور خود یہاں چلی آؤ تو پتا چل جائے گا کہ گھر اور بچے سنبھالنا ہی کتنی بڑی ذمہ داری ہے۔ بجائے تمہارا احسان ماننے کے کہ تم گھر کا خرچا بھی چلا رہی ہو، الٹا نخرے دکھاتا ہے، چڑھائی کرتا ہے۔ اب تک جتنا بھی پیسہ ڈبویا ہے نا وہ سب تمہارے باپ کی کمائی ہی تھی لیکن وہ ایسا ڈھیٹ ہے کہ اسے نہ کسی کا احسان محسوس ہوتا ہے اور نہ ہی شرم آتی ہے۔"

وہ اسکول سے بچوں سمیت امی کی طرف آئی ہوئی تھی۔ امی کا گھر اس کے گھر سے چند میل کی دوری پہ ہی تھا۔ جب دل ہلکا کرنا ہوتا تو امی کی طرف آجاتی۔ جب لگتا کہ بہت تھک گئی ہے تو میکا یاد آجاتا۔ بہن تو کوئی تھی نہیں جس سے کہتی سو سارے دکھ سکھ امی سے ہی کر لیا کرتی تھی۔ ابھی بھی شاہد کی ایسی ہٹ دھرمی پہ حلیمہ کا خون کھول گیا تھا۔ بیٹی پہ ترس اور داماد پہ جی بھر کر غصہ آرہا تھا۔ نجانے کون سی منحوس گھڑی تھی کہ شاہد کے گھر والوں کی شرافت پہ اعتبار کر کے اپنی نازوں پلی بیٹی اس کام چور، کاہل انسان سے باندھ دی تھی۔ ابو بھی بس خاندانی شرافت پہ ریجھ گئے تھے۔ لڑکے کو بھی تو ناپ تول کر دیکھ لیا ہوتا کہ کتنے پانی میں ہے۔

امی کی بات پہ وہ استہزائیہ مسکرائی جیسے وہ اس کے گھر اور شوہر کے حالات سے واقف نہ ہوں۔ برسوں کی کہانی تھی یہ تو جو روز دہرائی جاتی تھی کون سا

نئی تھی کہ اب تک از بر نہ ہو پائی ہو۔

"اسے بچوں سے کیا لینا دینا امی۔ بچے اس کے بقول صرف میرے ہیں اور میری ذمہ داری ہیں۔ میں نے پیدا کیے ہیں اور میں نے ہی پالنے ہیں۔ اس کے حوالے کروں جو انہیں پوچھنا گوارا نہیں کرتا۔ اتنی فکر ہوتی نا اسے تو ڈھنگ سے کوئی کام کر لیتا۔ اتنا ذمہ دار ہوتا نا وہ تو میرے اوپر ذمہ داریوں کا اتنا ڈھیر نہ ہوتا۔"

وہ ایسی تلخ نہیں تھی لیکن حالات نے ایسا بنا دیا تھا۔ بچوں کے سامنے تو وہ خود کو حد درجے نارمل رکھتی تھی کہ کہیں بچوں پہ کوئی منفی اثر نہ پڑے لیکن ماں کے آگے اکثر وہ دل کھول کر رکھ دیا کرتی تھی۔ تلخ بھی ہو جاتی اور رو بھی لیتی۔

"جو بھی ہے اولاد اس کی بھی ہے۔ باپ ہے وہ ان کا۔" امی کو شاید اب بھی امید تھی کہ وہ بچوں کا خیال کرتا ہوگا۔ وہ امی کی ایسی بات پہ ہنس دی۔

"دنیا میں کئی مرد ہوتے ہیں امی جنہیں باپ بننے کا شوق ہوتا ہے، بس شوق۔ لیکن وہ باپ بن کر نہیں دکھاتے۔ لیکن ماں کو ہر حال میں ماں بننا پڑتا ہے۔ بلکہ جب ان کا باپ اپنی ذمہ داری پوری نہ کر رہا ہو تو باپ بھی ماں کو ہی بننا پڑتا ہے۔ میں ایک ایسی ہی ماں ہوں۔ جب یہ بات جانتی ہیں تو کیوں ایسی باتیں کر کے میرے زخموں پہ جیسے کھرنڈ کھرچ ڈالتی ہیں۔ یہ میرے بچے ہیں اور میں انہیں لاوارث نہیں چھوڑ سکتی۔ ماں خود مر کھپ جاتی ہے امی لیکن اولاد کے لیے سب کرتی ہے۔ باپ خاص طور سے شاہد جیسا باپ یہ سب نہیں کر سکتا۔" امی اس کے تھکن زدہ لہجے پہ خاموش ہو گئی تھیں۔

سچ ہی تو تھا کہ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی تب سے اب تک شاہد نے کوئی ایک کام بھی ڈھنگ سے، مستقل مزاجی سے نہیں کیا تھا، نوکری تو جو شروع میں ہی چند ماہ کی تو کی، اس کے بعد اپنا کاروبار کرنے کی نجانے کیا سمائی کہ اچھی بھلی نوکری کو لات مار کر صلہ کا سارا زیور بکوا دیا۔ شروع کے دن تھے تب صلہ کو اس کی تساہل پسندی کا اتنا پتا نہیں تھا اسی لیے زیور دے ڈالا۔ لیکن پھر ساری رقم ڈوب جانے پہ شاہد کو کوئی دکھ نہ ہوا، الٹا صلہ کے ابو سے جا کر خود اس نے رقم مانگی تو صلہ اور اس کے درمیان کافی جھگڑا ہوا تھا۔ اور اس کے بعد یہ سب معمول بن گیا تھا۔

ایک کاروبار شروع کرتا اور جب دل اوب جاتا، منافع کم دکھائی دیتا تو دوسرے کی جانب بڑھ جاتا۔ اس پہ مستزاد کہ کاروبار کے لیے رقم بھی اسے ہمیشہ سسرال سے چاہیے ہوتی۔ وہ ہمیشہ صلہ کو اتنا مجبور کر دیتا کہ وہ باپ کے سامنے جھکے ہوئے سر سے ہاتھ پھیلا لیتی۔ ابو بھی کیا کرتے کہ وہ ایک بے بس بیٹی کے باپ تھے۔ پیسہ انہیں بیٹی کی خوشیوں سے زیادہ عزیز تھوڑی تھا کہ اسے خالی ہاتھ لوٹا دیتے۔ ہر بار شاہد کے ہاتھ میں کاروبار کے لیے پیسہ تھماتے تو وہ اتنا فرماں بردار بن جاتا کہ جس کی مثال نہ ملتی تھی۔ لیکن چند دن بعد واپس وہی روش۔ وہی لاابالی پن، لاپروائی اور چند ماہ بعد بزنس بند کرنے کی اطلاع۔ اب تو صلہ نے اس کی دھمکیوں اور باتوں پہ دل سخت کر لیا تھا۔ نہ وہ اس کے ڈراووں میں آتی تھی نہ ہی ابو سے مزید رقم مانگنے جاتی تھی۔

"کیا ہو جائے گا زیادہ سے زیادہ طلاق دے دے گا نا۔ تو دے دے۔ اب بھی تو اکیلی زندگی کی گاڑی چلا رہی ہوں۔ آگے بھی چلا لوں گی۔ ویسے بھی ایک طلاق تو وہ دے ہی چکا ہے۔"

وہ بھی ڈھٹائی کی مثال بن کر سوچنے لگی تھی۔ چند سال پہلے ہی ایک معمولی جھگڑے پہ شاہد نے اسے ایک بار طلاق دے ڈالی تھی۔ تب وہ بچے لے کر امی کے گھر چلی گئی تھی۔ کچھ دن وہیں رہی۔ ابو نے سمجھایا اور شاہد بھی اپنے ابا کو لے کر آ گیا۔ انھوں نے صلہ کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تو اسے ماننا ہی پڑا اور واپس گھر چلی آئی۔

شاہد اتنی آسانی سے اسے کہاں چھوڑنے والا تھا۔ اچھی خاصی سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو بھلا کون نادان ہاتھ سے جانے دیتا ہے۔ وہ بھی اتنا

پاگل نہیں تھا کہ اسے چھوڑ کر پھر فاقوں پہ آجاتا۔ جو بھی تھا کم از کم اسے گھر بٹھا کر کھلا رہی تھی۔ موڈ ہوتا تو کام کرتا تھا نہیں تو اللہ اللہ خیر صلہ۔

حلیمہ کو بیٹی کی تھکن، بے بسی بڑا رلاتی تھی لیکن وہ بھی کیا کرتیں بھلا۔ کتنی ہی بار صلہ چاہتی تھی کہ اس نام نہاد رشتے کو ختم کر دیا جائے جسے وہ پچھلے دس سال سے گھسیٹ رہی تھی لیکن بشیر صاحب نجانے کیوں ایسا نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ داماد کو ہر کچھ عرصے بعد رقم دیتے اور صلہ کو تسلی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن وہ جانتی تھی کہ کچھ بھی ٹھیک ہونے والا نہیں تھا۔ شاہد کو عادت پڑ چکی تھی سسر سے مانگنے کی جواب بھی نہیں بدلنا تھی۔

☆☆☆

رات وہ امی کے گھر ہی ٹھہر گئی تھی۔ شاہد اپنے والدین سے ملنے ساہیوال گیا ہوا تھا۔ ہفتے سے پہلے یقیناً اس کی آمد ممکن نہیں تھی۔ جب بھی وہ ساہیوال جاتا تھا یا وہ بچوں کو لے کر امی کے گھر رہنے چلی جاتی یا امی چلی آتیں۔ گو کہ بچے اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ وہ اکیلے رہنے سے ڈرتی نہیں تھی لیکن ابو امی کبھی اسے اکیلا نہیں رہنے دیتے تھے۔ اپنی شادی شدہ زندگی میں وہ کم ہی سسرال گئی تھی اور اب تو شاہد سے حالات سازگار نہ تھے اسی لیے وہ سسرالیوں کو بھی گھاس نہ ڈالتی تھی۔

فہد اور فضا کھانا کھا کر کب کے سو چکے تھے۔ اپنے گھر سے کہیں زیادہ وہ نانی کے گھر خوش رہا کرتے تھے۔ گھر کھلا اور بڑا تھا۔ بے شمار آسائشات تھیں اور نانا سارا دن کچھ نہ کچھ کھانے کو لاتے ہی رہتے تھے اسی لیے وہ دونوں خوش رہتے تھے۔ اوپر والے پورشن میں مقیم ماموں طاہر کے دونوں بیٹے بھی ان سے کھیلنے سارا دن نیچے ہی رہا کرتے تھے اسی لیے ان کا گھر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

بچوں کے سونے کے بعد ہی اسے اپنی فیس بک چیک کرنے کا موقع ملتا تھا۔ ابھی بھی وہ اپنا موبائل اٹھائے بیٹھی تھی تبھی اسی انجان نمبر سے میسج آیا تھا۔

"میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں صلہ۔ پلیز مجھ سے بات کر لیں۔ ایک بار ہی سہی لیکن مجھے جواب دے دیں۔"

اس کی تمام حسیات سن ہو گئی تھیں۔ آخر یہ کون تھا اور کیوں اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا۔ وہ پچھلے دو مہینے سے اسے نظر انداز کر رہی تھی لیکن وہ کتنا ڈھیٹ تھا کہ اسے میسجز پہ میسجز کیے جاتا تھا۔ بار بار وہی بات کہ اس سے بات کر لے۔ وہی منت بھرا لہجہ کہ ایک بار اسے جواب دے دے۔ لیکن یہ تو طے تھا کہ وہ اسے جواب نہیں دینے والی تھی۔

ابھی وہ موبائل ہاتھ میں لیے سوچ ہی رہی تھی کہ اگلا میسج موصول ہوا۔

"دس سال میں خود ویسا ہی بنا لیا ہے جیسا آپ نے چاہا تھا۔ مضبوط، بہادر، کامیاب۔" اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ کئی بار اس نے میسج پڑھا۔ دس سال، مضبوط، بہادر، کامیاب۔ یہ الفاظ، یہ جملہ۔ مانوس سا تھا، اپنا اپنا، جانا پہچانا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ الفاظ سنے سنائے سے ہوں۔ اس کے اپنے کہے اور کسی کے سنے ہوئے۔

یکدم اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا تھا اور وہ بے یقینی سے اس میسج کو دیکھے گئی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے میسج ٹائپ کرنے لگی۔

"کون ہے؟" انگریزی میں اس نے لکھا اور کچھ سوچ کر بھیج دیا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ زندگی کا ایک نیا ہی تجربہ تھا جس سے وہ گزر رہی تھی۔ ایک منٹ کے تیسویں حصے میں میسج ٹون بجی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے میسج کھولا۔ سامنے جو لکھا تھا اسے پڑھ کر اس کا سانس رک گیا تھا۔

☆☆☆

کھانے کی میز پہ تابندہ باجی اور ان کے شوہر سمیت ایک بیٹی نے انھیں مکمل کمپنی دی تھی۔ اب تک شادی کی جتنی دعوتیں وہ کھا چکی تھی اس میں سب سے سادہ اور مزیدار کھانا۔ گھر کی روٹی، چکن

قورمہ، مٹر پلاؤ اور رائتہ، میٹھے میں سوجی کا حلوہ۔ تابندہ باجی نے شاید محبت کوٹ کرڈالی تھی کہ وہ ہاتھ نہیں روک پا رہی تھی یا ان کے ہاتھ میں ذائقہ ہی اتنا تھا۔

"کھانا بہت زبردست بنا تھا۔" اس نے اتنی بار دہرایا کہ اب تو تابندہ باجی شکریہ کہنے کے بجائے مسکرانے پہ ہی اکتفا کررہی تھیں۔

"میں چائے بناتی ہوں تب تک تم میرے کمرے میں آرام کرو۔" وہ کچن میں چلی گئیں اور وہ اٹھ کران کے کمرے سے انجان کسی اور کمرے میں ہی چلی گئی۔ سامنے بستر پہ الٹے لیٹے بارہ تیرہ سالہ بچے نے رخ موڑ کر اندر داخل ہوتے وجود کو دیکھا اور اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں اور وہ غصے سے اسے گھور رہا تھا۔

"آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟" وہ بے حد خفا تھا۔

"سوری، میں تمہاری ممی کے کمرے میں جا رہی تھی۔ غلطی سے تمہارے کمرے میں آگئی۔" اس نے معذرت کرتے ہوئے مڑ جانا چاہا۔

"وہ میری ممی نہیں ہیں۔ وہ بابا کی وائف ہیں۔" اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قدم تھم گئے تھے۔ وہ رک کر اس خفا خفا سے بچے کو دیکھنے لگی جو اب بازو سینے پہ باندھے منہ پھلائے اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کی متورم ناک اور آنکھیں اس بات کا پتا دیتی تھیں کہ وہ روتا رہا ہے اور ٹھیک ٹھاک روتا رہا ہے۔

"اوکے سوری۔" وہ کہہ کر واپس پلٹنے لگی۔ اتنی بے تکلف وہ کسی سے نہیں ہوتی تھی کہ کوئی اس سے اتنی تلخی اور برہمی سے بات کرے اور وہ اس کے آگے بچھ بچھ جائے۔

"سوری آپ کو نہیں بابا کو کہنا چاہیے جو ان کو یہاں لائے ہیں ہماری نئی ممی بنا کر۔" وہ جاتی ہوئی کو کوئی ایسی بات کہتا تھا کہ وہ رکنے پہ مجبور ہو جاتی تھی۔ شاید وہ یہی چاہتا تھا کہ وہ اس کی سنے۔ اسے اپنے دل کی بھڑاس اور غصہ نکالنے کے لیے یقیناً کوئی سامع چاہیے تھا جس کے سامنے وہ اپنا دل ہلکا کر سکے اور کہیں اسے لگا تھا کہ وہ بہترین سامعہ ہے۔ اسی لیے اب وہ پلٹ کر اس تک آگئی تھی۔ اس کے برابر بیٹھ گئی تھی۔ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"تم نہیں چاہتے تھے کہ بابا دوسری ممی لائیں۔" وہ چپ رہا۔

"تمہیں ممی نہیں چاہیے تھیں؟" اس نے اگلا سوال پوچھا۔ وہ اسے بولنے پہ اکسا رہی تھی۔ اس نے پہلے اسے دیکھا اور پھر دائیں بائیں سر نفی میں ہلایا۔

"ممی لانے سے مجھے پرابلم نہیں تھی اگر وہ ہماری ممی بن کر دکھاتیں۔ لیکن وہ تو پہلے دن سے بابا کی بیوی ہی ہیں۔ ہماری ممی نہیں ہیں۔" وہ اس کی بات پہ چونکی تھی۔

اسے یہاں آکر یہی لگا تھا کہ تابندہ باجی نے چار مہینے کی شادی میں گھر کو بخوبی سنبھال لیا ہے لیکن اب احساس ہو رہا تھا کہ انہوں نے گھر تو سنبھال لیا تھا مگر بچے نہیں۔ شوہر تو ان سے خوش تھا لیکن اس کی اولاد نالاں تھی جس کی شاید انہیں پروا نہیں تھی۔

دراصل علی بھائی کی تابندہ باجی سے دوسری شادی تھی۔ تابندہ باجی اس کی سب سے بڑی نند تھیں جن کی شادی پینتالیس سال میں ہوئی تھی۔ علی بھائی کی بیوی کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر جلد ہی زندگی کی بازی ہار گئی تھیں اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے انہیں اب دوسری شادی تو کرنا ہی تھی اسی لیے انھوں نے دور پار کی کزن تابندہ کے لیے سوچا تھا جو اب تک شادی نہ ہونے کے سبب ماں باپ کی دہلیز پہ ہی بیٹھی تھیں۔ شادی تو انہوں نے بچوں کی خاطر ہی کی تھی لیکن تابندہ باجی اتنی اعلیٰ ظرف واقعی نہیں ہوئی تھیں کہ بچوں کی ماں بن کر انہیں سنبھال لیتیں۔ سوکن بھلے دنیا سے چلی گئی تھی لیکن اس کی اولاد ان کے دل کو چبھتی تھی اسی لیے وہ ان کی ماں نہیں بن سکتی تھیں۔

وہ ان کے لیے ایک روایتی سوتیلی ماں ہی ثابت ہوئی تھیں جس کا اظہار سامنے بیٹھا انس کر رہا تھا۔

وہ بارہ تیرہ سالہ ایک تنومند بچہ تھا جس کی بڑی بڑی ذہین آنکھیں بتاتی تھیں کہ باپ سے ناراض اور سوتیلی ماں سے ناخوش ہے۔ جبکہ اس کی چھوٹی بہن جو قریباً سات آٹھ برس کی ہوگی بالکل خاموش اور چپ چاپ تھی۔ اس نے نا صرف بڑی تمیز سے مہمانوں کو خوش آمدید کہا تھا بلکہ بڑی تہذیب سے ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی کھایا تھا۔ کھانے کے بعد وہ ماں کے ساتھ مدد کے طور پہ برتن اٹھا کر کچن میں بھی لے گئی تھی۔ وہ اگر ماں باپ سے خوش نہیں تھی تو کوئی ایسی ناراض بھی نہیں دکھتی تھی کہ یوں احتجاجاً خود کو کمرے میں بند کر کے روٹھ کر بیٹھ جاتی۔

''تابندہ باجی سے کوئی پرابلم ہے؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس بچے سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

''وہ خود ایک پرابلم ہیں۔'' اس نے سر جھٹکا۔ وہ چھوٹا تھا لیکن حساس تھا۔

''یو نو وہ کہتی ہیں کہ مجھے ممی بلا سکتے ہو لیکن یہ مت امید رکھنا کہ میں تمہاری ممی بن کر بھی دکھاؤں گی۔ جو ایسی بات کرے وہ کیا ہماری ماں کی جگہ لے سکتی ہے۔'' بچہ جذباتی تھا اور سمجھ دار بھی۔ وہ کتنی دیر اسے دیکھتی اور الفاظ جمع کرتی رہی کیونکہ اسے تابندہ باجی سے ایسے کسی جملے کی امید نہیں تھی جو اس کی شادی طے ہونے سے لے کر اب تک اس کے سامنے بچھی جاتی تھیں۔

''تم ان سے اچھے بچوں کی طرح ملو تو ہو نہیں سکتا کہ وہ بھی تمہارے ساتھ اچھی نہ ہوں۔''

گو کہ تابندہ باجی کے ایسے جملے پہ اسے افسوس ضرور ہوا تھا لیکن وہ اسے ہی سمجھا سکتی تھی۔ وہ بچہ تھا اسے جس سمت چاہے موڑا جا سکتا تھا۔ پیار اور توجہ سے اس کو سمجھایا جا سکتا تھا۔ اب تابندہ باجی کو تو وہ سمجھانے سے رہی۔

''میں ان کے ساتھ اچھا ہی تھا۔ لیکن وہ اچھی نہیں ہو سکیں۔ جب وہ اچھی نہیں ہو سکیں تو میں کیوں خواہ مخواہ اچھا بنا رہوں۔ اسی لیے میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ میں ان سے دور رہوں گا۔ تبھی ان کے گیسٹ کے ساتھ بیٹھنا بات کرنا مجھے گوارا نہیں۔''

اسے اس بات پہ ہنسی آ گئی کہ وہ انھی کے گیسٹ سے اب اپنا حال دل بیان کر رہا تھا۔

''کوئی بے شک ہمارے ساتھ اچھا نہ ہو، یہ اس کا عمل ہے نا۔ لیکن ہمیں تو اس کے ساتھ اچھا رہنا چاہیے۔ اگر تمہاری اپنی ممی ہوتیں تو انھیں برا نہ لگتا کہ تم کسی بڑے کے ساتھ ایسے بی ہیو کر رہے ہو۔ گھر آئے مہمانوں کے ساتھ یہ سب کرنا وہ پسند کرتیں کیا؟'' وہ خاموش ہو گیا تھا اور جب بات اسے سمجھ آئی تو اس نے سر ہلایا۔

''انہیں برا لگتا۔'' اس کی آواز مدہم تھی۔

''تو پھر......؟'' وہ اب اسے دیکھ رہی تھی۔

''سوری۔ میں رات کا کھانا آپ لوگوں کے ساتھ کھاؤں گا۔'' وہ مسکرا دی۔ تھا تو وہ بچہ ہی چاہے جتنا بھی ناراض ہوتا۔ اس نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

''فرینڈز۔'' وہ حیران سا اس کے بڑھے ہاتھ کو اور پھر اسے دیکھنے لگا پھر خفیف سا مسکرایا اور ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''فرینڈز۔'' سر ہلا کر وہ اب کھل کر مسکرایا تھا۔ تبھی باہر سے انزلہ نے آ کر چائے بن جانے کی اطلاع دی تھی اور وہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔

یہ اس کی انس سے پہلی ملاقات تھی۔

☆☆☆

رات کھانے کی میز پہ وہ شرافت سے انزلہ کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو سر جھکائے اپنی پلیٹ میں سب ڈالتا ہوا خاموشی سے کھا رہا تھا۔ تابندہ باجی نے بچوں کو کوئی ایک چیز بھی آفر نہیں کی تھی البتہ ہر ڈش وہ اپنے شوہر اور ان کے سامنے ضرور کر رہی تھیں۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ وہ ان کی ماں نہیں بلکہ باپ کی

بیوی ہی ہے جسے تابندہ باجی کا رویہ ثابت کر رہا تھا۔
کھانا کھا کر دونوں بچے برتن سمیٹ کر کچن میں رکھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ مرد حضرات اپنی محفل جمائے ٹی وی کے سامنے بیٹھے حالت حاضرہ پہ گفتگو کرنے لگے اور وہ تابندہ باجی کے ساتھ ان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔
''بچے آپ سے مانوس نہیں لگتے؟'' اس نے سرسری سا پوچھا تھا۔ تابندہ باجی کو تو شاید موقع چاہیے تھا کہ شروع ہو گئیں۔
''بس کیا بتاؤں یار۔ بہت ہی عجیب بچے ہیں۔ پہلے دن سے ہی ان کے دل میں میرے خلاف بغض ہے کہ میں ان کی دوسری ماں ہوں، ان کے باپ کی دوسری بیوی اور ایک ظالم جادوگرنی۔ انہوں نے مجھے قبول ہی نہیں کیا۔ مجھ سے کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں۔ کوئی بات نہ سنتے ہیں نہ مان کر دیتے ہیں۔ پتا نہیں ان کی ماں نے ان کی ایسی تربیت ہی کی تھی یا اس کی بیماری اور وفات سے ایسے ہو گئے ہیں۔'' ہو سکتا ہے کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ وہ خاموشی سے انہیں سنتی رہی۔
''بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں نا باجی۔ پھر ان کی ماں فوت ہوئی تھی تو ٹوٹ گئے تھے۔ آپ بڑی تھیں، انہیں جوڑ لیتیں۔ توجہ دیتیں تو کیا خبر وہ آپ سے اٹیچڈ ہو جاتے۔'' وہ نرمی سے کہنے لگی تو تابندہ باجی کا منہ بن گیا۔
''جب وہ مجھے کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے تو میں کیوں خواہ مخواہ انہیں اہمیت دیتی، سر پہ بٹھاتی۔ نخرے ہیں تو نخرے ہی سہی۔ میں تو علی کے ساتھ خوش ہوں۔ مجھے کیا پڑی ان کے آگے پیچھے پھرنے کی۔'' اس نے گہری سانس بھری۔
تابندہ باجی کا ہی ظرف چھوٹا تھا ورنہ ذرا سی محنت سے وہ ان بچوں کو اپنا بنا سکتی تھیں۔ انہوں نے ہی ان پہ سر کھپانا مناسب نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی انہیں پروا تھی کہ وہ ان سے قریب ہوتے ہیں یا باغی ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے یہی بہت تھا کہ ان کا شوہر ان کے قابو میں ہے۔
''اس عمر میں نجانے ان کی اپنی اولاد ہوتی بھی ہے کہ نہیں۔ کیا ہو جاتا اگر وہ شوہر کی اولاد کو ہی اپنا بنا لیتیں۔'' ان کے کمرے سے نکلتے ہوئے اس کے دل میں ملال سا تھا۔

☆☆☆

''تم دونوں اپنے کمرے سے نہیں نکلتے کیا؟''
اگلے دن وہ ناشتے کے بعد بچوں کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ انزلہ اپنی ویڈیو گیم کھیل رہی تھی اور انس کوئی کتاب کھولے بیٹھا تھا۔ دونوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو سامنے کھڑی ایک مہربان مسکراہٹ لیے انہیں دیکھ رہی تھی۔
''آپ کی باجی نے ہمیں منع کیا ہے کہ جب تک آپ یہاں ہیں ہم اپنے کمرے میں ہی رہیں۔'' وہ تلخی سے بولا اور سر پھر سے کتاب میں دے دیا۔
وہ جب بولتا تھا اس کے لب و لہجے سے بغاوت چھلکتی تھی۔ اس کی نسبت انزلہ خاموش طبع اور تابعدار سی تھی۔ اکثر ماؤں کے جانے کے بعد بیٹے اسی طرح اکھڑ مزاج سے ہو جاتے ہیں اور بیٹیاں خاموش اور حساس سی۔
''چلو مل کر کوئی گیم کھیلتے ہیں۔ میں بور ہو رہی تھی۔'' اس نے دوستانہ انداز اپنایا۔ اس کا دل ان بچوں کے لیے نرم پڑ رہا تھا۔ وہ اندر سے مانتی تھی کہ تابندہ باجی غلط کر رہی ہیں۔ انہیں بن ماں کے بچوں کے ساتھ ایسا رویہ نہیں رکھنا چاہیے تھا جو ماں سے ابھی ابھی محروم ہوئے تھے اور کسی روپ میں ممتا کو تلاش کر رہے تھے۔ لیکن کہنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اس کی نند تھی۔ پھر اس کی تو ابھی نئی نئی شادی تھی۔ ابھی اسے اپنے قدم جمانا تھے۔
''آپ ہمارے ساتھ کھیلیں گی تو ممی ناراض ہوں گی۔'' انزلہ گھبرا کر اسے دیکھنے لگی جو سامنے ریک میں پڑی ان کی ان ڈور گیمز کا جائزہ لے رہی تھی۔

''انہیں ممی مت کہا کرو۔ ہزار بار کہا ہے کہ وہ ہماری ممی نہیں ہیں۔'' انس دبے دبے غصے سے چلایا تھا۔ انزلہ بے چارگی سے بھائی کو دیکھ کر دبک گئی۔

''بری بات۔ وہ تم لوگوں کی ممی ہی ہیں۔ تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے کچھ نہیں ہوتا۔''

وہ اب ان کے ریک میں سے لڈو نکال لائی تھی کہ وہ تینوں کھیل سکیں۔

''آپ کے کہنے یا نہ کہنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا جب وہ خود نہیں مانتیں تو......'' وہ چڑ کر کہہ رہا تھا۔ وہ لاجواب ہو گئی تھی۔

''اچھا کیا اب ہم یونہی لڑتے رہیں گے۔ میں تم دونوں کے ساتھ کھیلنے آئی ہوں۔'' اس نے بات کو بدلنا چاہا۔

''لیکن ممی......'' انزلہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ شاید وہ اسے سمجھانا چاہتی تھی کہ اس کا یہاں بیٹھ کر کھیلنا انھیں ڈانٹ پڑوا سکتا ہے لیکن بھائی کے گھورنے پہ وہ خاموش ہو گئی تھی۔

لڈو کی گوٹیاں سیٹ کرنے کے بعد اس نے ان دونوں کو ایک نرم مسکراہٹ سے خوش آمدید کہا۔ انزلہ جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ پس و پیش کے بعد وہ بھی اٹھ کر کھیلنے آ گیا تھا۔

گھنٹے بعد جب تابندہ باجی اسے ڈھونڈتی ہوئیں ان کے کمرے میں آئی تھیں تو وہ تینوں ساتھ ایسے گھل مل گئے تھے جیسے عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ بچے خوش تھے، ہنس رہے تھے اور صلہ نجانے انہیں کون سے جہاں کی کہانیاں سناتے ان کے ساتھ بالکل بچی بن گئی تھی۔

''تم یہاں ہو اور میں کب سے سمجھ رہی ہوں کہ تم شاہد کے ساتھ مارکیٹ چلی گئی ہو۔'' ان کے چہرے کے تاثرات ان کی ناگواری چھپانے میں ناکام رہے تھے۔ اس کا یہاں ہونا انہیں بہت برا لگا تھا۔

''آئیں نا باجی۔ بہت مزا آ رہا ہے بچوں کے ساتھ۔'' اس نے کھلے دل سے انہیں بھی شمولیت کی دعوت دی تو انھوں نے نخوت سے سر جھٹکا۔

''اتنا فالتو وقت نہیں ہے میرے پاس۔ ابھی دوپہر کا کھانا بھی بنانا ہے۔ تم اب اٹھو یہاں سے اور مجھے بھی تھوڑی کمپنی دے دو۔ مہمان میری ہو یا ان کی۔ ویسے بھی دوسروں کے بچوں کو اتنا سر پہ نہیں بٹھانا چاہیے کہ وہ آپ کو ہی گرا دیں۔'' ماتھے پہ سلوٹیں ڈالے وہ شکوہ کیے بنا رہ نہیں سکی تھیں۔ جاتے ہوئے دروازہ ٹھا سے مارا تو صلہ کو بھی غصہ آ گیا۔

بچے بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ انس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ انزلہ سہم کر سر جھکائے اپنی لڈو سمیٹ رہی تھی۔ اتنا وقت لگا کر اس نے بچوں پہ جو محنت کی تھی سب اکارت ہو گئی۔

''کہا تھا نا کہ انہیں برا لگے گا آپ کا یہاں آنا۔'' تابندہ باجی کے جاتے ہی انس نے دھونکنی جیسی چلتی سانس کو قابو میں کرنے کی کوشش کی جو کہ اس کے غصے کی گواہی دے رہی تھی۔

صلہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر اسی نرمی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ریلیکس انس۔ کچھ نہیں ہوا ایسا۔ انہیں اچھا لگے یا برا، مجھے تم لوگوں کے ساتھ بہت اچھا لگتا ہے۔ اس لیے میں بالکل بھی ان کی پروا نہیں کرنے والی۔ میں پھر آؤں گی اور ہم کوئی اور مزیدار سی گیم کھیلیں گے۔'' انس کا پارہ یکدم نیچے آ گیا تھا۔

''لیکن آپ ان کی گیسٹ ہیں۔''

''تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں وہی کروں جو وہ چاہتی ہیں۔ میں تو وہ کروں گی جو میرا دل چاہتا ہے۔'' وہ مسکرا دی اور اس کا ہاتھ چھوڑ کر اٹھ گئی۔

''تو کون سی گیم پسند ہے تم دونوں کو جو اس کمرے سے باہر نکل کر کھیلی جائے؟''

''بھائی بیڈمنٹن بہت اچھی کھیلتا ہے۔'' انزلہ جھٹ سے بولی۔ انس نے اسے گھورا۔

''اوکے۔ ڈن۔ شام کو باہر صحن میں بیڈمنٹن کھیلتے ہیں۔'' اس نے شرارت سے آنکھ دبائی۔ انزلہ کا چہرہ کھل اٹھا اور انس بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"یہ آنٹی کتنی اچھی ہیں نا بھائی۔" وہ جا چکی تھی۔ انزلہ نے انس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بس چپ چاپ اس دروازے کو دیکھے گیا جہاں وہ غائب ہوئی تھی۔

☆☆☆

شام میں بیڈمنٹن کے میچ میں ان تینوں کے ساتھ ساتھ علی بھائی اور شاہد بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس نے تھوڑی دیر کھیل کر ریکٹس شاہد کے حوالے کر دیے تھے۔ انس بہت اچھا کھلاڑی ثابت ہو رہا تھا اور اس کے ہر شاٹ پہ انزلہ خوشی سے تالیاں بجاتے اسے داد دیتی تھی۔ جب بھی وہ میچ جیت جاتا تو سامنے کین کی کرسیوں پہ بیٹھی صلہ کی جانب دیکھتا جو دونوں ہاتھ کے انگوٹھے ہوا میں لہرا کر اسے داد دیتی۔ وہ سر پہ پی کیپ جمائے، بالوں کی اونچی سی پونی ٹیل بنائے، دوپٹے کو کمر کے گرد باندھ کر بالکل چھوٹی سی بچی لگ رہی تھی۔ یوں بھی وہ شاہد سے آٹھ سال چھوٹی تھی۔ کم عمری میں ہی ابو نے اس کی شادی کر دی تھی کیونکہ ان کے مطابق بیٹیوں کو وقت سے اپنے گھر کا ہو جانا چاہیے۔ شاہد ابو کے ایک دوست کا بیٹا تھا جو ساہیوال میں رہتے تھے۔ بہت شریف خاندان تھا۔ گو کہ مالی اعتبار سے ان کے ہم پلہ نہ تھا پھر بھی ابو کو اس خاندان کی شرافت نے متاثر کیا جو انہوں نے بی اے سے فارغ التعلیم صلہ کا رشتہ جھٹ قبول کر لیا تھا۔

"بچے کتنے خوش ہیں نا؟" علی بھائی اس کے ساتھ والی کرسی پہ آ کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ پانی کی بوتل منہ سے لگائے پانی پیتے ہوئے سر ہلا گئی تھی۔

"صرف آپ کی وجہ سے۔" وہ کچھ حیران ہوئی اور ان کی جانب دیکھا جو بچوں پہ ہی نظریں جمائے ہوئے تھے۔

"اپنی ماں کی وفات کے بعد پہلی بار میں نے انہیں یوں کھل کر مسکراتے اور ہنستے دیکھا ہے۔"

وہ بھی اب بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ شاہد اور انس کی گیم میں انس ایک بار پھر سے جیت رہا تھا۔ اس کے ہر انداز سے اس کی خوداعتمادی جھلک رہی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ تابندہ ان کی ماں نہیں بن سکی حالانکہ یہ شادی تو میں نے اپنے بچوں کے لیے کی تھی۔" ان کے لہجے میں دکھ تھا۔ صلہ کو افسوس ہوا۔

"وہ اچھی بیوی ہے لیکن اچھی ماں۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے تھے۔

"کاش کہ ان کو آپ جیسی کوئی ماں ملی ہوتی جو انہیں سنبھال لیتی۔" ان کی بات پہ وہ بری طرح چونکی تھی۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے لیکن ان کے لہجے اور آنکھوں سے چھلکتا دکھ وہ محسوس کر رہی تھی۔ نجانے ان کی آخری بات کا کیا مطلب تھا۔ وہ الجھ سی گئی۔

مغرب تک وہ باری باری مختلف میچز کھیلتے رہے تھے۔ مغرب سے پہلے تابندہ نے باہر نکل کر بڑوں پہ رعب جماتے ہوئے انہیں اندر چلنے کے لیے کہا اور بچوں کو کچھ ڈپٹ کر ان کے کمرے کی طرف بھیجا۔

"آج کے سارے میچز کا ونر میں رہا ہوں۔" جاتے جاتے ریکٹ وہیں کین کی کرسی پہ ڈالتے ہوئے اس کے قریب سے گزرتے انس نے اسے جتایا تھا۔

"مجھے تم پہ فخر ہے۔" اس نے اس کا شانہ تھپکا تو وہ یکدم جیسے کھل اٹھا تھا۔ علی بھائی نے مسکراتے پراعتماد بیٹے اور اس لڑکی کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

"آپ کو بچوں پہ توجہ دینا چاہیے تابندہ باجی۔ وہ دونوں بہت قابل اور حساس بچے ہیں۔ محبت کے بھوکے اور توجہ کو ترسے ہوئے۔ یقین جانیں اگر کچھ دن آپ یہ کریں گی تو وہ آپ کو اپنی ماں کا درجہ ہی دینے لگ جائیں گے۔" رات وہ دونوں ٹی وی پہ کوئی پروگرام دیکھتے ہوئے کافی کے کپ انجوائے کر رہی تھیں جب تابندہ نے اسے تھوڑا گھر کا تھا۔

"کیا ضرورت ہے بچوں کو اتنا سر چڑھانے کی۔ تم یہاں میری مہمان ہو، مجھے ٹائم دینے کے

بجائے تم ان کے ساتھ ٹائم گزارتی ہو۔ انہیں اتنی اہمیت مت دو۔ وہ اس قابل نہیں ہیں۔"

تبھی اس نے نرمی سے انھیں ایک بار پھر سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے اتنا سر کھپانے کی ان کے ساتھ۔ نہیں بھی ماں کا درجہ دیتے تو کیا ہوا؟ میں کون سا ان کی محبت کو ترس رہی ہوں۔" بڑی لاپروائی سے انہوں نے شانے اچکاتے ہوئے کہا تو صلہ کو نئے سرے سے افسوس ہوا تھا۔

"لیکن علی بھائی بھی ایسا ہی چاہتے ہیں کہ بچوں کو ماں کی محبت ملنا چاہیے۔ انہیں آپ سے بہت امیدیں تھیں۔ آپ کو ان امیدوں پہ تو تم از کم پورا اترنا چاہیے۔" اس کی بات پہ وہ چونکی تھیں۔

"تم سے علی نے کچھ کہا ہے۔؟" وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ علی بھائی سے کوئی جرح کریں۔ اس کی وجہ سے میاں بیوی کے آپسی تعلقات خراب ہوں۔ اسی لیے اسے اب کوئی بات ایسی بنانا ہی تھی جو انھیں مطمئن کر سکے۔

"انہوں نے مجھ سے کیا کہنا تھا۔ مجھے ان کے انداز سے لگا کہ وہ چاہتے ہیں کہ آپ ان کے بچوں پہ توجہ دیں۔ آخر ہر باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد خوش رہے۔ شام میں جس طرح بچے اتنا خوش اور مطمئن تھے وہ ایسا ہمیشہ رہیں تو کتنا ہی اچھا ہو۔" جواباً وہ خاموش رہی تھیں۔

☆☆☆

پورا ہفتہ وہ تابندہ باجی کے گھر رہی تھی۔ بچوں اور اس کے درمیان بہت بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اپنی ماں کی بہت ساری باتیں وہ اس سے کرتے تھے۔ اپنے اندر کے بہت سے راز وہ اسے بتا چکے تھے۔ جب اس کے جانے کا وقت ہوا تو دونوں ہی بہت اداس تھے۔

"آپ پھر کب آئیں گی؟" انزلہ اس کی گود میں چڑھ کر بیٹھی تھی۔

"جلد۔" حالانکہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اب اس کا اگلا چکر کب لگے گا لیکن ان کی تسلی کے لیے اسے کہنا ہی پڑا۔

"اگر آپ جلدی نہ آئیں تو ہم آپ سے ناراض ہو جائیں گے۔" وہ ہولے سے مسکرا دی اور انس کو دیکھا جو کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔

"ہم آپ کو بہت مس کریں گے۔" انزلہ نے اس کا گال چھوتے ہوئے کہا تو صلہ نے بھی اس کا گال چوم لیا۔

"میں بھی جانی۔" انس خاموش تھا۔ خاموشی سے ہاتھ میں پکڑی بال کو گھما رہا تھا۔ سر اس نے جھکا رکھا تھا۔ وہ بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم کچھ نہیں کہو گے لڑکے؟" اس نے جھکا سر اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں ضبط سے سرخ پڑ رہی تھیں۔ صلہ کو بہت پریشانی سی لاحق ہوئی۔

"میں آپ کو مس نہیں کروں گا کیونکہ میں آپ کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔" وہ کچھ دیر کو بالکل بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

"میں بھی تم دونوں کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

"کاش کہ میں آپ کو روک سکتا۔" اس نے اس کی نظروں میں دیکھتے ہوئے کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ وہ چونکے بنا رہ نہیں سکی تھی۔

"مجھے تو جانا ہی ہے نا۔"

"وہاں ایسا کیا ہے جو یہاں نہیں ہے۔ کیا یہاں نہیں رہا جا سکتا؟" وہ اس کی بچکانہ باتوں پہ ہنس دی تھی۔

"وہاں میرا گھر ہے۔"

"گھر تو یہ بھی آپ کا ہو سکتا ہے۔ آپ ایک بار کہیں تو۔" صلہ نے پھر سے چونک کر، الجھ کر اسے دیکھا تھا۔

"ابھی تم بچے ہو۔ ایسی باتیں بچے نہیں کیا کرتے کیونکہ بچے بہت سی باتوں کو نہیں سمجھتے۔ جب تم کسی قابل ہو جاؤ گے تو سب سمجھ جاؤ گے اور پھر تم ایسی باتیں نہیں کرو گے۔"

"پلیز مت جائیں۔ پلیز۔" وہ اٹھی تو اس نے

یکدم اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھیں نمکین پانی سے چمک رہی تھیں۔
وہ بالکل سن سی ہو گئی تھی۔ پھر خود کو کمپوز کر کے اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا تھا۔
''انس۔ تم بہت اچھے اور بہادر بچے ہو۔ اور اچھے بہادر بچے یوں نہیں کیا کرتے۔ وہ بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ وہ ہر قسم کے حالات سے لڑ سکتے ہیں۔ وہ سب باتوں کو سہہ سکتے ہیں۔ وہ ہر مشکل کا مقابلہ کرتے ہیں اور کبھی کمزور نہیں پڑتے۔ دنیا انہی کو پسند کرتی ہے جو بہادر ہو، مضبوط ہو اور تمہیں ایسا ہی بننا ہے۔ تمہیں اپنے ساتھ اپنی بہن کا بھی خیال رکھنا ہے۔ اچھا سا پڑھنا ہے۔ بہت کامیاب ہونا ہے۔ جیسے تم نے بیڈمنٹن میں کسی کو جیتنے نہیں دیا اسی طرح تم زندگی میں سب جگہ ہی کسی کو جیتنے نہیں دو گے۔ تم ہر مقام پہ کامیاب ہو گے۔ سمجھ رہے ہو نا۔'' اس نے سر ہاں میں ہلایا تو صلہ نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔
☆☆☆
وہ گھر لوٹ آئی تو بھی کتنے دن اس کے نمبر پہ انس میسج کرتا رہتا تھا۔
''میں آپ کو بھول نہیں پا رہا۔''
''ممی کے بعد مجھے پہلی بار کسی نے اتنا سمجھا ہے، اس طرح پیار دیا ہے۔''
وہ سمجھ سکتی تھی کہ ایک ماں کی محبت کا ترسا ہوا چھوٹا سا لڑکا جو لڑکپن کی دہلیز پہ کھڑا تھا، کسی بھی عورت کی توجہ اور محبت پا کر ایسی باتیں کر سکتا تھا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس عمر کے اکثر بچے ایسی کیفیت کا شکار ہو جاتے ہیں جو جذباتی کیفیت ہوتی ہے اور وقت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ انس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ اس کی توجہ کو کوئی اور رنگ دینے لگا تھا حالانکہ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وقت کے ساتھ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن اسے افسوس تھا کہ کاش یہی توجہ اور پیار تابندہ باجی نے اسے دیا ہوتا تو وہ انہیں کتنا مان اور محبت دیتا۔ ان کا کتنا احترام کرتا۔ سچ مچ ان کا بیٹا بن کر دکھاتا اور پھر اس کی اپنی شخصیت ایک تناور درخت کی طرح پروان چڑھتی لیکن افسوس کہ تابندہ باجی بہت ہی کم ظرف نکلی تھیں۔
''میں آپ کو بہت پسند کرنے لگا ہوں۔ میرا آپ کے بنا بالکل دل نہیں لگتا میں کیا کروں۔''
وہ بالکل سن ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اس کے کسی میسج کا جواب نہیں دے رہی تھی لیکن اب اسے سمجھانا ضروری ہو گیا تھا۔
''میں بھی تمہیں بہت پسند کرتی ہوں انس کیونکہ تم ہو ہی اتنے اچھے بچے۔ لیکن ابھی تم بچے ہو۔ اس لیے ایسی باتیں کر رہے ہو۔ جب بڑے ہو جاؤ گے تو سب سمجھ جاؤ گے اور پھر تم ایسا کبھی محسوس نہیں کرو گے۔ یہ سب وقتی جذبہ ہے۔ وہ سب یاد کرو جو میں نے آتے ہوئے کہا تھا کہ تمہیں خود کو مضبوط بنانا ہے۔ بہادر بننا ہے۔ کامیاب ہونا ہے۔ قابل بننا ہے۔ اتنا قابل کہ سب تم پہ رشک کریں۔ مجھے بہت خوشی ہو گی جب تم ایسے بن جاؤ گے تو۔ بلکہ یقین جانو سب سے زیادہ خوشی مجھے ہی ہو گی۔''
اور بس یہ آخری میسج اس نے کیا تھا اور اس کے بعد اس نے اپنا نمبر بدل دیا تھا۔ اس کے بعد دس سال کا عرصہ بیت گیا تھا۔ نہ کبھی اس کا تابندہ باجی کے گھر جانا ہوا اور نہ ہی انس سے سامنا ہوا۔ تابندہ باجی بھی جب بھی آئیں بچوں کے بغیر ہی آئیں۔ وہ کبھی نہیں جان سکی کہ انس اور انزلہ کیسے ہیں۔ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اپنی زندگی کے مسائل نے ہی اتنا پاگل کر دیا تھا کہ کسی اور کے بارے میں سوچنے کا تو وقت ہی نہیں تھا۔
☆☆☆
پھر دس سال بعد وہ اسے پھر سے دکھائی دیا تھا۔ اپنے دیور کی شادی پہ جب وہ ساہیوال گئی تھی تو مہندی کی تقریب میں جب وہ گوٹے کناری والے لہنگے سے الجھتی، ایک ہاتھ میں فضا کا ہاتھ تھامے، دوسرے سے فہد کو پکڑے گھر کے برابر لگے ٹینٹ میں داخل ہو رہی تھی تو ایک کسرتی بدن والے، خوش شکل

لڑکے نے اسے سلام کیا تھا۔
اس نے تعجب سے اسے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی۔ چہرہ دیکھا دیکھا لگتا تھا لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھ رکھا ہے۔
''سوری میں آپ کو پہچان نہیں سکی۔'' ان دس سالوں میں وہ کم کم ہی سسرال گئی تھی۔ اس لیے دور پار کے رشتے داروں کو تو بالکل بھی نہیں پہچانتی تھی۔
''ظاہر ہے دس سال گزر گئے۔ آپ اب مجھے کہاں پہچانیں گی۔'' اس کے چہرے پہ ایک نرم تاثر کے ساتھ عجیب کرب سا تھا جو صلہ کو جانا پہچانا لگا۔ وہ لہجہ طنزیہ نہیں تھا لیکن شاید اس کے اندر ہی کچھ تھا جو اسے لگا وہ اس سے جواب مانگ رہا ہے۔
''انس علی۔ آپ کی تابندہ باجی کے شوہر کا بیٹا۔'' وہ وہیں ٹھٹک کر رک گئی تھی۔
سفید شلوار قمیص میں ملبوس، گلے میں میرون اجرک کا دوپٹا لیے، پشاوری چپل پہنے وہ کہیں سے بھی دس سال پرانا انس نہیں تھا۔ یہ انس تو اس روتے بسورتے انس کی پرچھائی بھی نہیں لگتا تھا۔ اتنا پر اعتماد، مضبوط اور پرکشش شخصیت کا مالک۔ وہ لمحہ بھر کو اسے دیکھتی ہی رہ گئی جواب فہد کو گود میں لیے پیار کر رہا تھا۔ اتنے سال بیت گئے تھے اب تو۔ اسے تو یقیناً یاد بھی نہیں رہا ہوگا۔ تب تو وہ ایک معصوم سا، نادان سا بچہ تھا جواب باشعور سے نوجوان میں ڈھل گیا تھا۔ تب وہ چھوٹی موٹی سی لڑکی تھی جسے دس سال بعد دو بچوں کی پیدائش اور کٹھن حالات نے ایک فربہی مائل خاتون میں بدل دیا تھا۔ اب تو وہ اس قابل بھی نہ تھی کہ کوئی اسے ایک نظر بھی دیکھتا۔ کہاں وہ اتنا ڈیشنگ سا لڑکا اسے یاد رکھے ہوئے ہوگا۔
اپنی سوچ جھٹک کر وہ جلدی سے فضا کو لے کر اندر بڑھ گئی۔ اپنی پشت پہ اسے کسی کی نظروں کی تپش محسوس ہو رہی تھی اور پھر سارے مہندی کے فنکشن میں وہ انہی نظروں کی تپش محسوس کرتی رہی تھی۔ جب وہ اس کی طرف دیکھتی تو وہ اپنے ہی کسی کام میں مصروف ہوتا تھا۔ ایک بار بھی وہ اسے اپنی جانب دیکھتا نہیں پایا گیا۔
''یونہی میرا وہم ہے۔ شاید گلٹ ہے میرا جو مجھے اس کی موجودگی میں ایسا محسوس ہو رہا ہے۔'' اپنے آپ پہ ہی ہنس دی تھی۔ اپنی سوچ کو جھٹک کر اس نے پھر فنکشن پہ ہی توجہ مرکوز رکھی تھی۔
شادی کے دیگر فنکشنز میں بھی اسے یہی لگتا تھا کہ وہ اسے نظروں کے حصار میں رکھے ہوئے ہے لیکن ایک بار بھی اس نے اسکو اپنی جانب دیکھتے ہوئے نہیں پایا تھا۔ ہاں وہ فنکشنز کے دیگر کام نبٹا رہا تھا۔ اس کے بچوں کو بھی اٹھا رہا تھا، ان سے باتیں کر رہا تھا، باقی لوگوں سے بھی ہنس بول رہا تھا لیکن اس کی طرف تو کبھی دیکھتا نہیں پایا گیا۔
نجانے کیوں اندر سے ایک خوف سا لاحق تھا کہ گر وہ رستے میں کھڑا ہو کر یہ پوچھنے لگ جائے کہ نہ بھولنے کا وعدہ کیا ہوا تو وہ کیا کہے گی۔ کیا کیا عذر تراشے گی۔ کون سی مصروفیت بیان کرے گی۔ لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ اسے یقیناً وہ بھول بھال گئی تھی۔ بچپن میں کئی لڑکے ایسے ہی اپنی سے بڑی عمر کی لڑکیوں پہ فدا ہو جاتے ہیں۔ کچی عمر کی نادانیاں تو ہر کوئی کرتا ہے۔ دس سال بعد تو کسی کو یاد بھی نہیں رہتا کہ ایسا کچھ ہوا بھی تھا۔ پھر اس نے کون سا کسی غلط نیت سے ان سے ہمدردی جتائی تھی۔ وہ تو بن ماں کے بچوں کو تھوڑی بہت توجہ ہی دے رہی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس توجہ دینے میں وہ لڑکا کسی دوسرے رستے پہ ہی نکل گیا تھا۔
گھر آ کر شاہد نے سرسری ساذکر کیا تھا۔
''علی بھائی کا انس کتنا فرمانبردار بچہ ہے۔ سوچ رہا ہوں نرجس کی شادی جلدی نہ کی ہوتی تو اس کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔'' وہ اپنی ایک بھتیجی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
''ہاں کافی سمجھ دار ہو گیا ہے۔'' صلہ نے بھی واجبی سا جواب دیا۔
''ماشاء اللہ انجینئر بن گیا ہے اور بہت اچھی نوکری بھی مل گئی ہے ایک کمپنی میں۔ علی بھائی بتا رہے

تھے کہ ہمیشہ کلاس میں ٹاپ کرتا رہا ہے۔ بیڈمنٹن کا تو چیمپئن بن چکا ہے۔ نیشنل لیول پہ میچز بھی کھیلنے لگا ہے اور پڑھائی کے ساتھ کوئی آن لائن کام بھی کرتا رہا ہے۔"

"ماشاء اللہ۔" اس نے سراہا اور بات ختم ہو گئی۔

اور اب۔ ٹھیک دو مہینے بعد اسے کسی انجان نمبر سے میسج ملا تھا۔

"انس علی۔" اور ساتھ ہی دوسرا میسج۔ پھر تیسرا۔

"یہ وقتی جذبہ نہیں تھا۔ کیونکہ وقت گزر گیا لیکن جذبات اب بھی وہیں ہیں۔" وہ شاکڈ سی رہ گئی تھی۔

وہ بالکل بھی امید نہیں کر رہی تھی کہ دس سال بعد وہ ایک مضبوط، بھرپور شخصیت کا ایک کامیاب لڑکا بن کر اس کے سامنے کھڑا پھر سے وہی بات دہرا رہا ہو گا۔ دس سال کافی طویل مدت تھی کسی کو بھول جانے میں۔ کسی وقتی جذبے کو ختم ہو جانے میں۔ کسی بھی بے وقوف سے خیال کو خواب ہو جانے میں۔ کسی بھی سحر سے نکل آنے میں۔ لیکن وہ تو اب بھی وہیں کھڑا تھا۔

اب وہ کیا کرے۔ کیا جواب دے۔ کس سے بات کرے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنا موبائل بند کر دیا اس ڈر سے کہ وہ اسے کال نہ کرنے لگ جائے۔

☆☆☆

وہ کب تک موبائل بند رکھتی۔ اسے کبھی تو موبائل آن کرنا ہی تھا۔ کب تک کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے بیٹھ سکتی تھی۔

موبائل آن ہونے کی دیر تھی کہ میسجز کا ایک طوفان تھا۔

"یہ وقتی جذبہ نہیں تھا۔ مان جائیں کہ میری محبت وقت کے ساتھ زیادہ ہی ہوئی ہے، کم نہیں۔"

اس نے اپنا سر تھام لیا تھا۔

"میں بالکل ویسا بن گیا ہوں جیسا آپ نے سمجھایا تھا۔ اب تو میں آپ کے قابل ہوں نا یا اب بھی نہیں ہوں۔"

"میں شاہد صاحب سے تو حد درجے بہتر ہی ہوں۔ یقین جانئے ان سے کہیں گنا خوش رکھ سکتا ہوں آپ کو۔ بس ایک بار آپ ہاں کر دیں۔"

وہ کیسے سمجھاتی اس لڑکے کو کہ وہ جو باتیں کر رہا ہے وہ ناممکنات میں سے ہے۔

"میں سب جانتا ہوں کہ آپ کے اور آپ کے شوہر کے درمیان کیا تعلق ہے۔ وہ آپ کو ایک طلاق تک دے چکے ہیں میں جانتا ہوں۔"

صلہ خود حیران تھی کہ وہ اتنے سال اس سے کتنا ناخبر رہا تھا کہ سب جانتا تھا۔

"میں آپ کے بچوں کو اپناؤں گا۔ اس سے اچھی ان کی تربیت کروں گا جو ان کا باپ نہیں کر سکا۔ مجھے آپ کی عمر شمر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں سب کچھ اپنانے کے لیے تیار ہوں۔ نہ مجھے لوگوں کی پروا ہے نہ ہی کسی کا خوف۔"

"دیکھو انس۔ تم بالکل دیوانوں سی باتیں کر رہے ہو۔ ایسا ممکن نہیں ہے تم جانتے ہو۔" پہلا میسج اس نے سمجھانے کی نیت سے کیا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے برسوں پہلے وہ اس کی بات سمجھ گیا تھا اب بھی سمجھ جائے گا۔

"کیوں ممکن نہیں ہے۔ کیا رکھا ہے اس شخص میں جو نہ آپ کی ذمہ داری اٹھاتا ہے نہ آپ کے بچوں کی۔ ہر وقت بھکاری بن کر آپ سے، آپ کے فادر سے مانگتا ہی رہتا ہے۔ اسے آپ کی کوئی قدر نہیں ہے اور نہ ہی کبھی کرے گا۔ وہ آپ سے محبت نہیں کرتا تو پھر کیوں اپنی زندگی برباد کر رہی ہیں؟"

"جو بھی ہے میں اب دو بچوں کی ماں ہوں۔ مجھے ان کا سوچنا ہے۔"

"میں بھی انہی کا سوچ رہا ہوں لیکن آپ سمجھ نہیں رہیں۔ جیسے تابندہ بیگم نے ہمیں سنگل پیرنٹ کی اولاد بنا دیا، اس کا بھائی بھی وہی کر رہا ہے۔ اس زندگی پہ آپ کا بھی کوئی حق ہے۔ آپ کو پورا حق ہے

کہ اگر کوئی محبت سے ہاتھ بڑھائے تو اسے تھام لیں۔"

صلہ نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی سب باتیں حقیقی تھیں لیکن وہ کیا کرتی کہ وہ ایک روایتی سوچ کی حامل عورت تھی، ایک ماں تھی، بیوی تھی، کسی کی بیٹی تھی۔ وہ ایسی بغاوت نہیں کر سکتی تھی جیسی وہ چاہ رہا تھا۔ وہ بھلے مضبوط ہوگا، سب سہہ لے گا لیکن وہ یہ سب نہیں سہہ سکتی تھی۔ وہ اتنی مضبوط نہیں تھی۔

☆☆☆

"تمہیں شاہد کو سب کچھ سچ بتا دینا چاہیے صلہ۔ اس سے پہلے کہ اسے بھنک پڑے اور زندگی مزید مشکل ہو جائے۔ تم اپنے شوہر کو اعتماد میں لے کر سب بتا دو۔" جب کسی طور انس سمجھ کر نہ دے رہا تھا اور وہ دن رات پریشان رہنے لگی تھی، ذہنی اذیت اور کوفت کا شکار رہنے لگی تھی تو اس نے سارا معاملہ اپنی ایک کولیگ کے سامنے رکھا جس نے اسے یہ مشورہ دیا تھا۔

"وہ بہت شکی مزاج ہے۔ بات کو نجانے کیا رنگ دے۔ میں تو عجیب مشکل کا شکار ہو چلی ہوں۔" انس کی سب باتوں پہ اعتبار تھا اسے۔ یقیناً یہ کوئی وقتی جذبہ نہ تھا ورنہ کوئی کسی کو دس سال کہاں یاد رکھتا ہے۔ شاہد سے اسے کوئی محبت نہیں رہی تھی۔ اس نے کبھی خود کو اس قابل ثابت ہی کہاں کیا تھا کہ اس سے محبت کی جاتی۔ اس کے لیے وہ اس کے بچوں کا باپ تھا، وہ بھی بس نام کا۔ جو مرد ڈھنگ سے اس کے بچوں کا باپ نہ بن سکا اس سے بھلا کیا محبت کرتی وہ۔ لیکن انس سے بھی اسے لگاؤ نہ تھا کہ اندھی بن کر اس آگ میں کود جاتی۔ اس کے بچے بڑے ہو رہے تھے اور اب اس کی کل زندگی کا محور وہی بچے تھے۔ وہ اب ہر بات ایک ماں بن کر سوچتی تھی۔ ابھی وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے بچوں کا سنبھال لے گا، کل کو مکر جاتا تو وہ کس در پہ جاتی اور کس منہ سے جاتی۔ مرد کم ہی اتنے اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں کہ کسی دوسرے مرد کی اولاد کو اپنا کر اپنا نام دیں اور شفقت بھی۔ پھر اسے اسی دنیا میں رہنا تھا، سانس لینا تھا۔ کیسے دنیا کی باتیں سن کر بہری بن جاتی۔ اپنے سے آٹھ سال چھوٹے لڑکے سے شادی کر کے سب کی انگلیاں خود پہ اٹھنے سے کیسے روکتی۔ پھر کل کو ایک بڑی عمر کی عورت سے شادی پچھتاوا بھی تو بن سکتی تھی۔ پھر وہ اسے چھوڑ دیتا تو وہ کہاں کی رہتی۔؟ اسی لیے جیسے جی رہی تھی، ٹھیک تھا۔

"پھر تو تمہیں سب کچھ خود بتا دینا چاہیے۔ جتنا معاملے کو لٹکاؤ گی اتنا الجھتا جائے گا۔ خود سے بتا دو گی تو اسے یقین آ جائے گا کہ وہ لڑکا ہی تمہیں تنگ کر رہا ہے۔ تمہارا کوئی انٹرسٹ نہیں ہے اس میں۔ خود سے بتاؤ گی تو پہلا سوال ہی یہ ہوگا کہ تم نے اب تک ایسے کیوں نہیں بتایا۔ شاید تم اسے نہیں بتانا چاہتی تھی کیونکہ تم خود بھی انوالو تھی۔" اسے اس بات میں وزن محسوس ہوا تو رات میں شاہد سے بات کرنے کا فیصلہ کر ڈالا۔

☆☆☆

اور پھر اس کے بتانے کی دیر تھی کہ گھر میں پوری کچہری لگ گئی تھی۔

شاہد نے تابندہ باجی اور علی بھائی کے ساتھ ساتھ انس کو بلوا لیا تھا۔ پوری بات سن کر علی بھائی حیران پریشان سے سر جھکائے نادم بیٹھے تھے جبکہ تابندہ باجی نے اندر سالوں کا اندر جمع کیا روایتی نند کا بغض نکالنے کا یہ صحیح موقع جانا تھا۔

"بہت شوق تھا نا اس عورت کو اچھل کود کر کے بچوں کو اپنا گرویدہ بنانے کا۔ اب دیکھ لو نتیجہ۔ اسی لیے بہن منع کرتی تھی کہ پرائے بچوں کو زیادہ سر نہیں چڑھاتے۔" ہاتھ نچا نچا کر وہ کہہ رہی تھیں۔

صلہ ٹکر ٹکر ان کی شکل دیکھ رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

"یہ عورت ہی ہوتی ہے جو مرد کو اشارہ کرتی ہے، شہہ دیتی ہے ورنہ مرد کی کیا مجال اور پھر یہ تو بچہ تھا اس وقت۔ اسی نے آگے پیچھے گھوم کر اسے اپنے پلو سے باندھا ہوگا اور اب ایسی معصوم بنی بیٹھی ہے

میسنی۔"

اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا ایسے الزام پہ۔ اسے تو لگا تھا کہ سب انس کو سمجھائیں گے۔ اسے سمجھیں گے لیکن یہاں تو ساری قصوروار ہی وہ مانی جا رہی تھی۔

"غلط بات مت کریں ممی۔" وہ جو سامنے کھڑا سب سن رہا تھا یکدم بیچ میں بول پڑا۔ اس کے ماتھے کی شکنیں اور سرخ پڑتا رنگ بتاتا تھا کہ وہ کتنا ضبط کر رہا ہے۔ تابندہ کی تو اچھی بھلی بات بھی اسے بری لگتی تھی۔ اور اب تو وہ صلہ کے خلاف منہ بھر بھر کر باتیں کر رہی تھی تو وہ کیسے برداشت کرتا۔

"کیوں کیا غلط کہا ہے میں نے؟ یہ نہیں ہمارے گھر میں جب دیکھو تمہارے کمرے میں گھسی رہتی تھی۔ تمہارا دل بہلا رہی ہوتی تھی۔ تم سے ہمدردی کر رہی ہوتی تھی۔ تو اب ایسی ہمدردیوں کے یہ نتائج تو نکلنا ہی تھے۔"

زہر تھا ان کی زبان میں۔ صلہ کا وجود نیلو نیل ہونے لگا۔

"ہاں کر رہی ہوتی تھی کیونکہ جو کام آپ کو کرنا چاہیے تھا وہ انھوں نے کیا۔ جو پیار ہمدردی آپ کو ہم دونوں سے کرنا چاہیے تھی وہ انہوں نے آ کر کی۔ انہوں نے ہمیں پیار دیا، اعتماد دیا۔ ایک ہفتے میں ہمیں اتنی توجہ دی جو آپ دس سال میں نہیں دے سکیں۔ یہ کام تو آپ کا تھا نا۔ لیکن آپ کیوں کرتیں بھلا۔ کیوں کسی اور عورت کی اولاد کو سینے سے لگاتیں، ماں بنتیں۔ آپ تو بس بابا کی بیوی بننے آئی تھیں اور وہی بنی رہیں۔ ماں کہاں بننا تھا آپ کو۔ اور ماں نہیں بننا تھا نا اسی لیے اللہ نے آپ کو ماں نہیں بنایا۔"

تابندہ کو تو کسی نیزے کی طرح اس کی بات لگی تھی۔ وہ اس کے سامنے کھڑا اسے بے اولادی کا طعنہ دے رہا تھا۔ اس کا مذاق اڑا تھا۔ اتنی ہمت آ گئی تھی اس میں کہ سب کے سامنے وہ اسے باتیں سنا رہا تھا۔

"بکواس بند کرو انی۔" وہ مارنے والے انداز میں اس پہ جھپٹی تھی لیکن انس نے اس کے بازو تھام لیے تھے۔

"یہ سب مجھے بھی کرنا آتا ہے لیکن میری ماں کی تربیت ایسی نہیں تھی۔" تابندہ کا تو مارے ضبط کے برے حال تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ بندوق نکالے اور سارا کارتوس اس کے سینے میں اتار دے۔

"دیکھ رہے ہیں علی آپ؟" اس قدر اہانت پہ شوہر کی طرف لپکی۔

"دیکھ ہی تو رہا ہوں تابندہ بیگم۔ اتنے سالوں سے ایک دیکھنے کا کام ہی تو میں نے کیا ہے۔" وہ تھکے ہارے نادم سے تھے۔

"تو کچھ کہیں گے نہیں؟"

"کہنا ہوتا تو برسوں پہلے تمہیں نہ کہہ چکا ہوتا۔ جب تب تمہیں نہ کہا تو اب اسے کیا کہوں۔؟" اسے پرے دھکیل کر وہ انس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔

"اب تم کیا چاہتے ہو بیٹا! وہ بھی بتا دو۔" تھکا ہارا انسان، باپ بن گیا تھا۔

"جو کچھ بھی انھوں نے کہا ہے ٹھیک کہا ہے۔" اس کا اشارہ صلہ کی طرف تھا۔ "مجھ پہ لگائے سارے الزام درست ہیں۔ یہ سب میں نے کیا ہے۔ لیکن میں انھیں تنگ نہیں کرنا چاہتا۔ جس تنگی کا یہ شکار ہیں اس سے انہیں نکالنا چاہتا ہوں۔"

"تو کون ہوتا ہے ہمارے گھر کے معاملات میں بولنے والا؟" شاہد غصے سے اس پہ جھپٹا تھا۔

"آرام سے بات کریں شاہد صاحب۔ جب انسان گھر کے معاملات کا دنیا کے سامنے تماشا لگاتا ہے تو وہ گھر کے معاملات نہیں رہتے۔ آپ نے چند سال پہلے انہیں ایک طلاق دے کر جو تماشا خاندان کے سامنے بنایا تھا اس سے سب بخوبی آگاہ ہیں۔ جس عورت کو آپ کبھی خوش نہ رکھ سکے، اس کے بچوں کا باپ نہ بن سکے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔" وہ

کونے میں کھڑی سسک رہی تھی۔ شاہد غصے سے پاگل ہوتا اب اس کی طرف بڑھا تھا۔

''گھر کی باتیں باہر والے کر رہے ہیں تو مطلب تو نے ہی سب بتایا ہے نا اپنے یار کو۔ اور اب کیسی معصوم بنی کھڑی ہے۔ کیسے پاک باز بنی مجھے ساری کہانی سنا رہی تھی جیسے تیرا کوئی قصور ہی نہ ہو۔ باجی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ عورت اشارہ دیتی ہے تو مرد کی ہمت ہوتی ہے۔ پہل تو نے ہی کی ہوگی۔ یہ تو بچہ تھا دس سال پہلے۔ تو نے ہی اسے پیچھے لگایا ہوگا۔ دس سال تو ہی اس سے رابطے میں رہی ہوگی۔''

صلہ نے بے یقینی سے سر ہلایا۔ اس کا پورا وجود اپنی ذات کے پرخچے اڑائے جانے پہ کپکپا رہا تھا۔

''قسم لے لیں۔ میں نے کبھی اس سے رابطہ نہیں کیا...... میں تو......'' شاہد کا ہاتھ اٹھ گیا تھا۔

''چپ کر بری عورت۔ حرافہ۔'' انس نے آگے بڑھ کر شاہد کو دھکا دیا تھا۔

''خبردار جو اب اس کی طرف بڑھے تو۔ میں ہاتھ توڑ دوں گا۔''

صلہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے نیچے بیٹھی رو رہی تھی۔ جس چہرے پہ دنیا جہاں کی کالک مل گئی ہو وہ دنیا کو دکھانے کے لائق کہاں رہتا ہے۔

''اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ سمجھے آپ سب۔ کوئی قصور نہیں ہے ان کا۔ دس سال پہلے جو ہمدردی انہوں نے بن ماں کے بچوں کے ساتھ کی اس کو اس قدر گھٹیا رنگ دیں گے آپ لوگ۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے تو واپس آ کر مجھ سے رابطہ ختم کرنے کے لیے نمبر تک بدل لیا تھا۔ ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ سب میری غلطی ہے، میرا قصور ہے۔ انہیں پسند کرنا، ان سے شادی کی خواہش کرنا یہ سب میری طرف سے ہے۔'' وہ صلہ کی طرف مڑا تھا۔ اسے زمین سے اٹھایا تھا جو سسک رہی تھی لیکن اس کے ہاتھوں کو پرے دھکیل دیا تھا۔

''کہا تھا نا میں نے کہ تم جو کہہ رہے ہو وہ نہیں ہو سکتا تو کیوں ضد کی تم نے۔ کیوں میرا گھر برباد کرنے پہ تل گئے؟''

''کون سا گھر؟ کس گھر کی بات کر رہی ہیں آپ؟ یہ گھر جس میں کھڑا یہ شخص آپ کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ آپ ایک بری عورت ہیں۔ آپ کی کسی محنت، کسی وفا شعاری، کسی سمجھوتے کو یہ خاطر میں نہیں لایا۔ نہ اسے آپ سے محبت ہے اور نہ ہی آپ کے بچوں کی پروا ہے۔ یہ ایک دوسرے مرد پہ یقین رکھتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے لیکن یہ اپنی بیوی پہ یقین نہیں کرتا کہ وہ بھی بے گناہ ہو سکتی ہے۔ کس گھر کی بات کر رہی ہیں آپ جس میں ایک طلاق آپ کو یہ دے چکا ہے۔ باقی بھی عمر کے کسی نہ کسی حصے میں دے دے گا۔ جس کے لیے ایک طلاق دینا آسان ہے، باقی دینا کیا مشکل ہے۔ کس گھر کی بات کرتی ہیں جہاں کوئی محبت نہیں، خلوص نہیں، سکون نہیں۔ ایسا ہوتا ہے گھر کیا؟''

صلہ جواباً چلائی تھی۔

''جو بھی ہے جیسا بھی ہے میں اسی زندگی میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کسی دوسرے تیسرے کا ساتھ نہیں چاہیے۔ میرے لیے اب میرے بچے ہی سب کچھ ہیں۔ نہ یہ کچھ ہے اور نہ ہی تم۔ جاؤ یہاں سے۔ مجھے نہیں چاہیے تمہارا کوئی ساتھ، کوئی ہمدردی۔''

اس نے انس کو پرے دھکیلا تھا۔ انس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ جیسے کچھ بول ہی نہیں پا رہا تھا۔

''بہت غلط کر رہی ہیں آپ۔ پچھتائیں گی آپ ایک خلوص انسان کے ساتھ کو چھوڑ کر اس مفاد پرست انسان کا ہاتھ تھام کر۔''

''پچھتائی بھی تو کبھی تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔''

''مت کریں ایسا۔ میں نے دس سال خود کو آپ کے قابل بنایا ہے۔ جو محبت اور اعتماد مجھے آپ نے دیا وہ کوئی نہیں دے سکتا۔ میرے خلوص کی ایسی بے قدری تو مت کریں۔''

''وہ سب ایک ہمدردی تھی جسے تم نے غلط

رنگ دیا۔ کوئی بھی تم سے ہمدردی کرتا تو اس کا مطلب یہ تھا کیا کہ تم اس سے محبت کرنے لگ جاتے۔"

"کسی نے بھی نہیں کی نا سوائے آپ کے۔ کسی نے بھی وہ سب نہیں کہا مجھے جو آپ نے کہا۔ کوئی میرا حوصلہ نہیں بنا۔ آپ کیا ہیں میرے لیے میں کیسے سمجھاؤں۔ کسی منجھدار سے نکالا تھا مجھے آپ نے۔ جینے کا مقصد سکھایا تھا۔ کیسے بھول جاؤں؟" وہ بالکل بے بس سا انسان بنا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"کہا نا مجھے نہیں چاہیے تمہارا ساتھ۔ پھر یہ کیسی زبردستی ہے؟"

اس نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے تھے۔ وہ اس کی منت پہ اتر آئی تھی۔

"میری زندگی کو مزید تماشا مت بناؤ انس۔ اگر کوئی احسان تھا میرا اور تم اسے مانتے ہو تو اس کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ پلیز میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے تم میں۔ تم کیوں نہیں سمجھ رہے آخر؟"

انس کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا تھا۔ دس سال جس محبت کو اس نے ایک خواب کی طرح پالا تھا اس کا اختتام یوں ہونے جا رہا تھا۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ کاش کسی طرح وہ مان جاتی لیکن وہ اس سے بھی زیادہ بضد تھی اسے ٹھکرانے کے لیے۔ اس کا پہلا پیار، پہلی محبت کا انجام اسے رلا رہا تھا۔

وہ کتنی دیر اس کے بندھے ہاتھوں اور روتی ہوئی صلہ کو دیکھتا رہا۔

"چھوڑ دیا۔ خوش رہیں آپ۔" بڑی دقت سے کہا تھا۔ ایسا کہتے اس کی آواز کانپ گئی تھی۔ لب کپکپا اٹھے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دھاڑیں مار کر رو دے گا۔

اپنے آنسو اس نے سختی سے صاف کرتے ہوئے باقی سب کی طرف دیکھا۔

"مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہم کیوں ہمیشہ اسی عورت کو الزام دیتے ہیں کہ ضرور اسی نے پہل کی ہوگی جس کی طرف کوئی بھی مرد بڑھتا ہے؟ کیا مرد پہل نہیں کر سکتا؟ کیا وہ اتنا معصوم ہوتا ہے اور عورت اتنی چالباز کہ ہمیشہ سارا الزام اسی کے سر دھر دیا جاتا ہے۔ چاہے عورت کتنی بھی باحیا اور پاکیزہ ہو ساری غلطی اسی کے سر کیوں ڈال دی جاتی ہے۔ اس ساری قصے میں، میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ عورت معصوم، پاکدامن اور پاکیزہ ہے۔ اس نے بس ایک اچھی نیت سے ایک کام کیا تھا، جب اسے میرے ارادوں کی خبر ہوئی تو یہ پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے پھر مجھ سے زندگی بھر رابطہ نہیں کیا۔ اب بھی رابطہ میں نے کیا۔ جو کچھ بھی کیا میں نے کیا۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ خدا کے لیے اسے کوئی الزام نہ دیں۔ یہ ایک پاکباز بیوی ہے، محبت کرنے والی ماں ہے لیکن یہ کسی کی محبوبہ نہیں ہے۔ اس کا کہیں کوئی چکر نہیں ہے۔ میں اپنے رب کو گواہ بنا کر قسم کھاتا ہوں کہ یہ آج بھی اتنی ہی پاک ہے جتنی پہلے تھی۔ نہیں ہے یہ بری عورت۔ سمجھے آپ لوگ۔ نہیں ہے یہ بری عورت۔"

اس کی گواہی پہ صلہ نے حلق سے بلند ہوتی چیخوں کو دبایا تھا۔ علی صاحب نے تاسف سے سر ہلاتے بیوی اور سالے کو دیکھا جو خاموش کھڑے تھے۔

"بری عورت نہیں۔ بری عورت نہیں۔" صحن میں لٹکے پنجرے میں قید طوطا کئی عرصے بعد کسی دوسرے کا جملہ دہرا رہا تھا۔ یہ ایک بے زبان کی اپنی مالکن کے حق میں گواہی تھی۔

☆☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

"آپ پریشان ہیں؟"

نادیہ کافی دیر سے شوہر کو کسی سوچ میں گم دیکھ رہی تھی۔ صابر کی نگاہیں بظاہر تو ٹی وی اسکرین پر مرکوز تھیں مگر اس کی سوچ کا پرندہ کہیں دور پرواز کر رہا تھا۔ نادیہ کی نرم آواز پر صابر چونکا اور پھر گہری سانس لے کر سر اثبات میں ہلایا۔

"ہاں! کچھ خاص نہیں۔" صابر نے ہاتھ میں پکڑا ریموٹ سائیڈ میز پر رکھا۔ نادیہ نے چائے بنا کر لائی تھی۔

"سب ٹھیک ہے؟" نادیہ نے چائے کا کپ شوہر کو پکڑایا اور ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

آج اتوار کا دن تھا۔ صابر کا سارا دن گھر پہ گزرا۔ چاروں بچے بہت خوش تھے کہ باپ نے سارا دن ان کے ساتھ گزارا تھا۔ رات کے دس بجتے ہی، بچے سونے کے لیے اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے تو تب صابر اور نادیہ کو تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ یہ ان دونوں کا معمول تھا کہ جب بچے سو جاتے تو وہ رات کو چائے کے کپ پر اپنے ہر مسئلے، ہر پریشانی، خاندان میں ہونے والی دعوتوں، مہمان نوازی، ہر چیز کو ڈسکس کر لیتے تھے۔

ان دونوں نے کبھی بچوں کے سامنے اپنے مسائل کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ خاندان کے کسی مسئلے سے انہیں کبھی آگاہ کیا۔ اس لیے ان کے بچوں کی شخصیت میں ایک توازن اور سلجھاؤ تھا۔

"اللہ کا کرم ہے۔ بس بڑی عید آنے والی ہے۔ اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" صابر نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

نادیہ چپ چاپ چائے پیتے ہوئے شوہر کی اگلی بات کی منتظر تھی۔

"تم جانتی تو ہے کہ پچھلے کچھ عرصے سے کاروبار کی وہ صورت حال نہیں رہی، جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ خاص کر پچھلے سال سے، جب سے کورونا وائرس آیا اور اس نے سارے نظام کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔" صابر نے سنجیدگی سے کہا۔

"جی! مجھے اندازہ ہے کہ حالات کافی حد تک مشکل ہو چکے ہیں۔" نادیہ نے تائید کی۔

"ہاں مگر پھر بھی ہم کافی لوگوں سے بہتر ہیں۔ الحمدللہ! ہمارا ہاتھ دینے والوں میں سے ہے۔" صابر نے کہا تو نادیہ نے بھی دل میں شکر ادا کیا۔

"بے شک! اللہ کا کرم ہے۔" نادیہ نے نرم لہجے میں کہا۔

"پچھلے سال تو میں نے مشکل سے ایک لاکھ روپے میں گائے لے لی تھی۔ مگر اس بار قیمت مزید بڑھ جائے گی۔ بس اسی حساب کتاب میں لگا ہوا ہوں کہ کیا کروں اور کیا نہیں۔" صابر نے فکر مندی سے کہا۔

"آپ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائیں۔ سب سے اہم چیز قربانی کا فریضہ ادا کرنا ہے۔ اللہ کو راضی کرنا ہے۔ ہم نے بڑی یا مہنگی قربانی کر کے دنیا کے سامنے شو تو نہیں مارنی ہے۔" نادیہ نے سنجیدگی سے کہا تو صابر نے سر ہلایا۔

"کسی کے سامنے شو مارنے والی بات نہیں

ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں قربانی کے لیے ہمیشہ بڑا جانور خریدتا ہوں۔ اس بار بھی یہ ہی نیت ہے۔"

صابر نے کہا تو نادیہ نے سر ہلا دیا۔ صابر کو ہمیشہ سے بڑی قربانی کرنے کا شوق تھا۔ چاہے وہ اس کے ساتھ ایک یا دو بکرے بھی لے آئے مگر بڑے جانور کی قربانی ضرور کرتا ہے۔

"بس تم دعا کرو، ایک جگہ سے پے منٹ آنی ہے۔ ان شاء اللہ سب مسئلے حل ہو جائیں گے۔"

صابر نے مسکرا کر کہا تو نادیہ نے دل سے دعا کی۔

دراصل صابر کے کاروباری دوست یاسر نے قربانی کے لیے دو مہینے پہلے ہی ڈیڑھ لاکھ کی گائے خرید کر فارم ہاؤس میں رکھی تھی۔ جب سے صابر نے خوب صورت اور صحت مند گائے کو دیکھا تھا، اس کا بھی دل چاہنے لگا کہ وہ بھی ایسے ہی خوب صورت اور صحت مند جانور کو اللہ کی راہ میں قربان کرے۔ آج کل وہ اسی جوڑ توڑ میں گم رہتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ عید کے قریب جانوروں کی قیمتیں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ پھر لاک ڈاون اور کورونا نے بھی معیشت کا جنازہ نکال دیا تھا۔

☆☆☆

صابر آج آفس سے جلدی اٹھ گیا۔ صابر گھر کے پاس پہنچا تو اس نے ایک بائیک تیزی سے اپنے گھر سے نکلتے اور دوسری سمت میں جاتی ہوئے دیکھی۔ بائیک کو گھر سے نکلتے دیکھ کر صابر نے لب بھینچ لیے۔ اس کا چہرہ تن گیا۔ اس نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور پھر سلام کیے بغیر گھر کے اندر داخل ہوا۔ ماتھے پہ تیوریاں اور آنکھوں میں غصہ لیے، جب وہ لاؤنج میں کھڑی نادیہ کے سلام کا جواب دیے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تو نادیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"لگتا ہے صابر نے دیکھ لیا ہے۔" نادیہ نے فکرمندی سے خود کلامی کی۔

صابر کی ناراضی اور اپنی چوری پکڑے جانے کے خوف سے نادیہ کے ہاتھ پاوں ٹھنڈے پڑ رہے

تھے۔ کچھ دیر نادیہ بے چینی سے لاؤنج میں چکر کاٹتی رہی۔ تینوں بڑے بچے اسٹڈی روم میں اپنے ٹیوشن ماسٹر سے پڑھ رہے تھے۔ جبکہ چھوٹی بیٹی لاؤنج میں بیٹھی کارٹون دیکھ رہی تھی۔

نادیہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر ڈرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ صابر اصول پسند اور سخت مزاج تھا۔ مگر صابر کی ایک بات اچھی تھی کہ وہ اپنی ضد یا غصے پر اکڑا نہیں رہتا تھا مگر یہ اس صورت میں ہوتا اگر صابر کو سچ میں لگتا کہ اس نے غصہ کر کے غلطی کی ہے۔ دوسری صورت میں صابر کے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کرنا آسان نہیں تھا۔ نادیہ نے کمرے میں جھانکا تو اس کا اندازہ درست نکلا۔ صابر غصے میں بھرا، راکنگ چیئر پر جھول رہا تھا۔ اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے۔

"میری بات سنیں۔" نادیہ نے ڈرتے ہوئے پکارا تو صابر نے ایک تیکھی نظر اس پر ڈالی۔

''کیا سنوں؟ یہ کہ میری بیوی مجھ سے باتیں چھپاتی ہے؟ یا یہ کہ میری بیوی کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ جس شخص کو اپنے گھر کے اندر بلا رہی ہے، اسی شخص نے ایک دن سب کے سامنے بے عزت کیا تھا۔'' صابر کرسی جھلاتا ہوا ایک دم رکا اور اٹھ کر نادیہ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ نادیہ کے چہرے پر پریشانی اور ندامت تھی۔

''صابر پلیز! میری بات تحمل سے سنیں۔ حسان بہت پریشان ہے، اس کی بچی......'' نادیہ نے کچھ کہنا چاہا۔ جب صابر نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

''نادیہ! مجھے تمہارے گھر اور گھر والوں کے مسئلوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ تم اگر چاہتی ہو کہ ہمارا رشتہ خراب نہ ہو تو اپنے بھائی کو منع کر دو کہ یہاں نہ آیا کرے۔ میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

صابر نے غصے سے کہا تو نادیہ دکھی دل سے سر جھکا کر ہلایا اور آنسو پیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

صابر کچھ دیر غصے میں ٹہلتا رہا، پھر نادیہ کے اداس اور پریشان چہرے کا سوچ کر ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ یہ سچ تھا کہ اسے نادیہ سے سچی محبت تھی۔ نادیہ بھی اس کے لیے ایسے ہی انمول جذبات رکھتی تھی۔ مگر نادیہ کے گھر والوں کا سوچ کر صابر کا حلق کڑوا ہوا جاتا تھا۔ پہلے ایسا ہرگز نہیں تھا کہ صابر کو اپنے سسرال والوں سے چڑ ہو مگر ایک لین دین کے معاملے نے ان کے نازک رشتے میں مزید کڑواہٹ گھول دی تھی۔

ہوا یوں کہ......

☆☆☆

''صابر بھائی! میری بات ہو گئی ہے۔ انہیں گاڑی کی تصویریں پسند آئی ہیں۔ بس ایک بار دیکھ کر تسلی کر لیں گے۔''

حسان نے فون پر کہا تو صابر نے سر ہلا دیا۔ وہ ان دنوں کام کی وجہ سے بہت مصروف تھا۔ اس کے پاس دو گاڑیاں تھیں۔ جن میں سے وہ پرانے ماڈل کی گاڑی کو فروخت کرنا چاہ رہا تھا۔ یہ گاڑی اس نے فالتو اور عام کاموں کے لیے لی تھی مگر اب اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تو صابر نے اسے بیچنے کا فیصلہ کر لیا۔

''ٹھیک ہے حسان! تم دیکھ لو۔'' صابر نے بے فکری سے کہا۔ حسان نے فون بند کر دیا۔

دراصل حسان اپنے ایک دوست ظفر کے ساتھ مل کر گاڑیوں کی فروخت کا کام کر رہا تھا۔ حسان بے وقوف لڑکا تھا جبکہ ظفر بہت چالاک اور شاطر...... وہ ہر معاملے میں ہیرا پھیرا کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس لیے حسان کو بھی ایسے ہی طریقے سمجھاتا رہتا۔ حسان اور ظفر کو پتا تھا کہ وہ صابر کی گاڑی میں سے اچھا کمیشن لے سکتے تھے۔ اس لیے وہ گاڑی بیچنے میں دلچسپی ظاہر کر رہے تھے۔ دراصل انہوں نے جس پارٹی کو صابر کی گاڑی فروخت کرنی تھی، اس سے کافی جھوٹ بولے تھے۔ جن سے صابر واقف نہیں تھا۔ صابر سودے میں دھوکا دہی یا جھوٹ سے کام نہیں لیتا تھا۔ اس کی گاڑی کا بونٹ اور ڈگی اصلی حالت میں نہیں تھی، بلکہ پینٹ ہوئی تھی۔ جبکہ حسان اور ظفر نے دعوا کیا کہ ساری گاڑی اصلی حالت میں ہے۔ انہوں نے یہ جھوٹ بول کر ہی سودا پکا کر کے، ان لوگوں سے ایڈوانس کی رقم لے کر آدھی آدھی بانٹ لی۔

جس دن گاڑی کی پوری پیمنٹ ہونی تھی، حسان نے صابر کو اپنے گھر ہی بلا لیا۔ جہاں ظفر اور دوسری پارٹی بھی موجود تھی۔ صابر گاڑی لے کر پہنچ گیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر اس نے آفس بھی جانا تھا۔

گاڑی کی پوری رقم دینے سے پہلے ان لوگوں نے ایک بار پھر گاڑی دیکھنے کی فرمائش کی کیونکہ آج ان کے ساتھ ایک نیا شخص بھی موجود تھا۔ صابر نے کہا کہ آپ اچھی طرح تسلی کر لیں۔ پھر سودا طے کر لیں

گے۔ جب انھوں نے دوبارہ گاڑی دیکھی تو واپس آ کر حسان سے بحث کرنے لگے کہ تم نے جھوٹ بولا کہ گاڑی رنگی ہوئی نہیں ہے جبکہ گاڑی کے دو حصے رنگے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ آیا نیا شخص، دراصل ان کا پرانا میکینک تھا۔ جو پہلے گاڑی دیکھنے نہیں آسکا مگر آج سودے والے دن پہنچ گیا۔ اسی نے بتایا کہ یہ گاڑی ایکسیڈینٹل اور رنگی ہوئی ہے۔ اس بات سے وہ لوگ پہلے واقف نہیں تھے۔ اس لیے غصے میں آکر حسان سے بحث کرنے لگے۔

حسان گھبرا گیا اور ظفر کو دیکھنے لگا۔ صابر نے حیرانی سے حسان کی طرف دیکھا

''میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ گاڑی کے دو حصے رنگے ہوئے ہیں۔'' صابر نے سنجیدگی سے کہا۔

''مگر آپ کے رشتے دار نے ہم سے جھوٹ بول کر، ایڈوانس کی رقم لے لی۔''

ان لوگوں نے کہا تو صابر کو حسان پر بہت غصہ آیا۔ اس نے ان لوگوں سے معذرت کی اور ان کی رقم اپنے پاس سے واپس کر کے بھیج دیا۔

''حسان! تم نے غلط بیانی سے کام کیوں لیا؟'' صابر نے غصے سے سوال کیا۔

حسان نے گھبرا کر اپنے باپ کو آواز دی جو فوراً وہاں آگئے۔ ان کے پیچھے نادیہ کی امی بھی پریشان چہرہ لیے آگئیں جبکہ ظفر خاموشی سے تماشا دیکھنے لگا۔ صابر، حسان پر غصہ کرنے لگا۔ نادیہ کے والدین اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے، پیار سے سمجھانے لگے جس پر صابر کو لگا کہ وہ بیٹے کی طرف داری کر رہے ہیں۔ وہ بھی ایک غیر شخص کے سامنے۔

صابر کو اپنی سخت بے عزتی محسوس ہوئی اور وہ غصے سے وہاں سے چلا گیا۔ اس دن کے بعد سے صابر، نادیہ کے گھر والوں سے زیادہ نہیں ملتا تھا۔ سوائے کام کی بات کے یا کسی خاص موقع کے۔ وہ نادیہ کے والدین کی تو ابھی بھی عزت کرتا تھا مگر نادیہ کے بھائی کا داخلہ اپنے گھر بند کیا ہوا تھا مگر نادیہ بہن تھی۔ اس کا دل اپنے بھائی کے لیے نرم پڑ جاتا تھا۔

اس لیے وہ چوری چھپے اپنے بھائی سے مل لیتی۔ آج اتفاق سے صابر جلدی گھر آیا اور اس نے حسان کو گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ جس پر اس کا موڈ سخت خراب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''نادیہ! تمہیں صابر سے بات کرنی چاہیے۔''

اگلے دن نادیہ کی اپنی ماں سے بات ہوئی تو انہوں نے نرم لہجے میں سمجھایا۔

''امی! میں نے بہت بار کوشش کی مگر صابر اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتے ہیں۔'' نادیہ نے جھکے ہوئے انداز میں کہا۔

''آخر ایسا کب تک چلے گا۔ اس بات کو سال گزر گیا مگر صابر کا غصہ آج بھی اپنی جگہ پر برقرار ہے۔'' نادیہ کی امی نے اداسی سے کہا۔

''امی! میں کیا کروں۔ صابر کو لگتا ہے آپ لوگوں نے حسان کا ساتھ دیا۔ اس کی طرف داری کی تھی۔ جبکہ حسان غلط تھا۔'' نادیہ نے کہا۔

''نادیہ! ہم مانتے ہیں کہ حسان کی غلطی تھی۔ اس نے جھوٹ اور دھوکے سے کام لیا۔ اس دن میں نے اور تمہارے باپ نے حسان کی سائیڈ نہیں لی تھی بلکہ ہم نے ان دونوں کے درمیان معاملے کو سلجھانے کی کوشش کی مگر صابر یہ سمجھا کہ شاید ہم اپنے بیٹے کی سائیڈ لے کر اسے ذلیل کر رہے ہیں۔'' نادیہ کی امی نے تفصیل سے بتایا۔

''جی امی! میں جانتی ہوں۔ اس لیے تو صابر کا دل آپ لوگوں کی طرف سے صاف ہو گیا ہے مگر وہ حسان کو معاف کرنے پر تیار نہیں ہیں۔'' نادیہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''دیکھو بیٹی! حسان نادان اور کم عقل ہے۔ برے دوست کی صحبت کی وجہ سے اس نے بہت نقصان اٹھائے۔ اب وہ ظفر اور اس کی دوستی کو چھوڑ چکا ہے۔ اسے اپنی حرکت پر پچھتاوا ہے اور اس نے کئی بار صابر سے معافی بھی مانگی ہے۔ اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتا ہے۔'' نادیہ کی امی نے کہا۔

بی ابی! مجھے اندازہ ہے کہ حسان اپنی حرکت پر بہت شرمندہ ہے۔ اس نے کئی بار میرے سامنے بھی اعتراف کیا ہے۔ صابر کا دل صاف ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ آپ پریشان مت ہوں۔'' نادیہ نے تسلی دی اور پھر فون بند کر دیا۔

نادیہ خاموشی سے گھر کے باقی رہ جانے والے کام نپٹانے لگی مگر اس کا ذہن اپنے میکے میں گھوم رہا تھا۔

نادیہ اور حسان دو بہن بھائی ہی تھے۔ حسان اس سے چھوٹا اور لاڈلا تھا۔ اس لیے تھوڑا کم عقل اور بے وقوف بھی تھا۔ ہر ایک پہ جلدی اعتبار کر لینے والا۔ حالانکہ حسان کی شادی کو دو سال ہو چکے تھے اور اس کی نو مہینے کی پیاری سے ایک بیٹی ماہ نور بھی تھی مگر اب بھی اس کی حرکتیں بچوں جیسی تھی۔

نادیہ اداس تھی کہ پچھلے دو تین عیدوں کی طرح، اس عید پر بھی وہ میکے اکیلی ہی جائے گی یا تھوڑی دیر کے لیے کیونکہ صابر اس کے والدین سے ملنے کے بعد بس پانچ منٹ وہاں رکتا اور واپس چلا جاتا۔ نادیہ کو صابر کے بغیر میکے میں وقت گزارنا عجیب سا لگتا کہ عید کے دن وہ دونوں ایک دوسرے سے دور اور الگ الگ ہوں تو یہ کیسی عید ہوئی۔ عید تو اپنوں سے ملنے، ان کے ساتھ وقت گزارنے کا نام ہے۔ عید کے دن تو سب گلے شکوے دور ہو جاتے ہیں۔ مگر صابر کا رویہ حسان کے ساتھ ویسا ہی سخت تھا۔ جس پر اب نادیہ کو پریشانی ہونے لگی تھی کہ آخر ایسا کب تک چلے گا۔ ان دونوں کے خراب تعلقات کی وجہ سے نادیہ درمیان میں بری طرح پس رہی تھی۔ کیونکہ نہ تو وہ میکے کو چھوڑ سکتی تھی اور نہ اپنے مجازی خدا کی ناراضی مول لے سکتی تھی۔ اس کے لیے تو دونوں رشتے ہی اہم اور زندگی جیسے تھے۔

نادیہ چاہتی تھی کہ صابر، حسان کو معاف کر کے اپنا دل بڑا کر لے۔ مگر فی الحال ایسا ہونا ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ دوسری طرف حسان کی بیٹی کو نمونیہ ہو گیا اور وہ ہسپتال میں داخل تھی۔ نادیہ اس لیے بھی بہت پریشان اور اداس تھی۔ بڑی عید سر پر تھی مگر نادیہ کا دل کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب بے دلی اور بیزاری میں دن گزر رہے تھے۔ اس کی بے دلی اور بیزاری صابر نے بھی محسوس کر لی تھی مگر وہ بھی خاموش تھا۔

☆☆☆

''نادیہ! تم خوش نہیں ہوئی؟''

صابر آج ڈیڑھ لاکھ کی خوب صورت اور صحت مند گائے قربانی کے لیے خرید کر لایا تو بچے خوشی سے اچھلنے لگے اور گائے کے ناز نخرے اٹھانے میں مصروف ہو گئے۔ اپنی سب سے بڑی خواہش پوری ہونے پر، صابر کا چہرہ بھی خوشی سے تمتما رہا تھا۔ صابر کے دو چھوٹے بھائی اور ان کے بچے بھی گائے کو دیکھنے آئے اور بہت خوش ہوئے۔

صابر اپنی دور رہنے والی دونوں بہنوں کو ویڈیو کال پر گائے دکھائی تو وہ دونوں خوش ہو کر بھائی کو دعا دینے لگی۔ جو انہیں ہر موقع پر محبت سے یاد رکھتا تھا۔ اپنے ساتھ شامل کرتا تھا۔ بہنوں کے مان تو ایسے ہی ہوتے ہیں اور اپنے باپ اور بھائیوں سے ہی قائم رہتے ہیں۔

صابر نے ہمیشہ کی طرح اپنی خوشی، اپنے سب پیاروں کے ساتھ بانٹی تھی۔ صابر کو سب اپنوں کو ساتھ ہنستا مسکراتا دیکھ کر۔ نادیہ کو ان خوشیوں میں اپنے گھر والے بھی بہت یاد آ رہے تھے مگر وہ سب تو اپنی مشکل اور پریشانی کا شکار تھے۔ ان کی تکلیف کا سوچ کر نادیہ کا دل اداس تھا۔ نادیہ کے ہونٹ مسکرا رہے تھے مگر آنکھوں میں اداسی اور نمی تھی۔ جسے صابر نے دیکھ لیا، اس لیے نادیہ سے فوراً سوال کیا۔ نادیہ اداسی سے مسکرا دی۔

''میں بہت خوش ہوں۔ الحمدللہ!'' نادیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا۔ تمہاری آنکھوں سے تو نہیں لگ رہا؟''

صابر نے ایک نظر سامنے گائے کے نخرے اٹھاتے اپنے بچوں پر ڈالی اور دوسری نگاہ پاس کھڑی دل عزیز

بی ای! مجھے اندازہ ہے کہ حسان اپنی حرکت پر بہت شرمندہ ہے۔ اس نے کئی بار میرے سامنے بھی اعتراف کیا ہے۔ صابر کا دل صاف ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ آپ پریشان مت ہوں۔" نادیہ نے تسلی دی اور پھر فون بند کر دیا۔

نادیہ خاموشی سے گھر کے باقی رہ جانے والے کام نپٹانے لگی مگر اس کا ذہن اپنے میکے میں گھوم رہا تھا۔

نادیہ اور حسان دو بہن بھائی ہی تھے۔ حسان اس سے چھوٹا اور لاڈلا تھا۔ اس لیے تھوڑا کم عقل اور بے وقوف بھی تھا۔ ہر ایک پہ جلدی اعتبار کر لینے والا۔ حالانکہ حسان کی شادی کو دو سال ہو چکے تھے اور اس کی نو مہینے کی پیاری سے ایک بیٹی ماہ نور بھی تھی مگر اب بھی اس کی حرکتیں بچوں جیسی تھی۔

نادیہ اداس تھی کہ پچھلے دو تین عیدوں کی طرح، اس عید پر بھی وہ میکے اکیلی ہی جائے گی یا تھوڑی دیر کے لیے کیونکہ صابر اس کے والدین سے ملنے کے بعد بس پانچ منٹ وہاں رکتا اور واپس چلا جاتا۔ نادیہ کو صابر کے بغیر میکے میں وقت گزارنا عجیب سا لگتا کہ عید کے دن وہ دونوں ایک دوسرے سے دور اور الگ الگ ہوں تو یہ کیسی عید ہوئی۔ عید تو اپنوں سے ملنے، ان کے ساتھ وقت گزارنے کا نام ہے۔ عید کے دن تو سب گلے شکوے دور ہو جاتے ہیں۔ مگر صابر کا رویہ حسان کے ساتھ ویسا ہی سخت تھا۔ جس پر اب نادیہ کو پریشانی ہونے لگی تھی کہ آخر ایسا کب تک چلے گا۔ ان دونوں کے خراب تعلقات کی وجہ سے نادیہ درمیان میں بری طرح پس رہی تھی۔ کیونکہ نہ تو وہ میکے کو چھوڑ سکتی تھی اور نہ اپنے مجازی خدا کی ناراضی مول لے سکتی تھی۔ اس کے لیے تو دونوں رشتے ہی اہم اور زندگی جیسے تھے۔

نادیہ چاہتی تھی کہ صابر، حسان کو معاف کر کے اپنا دل بڑا کر لے۔ مگر فی الحال ایسا ہونا ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ دوسری طرف حسان کی بیٹی کو نمونیہ ہو گیا اور وہ ہسپتال میں داخل تھی۔ نادیہ اس لیے بھی بہت پریشان اور اداس تھی۔ بڑی عید سر پر تھی مگر نادیہ کا دل کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب بے دلی اور بیزاری میں دن گزر رہے تھے۔ اس کی بے دلی اور بیزاری صابر نے بھی محسوس کر لی تھی مگر وہ بھی خاموش تھا۔

☆☆☆

"نادیہ! تم خوش نہیں ہوئی؟"

صابر آج ڈیڑھ لاکھ کی خوب صورت اور صحت مند گائے قربانی کے لیے خرید کر لایا تو بچے خوشی سے اچھلنے لگے اور گائے کے ناز نخرے اٹھانے میں مصروف ہو گئے۔ اپنی سب سے بڑی خواہش پوری ہونے پر، صابر کا چہرہ بھی خوشی سے تمتما رہا تھا۔ صابر کے دو چھوٹے بھائی اور ان کے بچے بھی گائے کو دیکھنے آئے اور بہت خوش ہوئے۔

صابر اپنی دور رہنے والی دونوں بہنوں کو ویڈیو کال پر گائے دکھائی تو وہ دونوں خوش ہو کر بھائی کو دعا دینے لگی۔ جو انہیں ہر موقع پر محبت سے یاد رکھتا تھا۔ اپنے ساتھ شامل کرتا تھا۔ بہنوں کے مان تو ایسے ہی ہوتے ہیں اور اپنے باپ اور بھائیوں سے ہی قائم رہتے ہیں۔

صابر نے ہمیشہ کی طرح اپنی خوشی، اپنے سب پیاروں کے ساتھ بانٹی تھی۔ صابر کو سب اپنوں کو ساتھ ہنستا مسکراتا دیکھ کر۔ نادیہ کو ان خوشیوں میں اپنے گھر والے بھی بہت یاد آ رہے تھے مگر وہ سب تو اپنی مشکل اور پریشانی کا شکار تھے۔ ان کی تکلیف کا سوچ کر نادیہ کا دل اداس تھا۔ نادیہ کے ہونٹ مسکرا رہے تھے مگر آنکھوں میں اداسی اور نمی تھی۔ جسے صابر نے دیکھ لیا، اس لیے نادیہ سے فوراً سوال کیا۔ نادیہ اداسی سے مسکرا دی۔

"میں بہت خوش ہوں۔ الحمدللہ!" نادیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا۔ تمہاری آنکھوں سے تو نہیں لگ رہا؟"

صابر نے ایک نظر سامنے گائے کے نخرے اٹھاتے اپنے بچوں پر ڈالی اور دوسری نگاہ پاس کھڑی دل عزیز

بیوی پر۔
"آپ چہرے پر سجی ہنسی دیکھیں۔ آنکھوں کی اداسی سے آپ کا کیا لینا دینا ہے۔" نادیہ نے اداسی سے کہا۔
"نادیہ! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں صرف تمہارا شوہر ہوں۔ روح کا ساتھی نہیں۔" صابر نے خفگی سے کہا تو نادیہ ہنس پڑی۔
"روح کا ساتھی بھلا کون ہوتا ہے؟ صابر آپ بہترین شوہر ہیں مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں مگر میری آنکھوں کی اداسی کی وجہ میری بنیاد، میرے مرکز کے ٹوٹنے کی وجہ سے ہے۔ آپ خود ہی دیکھیں نا! آپ اپنی خوشی، اپنے سب پیاروں سے بانٹ رہے ہیں۔ سب دور اور پاس والوں کو یاد رکھا ہے۔ یقین مانیں کہ مجھے ہمیشہ بہت اچھا لگتا ہے کہ میرا شوہر حقوق العباد کا خیال رکھنے والا، اپنے رشتوں کو جوڑنے والا ہے۔ اس طرح میری بھی معمولی سے خواہش یا کوشش ہوتی ہے اپنے سب پیاروں سے جڑنے کی، انھیں ساتھ لے کر چلنے کی۔ جب اس میں ناکام ہو جاتی ہوں تو یہ ناکامی دکھ بن کر آنکھوں کی نمی میں ڈھل جاتی ہے۔"
نادیہ نے کہا تو صابر چند لمحوں کے لیے چپ چاپ کھڑا کچھ سوچتا رہا۔
"میں نے مانا کہ مجھ سے تمہارے والدین کو سمجھنے میں غلطی ہوئی اور میں نے اس کی تلافی بھی کی مگر حسان نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ کیا میں اسے معاف کر دوں؟" صابر نے الجھ کر سوال کیا تو نادیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔
"میرا دل نہیں مانتا۔" صابر نے بے بسی سے کہا تو نادیہ نے نفی میں سر ہلایا۔
"دل نہیں۔ آپ کی انا نہیں مانتی!" نادیہ نے کہا تو صابر چونکا۔
"انا؟" صابر نے دہرایا۔
"ہاں صابر! کیونکہ آپ بڑا ظرف رکھتے ہیں۔ اگر آپ اسی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کو پکڑنے والے اور معاف کرنے والے نہ ہوتے تو آج اپنے کسی رشتے کو جوڑ کر نہ رکھ پاتے۔ حسان کو معاف کرنے میں آپ کی انا آڑے آ رہی ہے اور کچھ بھی نہیں۔" نادیہ نے سنجیدگی سے کہا۔
"جو بھی کہو! یہ آسان تو نہیں ہے۔" صابر نے نفی میں سر ہلایا۔
"آپ کو ہمیشہ سے بڑی قربانی کرنے کا شوق ہے ناں؟ تو انسانی نفس میں انا کو کچلنا بھی بڑی قربانی کہلاتا ہے۔ جس کے لیے بہت ہمت اور حوصلہ چاہیے ہوتا ہے۔ بہر حال! میں ڈرائیور کے ساتھ ہسپتال جا رہی ہوں۔ حسان کی بیٹی آئی سی یو میں داخل ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے۔" نادیہ نے کہا اور ساکت کھڑے صابر کو چھوڑ کر، تیار ہونے اندر چلی گئی۔ صابر نے نادیہ کو جاتے ہوئے دیکھا اور پھر گردن گھما کر کچھ دور کھڑے قربانی کے بڑے جانور کو۔ چند لمحے کھڑا کچھ سوچتا رہا اور پھر بے ساختہ سر ہلانے لگا۔
"ہاں! اپنی انا کو مار کر، رشتوں کو گلے لگانے سے بڑی قربانی کیا ہوگی؟"
صابر کے ذہن میں یہ نقطہ واضح ہو گیا تھا۔ دراصل صابر کو ہمیشہ سے بڑی قربانی کرنے کا شوق تھا، اب بھی یہ شوق ہی اس کے کام آیا تھا۔ چاہے یہ قربانی عملی تھی یا نفس کی۔ تھی تو قربانی ہی اور اللہ سے بہتر نیتوں کے حال کو کون جانتا اور سمجھتا ہے۔
کچھ دیر کے بعد، صابر اور نادیہ حسان کی بیٹی کو دیکھنے ہسپتال جا رہے تھے۔ نادیہ ہسپتال کی طرف جاتے ہوئے، پریشان یا اداس ہونے کے بجائے، بہت خوش تھی کیونکہ یہ بڑی عید، اس کے لیے بڑی خوشیاں اور سکون لے کر آ رہی تھی۔
جس کے لیے وہ اپنے رب کی شکر گزار تھی کہ ہر پتھر دل پر ہدایت کا اثر رکھنے والا قطرہ، وہ ذات ہی عطا کرتی ہے، جو پتھر دل میں بھی سوراخ کر دیتا ہے اور انسان کے دل میں ہونے والے ہدایت کے سوراخوں سے، خیر کی ایسی روشنی پھوٹتی ہے جو نفس کے ہر اندھیرے کو مٹانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔
☆☆

منعم ملک

نمکین پانیوں کا سفر

مکمل ناول

رات کی تاریکی میں بجلی بند ہونے پر دو لڑکیاں چھپ کر کسی شادی میں شرکت کرنے نکلتی ہی۔ وہ کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتیں۔ شادی والے گھر میں جنریٹر چلا دیا جاتا ہے جس سے بھاگنے پر لڑکی کی چادر درخت سے اٹک جاتی ہے۔ ایک شخص بڑی حیرانی سے اس اجنبی لڑکی کو دیکھتا ہے جو چادر چھوڑ کر بھاگ گئی۔

پرفیوم گیلری میں شاپنگ کے بعد اس پر آشکار ہوتا ہے کہ وہ اپنے بیگ میں پیسے رکھنا بھول گئی ہے۔ شرمندگی سے عرق عرق ہوتے ہوئے اچانک ایک شخص آگے آ کر اس کا بل ادا کر دیتا ہے۔ وہ اسے اپنا نام شمائلہ بہادر خان بتاتی ہے جبکہ لڑکا اپنا نام خضر بتاتا ہے۔ خضرت کو احساس نہیں ہو پاتا کہ وہ کس سے مل رہا ہے۔

مولوی حیات دین دار اور نفیس انسان ہیں۔ مسجد امام ہیں اور لوگوں میں ان کی بہت عزت ہے۔ مولوی حیات کی دو نیک سیرت بیٹیاں تاجور اور شکیلہ ہیں۔ وہ ان کے فرائض سے اپنی زندگی میں سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔

صدام اپنے دوستوں کے ساتھ کسی قصبے میں شادی میں شرکت کرنے گیا ہے۔ ایک صبح کچھ مبہم آوازوں کے تعاقب میں اسے ایک پری پیکر لڑکی نظر آتی ہے۔ صدام دل پھینک شخص ہے۔ وہ صبا خان کے حسن کے آگے دل ہار دیتا ہے۔ حاکم دو بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ حاکم کے مزاج میں حاکمیت اور سختی ہے۔ وہ اپنی چچازاد تاجور سے منسوب ہے جو مولوی حیات کی بیٹی ہے۔ حاکم کی ماں تاجور کی بہن شکیلہ اپنے بڑے بیٹے کے لیے چاہتی ہے۔ حاکم اور مولوی حیات کو اس پر اعتراض نہیں ہے۔
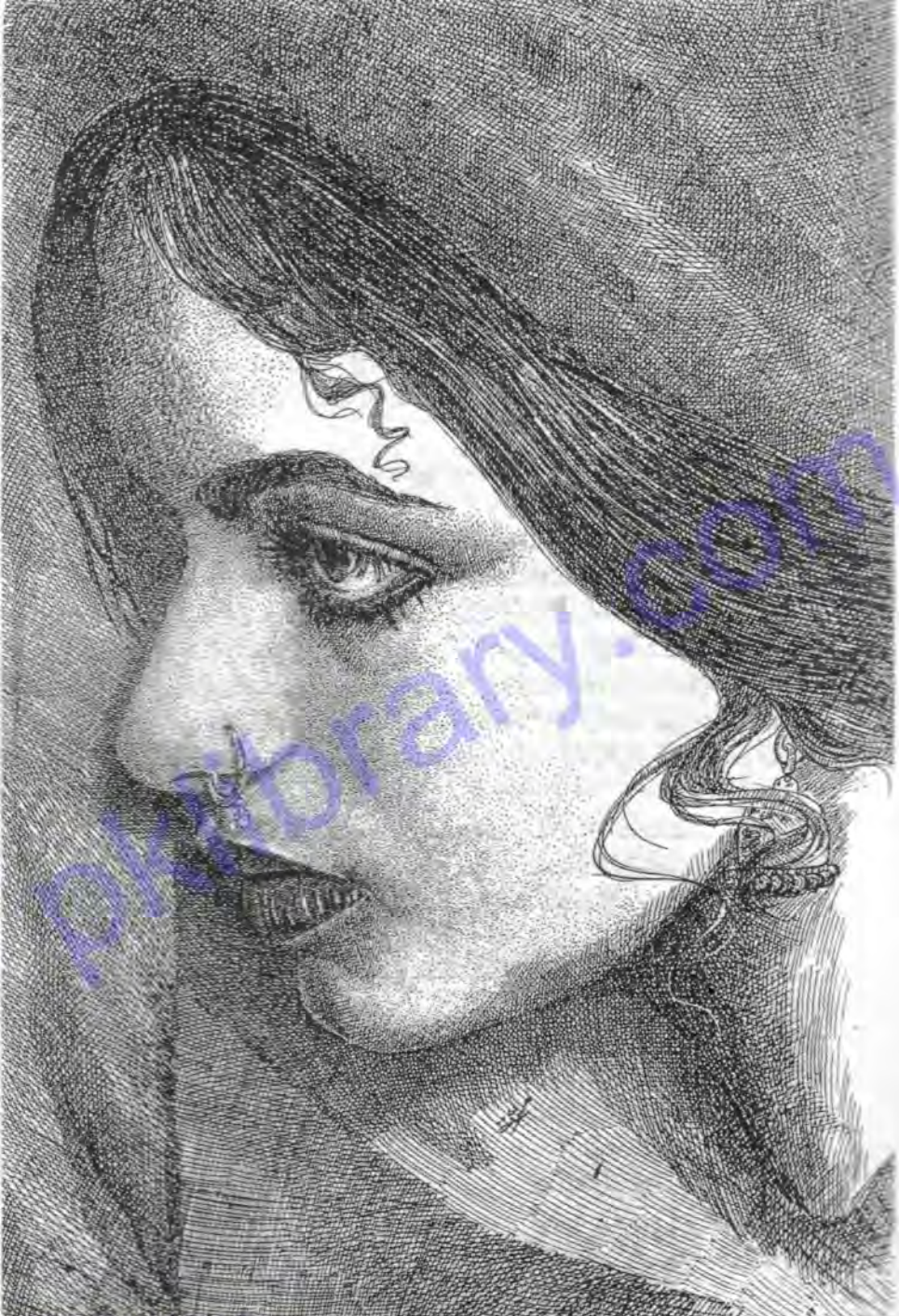
شمائلہ بہادر خان انتہائی خوب صورت اور ملک کی معروف مصنفہ ہیں۔ خضر اور اس کے یونیورسٹی فیلو شمائلہ کے ناولز کے مداح ہیں۔ یونیورسٹی میں پلے ہو رہا ہے جس کے دوران انہیں علم ہوتا ہے کہ شمائلہ بہادر خان مثل بہشت نامی گاؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ دراصل خضر کا بھی گاؤں ہے۔ اچانک خضر کو یاد آتا ہے کہ وہ شمائلہ بہادر سے شاپنگ مال میں مل چکا ہے۔ سب کو زور دار جھٹکا لگتا ہے۔ خضر اس اتفاق پر خوش گوار حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

مولوی حیات کا دروازہ بجتا ہے تو شکیلہ کھولتی ہے۔ باہر ان کا خالہ زاد دستگیر موجود ہے۔ شکیلہ اسے باپ کی موجودگی میں آنے کا کہتی ہے، وہ مسکرا کر جانے لگتا ہے کہ حاکم دیکھ لیتا ہے اور فوراً شک و شبہات میں گھر جاتا ہے کہ دستگیر کا اس کی منگیتر یا پھر دوسری بہن کے ساتھ چکر چل رہا ہے۔

یسمی اور ثانیہ دو بہنیں ہیں۔ ان کی اور تایا جان کی فیملی ساتھ میں رہتی ہے۔ تائی جی یسمی سے خار کھاتی ہیں۔

صدام صبا خان سے ملنے رات کی تاریکی میں اس کے گھر جا پہنچتا ہے۔ صبا خان اسے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ وہ اسے پرپوز کرنا چاہتا ہے کہ تب ہی زور سے دروازہ بجا۔ صبا بوکھلا کر اسے فوراً نکل جانے کو کہتی ہے۔ وہ آنے والے شخص کو اپنا شوہر بتاتی ہے۔

حاکم نیلم کو کہتا ہے کہ وہ تاجور کو حاکم سے ملاقات کا پیغام جا کر دے۔

حاکم نکاح سے قبل تاجور کے کردار کو جج کرنا چاہتا ہے۔

تاجور حاکم کی خواہش جان کر دکھی ہو جاتی ہے اور مولوی حیات کو اعتماد میں لے کر ان کے ساتھ حاکم سے ملنے اس کے گھر چلی جاتی ہے۔ حاکم تاجور کے اس قدم پر شدید بے یقینی اور خجالت کا شکار ہو جاتا ہے۔

یسمی اپنے تایا زاد معین سے بچپن سے منسوب ہے۔ یسمی کے بزرگ لڑکیوں کو ڈھیل دینے کے حق میں نہیں البتہ شمائلہ بہادر کے گھر جانے پر زیادہ پابندی نہیں۔ شمائلہ اور یسمی گہری سہیلیاں ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم۔ دونوں کے درمیان کہانیاں لکھنے سے لے کر ہر چھوٹی بڑی بات ڈسکس ہوتی ہے۔ دونوں میں کچھ ڈھکا چھپا نہیں۔

تاجور کی شادی حاکم سے انجام پا جاتی ہے۔ شادی کی پہلی رات حاکم اپنی شکی طبیعت کے باعث تاجور سے دستگیر کے متعلق اس کے کردار پر سوال اٹھا کر بے حد دکھی کر دیتا ہے۔ وہ اس کی صفائی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بہت سے احکامات دیتا ہے۔

خضر شمائلہ کو کتاب بھیجنے کی آڑ میں ایک خط لکھ کر اس سے ملاقات کرنے کی درخواست کرتا ہے۔

صدام جو کہ حاکم کا بھائی ہے۔ نکاح کی ترغیب دینے پر اپنے دوست سے تلخ کلامی کر بیٹھتا ہے۔ بات ہاتھا پائی پر جا پہنچتی ہے اور اس کا دوست اپنی بے عزتی پر صدام کے کردار کی سیاہی سب کو دکھانے کا عہد کرتا ہے۔

چوتھی قسط

ہم تو وہ لوگ ہیں جو
نہ کسی کے دست شمار میں ہیں
نہ کسی کی نگاہ کے حصار میں
یوں جیسے کوئی ہو صدیوں کا بے انت سفر
صحرا صحرا پھرتا کوئی خاک بسر
کیا پوچھتے ہو کہ کون ہیں ہم
ہم تو جگنو بھی نہیں ہیں
کہ کسی کی آنکھ میں چمکتے، کسی کو سنوارتے

ہم تو آنسو کی طرح ہیں
آنکھ سے ٹپکے اور ڈوب گئے
گھر سے نکلے اور بے سمت مسافت میں
محبت کی آس میں
دربدر پھرتے ہوئے
کسی بے نام شام کی نذر ہوئے

''کیا میں آپ کو کسی پرچی پر لکھ کر دوں کہ آپ مریض کے لیے کتنی مشکل پیدا کر رہی ہیں، یا کوئی

خاص دشمنی ہے آپ کی اس سے......؟" ڈاکٹر کی کوفت سے بھری آواز میں ہزار درجہ ناگواری تھی جو وہ اس کے سر کے اُوپر آ کر چلایا تھا۔

"نن......نن، نہیں۔" وہ ہڑبڑا کر بے ربطگی سے بولی اور آنکھیں پھاڑ کر ماحول پہچاننے کی کوشش کی۔

اس کے اردگرد ہسپتال کی مخصوص ناگوار بُو پھیلی ہوئی تھی۔ نتھنوں سے ٹکرا کر دماغ میں گھسنے کی کوشش کرتی بو...... فینائل کی تیز بدبو، ادویات کی بو، مریضوں کے بستروں سے اُٹھتی، صفائی کے ناقص انتظام نے ان سب کا مجموعہ بنا کر پورا ماحول باسی کر رکھا تھا۔ گورنمنٹ ہاسپٹل کا یہ طویل وارڈ تھا جس میں دورویہ بستر لگے تھے۔ اس میں ہر قسم کے مریض تھے...... غریب...... کچھ لاوارث...... بسترِ مرگ پر پڑے...... اور دوائیوں سے مزید بگڑتی حالت والے بھی...... زیادہ تر بوڑھے تھے۔ وارڈ کا ماحول سرد تھا۔ دن کے دس بج رہے تھے اور دو ڈاکٹرز راؤنڈ پر تھے...... اس وقت وہ مریضوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک مریض وہ تھا جو دروازے کے قریب بیڈ نمبر دو پر پڑا تھا۔ لاغر وجود، پیروں پر سوجن، چہرے پر خشکی اور دراڑیں...... اس کی آنکھیں بند تھیں۔ خوراک کی نالی ناک کے راستے سے گزر رہی تھی...... ضرورت پڑتی تو آکسیجن ماسک لگا دیتے۔ بیڈ کے ساتھ پڑی واحد بنچ پر ایک کمسن سی لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حزن تھا، سوگواریت تھی...... آس و ہراس!

جتنے دنوں سے یہ مریض داخل ہوا تھا، ڈاکٹرز اور وارڈ اسٹاف اسی کو بھاگ دوڑ کرتا دیکھ رہے تھے......!

"بی بی آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں......" ڈاکٹر زچ ہو گیا۔

"پڑھی لکھی ہیں کچھ؟" وہ چپ۔

"جب این جی پاس ہو رہی ہے تو منہ سے پانی کیوں ڈالتی ہیں؟"

"نہیں......" ہاتھ مسلتی لڑکی نے سر اُٹھایا۔

"کیا......؟" وہ جواب لینے کے لیے اسے دیکھنے لگا۔

"ہونٹ خشک ہو جاتے ہیں ان کے...... خود اشارہ کرتے ہیں۔" بے حد شکستہ آواز چغلی کھا رہی تھی کہ وہ ہچکیوں سے رو رہی ہے۔ ڈاکٹر ضبط سے کچھ نرم پڑ گیا۔

"وہ غنودگی میں ہے، آپ تو کچھ عقل مند ہیں۔" وہ کہہ کر مریض کی آنکھوں کی پتلیاں چیک کرنے لگا۔

"آپ کے ساتھ کوئی اور ہے؟"

"نہیں......" یک لفظی جواب۔

"بہرحال مریض کی کنڈیشن میں کوئی بہتری نہیں۔"

"جی......؟" لڑکی کی آنکھوں میں بات کی سنگینی سے سہم پھیل گیا۔

ڈاکٹر اب سوجن زدہ پیروں پر پنسل کی نوک گھسیٹ کر کچھ دیکھ رہا تھا پھر چھاتی کی طرف بڑھا۔

"ہیپاٹائٹس سی بگڑ چکا ہے۔ پورے جسم میں پھیل کر ہڈیوں میں گھس گیا ہے...... تلی کا سائز بھی بڑھ گیا ہے۔"

"پھر......؟"

"پرانی ٹی بی بھی ہے......"

"لیکن علاج......؟" اس کا گلہ رندھ گیا۔

"ٹی بی علاج ایک حد تک ہوتا ہے...... اب تک کہاں تھیں آپ جب مریض اس حالت کو پہنچ گیا؟"

وہ ایک نظر اس پر ڈال کر مریض کی سبز فائل پر ایک آدھ دوائی کا اضافہ کرنے لگا۔ پھر مڑ کر وارڈ بوائے کو کچھ کہا جس سے وہ ڈرپ تیار کرنے لگا۔ صبح شام یہی ہو رہا تھا لیکن نتیجہ صفر...... لڑکی کے وجود پر لرزش طاری ہو رہی تھی۔

"اللہ سے دعا کریں اور اگر ہو سکے تو کسی بڑے کو بلوا لیں......" ڈاکٹر نے مخلصانہ مشورہ دیا تو وہ

کپکپاتی آواز بمشکل نکال پائی۔
"میرا کوئی نہیں ہے......"
"ویل...... اللہ پر بھروسا رکھیں اور کسی بھی سچوئیشن کے لیے ذہنی طور پر تیار رہیں۔ زندگی اسی کے اختیار میں ہے اور موت بھی برحق......"
"نہیں......" وہ منت آمیز نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔ آنکھوں پر بادل جھک آئے تھے۔
"انہیں ٹھیک کردیں، میں آپ کی بڑی احسان مند رہوں گی۔ میرا ان کے سوا کوئی نہیں ہے...... میرے پاس کوئی چھت بھی نہیں ہے، میں بھری دنیا میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ اللہ کا واسطہ ہے ان کو ٹھیک کردیں...... آپ میری پہلی اور آخری اُمید ہیں۔" وہ دبی دبی آواز میں گڑگڑاتے ہوئے ڈاکٹر سے کہہ رہی تھی۔ اس کا اپنا دل عجیب ہونے لگا...... نجانے کیوں اسے اس معصوم سی لڑکی پر بے طرح ترس آرہا تھا۔ جو ابھی کچھ ہی دیر میں ہاتھ بھی جوڑ دیتی......
"ہمارے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہے نا...... ہم بھی اپنی سی کوشش کررہے ہیں لیکن......" وہ کچھ کہتے کہتے بھی چپ ہوگیا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ وہ آنے والے وقت ہمت پکڑے کیونکہ مرض بے قابو ہوچکا تھا...... لیکن اس حقیقت سے وہ بری طرح زخمی ہورہی تھی۔
"بس آپ دعا کریں...... اللہ آپ کے والد کو شفاء دیں گے......"
"میرے کوئی والد نہیں ہیں......" آنکھوں میں تیرتے بادل پوری طرح سے برس رہے تھے۔
"شوہر...... یہ میرے شوہر ہیں۔"
وہ کہہ کر آنکھیں میچے سسکیاں دبانے کی کوشش کررہی تھی جبکہ اس کے جواب پر ڈاکٹر ہکا بکا ہوکر اس کی صورت تکتا جارہا تھا...... بہت سے مریضوں کے لیے یہ رونا دھونا عام سی بات تھی لیکن وہ تو اس کمسن سی لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو حسن و جوانی میں مکمل تھی اور عمر میں تو اس سے بھی چھوٹی...... وہ ایک بستر مرگ پر پڑے بوڑھے آدمی کو اپنا شوہر بتا رہی تھی۔ اور اس کے لیے رو رہی تھی۔
ڈاکٹر کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا تو دوسرے بستر سے اُٹھتے شخص کو اس لڑکی کی سسکیاں سنائی دیں۔ یہ خضر تھا جو بے اختیار اسے دیکھنے پر مجبور ہوگیا...... وہ ایک اجنبی لڑکی کو مخاطب نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس کا دل چاہا کہ اس لڑکی کو مخاطب کرکے پوچھے کہ کیا اسے کسی مدد کی ضرورت ہے۔ وہ اب چہرے سے آنسو صاف کرتی بار بار ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی جیسے اجنبیوں کی بھیڑ میں شرمندگی مٹا دینا چاہتی ہو۔
خضر کے لیے یہ چہرہ بالکل اجنبی تھا۔ لیکن کہیں کچھ تھا، ہلکی سی چھایا۔ چہرے کے کچھ بولتے نقوش جیسے اس سے ملتا جلتا چہرہ وہ پہلے دیکھ چکا ہو۔ کچھ نقوش شناسا سے تھے۔
وہ سوچ کو جھٹکتا ہوا چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا اس کے پاس گیا اور نرمی سے پکارا۔
"ایکسکیوزمی......"
لڑکی نے جھٹکے سے سر اُٹھایا اور ناگواری سے دیکھنے لگی جو اس کے رونے میں خلل ڈالنے چلا آیا تھا۔ روئی روئی آنکھیں ابھی تک خضر پر جمی تھیں کہ وہ کیا چاہتا ہے۔
"کیا آپ کو کسی مدد کی ضرورت ہے؟" خضر نے پھر نرمی سے پوچھا لیکن اس کی آنکھوں میں کاٹ اُتر آئی تھی۔
"ہرگز نہیں......" بلا کے تیکھے لہجے میں کہہ کر وہ سختی سے دوسری سمت دیکھنے لگی کہ کہنے والا کوئی دوسرا سوال نہ کرسکے۔ کیا وہ جانتی نہیں تھی کہ اجنبیوں پر بھروسا کرنا کیسے خود مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ جیسے حالات تھے...... وہ اکیلی ضرور تھی لیکن کسی موقع پرست کی بھینٹ چڑھنے والی نہیں تھی......!!

☆☆☆

"آج بہت مصروف ہوں یار! مدیرہ پچھلے دو

روز سے کالز کر رہی ہیں کہ قسط بھیجنے کی آخری تاریخ بھی آخری سانسیں لینے پر ہے...... پرچا لیٹ ہونے پر بہت شور مچتا ہے مگر کیا کروں اس دفعہ کی قسط کا کچھ ٹیمپو ایشو آ رہا ہے۔ تمہاری بہن کے بقول اس دفعہ زیادہ صفحات دینے ہیں تا کہ پڑھنے والے پورا لطف لے سکیں، اور اگلے ماہ کے انتظار میں کہیں ربط میں کمی نا محسوس ہو لہٰذا ٹائپنگ میں وقت لگ رہا ہے......"

ثمائلہ نے جمائی روکنے کے لیے اپنی زبان کو بریک لگائی اور بال سمیٹنے لگی۔ ثانیہ نے دیکھا کہ وہ سچ کہہ رہی تھی کیونکہ اس کا بے ترتیب حلیہ اسی مصروفیت کی چغلی کھا رہا تھا۔

"مدیرہ بے چاری کہتی ہوں گی کہ کس نکمی رائٹر سے واسطہ پڑ گیا...... جو وقت پر قسط بھی نہیں بھیج پاتی۔" ثانیہ اپنی ہی بات پر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئی۔

"جی نہیں۔ اس نکمی رائٹر کی بہت اہمیت ہے اور وہ خوش بھی ہیں اس سے اور مہربان بھی۔"

"یہ تو اپنے منہ میاں مٹھو والی بات نہیں ہو گئی؟"

"خبردار! تم پر بھی سیمی کا رنگ چڑھتا جا رہا ہے، یاد رکھو کہ تم اپنی بڑی بہن سے مخاطب ہو۔" ثمائلہ کے آنکھیں نکالنے پر وہ شریف بن گئی۔

"چلیں پھر آپ کیوں سنتی ہیں سیمی کی بات...... ایسا بھی کیا ضروری ہے کہ آپ اپنے باقی سارے کام صرف اسی کے لیے چھوڑ دیں۔ صحت بھی تو ضروری ہوتی ہے نا......"

"سچ کہا مائی ڈیئر......" ثمائلہ نے پچکارا۔ "لیکن وہ بھی صحیح کہتی ہے اس لیے کبھی کبھار اس کی بات مان لیتی ہوں۔ آخر دوستی میں اتنا تو چلتا ہے...... بس میں یہ آج رات تک مکمل کر کے میل کر دوں گی۔ اور آئندہ میری توبہ کہ کبھی عین وقت پر کام شروع کروں...... اب وقت سے پہلے ہی تیار رکھوں گی۔"

"ہر انسان ایسی صورت میں اسی قسم کی قسمیں کھاتا ہے۔" ثانیہ نے ہنس کر اُسے اطلاع دی تو ثمائلہ بھی بے ساختہ مسکرا دی۔

"جینئیس......" ثانیہ کے مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔ گلابی گالوں میں گڑھے سے بن گئے تھے...... جس کے بھنور میں کوئی بھی گم ہوتا جائے۔

"چلیں آپ یہ کچھ صفحات سنبھالیں، ایک اور کامیاب ناول کی مبارک باد...... میں چلتی ہوں۔ وہ بکس آ جائیں تو سیمی آپی کو دے دیجیے گا۔"

"شیور...... کل شمریز نے شہر جانا ہے، آ جائیں گی۔" ثمائلہ نے سر ہلایا اور ثانیہ کے جانے سے پہلے کچھ یاد آنے پر پکارا۔ "اور ہاں...... سیمی سے کہنا کل لازمی گھر آئے۔ صبح جلدی، اوکے؟"

"جی ٹھیک......" ثانیہ کہہ کر باہر نکل آئی۔ وہ ثمائلہ کی دی ہوئی کتابیں واپس کرنے آئی تھی اور کچھ نئی کتابوں کا مشورہ دیا۔ ثمائلہ کتابیں منگواتی اور سیمی اس کے پڑھنے کے بعد خود بھی مطالعہ کرتی تھی...... اس لیے ثمائلہ اس کی فرمائش پر بھی کتابیں لے آتی تھی۔

باہر صبح طلوع تھی۔ راج ہنس کے پنکھ جیسی سپید و بے داغ صبح بے حد خوش گوار تھی۔ تیکھی چمکیلی دھوپ مختصر سے عرصے میں گھاس کے کھیتوں کے تمام لباس خشک کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ سورج نکلنے سے پہلے ہوئی رم جھم سے سفید گلابوں پر چمکتے ستارے بھی اب تپش کی کوکھ میں جا سوئے تھے...... مطلع صاف ہونے پر دھرتی یوں چمک رہی تھی کہ آنکھیں چندھیائی تھیں۔ کچھ زمینیں جو موسم بدلنے پر نئی کاشت کے لیے خالی تھیں اُن پر ہل چلاتے ٹریکٹرز صبح ہی کام شروع کر چکے تھے...... اور نوکیلے دانتوں سے زمین کو چیرتے ہل کے پیچھے لپکتے پیلی چونچوں والے پرندوں کی چہچہاہٹیں...... ٹریکٹر پر چلتے گانے کی آوازیں دور سے سنائی دے رہی تھیں۔

عشقے دی گلی وچ آ کے رُل گئے
جوگی بن کن پڑوا کے رُل گئے

(عشق کی گلی میں تباہی تھی، اس میں آ کر عشق

کے لیے پہلے جوگی بنے اور پھر اسی عشق نے رول دیا)

وہ مرکزی دروازہ عبور کرکے باہر نکلی ہی تھی کہ شمریز سے ٹکراؤ ہوگیا...... وہ صبح کی سیر کے لیے نکلا تھا اس لیے ٹراؤزر اور کھلی شرٹ میں تھا۔ ثانیہ کی نظر اس پر پڑی تو رفتار خود بخود سست ہوگئی...... اس نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی تو شمریز کو آواز دینے سے کون روک سکتا ہے۔ دوسری طرف شمریز کی چال میں بھی پھرتی آگئی تھی...... ثانیہ سے کیا بعید کہ دوڑ لگادے...... یوں بھی کتراتی ہی رہتی ہے۔

ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ اڑسے وہ اس کے روبرو آیا تو سرخ و سفید چہرے پر بلا کی تازگی اور ہلکی ہلکی نمی نظر آرہی تھی...... ثانیہ نے بھی رونق کو اس کے چہرے سے جدا ہوتے نہیں دیکھی تھی، تاہم ایک خاص چمک، میٹھی میٹھی مسکان اور بولتی آنکھیں...... ہزار زاویوں سے ان گنت جذبے بیان کرتے چہرے کے رنگ، وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ یہ رنگ اُس کی شخصیت کا خاصہ ہیں...... یا اُسے دیکھ کر بے اختیاری کیفیت میں اُمڈے چلے آتے ہیں۔

''وہ آئے ہمارے گھر اور چل بھی دیے...... انسان کسی کا انتظار بھی کرلیتا ہے۔'' روشن آنکھیں اس پر جما کر وہ اس کا امتحان لینے لگا۔ امتحان دینے والی گھبرا گھبرا گئی۔ اس کی پلکیں نگاہوں کی پہرے دار ہوگئی تھیں......!

''میں ایک کام سے آئی تھی...... ہوگیا تو۔'' اُسے سمجھ نہیں آیا کیا کہے...... یہی کہہ سکی۔ شمریز گھور کر دیکھنے لگا۔ (دیکھتا رہے، وہ کون سا دیکھ رہی ہے...... ثانیہ نے جی کڑا کیا)

''کام کے بغیر بھی بھولے سے آجاؤ گی تو قید ہوجاؤ گی...... یا گناہ ہوگا؟'' اس کی بچوں جیسی خفگی پر ثانیہ سادگی سے ہنس دی۔

''اکثر آجاتی ہوں...... اپنے گھر میں بھی بہت کام ہوتے ہیں۔''

''پھر بھی اپنی ذات سے جڑے لوگوں کا خیال رکھنا چاہیے، ورنہ انسان ناحق تکلیف سے گزرتا رہتا ہے۔''

''یہ بد دعا دے رہے ہیں......؟'' ثانیہ نے مسکراہٹ دبا کر سنجیدگی سے پلکیں اُٹھائیں۔ شمریز نے بے اختیار سر پیچھے کو کیا۔

''باخدا، اس سے پہلے مر نہ جائیں...... ہم تو کسی بھی تکلیف سے بچنے کا آسان ساحل بتا رہے ہیں۔''

''آپ کو کوئی کام ہے یا پھر میں جا سکتی ہوں......؟'' ثانیہ نے فوراً اُسے پھولنے سے روک دیا۔ تو وہ بھی کام کی بات کی طرف آگیا

''ہے نا...... لیکن پہلے بتاؤ ہمیشہ ایسی ہی کیوں بات کرتی ہو، کیا میں کوئی آسیب بن کر تمہارے ساتھ لگا ہوں کہ تمہیں راہِ فرار سوجھنے لگتی ہے؟'' اُس نے عام سے لہجے میں سوال پوچھا۔ ثانیہ کو خاص الخاص شرمندہ ہونا پڑا۔

''ایسی بات تو نہیں ہے...... بس تھوڑی جلدی میں ہوں۔'' اُسے یہی وضاحت بہتر لگی۔

''اچھا یہ کوئی نئی بات ہے......؟'' اُس نے پوری دلچسپی سے پوچھا۔ ''خیر دراصل تمہیں کچھ دینا تھا۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے......؟'' ثانیہ کو بنا سنے اعتراض ہوا تھا۔ شمریز نے اس کی عجلت پر تلملا کر دیکھا۔

''ضرورت ہے، میں تمہارے لیے ایڈمیشن فارم لایا تھا...... اب کہو کہ کیا ضرورت ہے؟'' وہ اسی کا لہجہ لٹا کر منہ پھلا کر کھڑا ہوگیا۔ ثانیہ کی کشادہ آنکھوں میں بے یقینی چھا گئی۔

''ایڈمیشن فارم...... میرے لیے، مگر......'' ایکدم پُرجوشی میں بولتے اُس کی آنکھوں میں چمک ماند پڑی اور مایوسی چھا گئی...... شمریز سے اس کی کیفیت چھپی نہیں رہ سکی۔

''اب کیا ہوا......؟'' اسے بجھا دیکھ کر مزید خفگی سے بولا...... ثانیہ کشمکش کا شکار ہورہی تھی۔

''ابھی تو اس بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں......''

''تو کیا اگلے سال سوچو گی...... میں نے سوچ لیا نا، خوش ہونا چاہیے تمہیں۔'' شمریز اس کا تذبذب سمجھنے سے قاصر تھا۔ ہوا کی چھیڑ چھاڑ سے اُس نے اپنا دوپٹا درست کیا۔

''میرے خوش ہونے سے کیا ہوگا...... گھر میں ایسا کوئی ذکر نہیں چلا، اور مجھے اُمید بھی نہیں ہے......'' وہ اُداسی سے بول کر چپ ہوگئی۔ شمریز کو شاک سا لگا۔

''کیسی اُمید؟ کیا کسی نے منع کیا ہے......؟''

''ابا نے صرف میٹرک تک کی اجازت دی تھی، وہ آگے پڑھنے نہیں دیں گے...... ادارے بھی تو دور پڑیں گے نا۔''

''تم پڑھنا ترک کر سکتی ہو؟'' بے یقینی کی کیفیت نے اُسے حیرت زدہ کر دیا تھا...... یہ وہ لڑکی تھی جس نے اتنی شاندار کامیابی حاصل کی تھی، کیا اتنا آسان تھا چھوڑ دینا......؟ ثانیہ کو اس سے یہی توقع تھی۔ وہ پھیکا سا مسکرا دی۔

''کچھ چیزیں ہمارے بس میں نہیں ہوتیں، سیمی آپی اور مظفر بھائی ایک ساتھ پڑھتے تھے اس لیے دونوں نے بی۔ اے ساتھ کیا۔ مظفر بھائی اُسے ساتھ لے جاتے ہیں...... ان کے دبئی جانے سے پہلے تک مجھے بھی چھوڑنے جاتے رہے مگر اب اکیلے جانا میرے لیے پاسیبل نہیں ہے...... ابا اس کے لیے بھی نہیں مانیں گے۔'' اس نے تفصیل سے روشنی ڈالی تو وہ غور سے اسے دیکھنا لگا۔ جس کے چہرے پر اداسی کھنڈ گئی تھی...... شمریز کا دل بے چینی محسوس کرنے لگا۔

''یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں ہے کہ تم پریشان ہو جاؤ...... میں ہوں نا، تمہیں کالج پک اینڈ ڈراپ سروس دینا میرے ذمے، میں تمہارے ابا سے بات کرلوں گا......'' شمریز نے چٹکی بجاتے اُس کا مسئلہ حل کیا اور ہاتھ جھاڑے...... لو اتنی سی بات......

لیکن ثانیہ یوں اُچھلی جیسے بجلی کی تار کو چھو لیا ہو۔ گھبرا کر اسے ایسے دیکھنے لگی کہ ابھی پہچاننے سے ہی انکار کر دے گی

''ہرگز نہیں، سوچنا بھی مت...... ابا تمہاری بات پر کس طرح کا ردِعمل دے سکتے ہیں تم تصور بھی نہیں کر سکتے...... وہ تمہیں پسند کرتے ہیں لیکن اُنہیں یہ بات پسند نہیں آئے گی اور ہو سکتا ہے وہ تم سے ناراض ہو جائیں۔ اچھا سمجھنے میں اور میرے حق میں بحث کرنے میں فرق ہے وہ برداشت نہیں کریں گے سمجھ گئے تم......'' اُس نے مضبوط اور دوٹوک لہجے میں اُسے خبردار کر دیا...... شمریز نے دیکھا کہ وہ اچھی خاصی ہراساں نظر آرہی تھی۔

''تم مجھے ڈرا رہی ہو......؟''

''میں صرف سمجھا رہی ہوں......''

''تو مت سمجھاؤ......'' وہ بزجستگی سے بولا۔ ''اس سارے میں اگر مجھے کسی چیز کا ڈر ہے تو صرف تمہارا کسی بھی قسم کا نقصان کا سوچ کر...... میں تمہاری کسی بھی خواہش کو ضائع نہیں جانے دینا چاہتا۔ مجھے پتا ہے کہ تمہارا کتنا دل ہے تعلیم حاصل کرنا......''

''آپ کو کچھ سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے، میں سیمی آپی سے کہوں گی وہ بات کرلیں گی اچھا۔'' ثانیہ جھنجلا کر شدید خفگی سے گویا ہوئی تھی۔ کچھ سمجھ ہی نہیں رہا تھا وہ......

''میں بھی کوئی عقل مندانہ ہی قدم اُٹھاتا، کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے...... میں نہیں تو شاکلہ ہے نا۔'' اس نے فخریہ انداز میں کہا اور بھنویں اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگا۔ اُف کارٹون کہیں کا...... ثانیہ بے بسی سے صبر کا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔

''اور اگر کچھ نہ بھی ہو سکا تو فکر مت کرنا...... میں بہت جلد تمہارے لیے ہر راہ استوار کرلوں گا تا کہ تمہیں کوئی روک ٹوک نہ سکے...... تمہیں چھوٹی سے چھوٹی خوشی دینے کا میں نے خود سے عہد کیا ہے۔'' ثانیہ کی خاموشی محسوس کر کے وہ مزید بولا تھا۔

ثانیہ کو محسوس ہو رہا تھا جیسے زمین اُس کے قدم جکڑ چکی ہو۔ شمریز کی معنی خیز باتیں اُس پر بوجھ اُتار دیتی تھیں......!

"ثانیہ......" اُس نے گمبھیر لہجے میں پکارا۔ ساز جیسے دل پر بج کر آیا تھا، انداز میں محبت سے زیادہ اپنائیت کی چاشنی سموئی تھی۔ اُس کی پلکیں لرزنے لگیں...... وہ بہت سنجیدگی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"تم جانتی ہونا میں تمہارے لیے کیا محسوس کرتا ہوں؟" اس نے ایکدم دریافت کیا اور...... ثانیہ کی دھڑکن رُک گئی۔ اُس نے پہلے کبھی یہ سوال نہیں پوچھا تھا۔

"اور کیا تم......" وہ بے ساختہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ ثانیہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے بھی سر جھٹکا

"میرا مقصد محض تمہارے جذبات سے کھیلنا نہیں ہے۔ میرے دل کی صدا پر روح سے لبیک ہوا ہے اور تب ہی میں تمہارے لیے ایسا فیل کرتا ہوں جیسے میری دھڑکنوں کا شور تمہارا میرے دل کے اندر گہرائی تک بسے رہنے کا سبب ہے...... میں نے کبھی تم پر وہ سب آشکار ہی نہیں کیا جو میرے اندر تلاطم پیدا کرتا ہے کیونکہ ابھی اس سب کا وقت نہیں ہے...... لیکن میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ میرا ہی سوچو۔ زبردستی کا تو میں قائل ہی نہیں اور یقین کرو تمہاری مرضی بھی ضرور معلوم کروں گا...... لیکن اچھی لڑکی! میں تمہیں چھیڑنے سے بھی خود کو باز نہیں رکھ سکتا...... تمہاری بوکھلاہٹ مجھے کسی بھی چیز سے زیادہ محظوظ کر سکتی ہے، اور تم وہ لڑکی ہو جسے میں نے اپنے بہت کم عمری میں اپنے گھر چلتے پھرتے دیکھا ہے اور تمہارا چہرہ، تمہاری موجودگی میرے مزاج پر جلتی زمین پر اچانک بارش کی مانند اثر کرتا ہے...... مجھ پر اختیار ہی نہیں رہتا، میں خود بہ خود تمہیں تنگ کرنے لگتا ہوں۔"

وہ کان کھجا کر مجبوری سے ثانیہ کی طرف دیکھنے لگا۔ لبوں کی تراش میں دلفریب مسکراہٹ جگمگا رہی تھی۔ اس کے دل نے آرزو کی کہ اس بے چارے شخص کو نظر اُٹھا کر دیکھ لے جو بچوں جیسی خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ اس پیارے شخص کو جو اسے پوری ایمانداری سے عزت بھی دیتا تھا...... لیکن نظریں دل کی بغاوت کے خلاف چلی گئیں۔ وہ لمحاتی کیفیت کے حصار میں بہہ نہیں سکتی تھی...... !

وہ واقعی بہت اچھا تھا۔ ہر لحاظ سے چاہے جانے کے قابل...... لیکن وہ یہ نہیں چاہتی تھی۔ چاند سورج سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت کرتا ہے تو دن بھر کے لیے "فنا" ہو جاتا ہے......

وہ تو لڑکی تھی۔ جیون بھر کے لیے اپنا وجود کھو بیٹھتی...... خود پر قابو پاتے ہوئے اُس پتھر کی مورتی میں جیسے حرکت کے آثار نظر آئے اور وہ تیزی سے پلٹی...... شمریز نے اُسے نہیں پکارا۔ جانے دیا...... وہ ہمیشہ کی طرح خاموشی سے جا رہی تھی لیکن آج اس کی کیفیت پہلے سے مختلف ضرور ہوئی تھی۔ پہلے وہ کترا کر نکل جاتی تھی، سوچ جھٹک دیتی، خیال سے ہاتھ چھڑاتی مگر آج...... ایک خوشگوار جھونکا تھا جو اُسے محسوس کرا رہا تھا کہ...... پہلے کا تو پتا نہیں لیکن آج شمریز کے لیے اُس کے دل کا دریچہ کھلنے کا اشارہ دے رہا تھا۔ بہار کی پہلی لہر جیسا...... وہ خوش گوار جھونکا...... جو صرف اولین محبت کا ہوتا ہے......!

محبتیں اور فلسفے کبھی قدیم یا جدید نہیں ہوتے
ہم بدل جاتے ہیں
محبتیں
فلموں کی طرح کامیاب یا فلاپ ہوتی ہیں
اور فلسفے
ہمارے ساتھ ہی سرما خوابی میں چلے جاتے ہیں
ہم جو خود فریبی کا شاہکار ہیں
سمجھتے ہیں کہ امر ہو گئے ہیں
حالانکہ ہماری موت کا انتظار کیے بغیر

دوسرے ہماری جگہ لے لیتے ہیں
(نصیر احمد)

☆☆☆

جوں ہی سکتہ ٹوٹا...... پرند سہم گئے۔ حاکم کے سرد، پتھریلے تاثرات نے تاجور کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ تیز قدموں سے دھمک پیدا کرتا وہ پل بھر میں اُن کے سر پر پہنچ چکا تھا...... تاجور کو وقت کے غلط ہونے کا شدت سے احساس ہوا۔ اُنہیں اس وقت یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا......!

''اُوہ تو یہ چکر تھا سارا...... بیٹھ کر مٹھائیاں کھائی جارہی ہیں۔'' اس کے طنزیہ وار کو وہاں موجود دولوگوں نے خاموشی سے سہا...... دولوگ تو سمجھے ہی نہ تھے۔ خالہ تاجور کو دیکھے، دستگیر حاکم کو...... نہ کوئی سلام ہوا، نہ دعا...... تاجور نے آگے آکر پہل کی۔

''حاکم! آرام سے...... آؤ تاجور بیٹی! جگ جگ جیو، سکھی رہو۔'' ابا نے حاکم کو گھرک کر مہربان مسکراہٹ اور نرم لہجے سے تاجور کا استقبال کیا اور سر پر ہاتھ رکھا...... ابا کی ہتھیلی سے شفقت کی ٹھنڈک اُتر کر تاجور کے سر سے پورے جسم میں سرائیت کر گئی تھی۔ ایک دم برسات جیسی ٹھنڈی چھایا کا احساس جاگا تھا...... اُس کا دل چاہا ابا کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دے۔

''آپ کیسے ہیں ابا میاں؟'' تاجور کی آواز خوشی کے بار سے بھیگ گئی تھی۔ حاکم نے بیزاری سے اس کی بات سنی

''آپ مجھے ٹال نہیں سکتے مولوی چچا، یہ یہاں کیا کر رہے ہیں......؟''

''میں نے کہا نا تم سے حاکم......'' اب کے ابا کی آواز میں بھی سختی اتری تھی۔ جانے کس دل سے بات کر رہے تھے...... ضبط کر کے تاجور سے کہنے لگے۔

''بیٹی تم اندر چل کر بیٹھو، شکیلہ بہت یاد کرتی ہے تمہیں...... اپنی خالہ سے باتیں کرو۔ میں کچھ دیر نوجوانوں میں بیٹھتا ہوں۔'' وہ بشاشت سے مسکرا کر بولے۔ تاجور سر ہلا کر خالہ کے ساتھ اندر چلی گئی۔ شکیلہ کی نظر پڑتے ہی بھاگ کر وہ اس کے گلے لگی تھی۔

''تمہاری بہت کمی محسوس ہو رہی تھی تاجو......''

اس کے کندھے پر وہ سسک پڑی۔ تاجور کے دل کو دھکا سا لگا تھا...... وہ تو صرف ہنسنا جانتی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں میں نہیں چمکتے تھے۔

''اس لیے تو میں آ گئی ہوں میری جان...... تم کیوں رونے لگی ہو، طبیعت تو ٹھیک رہی نا؟''

''چڑیا جیسا تو دل ہے اس کا...... ابھی تک تمہارے ساتھ کے بغیر عادی نہیں ہو سکی۔'' خالہ کو بہنوں کی محبت پر پیار آیا۔ شکیلہ الگ ہو کر خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

''تم اپنی بات کرو سب ٹھیک رہا ہے...... حاکم بھائی نے تو کچھ نہیں کہا؟''

اُسے کسی بات کا ڈر تھا۔ اسی ڈر کی پرچھائی وہ تاجور کے تاثرات میں کھوجنے لگی۔ یہی سوال تو تاجور کو بھی کرنا تھا شکیلہ سے...... لیکن کر نہیں سکی۔ جبراً مسکراہٹ چہرے پر گھسیٹنے لگی۔

''اُنہوں نے کیا کہنا تھا...... ابھی ساتھ ہی آئے ہیں۔''

''نہیں وہ مجھے...... رات کو نیند نہیں آتی تھی کہ......'' ایک بار پھر آنکھوں میں پانی پھیلنے لگا تھا۔ وہ اپنا خدشہ زبان پر نہیں لا رہی تھی کہ خالہ تا بھی سے دونوں کی مبہم گفتگو کو سن رہی تھی۔ تاجور نے شکیلہ کے دونوں ہاتھ پکڑ رکھے تھے...... کچھ کہنے سے پہلے وہ مڑ کر باہر دیکھنے لگی جہاں کی آوازیں اندر تک آرہی تھیں۔

''اُٹھو تم بھی...... مجھے چچا سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔'' حاکم نے چٹکی بجا کر اُنگلی کے اشارے سے اُسے اُٹھنے (دفع ہونے) کو کہا۔ دستگیر کو اس کے ہتک آمیز طرز پر ایک دم شرمندگی محسوس ہونے لگی۔

''حاکم یہ کیا طریقہ ہے...... آرام سے بیٹھ کر جو بات ہے کرو، دستگیر گھر کا بچہ ہے۔'' ابا میاں نے

ایک بار پھر سرزنش کی...... حاکم نے سسر کی بات پر خون کے کڑوے گھونٹ حلق سے اُتارے۔
''کس کے گھر کا......؟'' وہ تمسخر سے بولا۔ ''دو دھ پیتا ننھا بچہ......''
دستگیر خفت زدہ سا اُٹھ کھڑا ہوا۔
''حاکم بھائی بیٹھو تم...... کوئی مسئلہ نہیں، میں اندر چلا جاتا ہوں۔''
''کون بھائی؟ مجھے شوق نہیں ہر کسی سے بے تعلق رشتے بنانے کا...... اور کیوں جاؤ گے تم اندر، کس حق سے...... شرم نہیں آتی تمہیں؟'' اس کے ایک دم کرخت لہجے اور سخت الفاظ نے دستگیر کو دم بخود کر دیا تھا...... حاکم کا بے سبب کھردرا پن اس کے لیے ناقابل فہم تھا۔
''کس بات کی شرم...... کیا میرا کوئی رشتہ نہیں بنتا حاکم...... میرے خالو اور......''
''جو رشتہ بنتا ہے اس کی حقیقت سے بھی میں اچھی طرح واقف ہوں، اگر خالو مانا ہوتا تو پیٹھ پیچھے بدکاری کا چھرا نہ گھونپتے......'' اس نے اپنے اندر اُبلتا زہر باہر اُگل دیا۔ دستگیر کو اس وقت یہاں دیکھ کر ہی اس کا ضبط جواب دے رہا تھا...... دستگیر کا جواب سننے تک ابا کو چپ رہنا دوبھر لگا۔
''حاکم! میں کہتا ہوں، خاموش ہو جاؤ......''
''میں خاموش ہی رہنا چاہتا ہوں لیکن یہ آپ ہیں جن کے دوغلے پن نے مجھے آواز بلند کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔''
''یہ تم کیا واہیات بک رہے ہو......'' دستگیر کو شاک لگا۔ اس کا پہلے بھی حاکم کے ساتھ کوئی دوستانہ نہیں تھا مگر وہ اس کے اس روپ سے آگاہ نہیں تھا......
''دستگیر! جاؤ تم اندر......'' ابا کو لگا دونوں ابھی لڑ جائیں گے۔ کم از کم حاکم کے تیور انہیں ڈرا رہے تھے۔
''نہیں مولوی خالو، میں سننا چاہتا ہوں...... کیا ہے آخر حقیقت ہمارے رشتے کی؟'' وہ اب حاکم کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔
''اچھا......'' نفرت کے لبوں سے اُبلی ہنسی نے حاکم کے چہرے کو مسخ کر دیا تھا۔ ''جاؤ میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتا۔''
''اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے اپنا منہ بند رکھتے...... جواب دینا سب کو آتا ہے فرق صرف تہذیب و شرافت کا ہوتا ہے......''
''شرافت......'' حاکم نے اس کی بات پکڑی۔ ''تم دو ٹکے کے انسان، تم بات کرو گے شرافت کی...... جس کی اپنی ذات غلیظ داغوں کے ان مٹ نشانوں سے مسخ ہے تم حاکم کے سامنے بولو گے...... اوقات کیا ہے تمہاری؟''
حاکم کی دھاڑ نے درختوں کے سارے پرندے بھی اُڑائے اور اندر کھڑی تاجور کے ہاتھوں کے بھی...... وہ کپکپا کر رہ گئی تھی۔ خالہ بے اختیار اُٹھ کر چوکھٹ میں آئیں۔
''یہ کیا ہو رہا ہے تاجو...... تمہارا کوئی جھگڑا ہوا ہے؟'' خالہ اسے مخاطب کر کے پریشان صورت دیکھنے لگیں۔ شکیلہ نے تاجور کا رخ موڑا۔
''حاکم بھائی پہلے بھی بہت تماشا کر کے گئے ہیں......'' وہ خوف زدہ ہو رہی تھی۔ ''بہت برے الزام لگا کر......''
''الزام......؟'' تاجور کے دل میں سے مونہہ کانٹا پیوست ہوا۔ وہ بے یقینی سے شکیلہ کو دیکھنے لگی۔
''ابا میاں سہہ نہیں پائیں گے، روز روز کا جھگڑا تاجو...... ہمارے گھر کی ان کچی دیواروں کو تو اُونچی ہنسی سننے کی بھی عادت نہیں ہے ابا کیسے برداشت کر رہے ہوں گے۔'' وہ سر جھکا کر رونے لگی۔ خالہ کے وجود کو دونوں فراموش کر چکی تھیں۔
''اور یہ سب میری وجہ سے ہو رہا ہے۔'' روتے روتے اُس نے پلکیں اُٹھائیں۔ تاجور ساکت سی کھڑی ہوئی تھی۔
''ابا کو جس پر اعتراض ہے حاکم بھائی وہ بات خاطر میں نہیں لا رہے، مجھے اعتراض نہیں ہے

تاجو...... ابا اور تم جو فیصلہ کرو مجھے منظور ہوگا۔"
"تم خود کو قصور وار مت سمجھو شکیلہ...... ابا جو فیصلہ کریں گے سوچ سمجھ کر کریں گے۔"
"لیکن اس میں تمہارا گھر بھی خراب ہو رہا ہے تاجو...... میں نہیں چاہتی کہ وہ تمہیں کچھ کہیں، اگر میری وجہ سے تمہارے لیے مشکلات کھڑی ہوئیں......"
"تم میرے لیے قربانی دو گی۔" تاجور پھیکی سا مسکرا دی۔ حالانکہ اس کا دل اداسی کی دبیز چادر میں دھنستا جا رہا تھا۔
"خوشی خوشی...... میں سچ کہہ رہی ہوں تاجور......" وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بچوں جیسا شفاف سچ چمکنے لگا تھا......
تاجور کا دل پگھلنے لگا۔ وہ اپنی ہی بہن کو اپنے لیے قربان کر سکتی ہے؟ اس کی زندگی میں پُر پیچ موڑ چل رہے تھے۔ الجھے رستے، بگڑتے رشتے لیکن وہ خود غرض تھی کیا کہ انہی مشکلوں میں اسے بھی گھسیٹ لیتی......؟
"تم سے اچھی اُمید کیسے تھی مجھے......" کچھ دیر کے پھیلے سکوت میں دستگیر کے ملامتی لہجے نے ہی چھید ڈالا۔ اُس کی آنکھوں میں حاکم کے لیے کراہیت جھلک رہی تھی۔
"نکلے نا تم بھی اپنے بھائی کی طرح...... وہ کردار میں ایسا، اور تم سوچ میں......" دستگیر کا وار کاری تھا۔ حاکم کا دماغ گھوما...... اس نے جو سمجھا، وہ اپنے معنی سمیت بہت کچھ اس پر کھول گیا تھا۔
"تو تم تھے وہ...... میں پہلے ہی کیوں نہیں سمجھ گیا۔ تم نے میرے بھائی کے خلاف یہ زہر بھرا ہے دستگیر......"
وہ غراتا ہوا دستگیر کی طرف بڑھا اور اس کے گریبان سے پکڑ کر اتنے زور سے جھنجوڑا کہ اس کے قدم زمین سے اکھڑ گئے تھے...... مولوی حیات کی آواز بھی حاکم کے شور میں زمین پر گری سوئی کی مانند بے آواز گئی تھی۔

"تم نے اپنا مطلب نکالنے کے لیے میرے بھائی پر کیچڑ اُچھالا...... تم جیسا نیچ انسان ایسا ہی کر سکتا ہے۔ جب تم جانتے تھے کہ شکیلہ ہمارے گھر کی عزت ہے تم نے اس پر غلیظ نگاہ ڈالنے کی جرأت بھی کیسے کی...... تمہیں تو میں وہ سبق سکھاؤں گا کہ دیکھنے لائق نہیں رہو گے۔"
اس کے دو تین تھپڑوں نے دستگیر کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا...... اس کا کالر ایک طرف سے پھٹ گیا تھا۔ کمروں کی طرف سے باہر کا منظر دیکھ کر تینوں کے منہ سے دبی دبی چیخیں برآمد ہوئی تھیں......
"حاکم! دستگیر کو چھوڑ دو......" ابا نے غضب ناک ہو کر حاکم کو پیچھے سے کھینچ کر پرے دھکیلا...... ان کی ہڈیوں میں اتنا دم نہیں تھا کہ اس فولاد کو پرے کر دیتے لیکن دستگیر کے لیے اتنا سا موقع بہت ثابت ہوا۔ وہ اب حاکم کو جواب دینے کے قابل ہو چکا تھا۔
"حاکم! رک جائیں......" تاجور نے بے قابو سانسوں کے ساتھ کمزور آواز میں التجا کی۔ حالات اس کی توقع سے بڑھ کر خراب ہو گئے تھے۔
"گھٹیا پن جس میں رچ چکا ہو وہ چھپائے نہیں چھپتا...... میں لعنت بھیجتا ہوں کہ تمہارے بھائی پر باتیں کرتا پھروں۔ جو سارا جگ جانتا ہے وہ میں کیا کسی کو بتاؤں گا...... لیکن ایک بات تو ثابت ہو گئی کہ تم لوگ قابل نہیں ہو شکیلہ کے...... نہ ہی تاجور کے۔ اس سے اچھا تھا کہ وہ ساری زندگی اسی گھر میں رہ جاتیں......"
دستگیر سرخ آنکھوں کے ساتھ اب حاکم کا گریبان بھی حاکم سے بڑھ کر سختی سے جکڑے کہہ رہا تھا...... تاجور نے آگے آ کر دستگیر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تیزی سے بولی۔
"دستگیر! چھوڑو انہیں...... میں کہہ رہی ہوں پیچھے ہٹو۔" اس کی بھرائی آواز پر دستگیر نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ شکیلہ چوکھٹ میں کھڑی لرز رہی

تھی...... اور جھٹکا دے کر حاکم کو تین قدم دور کر دیا۔ خالہ دستگیر کے آگے آ کر سینے پر ہاتھ رکھے اب کھا جانے والی نظروں سے حاکم کو گھور رہی تھیں......

"تم نے حد ختم کر دی اب حاکم......" ابا ہانپتے ہانپتے بمشکل بولے۔ اس سارے تماشے میں شدت جذبات سے ان کے جسم پر لرزش طاری ہو رہی تھی۔

"ایک نہایت غلط فیصلہ تھا جو میں نے پہلے کیا...... بہر حال دوسرا ہرگز نہیں کروں گا۔" ان کے لہجے میں کچھ تھا، وہ کانپتا نہیں تھا چٹانوں سا سخت تھا...... تاجور کی سانس رک گئی۔

"ایک باپ کے منہ پر اس کی بیٹی کے کردار پر کیچڑ اُچھالنے کے بعد تم اگر سوچ رہے ہو کہ لڑ جھگڑ کر مجھے مجبور کر دو گے تو تمہاری اس سوچ کو آج ختم ہو جانا ہے...... اس مٹھائی کا نہیں پوچھا تم نے؟" اُنہوں نے ایک نظر تاجور پر ڈالی...... وہ چپ چاپ انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

"میں نے شکیلہ کی بات دستگیر سے طے کر دی ہے...... اب تم اُلٹے بھی لٹک جاؤ تو اپنی مقررہ تاریخ پر اس کا نکاح بھی ہو کر رہے گا۔ جمعے...... اگلے جمعے۔"

اُنہوں نے بات نہیں کی گویا منتر پھونک دیا۔ تمام نفوس اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے تھے...... شکیلہ نے دروازہ تھاما۔ اور دستگیر گنگ تھا...... یہ مٹھائی وہ زمین خریدنے کی خوشی میں لے کر آیا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک جس بات کا شائبہ تک نہ تھا...... وہ اب ایسی حقیقت بن کر ٹھوس وجود سمیت اُن کے درمیان آ کھڑی تھی جو برسوں نہ ٹوٹ سکتی، نہ اپنی جگہ سے ہلتی...... ابا کے لہجے میں جو قطعیت تھی وہ لچکائی ہرگز نہیں تھی۔ حاکم شل سا کھڑا دیکھ رہا تھا......

"یہ...... یہ جھوٹ ہے سراسر، میں نہیں مانتا......" حاکم کو قطعی یقین نہیں آیا۔ لیکن ابا کی آنکھوں میں چٹانی سختیاں تھیں۔

"میں ضروری سمجھتا بھی نہیں کہ تم مانو۔ یہ مٹھائی اسی بات کی نشانی ہے حاکم، تم لوگوں نے خود اپنی قدر میری نظروں سے گنوائی ہے۔"

"آپ ایسا نہیں کر سکتے......" حاکم نے سرگوشی کی۔ اس کے گھمنڈ کا سورج ڈوبنے لگا...... مجھے انکار نہیں ہو سکتا کا زعم، چکنی مٹی پر چلتے ننگے پیروں جیسا تھا۔ پھسل کر منہ کے بل گرا

"مجھے یقین ہے کہ میری بات میں اتنی مضبوطی ضروری ہوگی کہ یہ میرے اٹل ارادے کو ظاہر کر دے...... دوسری صورت میں اگلے جمعہ تک انتظار کر لو۔"

"آپ بھول رہے ہیں کہ آپ کی دوسری بیٹی میری دسترس میں ہے، اگر شکیلہ کی شادی کہیں اور ہوئی تو اس کا کیا کریں گے......" حاکم نے دکھتی رگ ٹٹولی اور مروڑ دی...... یہ بازی کھیلنی بھی تو باقی تھی۔

"وہ تمہاری بیوی ہے، تمہارا اس پر حق ہے لیکن شکیلہ پر تمہارا حق نہیں ہے۔ اگلے جمعے میں اسے رخصت کر دوں گا تا کہ تم مزید اوچھے ہتھکنڈوں سے باز رہ سکو۔" ان کا لہجہ ٹھنڈا تھا...... پُرسکون! جیسے طوفان کے بعد ٹھہراؤ کا سماں ہوتا ہے۔ وہ جانے کیسا طوفان اندر قید کیے ہوئے تھے۔

"میں آپ کو ساری زندگی تاجور کی شکل نہیں دیکھنے دوں گا۔" حاکم نے چبا چبا کر الفاظ ادا کیے۔

ابا کا دل لرزا، نگاہیں تاجور تک گئیں...... اور تاجور۔ وہ نگاہیں زمین پر گاڑھے کھڑی تھی۔ وہ ابا کو نہیں دیکھ سکتی تھی...... وہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ ابا کمزور پڑیں۔ وہ ابا کو اپنی کنواری بیٹی کے لیے بہترین فیصلہ کرنے دینا چاہتی تھی۔ وہ اپنا نہیں سوچ رہی تھی، وہ اپنے بزرگ ابا کی اذیت میں کرلا رہی تھی......!!

"تم اس وقت یہاں سے چلے جاؤ، میں اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کروں گا۔"

"یہ آخری دفعہ ہوگا کہ میں نے اس گھر میں قدم رکھا...... اس رشتے کو ہمیشہ کے لیے آپ کو بھلانا ہوگا۔"

"میں......" ابا کی آواز کانپی۔ لفظوں نے

حلق میں منہ چھپایا تھا۔ "اپنی بات پر قائم ہوں...... میری دوسری بیٹی اب نہیں بیاہی جائے گی تمہارے گھر۔" انہوں نے ٹکڑوں میں جملوں کی ادائیگی کردی۔ اور گرنے کے سے انداز میں چارپائی کا سہارا لیا...... سب کچھ پس منظر میں ہوتا چلا گیا۔ اُن میں مزید سکت نہیں تھی۔

"تاجور......"

حاکم کی دھاڑ پر اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ آنکھوں میں کرب کی ریت رواں تھی...... ایک مجبور بیٹی جس کا دل باپ کی طرف مائل بہ فریاد ہو...... اور دوسری طرف بیوی کے فرائض...... اس کے چہرے پر نقش تحریر کم از کم ایک شوہر پڑھنا نہیں جانتا تھا۔

"آج سے میرا یہاں موجود کسی شخص سے کوئی تعلق نہیں ہے...... تاجور نے آپ سے......" دونوں آنکھیں مولوی حیات پر جمائیں۔

"حاکم نہیں......" تاجور کے بے جان لبوں کے چوکھٹ یہ دو لفظ لانگھنے کی جرات کر پائے۔

"میری اجازت کے بغیر تاجور نے زندگی بھر آپ کو اپنی صورت دکھائی......"

"خدا کے لیے......" وہ خدا کے رحم کو آواز دینے لگی...... حاکم کوئی سخت بات نہ کہہ دے جو......

"تو...... میں اسے تین طلاقوں سے حرام سمجھوں گا......"

"نہیں......" شکیلہ کی آنکھیں گھٹی گھٹی چیخ میں اتنی پھٹ گئیں کہ پورے چہرے پر پھیل جانے کا خدشہ جاگ اُٹھا۔

"ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے بے دخل......" اُس نے کہہ دیا اور یہ صرف کہنا تو نہیں تھا...... نہیں۔

"حاکم......" تاجور کی چور آواز میں جو شور تھا...... وہ دکھ کی مجموعی شکل تھی۔ بات کی نوکیلی میخوں نے ایک بیٹی کا سینہ شق کیا اور ہر دکھ نے مات کھائی...... ابا کی پیاری بیٹی اپنی ذات کے آسماں سے ستارہ بن کر ٹوٹی اور اگنی کے سمندر میں غرقاب ہوئی......

آسمانی قیامت سے پہلے بھی کوئی زمینی قیامت آتی ہے تو وہ ان تین لوگوں کے لیے ایسی تھی۔

حاکم نے تاجور کی کلائی سے جکڑا اور گھسیٹتا ہوا ان کے بیچ سے نکلنے لگا...... تاجور نے گردن گھما کر شکیلہ کو دیکھا تو زخمی تاثرات کے ساتھ قدم اُکھاڑے اس کی سمت بھاگ کر آنا چاہتی تھی لیکن کسی بات کی سنگینی نے اعصاب شل کر رکھے تھے۔ ابا لٹے پٹے سے سر جھکائے بیٹھے تھے جیسے اپنی شکست کو گلے لگا چکے ہوں۔ سب تھم چکا تھا۔ بات ختم ہو چکی تھی...... اور بات جہاں سے ختم ہوئی سیاہ رات وہاں سے شروع......!

☆☆☆

اور شروع بھی ایسی کہ پھر کیا دل، کیا دماغ...... پوری زندگی پر چھا گئی۔

آج نہ پردے کا خیال رہا، نہ کسی شریک کا...... گلی کوچوں میں بھٹکتے لوگ سو جھے، نہ ٹھکانوں لوٹتے آدم زاد...... چند قدموں نے گلیوں کا فاصلہ پاٹا۔ ایک دھپ پر دروازہ کھلا اور ڈھلک ڈھلک جاتے دوپٹے سے برہنہ ہوتے سر والی کا وجود چکی کے دو پاٹوں میں آکر پسنے لگا۔ کالی آندھی، ہیبت ناک طوفان اور دیو جیسی طاقت کو اپنی رفتار سے مات دیتے اس انسان کی رگوں میں کوئی ایسا پارہ دوڑتا تھا جیسے دیسی کالی مرچوں کے کھیت کوٹ کوٹ کر سونگھتا رہا ہو۔ اور اب یہ سفوف خون میں شامل ہو کر لاوا بن گیا ہو......!

حاکم کے مضبوط شکنجے میں جکڑی تاجور کی پتلی کلائی ناقابل برداشت گرفت کے سبب رگیں کھینچ اور ہڈی تڑخ تڑخ گئی۔

"یارب خیر......" حاکم کی ماں حمیدہ نے جنونی انداز میں حاکم کو اندر آتے دیکھا تو دہل گئی۔ اس کا چہرہ اتنا سرخ نظر آ رہا تھا جیسے گرم ریت بھاپ بن کر اُڑتی جا رہی ہو۔

"حاکم مجھے درد ہو رہا ہے۔" تاجور نے کراہ کر زبان کھولی لیکن حاکم نے سنا نہیں۔ صحن عبور کر کے سب کو نظر انداز کرتے اُس نے اپنے کمرے کا دروازہ لات مار کر کھولا اور تاجور کو فرش پر جتنی قوت سے پٹخا، ایک زوردار آواز کے ساتھ انسانی چیخ بھی گونج اُٹھی تھی۔

"کیا کہا تھا میں نے تمہیں......؟" پلٹ کر اُس نے دروازہ بند کیا اور بھوکے شکاری کی مانند اس پر جھپٹا۔ نیلم اور اماں خوف زدہ ہو کر لپکی تھیں۔

"تم میرے ساتھ گئی تھیں کہ میرے حق میں بولو گی، لیکن تم اگر پہلے سے ہی ان میں شامل تھیں تو میری بے عزتی کرانا ضروری تھی۔" نجانے کہاں سے اس کے پاس رسی آ گئی جسے ڈبل کر کے وہ اندھا دھند تاجور پر کوڑے کی طرح برسانے لگا۔ وہ دلخراش چیخیں تھیں جس میں حاکم کی آواز دب گئی تھی۔

"حاکم! دروازہ کھول پتر۔" اماں نے ہراساں ہو کر دروازہ پیٹ ڈالا۔ نیلم بھی تاجور کی چیخوں سے ڈر کر دروازے کو جھٹکے دینے لگی تھی۔

"میں تو سمجھتا رہا کہ پردے میں لپٹی مولوی حیات کی بیٹیاں واقعی کوئی کردار رکھتی ہوں گی، مجھے تو اسی دن سمجھ جانا چاہیے تھا کہ یہ سب تو ڈھونگ ہے...... میرے بس میں ہوتا تو شروع سے ہی تم دونوں کو جوتے کی نوک پر رکھتا، اگر بات غیرت کی نہ آتی...... اب جب لوگ ہنسیں گے کہ وہ دیکھو حاکم کے بھائی کی منکوحہ، جو کسی اور کے ساتھ جا رہی ہے تم لوگوں کو سکون آ جائے گا...... یہ رہ جائے گی تمہارے شوہر کی عزت۔"

وہ کف اُڑاتا آپے سے باہر ہو چکا تھا...... غصے کا آتش فشاں پھٹ کر تاجور کو داغ دار کرتا جا رہا تھا۔ اس کے لہجے کی حقارت محسوس کرنے کے لیے تاجور کو ساعتیں چاہیے تھیں جو اس سے سائیں سائیں کر رہی تھیں...... وہ اب اپنے جوتوں کے ساتھ اس پر لاتیں برسا رہا تھا۔

"حاکم میں کہتی ہوں دروازہ کھول...... مر جائے گی وہ، نیلم جا کے دیکھ صدام کہاں ہے جلدی کر......" پھولے ہاتھ پیروں کے ساتھ اُنہوں نے نیلم کو دھکا دیا۔ نیلم کو خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کہاں جا کر دیکھے۔ تاجور کی اب صرف رونے کی آواز تھی جو ہموار ہو کر باہر تک آ رہی تھی۔ حاکم کی ضربوں سے بھی اس میں اُتار چڑھاؤ اور شدت نہیں رہی تھی......

"اگر وہاں جا کر یہی تماشا ہی کرنا تھا تو یہاں کیوں نہیں بتایا...... بہن کو شہ دینے والی تم، مجھے رسوا کرنے والی تم...... آج اگر ااپنے بڈھے باپ پر زور ڈالا ہوتا تم نے تو اس دو ٹکے کے بندے کے آگے میں منہ چھپا کر نہ نکلتا...... لیکن اب تم بھگتو۔ چھوڑوں گا تو نہیں تمہیں...... ایک ایک چیز کا حساب تم دو گی۔ ساری زندگی تمہیں نہیں ملنے دوں گا کسی سے، ترسیں گے سب...... پھر احساس ہوگا کہ کس مرد سے واسطہ پڑا تھا۔"

کتنی دیر تک وہ چپ چاپ مری چھپکلی کی طرح زمین پر چمٹی رہی۔ کتنا وقت حاکم اپنے مرد ہونے کا احساس جگا کر اسے زخم لگاتا رہا۔ کب اس کی ساس اندر آئی اور اسے سیدھا کرنے کے لیے ہاتھ پشت پر رکھا تو ہاتھ لرز کر رہ گیا تھا، تاجور کو اس چیز کا حساب رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ زمین پر اُوندھے منہ پڑی رہی...... وہ زمین کا حصہ بن چکی تھی۔ دھیرے دھیرے سانس لیتی اور مٹی کو ناک کے راستے اندر لے جاتی...... صرف آنکھیں تھیں جو منحوس ماری عادی ہی نہیں ہو پاتیں کہ اذیت اُنہیں ڈھیٹ کر دے، بے حس کر دے اور وہ رونے سے اُکتا جائیں۔ انہیں بار بار پانی کے تھال اُلٹنے کی چاہ رہتی ہے اور وہی پانی اس کی آنکھوں سے بہتا جا رہا تھا...... اذیت صرف جسمانی نہیں تھی نجانے کس کس کے دکھ کا سیال تاجور کے اندر سے ہو کر آنکھوں سے رواں تھا۔

"ابا......" اُس کا رواں رواں ایک ہی نام پکار رہا تھا......

ابا نے کہا تھا کہ اپنے اپنے ہوتے ہیں...... مار بھی لیں تو مار کر چھاؤں میں ڈالتے ہیں۔ ابا سچے تھے مگر کتنی عجیب منطق تھی ابا کی...... وہ دیکھ بھی نہیں سکتے تھے کہ اپنوں پر مان کا قاعدہ کچھ اور ہونا چاہیے۔ اگر اپنوں نے بھی مارنا لازم ہی ہے تو تپتی دھوپ میں ڈالیں یا ٹھنڈی چھاؤں میں......

کیا فرق پڑتا ہے؟

☆☆☆

انگاروں پر راکھ کی تہ بیٹھ چکی تھی۔ تپش چھپ گئی اور گرماہٹ رہ گئی۔ آسمان پر ثبت بجھے بجھے تاروں کے نیچے حاکم صدام کے مقابل بیٹھا ہوا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ ہم جیسے لوگوں کے لیے یہ بات چھوٹی سی نہیں ہے لیکن میں اسے اب مزید بڑھنے نہیں دوں گا...... تم صرف اتنا سمجھو کہ وہ لڑکی تمہارے قابل بھی نہیں تھی۔''

''تم کیوں دل جلا رہے ہو حاکم، کیا میں نے تم سے کچھ کہا ہے؟'' صدام کی سنجیدگی عروج پر تھی۔

''تمہارے نہ کہنے سے میں تمہارے دل کا حال نہیں جان سکتا؟ میں ابھی زندہ ہوں اور تمہارے ساتھ کھڑا ہوں...... میں کسی کو خوش نہیں رہنے دوں گا کہ وہ سمجھیں ہمیں ہرا دیا۔''

''تم کیا چاہتے ہو اب؟'' صدام نے استفسار کیا۔

''ساری بات جس بات سے شروع ہوئی اسی سے ختم کرنی ہے۔ میں تمہاری شادی کروانا چاہتا ہوں۔''

''جلدی کیا ہے حاکم......'' وہ غیر آرام دہ ہوا۔ حاکم اپنی گہری سوچ سے بتانے جا رہا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ شکیلہ کی شادی کے ساتھ ہی تمہارے شادی بھی ہو جائے تاکہ انہیں منہ توڑ جواب ملے...... تم جس کا بھی کہو گے میں وعدہ کرتا ہوں اسی کے گھر تمہارا رشتہ لے کر جاؤں گا۔'' حاکم نے مضبوط لہجے میں اسے یقین دلایا تو وہ نظریں اُٹھا کر حاکم کو دیکھنے لگا۔ اس کی طبیعت میں شروع سے ہی ضد تھی اور اس وقت بے چینی...... اس کو دیکھتے ہوئے اس وقت بھی صدام کے ذہن کے کسی خانے میں صبا کا ہلکا سا عکس لہرا گیا تھا۔ ایک حسرت ناتمام......!

''میں نے اس بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں۔'' ذہن کو جھٹک کر اس نے کہہ دیا۔

''تو پھر مجھ پر بھروسا کر لو۔''

''تم پر تو بھروسا ہے، میں کوئی اعتراض کر سکتا ہوں؟''

صدام کی بات نے حاکم کے لبوں پر مسکان بکھیر دی تھی۔ وہ فخر سے کھڑا ہوا اور صدام کو گلے سے لگا لیا۔

''میرا بھائی ہیرا ہے...... وہ لوگ واقعی تمہارے قابل نہیں ہیں۔'' بغل گیر ہو کر حاکم نے یہ بات اس سے کہی۔ صدام کو خوشی ہوئی تھی۔

''میں چلتا ہوں اپنے ڈیرے پر، رات ہو گئی ہے۔''

''آج یہیں رک جاؤ، اندھیرے میں کیسے جاؤ گے؟'' حاکم کو فکر ہوئی

''آج رات پانی کی باری ہے، فکر مند نہ ہو سیدھا راستہ تو جاتا ہے......'' وہ مل کر باڑے کے احاطے سے باہر نکل آیا۔ ذہن کے خوش رو خیال کے سنگ اس کی زبان پر ایک سرائیکی رومانوی گیت کے بول چڑھنے لگے۔ رات کا جادو اپنے اسرار کھولنے لگا اور وہ قدم قدم اُٹھاتا اپنی سلطنت کی سمت بڑھنے لگا، جہاں اس کے دوست انتظار کر رہے ہوں گے۔

''بات بالآخر ختم ہو گئی تھی۔''

اس نے اپنے کندھوں پر پڑا نادیدہ بوجھ جھاڑ دیا۔ اسے کسی چیز سے فرق نہیں پڑا تھا...... وہ کسی بھی بوجھ سے آزاد نہایت بے فکر تھا۔

☆☆☆

آسماں پر بکھری نارنجی شعاعوں کے شانوں سے ڈھلکتی ہوا روبرو آتی ہر شے کی پیشانی چھو رہی تھی۔ مدھم پڑتے اُفقی کناروں سے بہتی پیلی

دھوپ، درختوں میں سرسراہٹ پیدا کرتی ہوا، اور فضاؤں کے ہلکے پن پر ایک خوشگوار سی شام آنگن میں ٹھہر چکی تھی۔

''تائی جی! کیا آپ کو پتا ہے کہ نو سو چوہے کھانے کے بعد بلی حج پر کیوں چلی جاتی ہے؟ اور بالفرض اگر چلی بھی جاتی ہے تو کیا گارنٹی ہے کہ واپسی پر وہ چوہا دیکھ کر شریف بنی رہے گی اور اس پر ہرگز نہیں جھپٹے گی...... کیونکہ بھئی چوہا بلی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے نا۔ بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ چولی دامن اور قینچی کا...... کچھ کہیں گی آپ؟''

ثانیہ بی بی پر پھر سے کوئی خطاب کرنے کا بھوت سوار ہو رہا تھا۔ جس سنجیدگی سے اس نے اپنی بات مکمل کی تائی جی نے اسے ایسے دیکھا جیسے کہتی ہو دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا، کیا بک رہی ہو...... لیکن وہ بنا کوئی نوٹس لیے جواب کی منتظر تھی۔ سیمی برآمدے میں اماں کے آگے بیٹھی تھی اور وہ اس کے سر میں سرسوں کے تیل کی مالش کر رہی تھیں۔

''میں تو صرف یہی کہوں گی کہ تمہاری زبان اور قینچی کا بھی چولی دامن جیسا ساتھ ہے۔ اس کے آگے تو پوری خندق ہے......'' تائی جی نے جل کر جواب دیا تو ثانیہ کا منہ بن گیا۔

''آپ تو برا ہی مان گئیں تائی محترمہ...... سوال گندم جواب چنا۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض کروں کہ جس خندق کا دیدار آج تک میری والدہ ماجدہ نہ کر سکیں وہ آپ نے کیسے پرکھ لی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ تانکا جھانکی کی عادت رکھتی ہیں پھر تو بلی والے مسئلے کا جواب بھی آپ کو ضرور ہی معلوم ہونا چاہیے۔''

''میری ایسی کوئی عادت نہیں ہے۔ یہ تو تمہیں خبر ہو گی کیونکہ تمہاری ماں کو ہی بڑا ناز ہے اپنی بیٹیوں کی قابلیت پر......''

تائی جی نے اب اماں پر طنز کیا تھا لیکن وہ بنا جواب دیے سیمی کے سر پر ہاتھ چلائے جا رہی تھیں جو کبھی ایک آنکھ بند کرتی تو دوسری کھولتی...... کبھی ہلکا سا کراہ کر اماں کو منع کرتی مگر اماں......

''چپ بیٹھی رہو، سر خشک ہو کر اسٹیل کے برتنوں کی طرح بج رہا ہے۔ کچھ اپنا خیال کر لو، بال جھڑنا شروع ہو جائیں گے گنجی لگو گی۔''

سیمی سن کر کھی کھی کرنے لگتی۔ پھر ثانیہ کے ارشادات کی طرف متوجہ ہو جاتی۔

''اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔ بلکہ مجھے تو یہ شک ہے کہ بلی یقیناً مکار عورتوں کی طرح چال چلتی ہے کہ وہ نو سو چوہے کھا کر اب جا رہی ہے...... لیکن درحقیقت اس نے چوہوں کو لاپروا کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ مزید ان کا شکار کر سکے۔ ویسے تائی مجھے تو اس بندے کی قابلیت پر حیرت ہے جو دن رات ایک کر کے تعداد گنتا رہا کہ بلی نے پورے نو سو چوہے کھائے...... مجھے تو یہ بھی کسی چالاک عورت کا ہی کام لگتا ہے جس نے بات اپنے آدمی پر ڈال دی ہو گی۔''

ثانیہ نے بہت ہمدردی سے آنکھیں گھما گھما کر بڑے پتے کی بات تائی کے گوش گزار کی لیکن انہوں نے ایک شکلی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

''اپنے یہ سارے تجربات تم اپنی ماں کو جا کر سناؤ تاکہ وہ اس سے کوئی فائدہ اٹھائے۔ لیکن تمہاری تو یہ فضول ہی عادت ہے بھینس کے آگے بین بجانے کی......''

''کیا کہا آپ نے تائی محترمہ؟ ہمیں قطعی اُمید نہ تھی کہ آپ خود کو ''بھینس'' کہہ دیں گی...... اور ہماری گفتگو کیا اتنی سریلی ہے کہ آپ کو یہ بین کے سروں جیسی لگ رہی ہے؟''

ثانیہ مارے عقیدت کے آنکھوں میں آنسو بھر لائی تو سیمی کی اُونچی سروں کی ہنسی دبتے دبتے بھی تائی جی کی سماعتوں پر بھنبھناتی پہنچ چکی تھی۔ اماں نے سختی سے ٹوکا

''ثانیہ! اُٹھ جاؤ ادھر سے......''

''ارے کیوں، تم کیوں اُٹھاؤ گی اسے۔ تمہاری بیٹی اپنی تربیت کے جوہر تو دکھا ہی رہی ہے

خوش ہو جاؤ...... پتا نہیں ایسی کون سی خوبی ہے جس کے بل پر تم ان پر فخر کیے تھکتیں نہیں۔"

تائی جی نے ہمیشہ کی طرح تلخ لہجے میں تربیت پر پتھر مارا۔ وہ نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔

"اوہو، آپ کیوں ناراض ہو رہی ہیں، یہ ہمارا معاملہ ہے نا، کیا میں کبھی خفا ہوئی ہوں آپ سے...... میں تو سیدھی بات کر رہی ہوں کہ حقیقت دراصل وہی ہوتی ہے لیکن پھر وہ کہتے ہیں نا کہ بکرے کی ماں بھی کب تک خیر منائی گی۔"

"اچھا تو تائی! یہ جو بیٹے میرا مطلب بکرے کی ماں ہوتی ہے نا......" ثانیہ اب پینترا بدل کر کسی دوسرے فلسفے کی گود میں پناہ لینا چاہ رہی تھی۔

سیمی دل ہی دل میں ہنستی چیزیں اُٹھانے لگی۔ اماں ہاتھ دھونے چلی گئیں......

ثانیہ ایسا ہی کرتی تھی۔ تائی جی جب کبھی کوئی بات ہوتی اپنے شوہر کو ہی آگے کر دیتی تھیں اور پھر سیمی کو بہو بنانے کے بعد کی دھمکیاں تو ڈھکے لفظوں میں ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ایسے میں ثانیہ بھی موقع پا کر گھما پھرا کر تاک تاک کر جملے برساتی جاتی تھی جس سے تائی جی خوب تلملاتیں۔

"تمہاری یہی زبان ایک نہ ایک دن ضرور رنگ دکھائے گی۔" ابا کو گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر تائی جی نے اُنہیں سنانے کے لیے اُونچی آواز میں کہا اور شدید ناراضی سے دیکھنے لگیں۔

ثانیہ نے فوراً شرافت کا لباس اُوڑھتے ہوئے سرگوشی کرنا ضروری سمجھا۔

"اس کی چھوڑیے۔ آپ بکرے کی ماں والی تھیوری پر غور کیجیے۔" ہلکا سا ہنستی ہوئی کھسک گئی۔

شام کا سورج گھاس میں گرنے والا تھا کہ صحن میں اُترنے والی شام سبز سبز سی رونما ہو رہی تھی۔ وسیع صحن صاف ستھرا لگ رہا تھا، اس لیے پیلے پنجوں والے پکھیرو دھیرے دھیرے مٹرگشت کرتے ٹھنڈی چھایا میں سکھ سانس لیتے تھے۔ گرمیوں کے یہ حبس بھرے دن تھے۔ ابا قدم قدم اُٹھاتے آئے تو چھوٹا سا موبائل ان کی ہتھیلی میں چھپا چھپا نظر آ رہا تھا۔

"سیمی ماں کو بلاؤ...... مظفر کا فون ہے۔"

"مظفر بھائی!" سیمی کا دل مچلا اور ثانیہ کی آنکھوں میں خوشی...... پردیس میں بسے بھائی کی آواز سننا ایک نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ وہ بھی اس صورت کہ ابا بات بھی کبھی کبھار کرواتے۔

"سیمی! آواز کچھ بڑھاؤ۔"

اماں کو بیٹے سے خاص محبت تھی۔ ممتا ان کی آواز میں دھڑک رہی تھی...... سیمی نے فون ان کے کان سے لگایا تو وہ سانسیں درست کرتیں کمرے میں چلی گئیں۔ اماں کسی کے سامنے بات نہیں کرتی تھیں، ہمیشہ اکیلے میں کرتیں...... گلے شکوے، محبتوں کے اقرار، دعائیں، بے تابیاں اور نجانے کیا کیا...... تائی جی نے ناک چڑھا کر ابا کی سمت دیکھا۔

"ہمیں تو جیسے شریکے میں گنتی ہے۔ چھپ کر ساری برائیاں کرے گی تمہاری بیوی میری...... بچیوں کو بھی یہی گھول کر پلایا ہوا ہے۔ اس لیے تو کبھی مظفر نے بات کی مجھ سے......"

ابا نے بھابھی کا دکھڑا خاموشی سے سنا پھر ہولے سے مسکرا دیے۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ مظفر بہت عزت کرتا ہے آپ کی......"

"عزت......" تائی جی کا لہجہ ایسا تمسخرانہ ہو گیا کہ ابا جی وضاحت میں کچھ بول نہیں سکے تھے۔ وہ دیورانی سے ہمیشہ ہی بدگمان رہتی تھیں، شاید فطری چپقلش......!

سیمی اور ثانیہ ابا کے سامنے کبھی جواب نہیں دیتی تھیں۔ اماں نے کچھ دیر بعد کمرے سے سر نکالا اور بیٹیوں کو آواز دی۔

"سیمی، ثانی آ جاؤ...... بھائی بلا رہا ہے۔"

وہ دونوں چمکتی آنکھوں کے ساتھ سرعت سے اندر لپکیں۔ مظفر بھائی نے ان کی آواز سنتے ہی شرارت سے چھیڑا تھا۔

"کیسی ہیں میری دونوں شرارتی بلیاں......
کیا ابھی بھی گھر کو میدان جنگ بنالیتی ہو یا اماں نے سدھار دیا ہے۔" یمی سن کر ہنستی چلی گئی۔

"آج سب کی زبان پر بلیاں کیوں چڑھی ہیں...... یہ سوال اپنی چھوٹی بہن سے کرو، ابھی بلیوں پر ایسے لیکچر دے کر آئی ہے جیسے اسی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔" یمی کی بات پر ثانیہ نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھا جبکہ مظفر کا قہقہہ سنائی دیا تھا۔

"اس تعریف کا بہت شکریہ، لیکن ہم بگڑے ہوئے کب ہیں کہ اماں کو سدھارنا پڑے...... یہ تو بس یمی سارا کام خراب کر دیتی ہے۔" ثانیہ نے کہنی چبھوئی۔

"جی نہیں! میری بہن بہت معصوم ہے۔ اپنے کارنامے اس کے سر پر نہ ڈالو۔" مظفر نے فوراً سائیڈ لی تو ثانیہ منہ بالکل موبائل میں گھسا کر بولی۔

"اچھا جی، یہ معصوم ہیں اور وہ بھی بہت...... میں جا رہی ہوں نالے میں چھلانگ لگانے۔" تینوں کے قہقہے بے ساختہ ایک ساتھ گونج گئے تھے۔

"فضول بولتی ہے...... تم سناؤ کیسے ہو بھائی۔" یمی نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ ثانیہ چپ چاپ جواب سننے لگی۔

"اچھا ہوں! مس کرتا ہوں تم لوگوں کو......"

"اچھا اس لیے تو آئے روز کالز پر کالز کرتے ہو نا۔" یمی کے شکوے پر ثانیہ نے فوراً ٹکڑا لگایا۔

"پہلے کیا کہتے تھے کہ ہر تیسرے روز بات کروں گا۔ پھر تو جمعہ کے جمعہ بھی گیا...... بھائی پردیس جائیں یا شادی کریں بدل ہی جاتے ہیں۔"

"ہاہاہا میری چھوٹی ناراض چڑی، بات نہ کرنے سے یاد آنی بند ہو جاتی ہے؟ یہاں سے ایک تو کال مہنگی پڑتی ہے پھر کام کے لیے ڈبل شفٹنگ ہوتی ہے...... ابا سے کتنی دفعہ کہا کہ دوسرا موبائل بھیج دیتا ہوں۔ نیٹ کی کال سستی پڑ جاتی ہے اب تو...... مگر تمہارے ابا ہیں سمجھاؤ انہیں۔"

"تم نے کب آنا ہے، سال سے اُوپر ہو گیا ہے۔" یمی نے اداسی سے پوچھا۔ آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔

"آ جاؤں گا، زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا۔" اس نے تسلی دی

"کب......؟" ثانیہ تسلی میں نہیں آئی۔

"تھوڑا سا وقت دو......" وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔ "ابا حضور کے ارادے ہیں کہ واپسی کے ساتھ ہی سہرا باندھنا ہے۔ مجھ پر اور مجھے کسی کھونٹے سے، تم لوگوں کو یہ سکون راس نہیں ہے؟"

ثانیہ اس کی اشارہ سمجھ کر چہکی۔

"ہرگز نہیں! آپ کو تو پتا ہی نہیں کہ جو لطف تائی جی کے ساتھ چونچ لڑانے میں مجھے آتا ہے وہ کسی اور چیز میں کہاں...... ہمیں تو لڑاکا بھابی بقائمی ہوش و حواس منظور ہے۔"

مظفر کا ایک اور جاندار قہقہہ دونوں کی مسرت کا باعث بنا۔ وہ بہت محظوظ ہو کر ہنسی کے درمیان بولا تھا۔

"یہ جواب صرف ثانی کا ہی ہو سکتا ہے۔ لوگ دیکھیں گے لڑائیاں دو بھینسوں کی......"

"دو نہیں ایک...... مجھ جیسی نازک لڑکی کو بھینس کہنا تو قطعی مناسب نہیں۔" ثانیہ کی شوخی کم نہیں ہوئی۔

"تو پھر کیا ارادہ ہے......؟" یمی نے بھی شرارت سے چھیڑا۔

"فی الحال معاف کرو، یہ بتاؤ تمہارے لیے کیا بھیجوں...... اپنی چیزوں کی لسٹ بنالو۔"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے بھائی۔ بس تم خود آ جاؤ اماں بہت یاد کرتی ہیں اور ہم بھی......"

"ابا اور تایا جی معین کے نکاح کے بارے میں بات کر رہے تھے مجھ سے...... میری بھی تو ذمہ داریاں ہیں نا، تم مجھے بلا جھجک بتانا میں خود نہ آ سکا تو بھجوا دوں گا۔ اور تائی جی کا رویہ اب کیسا ہے؟" مظفر کے لہجے میں تھوڑی سی فکرمندی جھلکتی یمی کے

لبوں کی مدھم مسکان میں ڈھل گئی تھی۔
"اس عمر میں آکر رویے بدلنا کوئی آسان تھوڑی رہ جاتا ہے۔ ہمیں عادت پڑ چکی ہے۔"
"میں معین سے بات کروں گا...... ابھی کوئی جلدی نہیں کر رہے لیکن تم میری ہدایت یاد رکھنا۔ کچھ بھی ضرورت ہو مجھے بتانا اور اماں کا خیال رکھا کرو۔"
اب وہ بڑا بھائی بن کر نصیحت کر رہا تھا۔ سیمی نے محبت سے مسکراتے ہوئے موبائل ثانیہ کو دیا۔ جو وہ اُٹھائے باہر چلی گئی کہ ابا انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔
سیمی کچھ دیر تک چوکھٹ میں بیٹھی رہی...... سبز شام بھی اس کی چھوٹی سی جنت میں اب ڈوبتی جا رہی تھی۔ اس چھوٹی سی جنت میں محبتوں کے یہ عطر بیز بسیرے اُسے مکمل مکمل سے لگے......!

☆☆☆

"تاجور!"
لکڑی کا دروازہ چیختا ہوا وا ہوا تو روشنی اپنی ساخت پر ایک لکیر میں ڈھلی اور فرش پر پڑا وجود روشن ہو گیا۔
ہواؤں کی خشک سانسوں میں کچھ ایسی باس کی آمیزش تھی جیسے اس میں کسی اداس تنہا شخص کی آہیں شامل ہو گئی ہوں......!
گھر کی ویرانی کا وہ عالم تھا کہ گھور سیاہ پہاڑی کوا نجانے کب سے کائیں کائیں کرتا نحوست پھیلائے جا رہا تھا۔ سورج کی آنکھوں میں قہر پنہاں تھا۔ اس میں بھی قصور اس پر اُترتے جوبن کا تھا کہ جو کچھ نہیں دیکھتا، صرف جلاتا ہے...... آگ ایسے رنگوں میں۔ ساری ٹھنڈک چوس لیتا ہے صرف خشکی چھوڑتا ہے۔ جو اسے خود پسند ہے...... گرمیاں موسم کے نرم ہونٹ خشک کر کے اس پر اپنی راج دھانی قائم کر چکی تھی۔
لکڑی کا دروازہ چیختا ہوا وا ہوا تو روشنی اپنی ساخت پر ایک لکیر میں ڈھل کر فرش پر پڑا وجود روشن کر گئی...... وہ دم سادھے لمحوں میں دبے قدم چلتی، شرمندہ شرمندہ سی آنکھیں چراتی اس کے قریب گئی اور چائے کا پیالہ زمین پر رکھ دیا۔ گولیوں کے پتے نے مبہم سی آواز پیدا کی...... اور اُس نے بہت آہستگی سے پکارا تھا۔
"تاجور......" تاجور نے اپنی آنکھیں کھولیں اور سر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ نیلم تھی۔ نادم، فکرمند اور افسوس سے دیکھتی ہوئی...... تاجور کے جسم پر ایسے نیل پڑ رہے تھے جیسے کوئی روئی تیزاب میں بھگو بھگو کر چہرے پر لکیریں بناتا رہا ہو۔ نیلم کی نظریں جھک گئیں۔
"چائے لائی ہوں...... گولی بھی۔ شاید بخار ہو رہا ہے۔"
بخار کی تمازت سے سرخی اور زخموں کے نیلے پن نے مل کر اُس کی صورت کا اصل رنگ چھپا لیا تھا۔ بلا چوں چرا کے تاجور اُٹھ بیٹھی اور اتنی ہی خاموشی سے پیالے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا...... نیلم کے لیے یہ غیر متوقع تھا تاہم ایک مشکل مرحلہ آسان ہو گیا۔
"یہ سب تمہارے ابا کی وجہ سے ہوا تاجور...... نہ وہ خود غرضی دکھاتے نہ حاکم بھائی...... اب کہیں تو غصہ اُتارنا تھا۔" اُس نے دھیمی آواز میں شاید وہ کہنے کی کوشش کی جو تاجور کو سننے کی چاہ نہیں تھی۔ تاجور نے کامل خاموشی سے چائے سے بھرا پیالہ لبوں سے لگایا اور خشک حلق سے چائے و صبر کے گھونٹ کو اندر اُتارا۔ جسم کو ٹکور ملنے لگی تھی...... نجانے چائے کی گرمائش سے یا صبر کے مرہم سے......!
نیلم پھر سے کہنے لگی۔ "مجھے دکھ ہے تمہاری حالت کا...... لیکن تمہارے ابا نے ہی تمہارا نہیں سوچا۔"
"کیا سوچتے ابا......؟" اس نے سوئی سوئی آواز میں حیرت سے پوچھا۔
"انہوں نے جو کیا غلط کیا......"
"کیا میری بہن خریدی گئی چیز تھی تم لوگوں کی؟" اس کی آواز میں غیر معمولی بوجھل پن رچا ہوا

تھا۔

''کیا تم اب بھی...... اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود بھی اُن کی طرف داری کر رہی ہو؟'' نیلم کی ساری ہمدردی بھک سے اُڑی اور تناؤ ماتھے پر سکڑنے لگا۔

''اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود یہاں بھی تو بیٹھی ہوں نا...... کیا سمجھتی ہو؟'' وہ خالی پن سے نیلم کو دیکھنے لگی۔

''یعنی تمہارے ابا ہر حال میں بے قصور ہیں......؟''

''اُنہیں ''تمہارے ابا'' کہہ کر مت پکارو، ورنہ میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہوں گی......''

''آفرین ہے تاجور......'' تلخی سے نیلم کھڑی ہوگئی۔ ''میں ہی بے وقوف تھی جو رات سے افسوس لیے پھر رہی تھی...... لیکن ہو نا تم بھی اسی باپ کی بیٹی، یہ ساری تم سب کی ملی بھگت تھی بیچ میں میرے بھائیوں کو بدنام کر دیا۔''

''حیرت ہے ان بھائیوں کی بہن کی رات ابا کی بیٹی کے افسوس میں غارت چلی گئی۔'' تاجور کے ہونٹوں پر جو ہنسی آئی اس نے نیلم کو تحیر میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہونٹوں پر پڑی دراڑیں، اور آنسوؤں کی لکیروں سے پیدا ہوتا رخساروں کا کھنچاؤ، لگتا تھا جیسے کوئی پاگل بیٹھا اپنا مذاق اُڑا رہا ہو۔

نیلم نے بہت مہربانی کی کہ چپکے سے باہر نکل گئی۔

شاید ڈر گئی تھی یا اسے کسی برتر ذات کا خوف یاد آ گیا تھا...... تاجور آنکھوں میں آئی نمی کو پیچھے دھکیلتی گھونٹ گھونٹ بچی چائے اپنے اندر منتقل کرنے لگی۔ اس کا جوڑ جوڑ اپنی جگہ سے ہل گیا تھا یا ہڈیاں آپس میں فیوز ہو گئی تھیں درد اس چیز کا نہیں تھا...... یہ کوئی اور ہی اذیت تھی جو باقی چوٹوں پر حاوی ہو کر یکسر فراموشی کا عالم طاری کر رہی تھی۔

ہتھیلی اُبھری پرانی اینٹوں کے فرش پر جما کر اُس نے زمین کا سہارا اپنے وجود کو دیا اور چکراتے سر کو سنبھالتی کھڑی ہونے میں کامیاب ہوگئی...... جسم نے اسے اذیت پسندی کا احساس دلایا اور آنکھیں تیز روشنی کے احتجاج میں پلکوں میں پناہ گزیں ہوئیں مگر وہ بغیر ان کی مانے کمرے سے باہر نکل آئی۔

گھر میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ حمیدہ شاید کسی گھر گئی تھی اور نیلم کے ساتھ حاکم بھی غائب...... درخت کے پاس پڑا جھاڑو اُٹھا کر تاجور نے صحن صاف کیا، پھر رات اور صبح کے برتن کوئلوں سے مانجھ کر نلکا چلا چلا کر دھوئے، چارپائی دھوپ میں کھینچ کر خشک ہونے رکھے۔ کونے میں دھونے کے لیے جمع ہوئے سارے میلے کپڑوں کو بغل میں دبائے وہ نلکے کی طرف جا رہی تھی جب بازوؤں میں لرزش واضح محسوس ہونے لگی تھی۔ بازو چوٹوں کے سبب اکڑے اکڑے تھے اور ہاتھوں پر خراشوں سے کھنچاؤ محسوس ہو رہا تھا مگر وہ اپنی ذمہ داریاں نبھائے گئی۔ آس پاس کی دیواروں اور چھتوں سے جھانکتے سروں نے رات کے شور کے سبب اگر آج کسی دوسرے طوفان کا پورے یقین کے ساتھ انتظار کیا تھا تو وہ تاجور نے بڑی خاموشی کے ساتھ پی لیا......

حاکم سے جو ہو سکا اس نے کر دیا۔

تاجور وہ کر رہی تھی جو ''وہ'' تھی۔

☆☆☆

نک سک سے تیار خضر یونیورسٹی کی کلاس لے کر باہر آیا تو جا بہ جا کتابوں کے صفحات درمیان سے کھولے لڑکوں اور لڑکیوں کے گروپ نظر آ رہے تھے۔ اس نے لحظہ بھر کے لیے اپنا بازو آنکھوں کے سامنے کیا اور کلائی پر بندھی واچ سے وقت پر نظر ڈالی۔ اس کے ہاتھ میں چند کاغذات تھے۔ دوسری نظر اس نے گراؤنڈ میں بکھرے گروپس پر ڈالی کہ اپنے دوستوں کو تلاش کر سکے۔ اسے کچھ دور ہونٹوں پر بال پوائنٹ بجاتی دریہ نظر آ گئی۔ وہ تمام گول دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ کچھ سر پکڑے...... کچھ کنپٹیاں۔

''اُف، یہ سب نرا سر درد ہے۔ اچھی بھلی ہیں

گھر بیٹھی تھی نجانے کون سا وقت تھا جو یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا نامعقول شوق سر پر چڑھ گیا۔" نعیمہ نے کڑوا سا منہ بنا کر وقت کو کوسا اور گہری آہ خارج کی۔ خضر سن کر ہنس پڑا۔ باقی جھکے سر اوپر کو اٹھے۔

"یہ تم کن ہواؤں میں اُڑ رہے ہو...... پھر شکوہ بھی جناب کا ہوتا ہے کہ مجھے ڈسکشن میں شامل نہیں کیا جاتا۔" نعیمہ اس پر بگڑ گئی۔ ان دونوں میں کافی بے تکلفی تھی۔ خضر اب کی بار چڑانے کے لیے ہنسنے لگا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں جب کوئی ٹینشن تمہارے سر پر سوار ہو تو تم اسی طرح کے قیمتی خیالات کا اظہار کرتی ہو...... گھر بیٹھ کر تم نے کون سا دنیا کو سکون پہنچا دینا تھا۔"

"میں اپنے سکون کو ترس گئی ہوں دنیا کیا میری سگی لگتی ہے۔" اس نے اکتاہٹ سے کہا۔

"ہائے، گھر بیٹھ کر آرام سے رشتوں کی لمبی لائن سے آنکھیں سینکتی، آئے روز ان کے سامنے پیش ہوتے آئٹمز پہلے میرے ہاتھ اور منہ سے گزر کر جاتے۔ پھر کچھ ہوتا یا نہ ہوتا ہماری صحت کو کیا پروا ہے۔" نعیمہ کے چہرے پر وہ تاثرات تھے گویا تصور سے ہی سواد آگیا ہو۔ مسکراہٹ سب کے چہروں پر ایک ساتھ دوڑ گئی تھی۔

"دنیا میں شادی کے علاوہ لڑکیوں کے لیے کوئی کام باقی نہیں رہ گیا۔" خضر نے ہنسی دبا کر مصنوعی تاسف کا اظہار کیا۔ جیسے تمام لڑکیوں کے لیے بے چاری، بے چاری والی فیلنگز...... دریہ اور ماہین کو ہرگز برداشت نہ ہوا۔

"یہ تم کیوں سب لڑکیوں کو ایک ہی ڈنڈے سے ہانک رہے ہو۔ ہمیں دیکھو ہم تو یہ ڈگری فتح کیے بنا کوئی چین کا سانس نہیں لیں گی۔ اس سے پہلے تو یہ نامعقول خیال ہمارے پاس بھی نہ بھٹکے۔" اس نے یہ بات خضر کے جواب میں کہی اور فہمائشی نظر ڈالی نعیمہ پر......

"میرے ہاتھ میں نہ تو کوئی ڈنڈا ہے اور نہ لڑکیاں کوئی بھیڑ بکریاں اور نہ میں چرواہا کہ انہیں ہانک رہا ہوں...... لیکن یہ جیسی تمہاری بات ہے نا یہ خود بھی ظاہر کر رہی ہے وہی گھریلو ذمہ داریاں اور مال مویشی کی دیکھ بھال کرنا...... یعنی بات گھوم پھر کر وہیں پہنچ گئی۔" چرواہے نے بات توڑ کر انہیں واپس لوٹا دی۔ آنکھوں میں شرارت تھی، چہرے پر افسوس...... دریہ گڑبڑائی۔ اور بلال کا قہقہہ بلند ہوا تھا۔

"دریہ لمبا سا انگرکھا پہنے، اوڑھنی سنبھالتی مال مویشی کے پیچھے پیچھے...... ناٹ بیڈ!" بلال نے پنسل لبوں پر رکھ کر یہ تخیلاتی منظر خلا میں گھور کر دیکھا اور ستائش نظر دریہ پر ڈالی۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے چلائی۔

"شٹ اپ...... زہریلی سوچ۔" زہریلی سوچ والے کا زہریلا قہقہہ گونجا۔

"اچھا بھئی خاموش، سب دعا کرو کہ کسی طرح یہ ڈگری مکمل ہو اور ہم سب کی جان چھوٹ جائے۔ پڑھ پڑھ کر میں تو پاگل ہوتی جا رہی ہوں۔" نعیمہ نے سب کو خاموش کرا کر متوقع جنگ ختم کر دی۔ خضر نے جواب دیا

"آخر میں بڑن لوگی تو یہی ہوگا...... ہمیں دیکھو، وقت کی قدر کرنے والوں پر اس کا ثمر......"

"ہاں بھئی تم کھاؤ یہ ثمر اور بس وقت سے ہی قدر کرواتے رہو۔ تمہارے کام کا کیا ہوا...... کچھ کر بھی رہے ہو یا خالی اپنی دنیا میں مگن۔ دیکھ لو میرے اسکرپٹ کو ریجیکٹ کرنے کا نتیجہ......" نعیمہ اپنا دکھ بھولی نہیں تھی۔ طعنہ دینے سے باز نہیں آئی۔

خضر مسکرا دیا۔

"کام میں ہی تو مگن ہوں۔ بہت جلد نتیجہ تم بھی دیکھ لینا۔" وہ مزے سے بولا۔

"ایسا کیا ہوا...... کچھ بات بنی؟" وہ مارے تجسس کے آگے کو ہوئی۔

"جی مادام...... میں اس سنڈے شمائلہ خان سے ملاقات کرنے جا رہا ہوں۔ اور اس سے پہلے

عرض ہے کہ ہماری ٹیلی فونک گفتگو ہو چکی ہے۔"
خضر نے دل پر ہاتھ رکھ کر سر کو خم دیا۔ نعیمہ اب بے یقینی سے پیچھے ہوئی تھی۔

"واقعی...... سچ کہہ رہے ہو کیا وہ واقعی وہی ہیں؟ مطلب تمہارے گاؤں سے اور پرفیوم گیلری میں ملنے والیں؟" چھوٹی سی محفل میں گرم جوشی کی لہر دوڑ اٹھی تھی۔

"بالکل، وہ وہی ہیں اور میں نے نمبر بھجوایا تھا ان کو جس سے انہوں نے کال کی...... ان کی یادداشت بھی اتنی اچھی ضرور ہے کہ مجھے یاد بھی رکھے ہوئے ہیں اور بہت اچھے سے بات کی۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر انوائٹ کیا ہے۔" اس نے تفصیل سے آگاہ کیا تو نعیمہ کھل کر خوشی سے بولی۔

"واہ خضر! کیا بات ہے۔ مجھے تم سے یہی اُمید تھی...... اُف، خوشی بے قابو ہو رہی ہے کاش ہم بھی تمہارے گاؤں چل سکتیں اور ایک نشست شمائلہ خان کے ساتھ ہو سکتی۔"

"لکی مین...... تم واحد پیس نہیں ہو یعنی تمہارے پورے گاؤں کی زمین بہت زرخیز ہے۔" بلال نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"اس میں کوئی دو رائے نہیں...... تمہارے یہ تاثرات میں ضرور ان تک پہنچا دوں گا۔ اور نعیمہ اس کے لیے گاؤں آنا لازمی نہیں۔ مجھے ان سے تھوڑا سا فری ہونے دو پھر تم سب سے ملاقات بھی ضرور کروا دوں گا۔"

"کیا فری...... تم ان سے فری ہونے کا ارادہ رکھتے ہو؟" ان کی آنکھیں اُبلیں، نعیمہ کا مشکوک جاسوسانہ انداز۔ خضر کا بے ساختہ قہقہہ سنائی دیا تھا۔

"اُف، میرا مطلب تھا کہ......" خضر نے ہنستے ہنستے وضاحت کے لیے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ہنسی دبائی، مسکراہٹ کا راستہ روکا...... وہ سب اس کا مطلب جاننے کے مشتاق و منتظر تھے۔ خضر ہنسی کے دوران ہی بتانے لگا۔ اس ہنسی میں خوشی تھی۔ معصومانہ، سچی اور بے ریا...... خوشی، خضر کے اندر سے جھلکتی، باہر کو لپکتی۔

☆☆☆

ہجوم غم میں بھی توہین برداشت نہ ہوئی
اس احتیاط سے روئے کہ آنکھ نم نہ ہوئی

تیز دھوپ میں دیوار کے ساتھ کھڑا لوہے کا تلکا تپ رہا تھا۔ دھوپ میں بیٹھا وجود بھی اس تپش کو بے نیازی سے سہہ رہا تھا۔

"ٹھک ٹھک ٹھک......"

سرف میں بھیگے سفید کپڑوں کو نچوڑتے تاجور کے ہاتھ اس لمحے کو ساکت ہو گئے تھے جب دروازے کی معمول کی دستک الہام کی صورت اس کے دل پر گواہی بن کر گری تھی۔ یہ اس کے گھر کا فرد ہو سکتا تھا نہ کوئی آس پڑوس سے...... یہ کوئی اپنائیت کی صندل کی مہکار جیسی خوشبو تھی جو آبنوسی لکڑی سے گزر کر دور بیٹھی تاجور کو چھو گئی تھی...... کپڑے وہیں چھوڑ کر جھاگ کے بلبلے جھٹکتی، پلو سے پونچھتی وہ دروازے کے قریب گئی اور جوں ہی دونوں ہاتھ دروازے پر رکھے پتھر ہو گئی تھی۔

"تاجور! میری پیاری بیٹی......!"

یہ مولوی حیات تھے، اس کے پیارے ابا......
آنکھوں میں آنسوؤں کا ریلا آیا اور منہ لفظ "ابا" کہنے کے لیے یوں کھل گیا کہ آواز کہیں گم ہو گئی تھی۔ اس نے بہت کوشش کر کے زبان کو کئی بار حرکت دی مگر دکھ کی شدت سے وہ خالی سی تھی۔ تو وہ اب تک اس لیے چپ تھی کہ قریب کوئی اپنا نہیں تھا۔ کسی اپنے کا کندھا اتنا زور آور ہوتا ہے جو صبر کے بند کو توڑ کر لے جاتا تھا...... درد کسی اپنے کے دل پر کھلتا ہے۔ وہ اتنی بے قابو ہو جائے گی یہ اس نے بھی نہیں سوچا تھا۔

"دروازہ مت کھولنا تاجور...... مجھے معلوم ہے کواڑ کے پیچھے تم کھڑی ہو۔" ابا کی آواز بہت مغموم تھی، وہ بہت دھیرے بول رہے تھے۔ تاجور نے دونوں ہاتھ سختی سے منہ پر رکھ لیے کہ کہیں وہ بلند آواز میں رو نہ دے...... بند آنکھوں سے جھرنے پھوٹ پڑے تھے۔

"میں تمہارا مجرم ہوں میری بیٹی! رات کانٹوں پر گزار کر آیا ہوں مگر بخوبی جانتا ہوں کہ جو کچھ بیٹی کے دل پر گزرا ہو یہ تو اس کے آگے کچھ بھی نہیں...... خدا گواہ ہے کہ حالات ایسے ہو جائیں گے تمہارے اس بے وقوف باپ کو کچھ پتا نہیں تھا۔" مولوی حیات کا لہجہ سیلاب میں بھیگتا لگ رہا تھا۔

"میں نے حاکم پر اعتبار کیا کہ میری بچیوں کا کوئی آسرا نہیں میں مطمئن ہو کر مر سکوں گا مگر یہ جو میں نے کیا یہ تو مجھے قبر میں بھی چین نہیں لینے دے گا...... اپنے بدقسمت باپ کو معاف کر دینا، باوجود اس کہ تمہاری معافی بھی مجھے بری الذمہ نہیں کرتی۔ تمہاری ہر تکلیف مجھے اتنا تڑپائے گی کہ کسی روز شاید برداشت ہی نہ کر سکوں......"

تاجور نے تیزی سے دھندلی آنکھیں اُٹھائیں۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ خدا کے لیے اس طرح کی گفتگو مت کریں...... یہ دل میں سوراخ کرتی جا رہی ہیں، ان کا کوئی قصور وہ نہیں مانتی۔ یا کاش وہ یہ دروازہ جو لکڑی کا بے جان ٹکڑا تھا ہٹا کر ابا کو دیکھ سکتی...... ان سے لپٹ جاتی۔ سر پر ہاتھ رکھواتی یا ماتھے پر بوسہ۔ لیکن حاکم کی بات پوری طرح اس کے ذہن میں روشن تھی وہ بے بس تھی اور اس حالت میں ابا کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی۔

"میں نے بہت سوچا تاجور۔ تم شاید مجھے خود غرض سمجھو مگر میں شکیلہ کو ان لوگوں کے حوالے کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ وہ سوچ، سمجھ اور ہمت میں تم سے کہیں پیچھے ہے اور ایسے لوگوں کی خواہش کے لیے بھلے سونے کے پانی میں بھی نہا کر آ جاؤ ان کی خصلت کبھی نہیں بدلتی...... کوئی یقین نہیں کہ شکیلہ کا رشتہ ہونے کے بعد یہ لوگ بہتر رویہ اختیار کر لیں بلکہ شکیلہ کو بھی ہم مشکل کے حوالے کر دیں گے...... انہوں نے میری پاکیزہ بچی پر کیچڑ اُچھالا ہے تاجور۔ اس لیے میں نے بہت سوچ کر شکیلہ کا نکاح واقعی دستگیر کے ساتھ پکا کر دیا ہے......"

ان کی آواز بہت بھرا گئی تھی۔ مولوی حیات نے چپکے سے اپنی آنکھیں صاف کیں، گلا صاف کیا اور دوبارہ گویا ہوئے۔

"لوگ مولوی حیات کی دور اندیشی کی داد دیتے ہیں مگر مولوی حیات ایک باپ کا کردار اچھا نہ نباہ سکا۔ شاید بیٹیوں کے باپ کو بہت سی فکریں ہوتی ہیں اور انہی فکروں کو سوار کر کے وہ شاید غلط قدم اُٹھا بیٹھتے ہیں۔ میں اللہ سے دعا کروں گا کہ میری کوتاہی کی سزا مجھے یوں نہ ملے...... میری پیاری تاجور یہ شاید تمہاری قسمت بھی تھی اور قسمت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی، اس کی یہی اچھائی ہے کہ یہ اچھائی ضرور لاتی ہے۔ میں جانتا ہوں تم بہت صبر والی ہو اور اللہ اس کا تمہیں اجر دے گا۔ حاکم جیسا بھی ہو تمہارا شوہر ہے اور اب ہم سے زیادہ تمہارا اس سے واسطہ ہے...... وہ جیسا چاہے ویسا ہی کرنا۔ جمعے کو شکیلہ کا نکاح ہے میں حاکم کی منت کروں گا کہ تمہیں شرکت کرنے دے اور اپنی قسم واپس لے لے...... ورنہ...... ورنہ تم اپنے باپ سے ناراض نہ رہنا تاجور، دل برا مت کرنا۔"

ان کی آواز میں ایک بے بس لاچار سا دکھ بولتا تھا۔ اور تاجور کا دل کٹ کٹ کر گرنے لگا تھا...... وہ جانتی تھی اب ابا اپنی سفید پگڑی کا ایک کونا اُٹھا کر آنکھیں صاف کریں گے۔ اور مولوی حیات نے یہی کیا۔

"میں حاکم کو اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔ مجھے وہ پسند تھا کہ اُس کی ذمہ دار طبیعت تھی لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنا یہ رنگ بھی دکھا سکتا ہے...... کاش میں بھی ایک بیٹے کا باپ ہوتا تاجور۔ کاش تمہارا یہ باپ مجبور نہ ہوتا...... ان مجبوریوں کو تمہاری سزا نہ بننے دیتا۔"

دروازہ نہیں کھلنا تھا...... دروازہ نہیں کھلا۔ مولوی حیات آخری بار تاجور سے کچھ کہنے آئے تھے کچھ سنے بغیر شکستہ قدم گھسیٹتے واپس جا رہے تھے۔ تاجور دروازے کی سمت گھٹنوں کے بل گر گئی اور اس سے کسی انسان کی مانند لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔

شدت سے سسکیاں ضبط کرنے سے گردن و پیشانی کی رگیں بے حد نمایاں ہو رہی تھیں۔
تاجور سے بے خبر کسی تیسرے شخص کا دل سکون سے بھرتا جا رہا تھا۔ چھت کی منڈیر سے دیکھتے حاکم کی نگاہوں میں جو جلن تھی وہ مولوی حیات کو دروازہ نہ کھلنے اور خالی ہاتھ واپس لوٹ جانے پر جو خوشی میں تبدیل ہو رہی تھی اس کا نعم البدل شاید اور کچھ نہ ہوتا۔
یہ لوٹنا تھا ناحاکم کی بے عزتی کا اصل بدلہ......
اُسے اپنی مردانگی پر اس روز بڑی شدت کا غرور ہوا تھا جس کی گھر والی نے اس کے حکم کو مقدم جانا۔ شوہر کو قبول کیا اور باپ کو مسترد...... ! مسترد باپ کو وہ بے قصور بیٹی آخری مرتبہ سن رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی۔
مردانگی کی اونچی اُڑان اُڑتے حاکم کو کبھی محسوس نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک شادی شدہ بیٹی...... جس کا باپ خود چل کر بیٹی کے در پر آئے اور بند دروازے سے واپس لوٹ جائے اس کے لیے دن اور رات کتنے پہروں میں بٹ جاتے ہیں...... لمحے کتنے آہنی ہوتے ہیں۔ احساسات کتنے سنگلاخ...... تکلیف کتنی کاری...... سانس بھاری...... اور دل لیر لیر!

☆☆☆

سفید بگلوں جیسی اُجلی صبح خضر کے لیے بے حد قیمتی احساس لے کر طلوع ہوئی تھی۔ اس صبح کا اس نے بے صبری سے انتظار کیا تھا۔ جس کی سفید چاندی پر اولین پہر کا زرد سورج اپنی سونے جیسی تاروں کو پرونے لگا تھا۔ وقت سے پہلے جاگنے کے لیے آج اسے کسی الارم کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ اپنی عادت کے مطابق صبح کا شاور لے کر وہ تولیہ سے بال خشک کرتا کمرے میں آیا تو بالوں سے پانی کی بوندیں گردن تک پھسلتی جا رہی تھیں۔ ہاتھ بڑھا کر اُس نے سائیڈ پر رکھا موبائل اُٹھا لیا۔
''ہوں......!'' اطمینان سے کچھ سوچتے ہوئے اُس نے موبائل اسکرین روشن کی اور نرمی سی مسکان کے ہمراہ ایک میسج ٹائپ کرنے لگا۔ چند لمحے انگلیاں متحرک رہیں اور پھر ایک نقطے پر جا کر ٹھہر گئیں۔
اسکرین پر شائلہ کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ ایک توقف کے بعد اس نے اُنگلی کو جنبش دی اور اس کا پیغام لمحوں میں تھوڑی ہی دوری پر موجود مطلوبہ شخص کے سامنے اس کا نام ساز بکھیر تا روشن ہو گیا تھا۔
''آج آپ سے ملاقات ہو گی۔'' بالوں کو تیزی سے رگڑتے خوش گوار مزاج کے ساتھ وہ گنگنانے لگا۔ پھر اس کام سے اکتا کر وہ آگے بڑھا اور نئے سرے سے جائزہ لینے لگا کہ اُسے اب کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

یمی کے گھر میں ناشتے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔
صبح کی گلابی دھوپ ساکت کھڑے املتاس کی اُونچی چوٹیوں پر سبز رنگوں میں مدغم ہونے لگی...... گزشتہ شب کے آخری پہر بارش کی بوندیں دھیرے دھیرے بالکل اوس کی صورت گرتی رہی تھیں جس سے درخت و مکان گیلے گیلے اور صحن سے کچی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ ورنہ صبح کے باوجود اس سے گرمائش ہو جاتی تھی......
مٹی کے چولہے کے پاس بیٹھی یمی نے ہلکا انگوری رنگ کا سادہ سوٹ زیب تن کر رکھا تھا، ہم رنگ دوپٹے میں لپٹے بال پشت پر پڑے تھے...... تازہ دھلے چہرے کے اطراف میں پانی کی بوندوں سے بالوں کی لٹیں چپکی تھیں...... سادہ نقوش سے مزین گندمی چہرہ، اس پر لمبی گھنیری پلکوں کے سائے میں گہری گہری سرمئی آنکھیں جو قدرے گیلی لکڑیوں سے اُٹھتے کڑوے کسیلے دھوئیں کے سبب سرخ ہو رہی تھیں...... مقناطیسی کشش رکھتی تھیں۔
سارے میں مولیوں کے پراٹھوں کی خوشبو اُڑ رہی تھی...... معین کو یہ بہت مرغوب تھے۔ یمی نے بڑی مہربانی کی کہ اس کے لیے پکائے...... اس

کے حصے سے آدھا ثانیہ اُڑا گئی۔
"جیتی رہو میری بہن! مزا آگیا...... روزانہ مسی روٹی کھا کھا کر عاجز آگئی ہوں۔ صبح سویرے ہی دل بھاری ہو جاتا ہے......" ثانیہ کسی ٹھنڈی کرتے ہوئے کہتی گئی۔ "تمہارے ہاتھ میں واقعی بہت ذائقہ ہے......"
"اپنے ہاتھوں کو بھی کبھی آزما کر دیکھ لیا کرو...... صرف کھانے پر ہی اکتفا کرتی رہنا۔" یمنی نے شکایت کی۔ ثانیہ پر کون سا اثر ہو جانا تھا۔
"نہیں نہیں، میں اپنے ہاتھوں کو زحمت ہرگز نہیں دوں گی۔ اپنی بہن سے مقابلہ کرنے میں جسارت بھی کیسے کر سکتی ہوں۔" وہ توبہ توبہ کرتے سرے سے انکاری ہو گئی۔
"بس باتوں سے مقابلے کی جسارت ہی رہ گئی ہے تمہارے لیے...... باقی ہر کام میں ڈھٹائی پر قائم رہنا۔" یمنی نے اس کے ہاتھ پر چپت لگائی۔
"ظاہر ہے بڑی بہنوں کے ہوتے چھوٹی عیش کرتی ہی ہیں......" وہ کھی کھی کرتی چلی گئی۔ املتاس پر پرندے پھدک رہے تھے...... تائی جی رات کی بچی روٹی توڑ کر اپنی مرغیوں کو ڈال رہی تھیں...... یہ دیکھ کر چڑیاں بھی فراٹے سے ذرا سا فاصلہ رکھ کر زمین پر اُترنے لگیں۔
ایک ہی چارپائی پر بیٹھ کر لسی پیتے تایا جی ابا سے کہہ رہے تھے۔
"مجھے لگتا ہے اب معین کی شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے...... بات گھر کی ہے تو پھر تاخیر کیا کرنی، یہ معاملہ بھی نمٹ جائے مظفر کا فون آئے تو بات کروانا۔"
"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہی مناسب وقت ہے، پھر مظفر کی بھی تو کرنی ہے...... میں نے اس سے بات کرلی تھی۔ وہ پیسے بھیج رہا ہے تو تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ وہ فی الحال نہ بھی آسکا تو بعد میں آجائے گا فرض کی ادائیگی پہلے ضروری ہے۔" ابا نے متانت سے جواب دیا اور دھیمی آواز میں گفتگو آگے بڑھانے لگے...... ایسے میں معین تندور پر برتن رکھنے آیا تو ہاتھ صاف کرتے ہوئے کھنکار کر بولا۔
"یہ کس خوشی میں...... میں نے تو نہیں کہا تھا؟" اس کا اشارہ پراٹھے کی طرف تھا۔ یمنی نے روٹی پلٹتے مدھم آواز میں جواب میں سوال دیا۔
"تمہارا کہنا ضروری ہے؟"
"پھر بھی آج سے پہلے تو کبھی خیال نہیں آیا......" وہ نجانے کیوں مصر تھا۔
"میں نے سوچا تائی جی یہ نہ سوچیں کہ اپنے بہن بھائی کی فرمائشیں ہی پوری ہوتی ہیں اور کسی کو کوئی پوچھنے والا نہیں...... کبھی کبھار کی عیاشی میں کوئی حرج نہیں لگا مجھے۔"
"اچھا واقعی...... تائی جی کی سچ مچ اتنی پروا ہے؟" وہ دلچسپی سے پوچھنے لگا...... یمنی اچھی طرح جانتی تھی وہ صاف چڑا رہا ہے۔
"نہیں تو تم نے کیا سننا ہے؟" اس نے بھی تیوریاں چڑھائیں۔ کھا لیا ہے تو اب جائیں بس......
معین نے نظر بھر کر اُسے دیکھا۔
"کچھ نہیں، سیانیوں والی بات کردی تھی نا...... اس لیے حیرت ہوئی کہ بڑی سوچ آگئی آج اپنی تائی جی کی۔ کبھی کبھی سمجھ دار ہو جاتی ہو ویسے۔" وہ نجانے کیا سوچ کر محظوظ ہوا تھا...... یمنی نے گھور کر دیکھا۔ وہ بظاہر نظر بچاتا باقیوں کو دیکھ رہا تھا لیکن کن انکھیوں سے اُس کے تاثرات جانچ لیتا۔
"چلو اتنا مان لیا یہ بھی کافی ہے...... ورنہ تو اکثر لوگوں کو یہی ماننے میں بھی بڑی دقت کا سامنا ہے۔" بے نیازی سے کہہ کر وہ جلی لکڑیوں پر پانی ڈالنے لگی...... معین کے لبوں پر مسکان چمکی۔
"کون ہیں یہ اکثر لوگ...... میں نے تو ایسی بات کبھی نہیں کہی۔" معین شاید اچھے موڈ میں تھا...... کیا یمنی کے مزے دار ناشتے کی وجہ سے؟
"منہ سے کہنا ضروری ہے کیا؟" یمنی نے پھر دہرایا۔

''طنزاچھا کرلیتی ہو......''

''میری اتنی مجال......'' یمی زیر لب مسکاتی دوسری سمت دیکھنے لگی۔ ایسے ہی مسکراتا معین آگے بڑھ گیا اس پاگل کے سامنے سے......

تائی جی اپنے کام سے فارغ ہو چکی تھیں۔ چڑیاں مرغیوں سے نظر بچا کر چونچ بھر لیتی تھیں...... مرغیاں اُنہیں راضی خوشی اس دعوت میں شریک کرنے پر تیار نہیں تھیں۔

معین گھر سے چلا گیا تو اماں بازو جھاڑتے ہوئے صحن میں آئیں...... ان کا رخ نلکے کی جانب تھا۔ غالباً صفائی کر کے آئی تھیں...... یمی نے جھوٹے برتن سمیٹے، روٹیاں ہاٹ پاٹ میں رکھیں، اور اندر لے گئی۔ اماں کو بے سلیقگی پسند نہیں تھی...... یمی اُنہیں شکایت کا موقع نہیں دیتی تھی۔

اُس نے بچے ہوئے چند کام سمیٹے تھے کہ اماں نے پکار لیا۔

''جی اماں! آپ کے لیے ناشتا لاؤں......؟''

وہ یہی سمجھی تھی۔ اماں نے کلائی سے پکڑ کر پاس بٹھا لیا۔

''تم کچھ دیر فارغ بھی بیٹھ جایا کرو سب تمہاری ذمہ داری نہیں ہے...... ثانیہ کو کام کرنے دو۔ سب کا کام خود کرتی رہتی ہو، اُسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔''

''کام کے لیے ساری زندگی بھی تو پڑی ہے، ابھی میں کس لیے ہوں......'' اس نے لاڈ سے بانہوں کو اماں کے گرد حائل کیا۔ اماں نے محبت پاش نگاہوں سے اُسے دیکھا اور بال سنوارے۔

''اپنے ابا کی بات سنی نہیں تم نے...... پتا بھی نہیں چلے گا پرائی ہونے میں، بیٹیاں کب تک ماؤں کا بار اُٹھا سکتی ہیں۔'' اماں نے ٹھنڈا سانس لیا۔ چبھتی ہوئی دھوپ دہلیز پر بکھر رہی تھی۔ پنچھی رزق میں مگن تھے...... یمی نے چہار سو سکون پھیلا محسوس کیا تھا۔

''اس صورت میں تو ہمیشہ اُٹھا سکتی ہیں جب رہنا ہی ایک گھر میں ہو۔ میں آپ سب کے لیے ہر وقت موجود ہوں۔'' اس نے ہاتھ دبا کر حوصلہ دیا۔

ثانیہ کی غیرت جوش کھا گئی تھی جو وہ برتن اُٹھا کر دھونے جا رہی تھی۔ یمی نے جتاتی نظر ماں پر ڈالی اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ پھر یمی اندر جا کر چادر لے آئی اور ماں کو مخاطب کیا۔

''شمائلہ نے کسی کام سے بلایا ہے اماں، میں جاؤں؟''

''کس کام سے بلایا ہے۔ روز روز کیوں چلی جاتی ہو وہاں، اچھا تھوڑی لگتا ہے۔'' ابا نے کبھی منع نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود بھی چھوڑ آتے تھے لیکن آج یمی کو چپ سی لگ گئی۔

''اچھا لگے یا نہیں مگر جب روک ٹوک نہیں کی جائے گی تو کوئی کیوں چار دیواری میں قید بیٹھنا چاہے گا۔ آفرین ہے بھئی، میں تو اس دن سے ڈرتی ہوں جب نکے نکے کے لوگ آکر یہ بات کہیں گے کہ اتنے چکر وہاں کے کیوں لگتے ہیں۔'' تائی جی نے فوراً موقعے کا فائدہ اُٹھایا تھا۔ وہ کسی بھی طرح ذرا سی بات بھی جانے نہیں دیتی تھیں۔ یمی نے ملامتی نگاہ ان پر ڈالی۔ ابا ہمیشہ کی طرح خاموش بیٹھے رہے۔

''میں کچھ کہہ دیتی ہوں تو سب کو برا لگتا ہے۔ پتا نہیں بڑے ہوتے کس لیے ہیں؟ معین کے گھر آکر تو ایسا چلنے والا ہے نہیں...... چلو اگر اونچا اُڑ کر پر کٹوانے کی تکلیف سہنی ہے تو وہ بھی بخوشی۔ وقت بھی کتنا بچ گیا ہے۔'' وہ تمسخرانہ نگاہوں سے یمی کو دیکھنے لگیں۔ یمی نے تحمل سے جواب دیا۔

''مجھے معلوم نہیں ابا! بس اُسی نے کسی ضروری کام کا کہہ کر بلایا ہے...... آپ ناراض ہوتے ہیں تو میں نہیں جاتی۔ وہ خود ہی آجائے گی۔'' یمی نے بجھے دل کے ساتھ کہا اور چادر اُتارنے لگی۔

''اچھا آؤ میں چھوڑ آتا ہوں...... پھر خود لے جاؤں گا مجھے بھی باہر کام ہے۔'' ابا اس کی بات سن کر تیار ہو گئے۔ تائی جی کا منہ ناگواری کے احساس نے بگاڑ دیا اور یمی خوشی خوشی ساتھ ہو لی۔

ان کے گھر کے چھوٹے دروازے سے دروازے سے باہر آ کر ایک چھوٹی سی پگڈنڈی سیدھا حویلی تک جاتی تھی (بڑے دروازے سے باڑے کی چار دیواری سے گزر کر باہر نکلا جا سکتا تھا اور یہ راستہ مخالف سمت میں بستی اور ''ولنگ'' کی طرف نکلتا تھا)۔ شائلہ نے جس کام کے لیے بلایا تھا اس کے لیے ابا کا سوچ کر ہی ہلکا ہلکا ڈر اس کے دل میں ہلکورے لے رہا تھا۔

''اور اگر کسی کے علم میں آیا تو......؟''

بے اختیار جھرجھری لیتی یمی نقاب میں کھیتوں کے درمیان بنے چھوٹے چھوٹے راستوں سے گزرتی ابا کے پیچھے پیچھے چلتی حویلی کے سرے پر پہنچی تھی کہ ایک بزرگ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ یمی بے اختیار ابا کے اوٹ میں ہو گئی تھی۔

''کرم الٰہی......'' ابا کے لبوں سے نکلا۔ اتنے میں وہ بھی ابا کو دیکھ چکے تھے اسی لیے انہی کی طرف بڑھنے لگے...... ابا نے یمی کو اشارہ کیا۔

''تم چلی جاؤ اندر......'' یمی تیزی سے اندر کی جانب بڑھی۔ کرم الٰہی کے قریب سے گزرنے پر وہ ایک گہری نظر اس پر ڈالنا نہیں بھولا تھا۔ یمی کو نجانے کیوں جب بھی سامنا ہوتا اس کی آنکھوں سے عجیب خوف سا آتا تھا...... اندر آ کر اُس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹکا اور سیدھ میں چلتی گئی۔

آج ''سنڈے'' تھا۔ شوخ دھوپ ہمیشہ کی طرح منڈیروں پر براجمان......!

☆☆☆

دھوپ گوم ہونے تک شائلہ کے کمرے کی کھڑکیاں تاریک نظر آتی تھیں۔ اندر جھانکنے پر ٹیوب لائٹ کی سفید روشنی میں قد آدم آئینے کے مقابل کھڑی موی سی لڑکی ہلکا پھلکا تیار ہونے کے بعد اپنا تنقیدی جائزہ لے رہی تھی۔ اس کام سے مطمئن ہونے کے بعد وہ الماری کی طرف بڑھی اور ہلکے رنگ کا ایک بے شکن دوپٹا اُٹھا کر شانوں کے گرد پھیلا لیا۔ اس سے اس کی شخصیت میں ایک وقار سا در آیا تھا...... طمانیت سے چلتی ہوئی وہ صوفے کے قریب آئی اور اس کا انتظار کرنے لگی، جس کی منتظر تھی۔

''آپ نے آج کا دن ملاقات کے لیے مقرر کیا تھا...... مجھے اُمید ہے آپ بہت مصروف نہیں ہوں گی۔''

اپنے موبائل پر جگمگاتے اس ٹیکسٹ کو وہ دوبارہ پڑھ کر مسکرا دی۔...... یہ خضر کی طرف سے اس کو صبح ہی موصول ہوا تھا۔

باہر گول برآمدے کی چھاؤں میں یمی سنجیدہ چہرہ لیے (بلکہ خراب منہ بنائے) ندرت کے چھوٹے چھوٹے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح چہرے پر شگفتگی تھی اور دھلے بال سوکھ کر سلکی اور چمکدار لگ رہے تھے...... وہ تینوں شہر کے لیے نکل رہے تھے۔ شائلہ پہلے ہی پھپو کے گھر رہ آئی تھی اس لیے انکار پر کسی نے زیادہ اصرار نہیں کیا...... ندرت بی بی نے پھپھو کے لیے لے جانے والی سوغاتیں اُٹھائیں اور شمریز کے ہمراہ چل دیں۔ یمی اندر آئی تو شائلہ کو دیکھ کر ہونٹ سکوڑے۔

''اوہ ہو! یہاں تو پوری تیاری کے ساتھ بیٹھی ہیں محترمہ......''

''کیا یہ شائلہ سے مخاطب ہیں آپ......؟'' وہ ایک ادا سے بولی تو یمی کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''جی نہیں! بندی ملکہ کو مخاطب کرنے کی جرأت کب کر سکتی ہے۔'' وہ بھی اسی کے انداز میں بولی۔

''اب تم نے اپنی مرضی تو کر ہی لی ہے...... اس ملاقات کی مدت محدود رکھنا مجھے ابا چھوڑ کر گئے ہیں، وہ لینے بھی آ جائیں گے......''

''ظاہر ہے میں نے اُس کو کون سا بیٹھ کر الف لیلیٰ یا داستانِ امیر حمزہ سنانا ہے...... بلقیس (ملازمہ) کو میں نے گھر بھیج دیا ہے۔ اب جو سرو کرنا ہے وہ تم ہی لے کر آنا، مجھے خدشہ تھا کہ کہیں اس کا ذکر وہ بھول کرامی کے سامنے نہ کر بیٹھے۔'' شائلہ نے

ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر اسے آگاہ کیا تو سیمی کی بھنویں اکٹھی ہوئیں۔

"میں ایسا کچھ نہیں کرنے والی میڈم...... یہ بات تم سے پہلے کہہ چکی ہوں۔" وہ بے رخی سے کہہ کر دوسری سمت دیکھنے لگی تو شمائلہ آگے ہوئی۔

"یار اب سوکھے منہ بھیجنا اچھا تو نہیں لگے گا۔"

"جی! صحیح فرمایا آپ نے......صرف منہ ہی کیوں پورا تالاب میں ڈبکی لگوا کر بھیجنا۔" اُس نے باقاعدہ منہ بگاڑا اور دونوں اُٹھ کر باہر آئیں۔ کچھ دیر گزری تھی کہ فضل دین برآمدے میں کھڑا نظر آیا۔ مردوں کی غیر موجودگی میں اُن کو حویلی کے اندر آنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے چہرے پر تذبذب تھا۔ شمائلہ خود چل کر قریب گئی تو انہوں نے خضر کی آمد کی اطلاع دی۔

"آپ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھائیں...... میں ابھی آتی ہوں۔" شمائلہ نے عجلت میں اسے جواب دیا، وہ کچھ نروس ہو گئی تھی ایک دم۔

"بات سنیں!" وہ جاتے جاتے مڑی۔ فضل دین بھی مڑا۔

"وہ میرا مہمان ہے، اس کا ذکر بابا سے یا بھائی سے مت کیجیے گا...... انہیں میں خود بتاؤں گی۔"

"جی۔" وہ سر ہلاتے چلے گئے تو شمائلہ سانسیں درست کرتی سیمی کی طرف گئی جو کچن میں تھی۔ ڈرائنگ روم اُن کے رہائشی حصے میں نہیں تھا۔ وہ حویلی کے سامنے والی دو بیرونی دیواروں کے کونے میں بنایا گیا تھا۔ کھڑکیاں کھلی ہوتیں تو حویلی کا برآمدہ اور لان صاف نظر آتا تھا جبکہ آنے جانے کے دو راستے تھے۔ ایک حویلی کے اندر سے اور دوسرا باہر سے......!

خضر صوفے پر تکلف سے بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے صحن میں چل کر آتی شمائلہ پر نظر پڑی تو یک بیک دل میں ناقابل فہم احساسات بیدار ہوئے تھے۔ شاید پہلی بار ایک رائٹر سے ملنے پر اعتماد میں واقع ہوئی کمی...... وہ بے اختیار گفتگو کے الفاظ ترتیب دینے لگا۔

"السلام علیکم......!" اندر آکر شمائلہ نے شائستہ انداز میں سلام کیا۔ خضر کے لبوں پر بے ساختہ پزیرائی آمیز مسکراہٹ لپک گئی...... اگلے ثانیے سلام کا جواب دے کر وہ سنبھل کر کہنے لگا۔

"کیسی ہیں آپ...... میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ کو کچھ زیادہ زحمت نہیں ہوئی ہوگی۔ آپ نے میری درخواست قبول کی اور تھوڑا سا وقت نکالا اس کے لیے مشکور ہوں۔" وہ پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ پُرتکلف کلمات سے گفتگو کی شروعات کرنے لگا تو شمائلہ بھی ہلکا سا مسکرا دی۔ وہ آج اس دن کی طرح اور بھی اچھا لگ رہا تھا۔ شمائلہ نے پسندیدگی کی سند بخشی اور خوش گفتار لڑکے کو سراہا۔

"آپ شرمندہ کررہے ہیں، مجھے جان کر اچھا لگا کہ آپ میرے ہی گاؤں کے ہیں تو پھر میں آپ کا اصرار کیسے رد کرسکتی تھی وہ بھی اس صورت کہ جب آپ مجھے ایک نازک صورت حال سے نکال چکے ہوں......اور مجھے بالکل بھی زحمت نہیں ہوئی بلکہ خوشی ہورہی ہے آپ سے دوبارہ مل کر...... کوئی ہمارے گاؤں سے بھی ہے جسے میری تحریریں نہ صرف پڑھی ہیں بلکہ بہت پسند بھی ہیں۔ یہ خوشی ہی الگ ہوتی ہے۔" شمائلہ کی بات پر مسکراہٹ اس کے لبوں پر گہری ہوگئی۔

"پھر تو آپ میری خوشی کا بھی اندازہ بخوبی کرسکتی ہیں کہ مجھے کتنا پراؤڈ فیل ہوا ہوگا...... پہلے کچھ دن تو میں بے یقینی کی کیفیت میں رہا، سمجھ نہیں آتا تھا کہ حیران ہوں یا پھر اپنی کوتاہی پر خود کو ہی ڈانٹوں کہ آپ کو پہچان نہیں سکا۔ بلکہ نام پر ایک لمحہ بھی نہیں ٹھٹکا حالانکہ مجھے پوچھ لینا چاہیے تھا...... اس چیز کو لے کر تو بہت پوزیسو ہوتے ہیں ہم۔"

اس کی بات کو انجوائے کرتی شمائلہ دھیمی سروں میں ہنستی چلی گئی۔

"کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے۔ قابل ستائش یہ ہے کہ آپ کو پھر یاد بھی آگیا...... شاید اس طرح آپ نے ملنا ہوگا۔" وہ رسانیت سے کہہ کر اسے

دیکھنے لگی تو خضر نے نظریں ہٹا کر پلکیں جھپکیں۔ بہت سریلے ساز پیدا کر دیتی تھی اس کی ہنسی۔
"بالکل! میرا یقین ہے کہ کسی چیز کی آپ سچے دل سے چاہ رکھیں تو قدرت کہیں نہ کہیں وہ چاہ ضرور پوری کر دیتی ہے...... میرے سارے دوست مجھ سے زیادہ ایکسائیٹڈ ہیں اور آپ کو شاید سن کر عجیب لگے کہ ان کا بس نہیں چلتا وہ مجھ سے پہلے آپ کے گھر پہنچ جائیں......"
"نہیں، مجھے بالکل عجیب نہیں لگے گا، ہم قلم کار بھی باقی تمام انسانوں کی طرح ہوتے ہیں بس قدرت نے ایک صلاحیت اضافی رکھ چھوڑی ہوتی ہے جس سے ہم تخلیق کرتے ہیں...... اس کے علاوہ ایک رائٹر کو اصل مقام اس کے قاری ہی دلاتے ہیں۔ اور میں سمجھ سکتی ہوں کیونکہ لکھنے سے پہلے میرا دل بھی اپنے پسندیدہ لکھاریوں سے ایسے ہی جذبات رکھتا تھا، پھر وقت گزرنے کے ساتھ طبیعت میں ٹھہراؤ آتا جاتا ہے۔"
شمائلہ کی باتوں کو غور سے سنتے خضر کے دل میں اس کی اہمیت دوچند ہوگئی تھی۔ اس کے خاموش ہونے پر خضر نے لب کشائی کی۔
"اور ہمیں دیکھیں کہ ہم تو وہیں کے وہیں ہیں...... آج بھی کرداروں کو ڈسکس کرنے پر آئیں تو گھنٹوں بیتا دیتے ہیں...... ہم کتابی لوگ ہیں اور عجیب تر ہیں، کہ آج کے دور میں بھی پریکٹیکل لائف میں ہونے کے باوجود ان کرداروں سے جڑے رہتے ہیں...... لفظوں کے فریب ہمیں مسحور کر دیتے ہیں۔ اور کردار کسی دوسری دنیا میں لے جاتے ہیں...... یہ بہت دیر ہمارے ساتھ ہنستے بولتے ہیں، اور اگر وہ نکلے بھی آپ کے قلم سے ہوں تو......" اس کی بات جتنی پیاری تھی چہرے پر بھی اتنے ہی پیارے جذبات بکھرتے جارہے تھے۔
"یہ تو اچھی بات ہے نا...... مطالعہ کسی بھی دور میں ہو انسان کو کچھ نہ کچھ دیتا رہتا ہے۔ بلکہ اکثر اوقات تو زندگی کی الجھی گتھیاں بھی سلجھا دیتا ہے۔"
"اچھی بات تو ہے لیکن آپ جس طرح جذبات سے کھیلتی ہیں یہ اتنی اچھی بات نہیں...... آپ کو رحم نہیں آتا ہے لوگوں کو رلانے سے۔"
"نہیں، رحم نہیں آتا۔ پہلے ہم بھی تو روتے رہے ہیں کسی اور کی کہانیوں سے......" وہ بزرگی سے بولی تو دونوں ایک ساتھ ہنسے تھے۔
"مذاق برطرف، یہ رلانا بھی اچھا ہوتا ہے بعض اوقات...... انسان کے اندر جمع ہوا سارا غبار، شکوے، دکھ اکثر کسی بہانے ڈھل جاتے ہیں۔ پھر زندگی تو اور بھی مشکل ہے۔" شمائلہ کی سنجیدہ بات پر وہ متاثر ہو کر بولا۔
"آپ کو بھی تجربہ ہوا ہے؟"
"میرا مشاہدہ ہے۔ آپ تجزیہ کہہ لیں......" وہ نزاکت سے مسکرائی۔
"یہ بھی ٹھیک...... آپ سے یہ بھی سوال ہے کہ آپ اکثر اپنے پڑھنے والوں کی لکھتے لکھتے ہی سانسیں روک دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں......تو کیا خود آپ بھی سانس روک کر ہی لکھتی ہیں۔" وہ بات کے اختتام پر بے اختیار ہنسا تھا۔ شمائلہ نے بھی ہنسنے میں اس کا ساتھ دیا۔
"اس کا جواب میں کیا دوں...... ہاں یہ ضرور کہوں کہ میں کبھی اپنی کاوش سے مطمئن کم ہی ہوتی ہوں۔ اور یہ کہ سانس روکنے کا تو پتا نہیں البتہ میری سانسیں ان کی وجہ سے رواں ضرور رہتی ہیں۔"
"بہت انکساری سے کام لیا آپ نے......" خضر بے ساختہ بولا۔ "ورنہ اپنے پڑھنے والوں سے پوچھیں کہ آپ کسی سوغات سے کم نہیں ہیں۔"
"بے حد شکریہ......" شمائلہ نرمی سے بولی۔
اسی وقت دروازے کے سامنے ٹرالی رکنے کی آواز آئی تو شمائلہ چہرہ موڑے دیکھنے لگی۔ ٹرالی ساکت رہی اور آگے نہیں بڑھی یمی اندر آنے کے بجائے شاید واپس چلی گئی تھی۔ شمائلہ نے مسکراہٹ برقرار رکھی۔

"اس کو تو میں بعد میں دیکھتی ہوں......" وہ دل ہی دل میں یمی کی اس حرکت پر کہتی ہوئی اٹھی اور ٹرالی گھسیٹی ہوئی صوفے کے بیچ لے آئی۔ ٹرالی میں چائے، ٹھنڈا اور کھانے کے لیے دو تین اشیاء تھیں...... چاکلیٹ کیک کے ٹکڑے بھی موجود تھے۔ خضر دیکھ کر کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

"یقین کریں، اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں ایک مقصد سے آیا تھا آپ نے ناحق زحمت کی......"

"زحمت کی کیا بات ہے خضر صاحب! آپ پہلی بار آئے ہیں تو ایسے ہی تو نہیں چلے جائیں گے...... کچھ لیجیے۔ مقصد پر بات بھی کر لیتے ہیں۔" شمائلہ کے کہنے پر اس نے کولڈ ڈرنک کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ شمائلہ نے بھی پھر کولڈ ڈرنک لی۔ کچھ دیر چھوٹی موٹی باتیں کرتے رہنے کے بعد خضر نے کہا۔

"مجھے بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر...... اور اب مجھے لگتا ہے کہ جس کام کے لیے میں آیا ہوں، وہ بھی کہہ دینا چاہیے۔"

"جی......" شمائلہ نے کرسٹل کا نازک گلاس رکھ دیا اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"دراصل ہماری یونیورسٹی میں "پلے" ہو رہا ہے...... یہ ایک طرح کی سالانہ پارٹی سمجھیں، جس کے بعد ہمیں الوداعی ڈنر دیا جاتا ہے۔ اور تقریباً یہ ہر سال ہوتی ہے یونیورسٹیز کا آپ کو بھی پتا ہی ہوگا......"

"جی جی...... بالکل!"

"تو میں نے گزارش یہ کرنی تھی کہ آپ اس کے لیے ہمیں اسکرپٹ لکھ کر دیں...... ہمارے پروفیسر نے یہ ذمہ داری ہمیں سونپی اور میں بالکل نہیں چاہتا کہ ہم پرانی اسٹوریز پر کام کریں جو بہت سے لوگ پہلے کر چکے ہوں......" وہ کہہ کر اُسے پُراُمید نگاہوں سے دیکھنے لگا جیسے اُمید یقین ہو کہ آپ ہی لکھ سکتی ہیں۔

"یہ تو آپ کی بات ٹھیک ہے لیکن میں کیسے...... میں نے تو کبھی اسکرپٹ وغیرہ لکھا نہیں......" شمائلہ نے اپنی الجھن بیان کی تو خضر جلدی سے کہنے لگا۔

"یہ کچھ مشکل نہیں ہے، آپ پریم ریت کے ایک حصے پر لکھ دیں یا پھر کسی نئے آئیڈیا پر...... اس میں آپ کا بھی ایک فائدہ......" خضر ذرا سا آگے ہو کر اسے بتانے لگا تھا کہ شمائلہ نے درمیان سے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ پلیز مجھے میرا فائدہ مت بتائیں...... میں نے لکھنا ہوا تو آپ کو ویسے بھی لکھ کر دے دوں گی۔ میں صرف اس لیے ہچکچا رہی ہوں کہ یہ میرے لیے بالکل پہلی بار ہوگا......"

خضر بے اختیار ہنس دیا۔

"نیا ضرور ہوگا مگر مشکل نہیں...... میں صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اس پلے میں ڈائریکٹر بھی شرکت کریں گے۔ اُنہیں بھی اپنے مقصد کے لیے کسی فریش فیس اور اچھے کام کی ضرورت ہوتی ہے...... یقیناً وہ اس اسکرپٹ سے بھی ضرور متاثر ہوں گے۔"

"خوش فہمی بھی ہو سکتی ہے۔" شمائلہ محظوظ ہوتی سر ہلانے لگی۔ "ہر کوئی آپ جیسا تو نہیں ہو سکتا۔"

"آپ کو پڑھنے والے بے شمار ہیں تو اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہر کوئی آپ کے مداحین میں شامل نہیں ہو سکتا۔"

"چلیں، مجھے ایک دو دن دیں میں سوچ کر آپ کو بتاؤں گی...... کیا پریم ریت جیسا ضروری ہے؟"

"ضروری تو نہیں...... لیکن وہ بہت اچھوتا آئیڈیا تھا تو......" وہ سوچ سوچ کر کہنے لگا۔

"پریم ریت کوئی ایک کہانی تو نہیں جناب...... یہ تو ہر محبت کا عنوان ہے...... ازل سے محبت کی راہوں میں نقش کی گئیں قربانیوں کا رواج...... وفا میں نبھانے کی ریت۔ اس لیے

آپ فکر مند نہ ہوں...... آپ مایوس نہیں ہوں گے۔"

"آف کورس...... آپ پر ہی تو بھروسا کر سکتا ہوں۔" وہ اشتیاق بھری نگاہیں اس پر جمائے بولا۔ چہرے پر پھیلی نرم سرما سی مسکان بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی......

ان سے تھوڑے ہی فاصلے پر گھاس پر ٹہلتی یمی کا کوفت سے برا حال ہو رہا تھا...... دھیمے دھیمے ہنسی کے سُر اور باتوں کی بھنبھناہٹیں کانوں میں پڑتیں تو وہ گھور کر ان کی سمت دیکھتی اور منہ بگڑ جاتا۔

ہنہہ! جیسے صدیوں بچھڑا بھائی مل گیا ہو...... اُٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔

کچھ دیر بعد خضر نے اجازت چاہی تو دونوں بہت خوش اور ایک دوسرے سے متاثر نظر آرہے تھے...... مختصر دورانیے کی یہ ملاقات خوش گوار طریقے سے اختتام پزیر ہوا چاہتی تھی۔ شمائلہ بہادر کو خضر سے مل کر بہت اچھا لگا تھا اور خضر کو بہت "زیادہ" اچھا...... وہ سفید کُرتا شلوار میں پہلے دن کی طرح خوبرو اور سلجھا ہوا لگ رہا تھا۔ شمائلہ کو اس کے ذوق، انداز و لہجے اور آنکھوں میں نظر آتی شرافت اور دوسروں کے لیے عزت بہت اچھی لگی تھی۔ وہ خضر کو اپنی کتاب کا تحفہ دینے کے لیے اُٹھی جو اس نے رات ہی تیار رکھی تھی۔ اس کے اُٹھتے ہی خضر بھی بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ وہ الماری کی طرف بڑھ رہی تھی اور باہر یمی کو کھڑا ہونا دوبھر ہو گیا تو وہ نزاکت سے قدم دھرتے تیتر کی طرف بڑھی۔ اس کی عادت تھی کہ ہمیشہ پیار سے اس کے پروں کو سہلائے بغیر نہ رہ پاتی...... اس وقت بھی وہ زمین پر بیٹھ کر اس کے اُوپر جھکی اور اس کے اُوپر ہاتھ رکھا۔

"یہ میری طرف سے......" شمائلہ نے دونوں ہاتھوں سے کتاب اس کی طرف بڑھائی اور اسی وقت اچانک کھلی کھڑکی سے خضر کی نگاہ بھٹک کر باہر تک گئی...... کھڑکی سے پار، لان میں، سبز گھاس پر اس وجود کے گرد...... جو ہل ہل کر جیسے پرندے کے کان میں کوئی نصیحت کر رہی تھی...... کوئی شکایت، یا پھر پیار...... وہ اس کی پشت تھی پر لگتا تھا کہ وہ بول رہی ہوگی۔

یمی جونہی اس کے دونوں پروں کو سہلاتی آگے ہوئی دوپٹا اس کے شانے سے ڈھلک کر ایک طرف ہو گیا اور سلکی سیاہ بال لہراتے ہوئے پہلے اس کے چہرے کی ایک طرف کا پردہ بنے پھر جھولتے ہوئے زمین بوس ہو گئے تھے...... وہ پرندے کے پیروں میں کچھ دینے کے لیے اتنی مگن تھی کہ اپنی زلفوں کو سنبھالنے میں دلچسپی نہ رکھتی تھی جو اب آزادانہ لہراتے ہوئے اٹکھیلیاں کر رہے تھے...... اس کا پورا وجود جیسے گھنے بالوں میں چھپ گیا تھا۔ چار سو حصار بندھ گیا تھا......

اور اسی طرف کھڑکی سے سفر کرتی خضر کی نگاہوں نے اسے ایک پل کے لیے اپنا آپ بھلا دیا تھا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ مبہوت رہ گیا تھا......!

وہ سیاہ بالوں والی کوئی جادوگرنی تھی...... جو پتھر کرتی ہوگی۔ کوئی اپسرا جو اپنی زلفوں سے تاریکی کر کے کسی کو بھی راستے سے بھٹکا دیتی ہوگی...... پھر ہنستی جاتی ہوگی، کسی کو ویران، بالکل خالی خالی چھوڑ کر......!

پھر وقت شریر ہوا، اور پُراسرار سی مسکراہٹ چہرے پر بچھا کر ارد گرد بکھیرنے لگا۔

خضر کے لبوں سے غیر ارادی طور پر...... بے اختیار اور فی الفور خود کلامی کے سے انداز میں سرسراتا ہوا ایک نام ادا ہوا تھا......

"دو کیکی......"

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

زارا ہنجرا

''بتا رہا ہوں کہ آج کے بعد میں منڈی نہیں جاؤں گا۔'' گلو دن بھر کی خواری کے بعد لوٹا اور لاؤنج میں قدم رکھتے ہی دونوں بازو اٹھا کر اعلان کیا۔ پسینے میں نہایا ہوا۔ شیخ جی اور شیخانی نے سرتاپا اسے دیکھا۔ وہ دال کا تھال اک طرف رکھتے ہوئے اٹھیں۔ گلو قمیص کے دامن سے ہی چہرے کا پسینہ صاف کرنے لگا۔

''بکرا لے آئے ہو؟'' شیخ جی سیدھے ہو بیٹھے، پتلی سی مونچھوں تلے شریر مسکراہٹ گلو سے چھپی نہ رہ سکی۔ باورچی خانے میں روح افزا کا شربت بناتے ہوئے شیخانی بھی دبی ہنسی ہنسنے لگیں۔ جانتی تھیں کہ اب دونوں کی نوک جھوک شروع ہونے والی ہے۔

اک تو وہ نامراد اتنی گرمی میں جل بھن کر آیا ہے، اوپر سے شیخ جی کی چھیڑ چھاڑ۔

گلو نے تیکھی نظر شیخ جی پر ڈالی اور برابر والی چارپائی پر شیخ جی کے روبرو ہو بیٹھا۔

''ہاں ہاں، لے آیا ہوں۔ وہاں اک بندہ خیراتی بکرے تقسیم کر رہا تھا۔ مجھے آواز دے کر کہنے لگا تو شیخ جی کے گھر سے آیا ہے نا، یہ اک خیراتی بکرا لے جا میں نے بطور خاص شیخ جی کے حصے کا رکھا تھا۔ بے چارے یوں تو خرید نہیں سکیں گے۔ چلو خیرات کے بکرے سے ہی کام چلا لیں۔''

گلو کا تیر نشانے پر لگا تھا۔ شیخ جی جو اس مسکین کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے والے تھے، اک ہی نشانے پر دوبارہ چارپائی بوس ہو گئے اور وہ بغیر آواز ہنستا رہا۔

''ویسے یہ خیراتی بکرا ہے کہاں؟ مجھے تو نظر نہیں آ رہا۔'' شیخانی نے جلتی پر تیل پھینکا اور خود روح افزا کا جگ اور دو گلاس لیے گلو کے پاس بیٹھ گئیں۔

''مہمان تو کوئی نظر نہیں آ رہا۔'' شیخ جی نے دانستہ سارے میں نظر دوڑائی۔ ''پھر یہ شربت کس خوشی میں؟''

''خیراتی بکرے کی خوشی میں۔''

شیخانی کی جگت پر گلو کے منہ سے ہنسی کی پھوار نکلی اور وہ بے چارے جو بیگم سے بدلہ لینے اٹھے تھے، اک بار پھر منہ کے بل گر گئے۔ مقابل دشمنوں کی تعداد زیادہ تھی۔

''ویسے گلو کیا بنا پھر؟'' وہ جان بوجھ کر اتنا اونچا بولتی تھیں، محض شیخ جی کا سکون غارت کرنے کے لیے۔

''تیرے ماں باپ نے کیا تیرے گلے میں اسپیکر فٹ کرایا تھا۔'' شیخ جی نے رخ انور موڑ کر تیر پھینکا۔ شیخانی کی پیشانی کے بل گہرے ہوئے ابھی وہ جوابی جملہ سوچ رہی تھیں کہ گلو نے میدان مار لیا۔

''دیکھ لیں، اگلے کتنے سیانے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا داماد اتنا کنجوس ہوگا کہ اک ٹشو پیپر ضائع کرنا تو گوارا نہیں کرے گا، بھلے کانوں میں میل جم جانے سے بہرا ہی کیوں نہ ہو جائے۔ بھلے مانسوں نے سارا بندوبست کر کے ہی دھی بھیجی تھی۔''

''لعنت ہو تم پر۔'' شیخ جی نے وہاں سے اٹھ جانے میں ہی عافیت جانی۔ گلو اور شیخانی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

''اچھا کیا بنا...... ملا کوئی بکرا؟'' شیخانی کو تھوڑی

دیر بعد یاد آیا کہ وہ تو بکرے کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔

''وہی بنا جو ہر بار بنتا ہے۔ سڑکوں کی خاک چھان کے آ گیا ہوں۔'' اس کے منہ کے زاویے بگڑے۔

''ہاہائے...... تو بکرا منڈی گیا ہی نہیں۔'' شیخانی نے اوپر والے ہونٹ پر انگلی رکھی۔

''نہیں گیا تو کیا اپنے پپو کے ولیمے پر گیا تھا؟''

وہ کپڑے جھاڑتا اٹھ گیا۔

''مرن جوگا...... خود ہی کہہ رہا ہے سڑکوں کی خاک چھان کے آیا ہوں، منڈی کی خاک دھول کا تو ذکر ہی نہیں کیا تو نے۔'' گلوکوڈا نتھتے ہوئے وہ منجھی پر لیٹ گئیں اور زور سے ڈکار لی، تین گلاس روح افزا جو چڑھایا تھا۔

''ٹھیک ہی کہتے ہیں شیخ جی، گلے میں تو واقعی لاؤڈ اسپیکر لگا ہے۔'' وہ باہر جاتا ڈکار کی آواز پر ڈر گیا۔

☆☆☆

''لو جی، آج تو نکڑ والے حاجی صاحب کے گھر بھی بکرا آ گیا ہے۔'' گلو کو جب بھی باہر سے کوئی خبر ملتی، دہلیز پار کرتے ہی با آواز بلند تشہیر کرنے لگتا۔

ابھی بھی وہ سبزی لینے گیا تھا، واپسی پر حاجی صاحب کا بکرا دیکھ کر آیا۔ شیخانی کی چاروں آنکھیں شوہر پر جا ٹھہریں۔

''شیخ جی! میرا مشورہ ہے، بکرا لے ہی آئیں۔ کیونکہ اس بار آپ کا داؤ نہیں لگنے والا۔'' انہوں نے شیخ جی کو خبردار کیا۔

''ہاں جی۔'' گلو نے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر دائیں کا گھونسا مارا۔ ''یہی تو میں انہیں سمجھا رہا ہوں، یہ جو سوچتے ہیں کہ کسی نہ کسی دن تو قیمتیں کم ہو ہی جائیں گی۔ لکھ کے رکھ لیں، اس بار ایسا نہیں ہوگا۔ یہ نہ ہو کہ ہمیں عید کے دن بھی دال ہی کھانی پڑے۔'' وہ برا منہ بناتا قالین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔

شیخ جی پر ان کی کسی بات کا اثر ہوتا تو تب نا، وہ مزے سے اپنا پسندیدہ ڈراما دیکھنے میں منہمک تھے۔

☆☆☆

شیخ جی بھی اپنے نام کے ایک تھے، بڑے حسابی کتابی، ہر چیز ناپ تول، گن چن کر لانے والے۔ شہر کے وسط میں ان کی برتنوں کی دکان تھی۔ ساری زندگی پائی پائی جوڑتے گزاری۔ ملازم کے روپ میں گلو بے دام غلام مل گیا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات تھی جب گلو سولہ یا سترہ سال کا تھا۔ ماں باپ تو تھے نہیں، بھائی بھابھیوں نے دھکے دے کر نکال دیا اور شیخ جی کے ہاتھ آ گیا، مفت کا نوکر۔ یہ تو بھلا ہو شیخانی اور عثمان کا جو اسے گھر کا فرد ہی سمجھتے تھے۔

عثمان، شیخ جی کا اکلوتا ہونہار بیٹا تھا۔ جو پچھلے پانچ سالوں سے کینیڈا میں کام کر رہا تھا۔ شیخ جی تو اس کے کینیڈا جانے میں ہرگز راضی نہ تھے۔ ظاہر ہے اتنی بڑی رقم خرچ ہونی تھی لیکن بیٹے کی ضد سے مجبور دل پر پتھر رکھ کر ایک دکان بیچنی پڑی۔ اور وہ دکان کا ہی صدمہ تھا کہ وہ پھر دو ماہ تک بخار میں پڑے رہے لیکن جب بیٹے نے پیسے بھیجنا شروع کر دیے تو اسی وقت ٹھان لی کہ جب تک دوسری دکان نہیں خرید لیں گے، دم نہیں لیں گے۔ اس بابت بیٹے کو بھی باور کرا دیا۔ ہونہار بیٹے نے فقط دو سالوں کے اندر باپ کو پہلے سے بھی اچھی دکان خرید کر دی۔

کاروباری حلقے میں اب شیخ جی کی خوب واہ واہ تھی لیکن گلو اور شیخانی تو ان سے گوڈے گوڈے بیزار تھے۔ بے چارے پائی پائی کے لیے من من جو کرتے رہتے تھے۔ گھر کی طرف شیخ جی نے ہاتھ کافی تنگ رکھا تھا۔ سارا سال گلو اور شیخانی باسی دالیں اور سبزیاں اس امید پر کھا لیتے کہ بقرہ عید پر پورا بکرا ہاتھ لگے گا جو کہ عثمان کے جانے کے بعد بکرے کے بجائے میمنا بن گیا تھا۔

اتنا سا گوشت...... بندہ تقسیم کرے یا کھائے۔ وہ دونوں جل بھن کر رہ جاتے۔ نتیجتاً عید کے بعد جتنے دن گھر میں گوشت پکتا، شیخ جی کو ایک بوٹی ہی ملتی۔ اب اس سے زیادہ شیخانی انہیں کیا سزا دیتیں۔ یہ الگ بات کہ وہ رات کو باورچی خانے میں گھس کر کہیں چھپا کے رکھا سالن ڈھونڈ کر چٹ کر جاتے۔

''ہائے میں مر گئی...... یہ نامراد میرے ساتھ دو دو ہاتھ کر گیا۔''

صبح خالی دھلا دھلایا کٹورا برتنوں میں دیکھ کر شیخانی گلو کے سر ہو جاتیں۔ ظاہر ہے وہی ان کا ہمراز تھا۔ تیسرے بندے (شیخ جی) کے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا۔

''اوئے نامراد...... دھوکے باز! مجھے یہ صلاح دی کہ کٹورا بھر سالن چھپا کے رکھ دیں، اگلے دن شیخ جی کی غیر موجودگی میں کھا لیں گے...... تو الٹا مجھے ہی دغا دے گیا۔''

بے چارہ گلو لاکھ قسمیں اٹھاتا، مگر وہ مان کے نہ

دیتیں مگر یہ ساری جنگ چپکے چپکے ہوتی۔ ظاہر ہے کرتا اٹھا کے خود کو ننگا کرنے والی بات ہوتی۔
شیخ جی بظاہر بے نیاز بنے رہتے لیکن دل دھمالیں ڈالے نہ تھکتے۔ وہ جو چلے تھے ہمیں دھوکا دینے، خود ہی لٹ گئے۔

☆☆☆

"کمپوڈر صاحب کے گھر بھی بکرا آ گیا ہے۔ بھائی بلال نے بیل لے لیا ہے۔ ساتھ والے جمیل خالو اور واپڈا والے چاچو مشرف نے مشترکہ بیل لے لیا ہے۔ خالہ پھرکی (اکثر محلے میں چلتے پھرتے نظر آتی تھیں تو گلو نے اس کا نام پھرکی رکھ دیا تھا) کے گھر بھی دنبہ آ گیا۔ حاجی صاحب نے دو بکرے لے لیے ہیں۔ اک ہمارا ہی گھر رہ گیا ہے۔"
وہ شیخانی کے ساتھ بیٹھا لہسن چھیلتا ساتھ باتیں کر رہا تھا، حسب عادت اک تیکھی نظر شیخ جی پر بھی ڈال دیتا جو ارد گرد سے بے نیاز کسی رجسٹر پر جھکے یقیناً پیسوں کا حساب کتاب لکھ رہے تھے۔
"شیخ جی! کچھ سن بھی رہے ہیں کہ سچ مچ کانوں میں میل جم جانے سے آواز اندر جانے کے سارے راستے بند ہو چکے ہیں۔"
شیخ جی نے ذرا کی ذرا سر اٹھا کر سوالیہ انداز میں ہلایا۔
"گلو بتا رہا ہے کہ سارے محلے میں قربانی کے جانور آ گئے ہیں۔ آپ بھی کچھ عقل سے کام لیں اور جا کر جانور خرید لائیں، ویسے بھی گلو کہہ رہا ہے اس بار الٹا ہی چکر چلنا ہے۔ جوں جوں دن کم رہ جائیں گے، قیمتوں میں تیزی آ جائے گی۔"
گلو تیلی لگا کے اب میمنا بنا لہسن چھیل رہا تھا۔
"کوئی تیزی نہیں آنی، پتا ہے مجھے سب۔ ساری عمر کا تجربہ ہے میرا۔ ہمیشہ مناسب قیمت پر اچھا بکرا (میمنا) لیا ہے، اب بھی اچھا جانور لاؤں گا۔"
"سوچ لیں شیخ جی! اتنی کنجوسی بھی کبھی بندے کو راس نہیں آنی۔"
پھر یوں ہوا کہ شیخ جی روز منڈی کا چکر لگاتے لگا۔ تے تھک گئے لیکن قیمتیں مزید بڑھنے لگیں۔ اب ان کے دل میں محض اک آس تھی کہ عید کے دن تو قیمتیں گر ہی جائیں گی یقیناً پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔
عید کے دن نماز عید ادا کرنے کے بعد گلو کو ساتھ لے کر منڈی پہنچے، وہ جو سوچ رہے تھے آج منڈی والے گاہکوں کے پیچھے پیچھے گھومیں گے تاکہ جلدی مال بکے اور وہ بھی فارغ ہوں لیکن منڈی میں الٹا ہی چکر چل رہا تھا۔
قیمتوں میں اک ٹکا بھی کم نہیں ہوا تھا۔ انہیں پھر خالی ہاتھ ہی لوٹنا پڑا۔ اک طرف شیخانی کے طنز...... گلو کی بکواس اور دوسری طرف محلے والوں کے مذاق۔
"میں تو کہتا ہوں عید گزر رہی گئی ہے، اب قربانی دینے کا شوق دل سے نکال دیں حضور۔" گلو نے طنزاً کہا۔
"قربانی تو میں ضرور کروں گا ان شاء اللہ۔" وہ جواباً ٹھوس لہجے میں بولے تو گلو منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر ہنسی چھپانے لگا۔
عید کے دوسرے دن بھی خالی ہاتھ لوٹنا پڑا لیکن وہ نجانے کس مٹی کے بنے تھے، تیسرے دن پھر چل پڑے۔ گلو نے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔
"ویسے شیخ جی! آج جیبیں بھر کے جانا۔ کیا پتا آج قیمتیں دوگنی ہو گئی ہوں۔" شیخانی نے پیچھے سے آواز لگائی۔
پھر دوپہر وہ بکرا لے کر لوٹ تھے۔ اک تو گرمی پھر بکرے نے بھی سارا راستہ خوب ستایا۔ وہ گھر میں داخل ہوئے تو عجیب لٹے پٹے سے لگ رہے تھے۔
"کیا ہوا شیخ جی؟" گلو کو انہیں لمبے لمبے سانس لیتے دیکھ کر فکر ہوئی۔
وہ دھڑام سے چارپائی پر گر گئے۔
"آج قیمت دوگنی ہو گئی تھی۔"

☆☆

منشا محسن علی

میرا نام یاقوت ہے۔
شاید کسی قیمتی پتھر کو کہتے ہیں۔
مگر میں قیمتی اور خوب صورت دونوں نہیں ہوں
کبھی کبھی مجھے بہت حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے وہ نام کیوں رکھ دیے جاتے ہیں جو بالکل بھی ہماری شخصیت کی ساتھ مطابقت نہیں رکھتے جیسے میرا نام یاقوت رکھ دیا گیا ہے۔

تاکہ میں ساری عمر اس وہم میں اور گمان میں رہوں کہ میں قیمتی ہوں مگر مجھے معلوم ہے میں قیمتی نہیں ہوں میں تو ایک عام سی لڑکی ہوں جس کا نام صرف اور صرف نام ہی یاقوت ہے ورنہ اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔

میری زندگی ہمیشہ ہی اپنے نام کو ڈیفینڈ کرنے میں گزر گئی ہے اور میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ رکھنے

والوں نے میرا یہ نام کیوں رکھا تھا بعد میں مجھے پتا چلا تھا کہ یہ میرا نام میری پیاری دادی ماں نے رکھا تھا۔

دادی ماں آپ نے ایک بار تو سوچ لیا ہوتا کہ جس کے جسم کی چال ڈھال اور خدوخال ایسے ہیں کہ وہ یاقوت جیسی نہیں دکھتی تو یہ پھر اس پر ظلم ہے کہ اس کا نام یاقوت رکھا جائے۔

ساری زندگی مجھے یہی پچھتاوا رہے گا کہ میرا نام یاقوت کیوں ہے اور میں اس کے علاوہ سوچ بھی کیا سکتی ہوں۔ ارم بھابھی جیسے باتوں باتوں میں مجھے جتا دیتی ہیں کہ ''تمہارا نام ہرگز بھی یاقوت نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

☆☆☆

یہ بہت بڑا سا گھر جہاں میری دو بھابھیاں، بھابھیوں کے چار بچے، دو بھائی، ابا اور میں رہتے ہیں کبھی کبھی مجھے لگتا ہے۔ جب اذیت اور شدت کی انتہا پر پہنچ گئی ہوتی ہوں تو یہ سوچ کر اپنے آپ کو اذیت دیتی ہوں کہ کاش میرا نام یاقوت نوکرانی ہوتا جس کی زندگی میں صرف اور صرف پوچے لگانا، برتن دھونا، کچن کی سخت گرمی میں بھی کھانا پکانا ہی رہ گیا ہے۔ جس کی زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں ہے کہ وہ زندگی میں کچھ کرلے......!

اب بھی سوچتی ہوں تو دل بھر آتا ہے کہ میری زندگی میں کتنے بڑے بڑے خواب تھے میں نے کیا کیا نہیں سوچا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ پاکستان کی کسی بڑی سی یونیورسٹی میں فائن آرٹس کی ڈگری لوں گی اور روز رنگوں کی بارشوں کے ساتھ کھیلوں گی۔

منشا محسن علی

میرا نام یاقوت ہے۔
شاید کسی قیمتی پتھر کو کہتے ہیں۔
مگر میں قیمتی اور خوب صورت دونوں نہیں ہوں کبھی کبھی مجھے بہت حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے وہ نام کیوں رکھ دیے جاتے ہیں جو بالکل بھی ہماری شخصیت کی ساتھ مطابقت نہیں رکھتے جیسے میرا نام یاقوت رکھ دیا گیا ہے۔

تاکہ میں ساری عمر اس وہم میں اور گمان میں رہوں کہ میں قیمتی ہوں مگر مجھے معلوم ہے میں قیمتی نہیں ہوں میں تو ایک عام سی لڑکی ہوں جس کا نام صرف اور صرف نام ہی یاقوت ہے ورنہ اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔

میری زندگی ہمیشہ ہی اپنے نام کو ڈیفینڈ کرنے میں گزر گئی ہے اور میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ رکھنے والوں نے میرا یہ نام کیوں رکھا تھا بعد میں مجھے پتا چلا تھا کہ یہ میرا نام میری پیاری دادی ماں نے رکھا تھا۔

دادی ماں آپ نے ایک بار تو سوچ لیا ہوتا کہ جس کے جسم کی چال ڈھال اور خدوخال ایسے ہیں کہ وہ یاقوت جیسی نہیں دکھتی تو یہ پھر اس پر ظلم ہے کہ اس کا نام یاقوت رکھا جائے۔

ساری زندگی مجھے یہی پچھتاوا رہے گا کہ میرا نام یاقوت کیوں ہے اور میں اس کے علاوہ سوچ بھی کیا سکتی ہوں۔ ارم بھابھی جیسے باتوں باتوں میں مجھے جتا دیتی ہیں کہ "تمہارا نام ہرگز بھی یاقوت نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

☆☆☆

یہ بہت بڑا سا گھر جہاں میری دو بھابھیاں، بھابھیوں کے چار بچے، دو بھائی، ابا اور میں رہتے ہیں کبھی کبھی مجھے لگتا ہے۔ جب اذیت اور شدت کی انتہا پر پہنچ گئی ہوتی ہوں تو یہ سوچ کر اپنے آپ کو اذیت دیتی ہوں کہ کاش میرا نام یاقوت نوکرانی ہوتا جس کی زندگی میں صرف اور صرف پوچے لگانا، برتن دھونا، کچن کی سخت گرمی میں بھی کھانا پکانا ہی رہ گیا ہے۔ جس کی زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں ہے کہ وہ زندگی میں کچھ کر لے......!

اب بھی سوچتی ہوں تو دل بھر آتا ہے کہ میری زندگی میں کتنے بڑے بڑے خواب تھے میں نے کیا کیا نہیں سوچا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ پاکستان کی کسی بڑی سی یونیورسٹی میں فائن آرٹس کی ڈگری لوں گی اور روز رنگوں کی بارشوں کے ساتھ کھیلوں گی۔

مجھے رنگ بہت پسند ہیں۔ یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ میں کبھی پینٹ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ مجھ میں یہ صلاحیت نہیں ہے لیکن پھر بھی کچھ چیزیں ہوتی ہیں نا جن کے بارے میں آپ کو سوچ کر ہمیشہ اچھا لگتا ہے جیسے مجھے کتاب، تصویر اور موسیقی کے بارے میں سوچ کر اچھا لگتا ہے اور میں بہت خوش ہو جاتی ہوں مگر یہ چھوٹی سی بات ہے۔ ورنہ زندگی تو اس سے کہیں بڑی اور تنوع والی ہے جو آپ کو آپ کے نظریے اور سوچ

ناولٹ

کے بالکل مختلف دورا ہے پر ملا کرتی ہے......!

اماں کے گزر جانے کے بعد تو جیسے زندگی زمانے کے رحم و کرم پر آ گئی ہے۔ مائیں تو سہیلیاں ہوتی ہیں۔ دکھ سکھ میں ساتھ دینے والی، کچھ سننے والی، کچھ سنانے والی۔ میری جب سہیلی ہی چلی گئی تو میں نے اپنے آپ کو اس دو پورشن کے گھر کے لوگوں کے لیے وقف کر دیا جنہیں میری رتی برابر بھی پروا نہیں ہے کہ کوئی یاقوت بھی ہے۔ سب کو میری یاد صرف اور صرف ضرورت کے وقت ہی آتی ہے۔

ارم بھابھی اور طلعت بھابھی تو حق سمجھ کر گھر کا ہر کام میرے ذمے لگا کر سائیڈ پر ہو جاتی ہیں۔ موسم جیسا بھی سردی گرمی کا ہو میں اکیلی کولہو کے بیل کی طرح بس جتی رہتی ہوں کہ یہ زندگی ہے اور میرے حصے میں یہی راحتیں ہیں۔ کیا کروں؟

ابا اکثر مجھے دیکھ کر کڑھتے رہتے ہیں، میرا وہیل چیئر پر بیٹھا معذور باپ اگر آج صحت والا ہوتا تو مجھے بھابھیوں اور بھائیوں کے آگے خواری نہ کرنی پڑتی۔ کاموں کی طویل فہرست ہوتی ہے جو صبح شروع ہوتی ہے اور رات کے آخری پہر تک چلی جاتی ہے۔ مجھے نہیں یاد میں نے آخری بار پرسکون نیند کب لی تھی۔

کیا نیند لینا ضروری ہوتا ہے؟

اگر نیند پوری نہ ہو تو کیا ہوتا ہوگا؟ شاید کچھ نہیں مجھے کچھ نہیں ہوتا تھا۔

گھڑیوں کی جگہ الارم جیسے مجھ میں فٹ تھے، مسلسل بغیر رکے...... ہر سیکنڈ کام کا ہے، ہر لمحہ کام کا ہے۔

ناشتے کی میز پر پوڑیاں حلوہ، چائے، پراٹھے، ساگ اور لسی دوپہر کے کھانے پر چکن کا سالن، سبزی، چاول، فروٹ چاٹ، بچوں کی فرائز، نگٹس۔

رات کے کھانے کا مینیو پھر سے تھکا دینے والا ہوتا تھا، مرغ چنے، دال، بریانی، رشین سلاد۔

صبح سے چرخی کی طرح گھومتے ہوئے دل اندر سے بس صرف چائے کا ایک کپ کے لیے مچل اٹھتا تھا۔ مگر چائے پینے کی فرصت بھی مجھے نہ ہوتی تھی......!

میں نے صحیح کہا ہے کہ میرا نام ہی یاقوت نوکرانی ہونا چاہیے تھا۔ کام، کام اور بس کام۔

گھر دو پورشنز پر مشتمل ہے اور میں انہی دو پورشنز میں گھن بنی چکر گھومتی رہتی ہوں۔

بعض دفعہ تو حیرانی ہوتی ہے کہ مجھے پیروں کے بجائے کوئی پر لگ گئے ہیں۔ یہ بھاگ دوڑ عام بندے کا کام بھی تو نہیں ہوتا ناں۔

میری دو بھتیجیاں ہیں جن کی عمریں سولہ سال سے بھی زیادہ ہونے کو آئی ہیں میرے قد سے بھی اونچا نکلتا ہوا قد ہے ان کا۔ ہوشیار، ذہین، زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے والی میں تو بس انہیں دیکھ کر ہی خوش ہوتی رہتی ہوں، بھائیوں کی اولاد بڑی عزیز ہوتی ہے۔ جیسے مجھے اقرا اور سویرا عزیز تھیں، ایک بھتیجا ارسلان بھی ہے سات سال کا، ان کے سارے کام میرے ذمے ہیں کچھ دنوں پہلے میں سمجھتی تھی کہ شاید وہ سب مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ بعد میں خبر ہوئی تھی وہ ضرورت تھی جسے میں محبت سمجھ بیٹھی تھی۔ دل کو کسی نے جیسے آری سے چیر کر رکھ دیا تھا۔

محبت...... آہ۔ یہ جھانسا ہے، خیال ہے، فریب ہے۔ جو ہم جیسی لڑکیوں کو پھانس لیتا ہے۔ دنیا ان جذبوں سے کہیں آگے جا چکی ہیں۔ اس کاروبار میں ہم جیسوں کی مانگ نہیں ہے۔

☆☆☆

طلعت بھابھی کا بھائی تھا جس کا نام جعفر تھا۔ وہ میرے لیے شاید وہ میر جعفر ہی ثابت ہوا تھا، پتا نہیں کیوں میں ہمیشہ یہ سوچ رہی ہوتی ہوں کہ ہم لڑکیاں صرف محبت کے نام پر جھانسے میں کیوں آ جاتی ہیں۔ محبت کا لفظ ہمیں کتنا فینٹسائز کرتا ہے اور ہم پریوں کی دنیا میں رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ جیسے جادو کی چھڑی ہے محبت اور جس سے سب کچھ بدل کر رہ جائے گا۔ جعفر کی باتوں سے ہی مجھے ایسا ہی لگا تھا۔

وہ طلعت بھابھی کا بھائی تھا جو اکثر ہمارے

گھر آیا کرتا تھا اور کبھی اگر میں کچن میں کام کر رہی ہوتی تو کوئی نہ کوئی ذومعنی بات کر کے وہ اپنا راستہ لیتا تھا لیکن ایسے لڑکوں کو پتا بھی نہیں ہوتا کہ ان کا کہا ہوا کوئی ایک جملہ، بات لڑکیاں اپنے پلو سے باندھ کر رکھتی ہیں اور راتوں کو تکیے پہ سر رکھ کر انہیں سوچتی رہتی ہیں۔ لڑکوں کو چاہیے کہ ایسے جملے زبان سے نکالتے ہوئے سو بار سوچا کریں کہ کہیں ان کی زبان سے نکلے ہوئے جملے کسی اور کے دل پہ تو نہیں لگ رہے۔ وہ کسی اور کے دل کو ہرٹ تو نہیں کر رہے۔

شاید سب ہی لڑکے ایسے ہوتے ہوں یا شاید کچھ مختلف بھی ہوتے ہوں۔ میں نہیں جانتی مگر جعفر کی نظریں جب بھی مجھ پر پڑتی تھیں میں اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی، مجھے یوں لگا تھا وہ شخص میرا نجات دہندہ تھا۔ جو دو گھڑی بیٹھنے آتا تھا تو مجھ سے بات کرتا تھا۔ میرا حال احوال پوچھتا تھا اور مجھے باہر کی زندگی کے بارے میں مزے مزے کی باتیں سناتا تھا۔ جیسے کے باہر زندگی بہت پرسکون اور بہت اچھی ہے۔ تو کیا یہ ایک بہلاوہ تھا؟ کیا تھا یہ؟

جعفر بہت بڑی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور اس کے پاس باتوں کا ایک بہت بڑا انبار تھا اس کی باتیں کبھی بھی ختم نہیں ہوتی تھیں۔ جب بھی وہ مجھ سے بات کر رہا ہوتا تھا تو ہمیشہ مسکرا کر بات کرتا تھا۔ میں نے زندگی میں دل نشین اور خوب صورت لہجہ کسی مرد کا پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ شاید یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں کب سے محبتوں اور شفقتوں کو ترسی ہوئی تھی۔

دونوں بھابیاں صرف ضرورت کے وقت مجھے یاد کرتی تھیں اور بھائی تو جیسے تھے ہی بیگانے جنہیں اس بات سے فرق بھی نہیں پڑتا کہ کوئی ان کی بہن بھی ہے جو ایک نوکرانی کی طرح سارا سارا دن کام میں لگی رہتی ہے۔ بھائیوں کی اولاد بھی ان کے جیسی تھی۔ ضرورت کے وقت کام پڑنے کے وقت سامنے آ جانے والی۔ یہی میری زندگی تھی اور ایسے ہی دن گزر رہے تھے۔

انہی دنوں میں طلعت بھابھی کے بھائی جعفر نے میری زندگی میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ اکثر طلعت بھابھی کے پاس آیا کرتا تھا۔ اس کی یونیورسٹی ہمارے گھر کے کہیں آس پاس تھی۔ تو وہ اکثر کھانا کھانے کے لیے یا اس کے لیکچرز نہیں ہوتے تھے تو وہ ہمارے گھر آ جایا کرتا تھا۔ تب میں کچن میں مصروف ہوتی تھی کبھی اس کے لیے چائے بنا دیتی تھی۔ کبھی کھانے کی میز پر مختلف قسم کے کھانے چن دیتی تھی۔ اسے میرے ہاتھ کا ذائقہ بہت پسند تھا اور اس نے کبھی بھی کنجوسی سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا۔

''یاقوت! تمہارے ہاتھ میں جادو ہے جادو۔ جس گھر میں بھی جاؤ گی خوب راج کرو گی اور اپنے میاں کے دل پر تو تم قبضہ جما ہی لو گی کیونکہ میاں کے دل تک کا راستہ معدے سے ہو کے گزرتا ہے۔ تو اب میں...... مجھے تو لگتا ہے کہ تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمہارے ہاتھ میں اتنی لذت اور ذائقہ ہے۔ ورنہ آج کل کی عورتیں تو بہت پھوہڑ ہیں اور آج کی لڑکیوں کو کچھ بھی نہیں آتا۔''

میں ہنس کر برتن اٹھاتے ہوئے بس خاموش ہی رہتی تھی۔ میں نے زیادہ کبھی اس سے بات نہیں کی تھی۔ شاید پھر آہستہ آہستہ ہم میں باتیں ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

وہ اکثر کچن میں کام کرتے ہوئے میرے پاس کھڑا ہو جاتا تھا۔ اور میں چائے کا کپ اسے دیتی تھی چائے کے سپ لیتے ہوئے وہ مجھے اپنی یونیورسٹی کی لڑکیوں کے بارے میں بتایا کرتا تھا کیسی ہیں؟ کیا کرتی ہیں؟ کیا پہنتی اور اوڑھتی ہیں؟ ان میں کیا طریقہ سلیقہ ہے؟ اور ان کے بارے میں بہت ساری باتیں کرنے کے بعد ہمیشہ وہ ایک بات کہا کرتا تھا۔

''تم سب لڑکیوں سے الگ ہو، مجھے نہیں معلوم تم میں ایسا کیا ہے لیکن تم ان سب جیسی نہیں ہو تم بہت خالص اور سادہ ہو اور دنیا میں ایسے لوگوں کی بہت کمی ہے۔''

☆☆☆

جہاں میں زندگی سے بالکل اکتائی ہوئی تھی وہاں جعفر کی باتیں مجھے ہوا کے کسی تازہ جھونکے کی طرح محسوس ہوئی تھی۔ میں وہ سارے دن کی تھکن اذیت اور کاموں کی خواری بھول بھال جاتی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ جیسے اس کی باتوں میں کوئی مرہم تھا۔ جو آہستہ آہستہ میری ساری تکلیفیں زائل کر کے رکھ دیتا تھا میں خوش تھی۔

طلعت بھابھی کے گھر سے جب بھی کوئی آتا تھا تو میں ان کی خدمتوں میں جیت جاتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم میں ایسا کیوں کرتی تھی یا میرے ذہن میں کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی لیکن پھر بھی مجھے یہی لگتا تھا وہ جعفر کی فیملی ہے اور مجھے ان کا خیال رکھنا چاہیے۔ یہی ہوتا ہے زندگی میں ہم ہمیشہ کسی نہ کسی رشتے کے ہاتھوں ایکسپلائٹ ہوتے رہتے ہیں اور رشتے ہمارا فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ شاید یہی قدرت کا اصول ہے نیچر کا اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتی۔ جعفر اکثر میرے پاس سیڑھیوں پر بیٹھ کر باتیں کیا کرتا تھا۔

"یاقوت! میں نے زندگی میں بہت ساری لڑکیاں دیکھی ہیں۔ لیکن میں نے تمہارے جیسی کوئی لڑکی نہیں دیکھی تم اتنی سادہ ہو۔ ہرفن مولا ہو۔ بے شک تمہاری تعلیم تھوڑی کم ہے لیکن پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ تم بہت ساری تعلیم یافتہ لڑکیوں سے زیادہ کامیاب ہو اور عورت کو تو گھر ہی چلانا آنا چاہیے اور میں خوش ہوں کہ تم یہ سب کر لیتی ہو۔ مجھے تمہارے اس طرح کے کام کرنے سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ورنہ میں نے اپنے گھر میں اور باہر کی دنیا میں عورت کو کام چور ہی دیکھا ہے۔ کاموں سے بھاگنے والی۔ اب اپنی طلعت بھابھی اور میری بہن کو ہی دیکھ لو، ان کی ہمیشہ سے یہی عادت رہی ہے کہ وہ کام چور ہیں اور کاموں سے بھاگتی ہیں۔ مگر آج تک میں نے تمہارے ماتھے پر کاموں کے حوالے سے کوئی شکن نہیں دیکھی، تمہارے چہرے سے ایک مسکراہٹ جدا نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے میں تم سے پوچھوں کہ اس مسکراہٹ کا کیا راز ہے جو تمہارے ہونٹوں پر کسی گلاب کی کلی کی طرح کھل جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے بہار کا موسم ہے۔ تو بتاؤ لڑکی یہ مسکراہٹ اس کا کیا راز ہے؟"

میں مسکراتے ہوئے بس چپ چاپ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھا کرتی تھی اور میں یہ سوچا کرتی تھی یہ شخص جو اتنی خوب صورت باتیں کرتا ہے۔ کیا کبھی مستقبل میں میرا ہو سکتا ہے؟ کیا میرا اس کے ساتھ کوئی جائز رشتہ ہو سکتا ہے تاکہ میں زندگی کے بوجھ اور کاموں کے بوجھ سے لدی ہوئی جب بھی تھک ہار جاؤں تو تب یہ بندہ مجھے آ کر کچھ لفظ کہے اور میرے پورے وجود اور میری زندگی کی تھکن صرف اور صرف لفظوں سے زائل ہو جائے۔ ہوتا ہے نا، ہوتے ہیں نا کچھ لوگ ایسے کہ جو صرف اور صرف اپنے لفظوں سے آپ کے وجود کی ساری تھکن کو چن لیتے ہیں۔ مجھے جعفر بھی ایک ایسا ہی انسان معلوم ہوا تھا۔

☆☆☆

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طلعت بھابھی بھی مجھے اور جعفر کو دیکھ کر ذومعنی سی باتیں کرنے لگی تھیں۔ اور شاید انہیں اپنے بھائی کا میری طرف متوجہ ہونا کچھ خاص اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن باتوں باتوں میں اکثر وہ مجھے جتا دیتی تھیں۔

"یاقوت! تم نام کی یاقوت ہو بس۔ اس کے علاوہ اپنے دل میں کوئی خوش فہمی مت پالنا۔"

اور ان کی یہ بات مجھے خوف زدہ کر کے رکھ دیتی تھی۔ جانے اس بات کا مطلب ہوتا تھا؟ پس منظر کیا ہوتا تھا؟ وہ کیا کہنا چاہتی تھیں؟ مگر بار بار اکثر وہ مجھے عجیب طرح کے رویے سے طنز سے زچ کرتی رہتی تھیں۔

اکثر کبھی وہ دونوں بھابھیاں اکٹھی بیٹھی ہوتی تھیں تو وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستی تھیں۔

"آج کل کی لڑکیوں کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے کہ کوئی دو لفظ ایسے محبت سے بول دے تو اپنے آپ

کو کیا سمجھنے لگ جاتی ہیں۔ اگلا بس چند لفظوں کی تعریف کر دے تو خود ہی بیٹھے بیٹھے تاج محل استوار کر لیتی ہیں اور انہیں پتا بھی نہیں ہوتا کہ اگلے کا معیار اور اسٹینڈرڈ کیا ہے۔ بھلا گھروں میں رہنے والی ان دبو سی لڑکیوں کو اسٹینڈرڈ، معیار اور کلاس کا کیا پتا ہوتا ہے۔ جن کی زندگی صرف چولہے چوکی اور کاتا روٹی کے گرد ہی گھومتی ہے۔ باہر کی دنیا تو بہت الگ ہے۔ لوگ آج کل اسٹینڈرڈ، عقل، شکل اور بہت کچھ دیکھتے ہیں۔ اب تو سوسائٹی میں ایسے لوگوں کو بہت ہی عجیب گردانا جاتا ہے۔ دقیانوسی کہا جاتا ہے جو بس گھر کی مرغی دال برابر ہوتے ہیں اور انہیں گھر کی چار دیواری کے باہر کی دنیا کا پتا ہی نہیں ہوتا۔ مجھے تو ایسے لوگ ہرگز بھی پسند نہیں ہیں جو صرف گھر کی دنیا کے اور چار دیواری میں ہی مگن رہیں اور جن کی سادگی ہی سب کچھ ہو۔ وہ پہلے دور تھے سادگی قیامت ہوا کرتی تھی۔ آج کل کا زمانہ فیشن، اسٹائل کا زمانہ ہے۔ ورنہ سادگی کے وہ پرانے دور تو کب کے رخصت ہو گئے۔"

☆☆☆

طلعت اور ارم بھابھی کی باتوں نے میرا الگ دل دکھایا تھا۔ لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ جعفر نے ان باتوں کا اثر زائل کر کے رکھ دیا تھا اور اپنے لفظوں سے وہ مرہم رکھتا گیا تھا۔ اب وہ میرے ہاتھ کے کھانوں کی بہت زیادہ تعریف کرتا تھا۔ یہ لڑکے کیوں باتوں کے، لفظوں کے جادوگر ہوتے ہیں انہیں اتنے اچھے سے باتیں کرنا کیوں آتی ہیں؟ کہ وہ ہم لڑکیوں کے دل چھین لیتے ہیں۔ میں بھی شاید اپنے دل کو اپنی جگہ سے غائب محسوس کر رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ جعفر کی باتوں میں آتی جا رہی تھی۔ وہ میرے لیے بیرونی دنیا کا کوئی فرشتہ تھا جو میرے لیے ہمیشہ خوب صورت باتوں کی محفل سجا لیتا تھا اور میں ان باتوں میں پور پور بھیگ جاتی تھی۔ اب تک زندگی میں اماں کے مرنے کے بعد میرے کھانے کی کسی نے تعریف نہیں کی تھی۔ وہ شخص جب بھی ملتا تھا تو تعریفوں کے پل باندھ لیتا تھا۔ اور میں اپنے آپ کو ہواؤں میں محسوس کرنے لگ جاتی تھی۔ ہمیشہ وہ یہی کہتا تھا۔

"یاقوت! تم کھانا بہت اچھا بناتی ہو، تم جیسی سادہ لڑکیاں اس دنیا کی سب سے بڑی ضرورت ہیں تمہیں پتا ہے دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ جو چیز ہے مصنوعی پن ہے اور اس مصنوعی دنیا میں تم سا حقیقی انسان میں نے پہلی بار دیکھا ہے، جب بھی میں تمہیں کچن میں کام کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ مجھے گھر سنبھالنے والی لڑکیاں بہت زیادہ پسند ہیں، مجھے معلوم ہے کہ تم سادگی میں ہی اچھی لگتی ہو۔ کیونکہ کچھ چیزیں جتنی سادہ ہوں وہ اتنی ہی پیاری لگتی ہیں۔ وہ یونیورسٹی میں لڑکیوں کے میک اپ زدہ چہرے دیکھ دیکھ کر تھک گیا ہوں اور جب میں یہاں آ کر تمہارا چہرہ دیکھتا ہوں تو مجھے سکون محسوس ہوتا ہے۔"

میں اس کی باتوں میں آ کر اپنے آپ کو بار بار شیشے میں دیکھا کرتی تھی اور تب مجھے اپنا نام بھی برا نہیں لگتا تھا۔ وہ کتنے پیار سے میرے نام کی ادائیگی کرتا تھا یاقوت......! زندگی میں پہلی بار مجھے اپنا آپ، اپنا نام قیمتی اور مکمل لگا تھا۔ جیسے بنا ہی میرے لیے تھا اور میں بہت زیادہ خوش تھی۔

مگر شاید ہم جیسوں کی خوشی بھی چند لمحوں کی ہوتی ہے اور پھر چند لمحوں کی مہمان یہ خوشی رخصت ہو جاتی ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا جب میں طلعت بھابھی کے کمرے میں بچوں کے لیے آلو کے چپس بنا کر لے کر جا رہی تھی اور میں نے طلعت بھابھی کو جعفر پر چیختے ہوئے سنا تھا۔

"تمہارا کوئی اسٹینڈرڈ اور معیار ہے بھی یا نہیں، یہ تم نے کیا سوچ لیا ہے، یہ تم اس لڑکی کے ساتھ کیوں اتنے فری ہوتے ہو؟ اس ماسی جیسے حلیے والی لڑکی کے خیال اور خواب دیکھنا چھوڑ دو۔"

اور وہ جو خوشبوؤں جیسا تھا اور جو مجھے کسی پرستان کا شہزادہ لگتا تھا۔ میں نے اس کی آواز سنی تھی

اور سچ کہوں تو مجھے لگا تھا وہ آگ کے شعلوں جیسا لہجہ تھا۔ جس نے سب کچھ جلا کر خاکستر کیا تھا۔

"ارے آپ بھی کیا سوچتی رہتی ہیں۔ نکال دیں دماغ سے یہ سب باتیں۔ بس وہ بے چاری ایسی ہے معصوم اور سادہ سی تو میں اس کا دل رکھنے کے لیے اس سے یہ سب چند گھڑی کے لیے دل بہلانے کے لیے باتیں کر لیتا ہوں۔ آپ لوگوں کے پاس بھی تو وقت نہیں ہوتا۔ آپ بے فکر رہیں ایسا ویسا کوئی ارادہ نہیں اور میں بھی جانتا ہوں اور آپ بھی یہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ یاقوت جیسی لڑکیوں کے ساتھ کبھی بھی زندگی نہیں گزاری، جاسکتی۔ آہ، آج کل کا دور وہ نہیں ہے۔ آپ کو کھانا اور چیزیں پکی پکائی مل جاتی ہیں۔ کام کرنے کے لیے آپ نوکر رکھ سکتے ہیں۔ بیوی کو تو ایک اسٹینڈرڈ اور معیار کا ہی ہونا چاہیے جو آنے والے وقت میں آپ کا ساتھ دے سکے۔ آپ کے شانہ بشانہ چل سکے۔ ورنہ یاقوت جیسی دبو سی لڑکیوں کا مستقبل کیا ہوتا ہے؟ یہ آپ اور میں اچھی طرح جانتے ہیں۔"

وہ دن پھر مجھے اپنا نام پھر سے برا بھلا لگنا شروع ہو گیا تھا۔

یاقوت......! شاید کسی پتھر کو کہتے ہیں لیکن قیمتی پتھر ہوتا ہے۔ میں نے یہی سنا ہے لیکن میں قیمتی اور خوب صورت دونوں نہیں ہوں اور شاید میں کسی بھی خانے میں فٹ نہیں بیٹھتی جہاں کے لوگ مجھے اپنے لیے ضروری سمجھیں......!

☆☆☆

میرا نام سکندر حیات ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ میرا نام سن کر چونک گئے ہوں گے۔

کیوں کہ آپ تو یاقوت کی کہانی پڑھ رہے تھے یا یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ یعقوب کی زبانی یاقوت کی کہانی سن رہے تھے اور اب آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ یاقوت کی کہانی میں سکندر کیسے آسکتا ہے یا پھر سکندر کی کہانی میں یاقوت کیسے آسکتی ہے......؟

لیکن ہونے کو تو اس دنیا میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال میں اپنا تعارف کرا دیتا ہوں۔ میرا نام سکندر حیات ہے۔ جس طرح آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میرا نام کافی بھاری بھرکم ہے۔ میں اپنے نام کے بالکل متضاد ہوں۔ سکندر نام ہی سن کر آپ کے ذہن ایک بھاری تن و توش والا بارعب شخصیت کا بندہ آتا ہے۔ جس کی پرسنیلٹی بہت دبنگ ہے اور وہ جو اپنے جلال سے مشہور ہوسکتا ہے۔

لیکن میں ہرگز بھی ایسا نہیں ہوں۔ جیسے میری بہنیں اور میری ماں ہمیشہ کہتی ہیں۔

"تم تو بہت نازک اور نفیس طبیعت کے مالک ہو، اپنے نام سے بالکل الٹ۔"

میں پھر ان سے اس بحث میں پڑ جاتا ہوں کہ انہوں نے میرا نام ایسا رکھا کہ میرا نام تو کچھ اور ہونا چاہیے تھا۔ چاہے نفیس ہی کیوں نہ ہو جاتا۔ مجھے نفیس نام بھی بہت پسند ہے، میری فطرت میں شاعری ہے اور میں بہت فطرت پسند بندہ ہوں۔ مجھے نیچر، اپنی طرف قدرت اپنی طرف اٹریکٹ کرتی ہے۔ مجھے کائنات کی دلچسپیاں کھوجنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ مجھے بادل، پھول، چاند، تتلیاں، پرندے، بارشیں یہ سب چیزیں بہت پسند ہیں۔ شاید میری فطرت ہی ایسی ہے ہر انسان کی اپنی مختلف طبیعت ہوتی ہے۔

تو یہی وجہ ہے کہ میں اس فطرت کا مالک ہوں اب بھی میں اپنے گھر والوں کی ساتھ اس بحث میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ دنیا آہستہ آہستہ مجھ جیسے نفیس لوگوں سے، جو فطرت کے دلدادہ ہوتے ہیں جو قدرت سے محبت کرتے ہیں۔ جو کائنات پیچیدگیوں کو کھوجنے میں مصروف رہتے ہیں۔ کو دنیا کھوتی جارہی ہے اور میں ایسا نہیں چاہتا۔

میری دو بہنیں جو بہت نٹ کھٹ اور شریر ہیں۔ انہیں میری شادی کی فکر لگی ہوئی ہے اور میری اماں نے تو مجھے لگتا ہے میرے پیدا ہوتے ہی میری شادی کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ آخر ان ماؤں کے پاس شادی کے علاوہ کوئی اور آپشن کیوں نہیں

اور سچ کہوں تو مجھے لگا تھا وہ آگ کے شعلوں جیسا لہجہ تھا۔ جس نے سب کچھ جلا کر خاکستر کیا تھا۔

''ارے آپ بھی کیا سوچتی رہتی ہیں۔ نکال دیں دماغ سے یہ سب باتیں۔ بس وہ بے چاری ایسی ہے معصوم اور سادہ سی تو میں اس کا دل رکھنے کے لیے اس سے یہ سب چند گھڑی کے لیے دل بہلانے کے لیے باتیں کرلیتا ہوں۔ آپ لوگوں کے پاس بھی تو وقت نہیں ہوتا۔ آپ بے فکر رہیں ایسا ویسا کوئی ارادہ نہیں اور میں بھی جانتا ہوں اور آپ بھی یہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ یاقوت جیسی لڑکیوں کے ساتھ کبھی بھی زندگی نہیں گزاری، جاسکتی۔ آہ، آج کل کا دور وہ نہیں ہے۔ آپ کو کھانا اور چیزیں پکی پکائی مل جاتی ہیں۔ کام کرنے کے لیے آپ نوکر رکھ سکتے ہیں۔ بیوی کو تو ایک اسٹینڈرڈ اور معیار کا ہی ہونا چاہیے جو آنے والے وقت میں آپ کا ساتھ دے سکے۔ آپ کے شانہ بشانہ چل سکے۔ ورنہ یاقوت جیسی دبوسی لڑکیوں کا مستقبل کیا ہوتا ہے؟ یہ آپ اور میں اچھی طرح جانتے ہیں۔''

وہ دن پھر مجھے اپنا نام پھر سے برا بھلا لگنا شروع ہوگیا تھا۔

یاقوت......! شاید کسی پتھر کو کہتے ہیں لیکن قیمتی پتھر ہوتا ہے۔ میں نے یہی سنا ہے لیکن میں قیمتی اور خوب صورت دونوں نہیں ہوں اور شاید میں کسی بھی خانے میں فٹ نہیں بیٹھتی جہاں کے لوگ مجھے اپنے لیے ضروری سمجھیں......!

☆☆☆

میرا نام سکندر حیات ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ میرا نام سن کر چونک گئے ہوں گے۔

کیوں کہ آپ تو یاقوت کی کہانی پڑھ رہے تھے یا یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ یعقوب کی زبانی یاقوت کی کہانی سن رہے تھے اور اب آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ یاقوت کی کہانی میں سکندر کیسے آ سکتا ہے یا پھر سکندر کی کہانی میں یاقوت کیسے آ سکتی ہے......؟ لیکن ہونے کو تو اس دنیا میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال میں اپنا تعارف کرا دیتا ہوں۔ میرا نام سکندر حیات ہے۔ جس طرح آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میرا نام کافی بھاری بھرکم ہے۔ میں اپنے نام کے بالکل متضاد ہوں۔ سکندر نام ہی سن کر آپ کے ذہن ایک بھاری تن و توش والا بارعب شخصیت کا بندہ آتا ہے۔ جس کی پرسنیلٹی بہت دبنگ ہے اور وہ جو اپنے جلال سے مشہور ہوسکتا ہے۔

لیکن میں ہرگز بھی ایسا نہیں ہوں۔ جیسے میری بہنیں اور میری ماں ہمیشہ کہتی ہیں۔

''تم تو بہت نازک اور نفیس طبیعت کے مالک ہو، اپنے نام سے بالکل الٹ۔''

میں پھر ان سے اس بحث میں پڑ جاتا ہوں کہ انہوں نے میرا نام ایسا رکھا کہ میرا نام تو کچھ اور ہونا چاہیے تھا۔ چاہے نفیس ہی کیوں نہ ہو جاتا۔ مجھے نفیس نام بھی بہت پسند ہے، میری فطرت میں شاعری ہے اور میں بہت فطرت پسند بندہ ہوں۔ مجھے نیچر، اپنی طرف قدرت اپنی طرف اٹریکٹ کرتی ہے۔ مجھے کائنات کی دلچسپیاں کھوجنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ مجھے بادل، پھول، چاند، تتلیاں، پرندے، بارشیں یہ سب چیزیں بہت پسند ہیں۔ شاید میری فطرت ہی ایسی ہے ہر انسان کی اپنی مختلف طبیعت ہوتی ہے۔

تو یہی وجہ ہے کہ میں اس فطرت کا مالک ہوں اب بھی میں اپنے گھر والوں کی ساتھ اس بحث میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ دنیا آہستہ آہستہ مجھ جیسے نفیس لوگوں سے، جو فطرت کے دلدادہ ہوتے ہیں جو قدرت سے محبت کرتے ہیں۔ جو کائنات پیچیدگیوں کو کھوجنے میں مصروف رہتے ہیں۔ کو دنیا کھوتی جارہی ہے اور میں ایسا نہیں چاہتا۔

میری دو بہنیں جو بہت نٹ کھٹ اور شریر ہیں۔ انہیں میری شادی کی فکر لگی ہوئی ہے اور میری اماں نے تو مجھے لگتا ہے میرے پیدا ہوتے ہی میری شادی کے خواب دیکھنے شروع کردیے تھے۔ آخر ان ماؤں کے پاس شادی کے علاوہ کوئی اور آپشن کیوں نہیں

ہوتا؟ کیا ان کی ساری زندگی کی خوشیاں ایک بیٹے اور ایک بھائی کی شادی سے ہی جڑی ہوتی ہیں۔ کم از کم مجھے تو یہی لگتا ہے کیونکہ دن رات آج کل میں ایک یہی موضوع سن رہا ہوں اور میں اس سے کافی اکتا چکا ہوں۔

اب آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میں اپنی فیملی سے محبت نہیں کرتا یا فیملی سے اکتایا ہوا ہوں، نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں آدم بیزار بندہ بھی نہیں ہوں۔ میں بہت خوش مزاج، خوش شکل، اور کہہ چکا ہوں ناں نفیس بندہ ہوں۔ مجھے اپنی فیملی سے بہت محبت ہے۔ میں ایک فیملی مین ہوں جس کے لیے اس کا خاندان اور اس کے رشتے ہی سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ وجہ ہے کہ میرے گھر والوں کو خاص کر ماں کو میرے ہاتھ کے کھانے زیادہ پسند آتے ہیں۔ میری بہن جو نگہت ہے سب سے چھوٹی ہے اس کو میرے ہاتھ کی کڑھی پکوڑا بہت پسند ہے اور جو میری اس سے بڑی بہن ہے جس کا نام رومانہ ہے جسے ہم پیار سے رومی کہتے ہیں وہ میرے ہاتھ کی بریانی کی بہت بڑی شوقین ہے امی کو تو خیر میرے ہاتھ کا شیر خورمہ بہت پسند ہے۔

کل ملا کر ہم چار لوگ ہی گھر میں بچتے ہیں، میری دو بہنیں، میری ماں اور میں یعنی کے سکندر حیات۔ تو یہ وجہ ہے مجھے کوکنگ کرنے کا بھی بہت شوق ہے۔ میں ویسے گھسے پٹے ماحول کے وہ ان لڑکوں کی طرح نہیں ہوں جیسی آج کل کی ہماری ینگ جنریشن ہے جنہیں بس اکڑنے، پہننے اوڑھنے اور منہ بنا بنا کر انگریزی زبان بولنے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں آتا۔ مجھ سے پوچھیں تو مجھے خسرو غالب اور درد جگر کی شاعری بہت پسند ہے۔ میں ہمیشہ لٹریچر سے محبت انسان رہا ہوں اور مجھے لگتا ہے میری روح ہی لٹریچر کے پودے سے پروان چڑھی ہے۔ ادب مجھ میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا ہے۔ اس چیز کا اعتراف میری بہنیں اور میری ماں بھی کرتی ہیں۔ کیونکہ اکثر اوقات جب وہ ڈپریشن میں ہوتی ہیں یا دن رات کی تھکا دینے والی مصروفیت سے تھک چکی ہوتی ہیں آدھی رات کو ہم گھر کے لان میں ایک محفل مشاعرہ منعقد کر لیتے ہیں جن میں وہ سامعین ہوتے ہیں اور میں ان کا میزبان ہوتا ہوں سنانے والا۔ میں انہیں تفریح فراہم کرتا ہوں۔ کبھی میں غزل سنا دیتا ہوں کبھی میں خسرو کا کلام سنا دیتا ہوں۔ کبھی عمر خیام کی رباعی، کبھی رومی کی باتیں، میرے پاس یہی کچھ ہے۔

اب آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ میرا اور یاقوت کا ٹاکرا کہاں ہوا ہوگا؟ تو چلیے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں اور یاقوت پہلی بار کہاں اور کیسے ملے تھے؟

☆☆☆

وہ موسم بہار کا ایک خوب صورت سا دن تھا جب میں معمول کے مطابق باغ میں بیٹھا ایک بینچ کے پر بیٹھا رسول حمزہ توف کی مشہور کتاب "میرا داغستان" پڑھ رہا تھا وہ میری سب سے پسندیدہ کتاب تھی جو مجھے اردگرد کے ماحول سے ہمیشہ بے خبر کر کے رکھ دیتی تھی۔ اس دن بھی میرا یہی حال ہوا تھا۔ رسول حمزہ توف کی شاعرانہ باتیں مجھے کسی اور ہی جہان میں لے گئی تھیں۔

"کیا ہم اس چڑیا کے بچوں کے بچے کو ریسکیو کر سکتے ہیں؟"

اس انجان آواز پر میں نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ میرے سامنے ایک لڑکی حزن و ملال کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں نا جانے کون سے سوالات چھپے ہوئے تھے۔ میں نے غور سے اس کو دیکھا تھا۔ اس نے اپنی ہتھیلی پر ایک چڑیا کا چھوٹا سا زخمی بچہ لیا ہوا تھا اور وہ اس کے بارے میں کافی فکر مند نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے کہا تھا۔

"جی بالکل، اسے کیا ہوا ہے یہ آپ کو کہاں سے ملا ہے؟"

وہ چڑیا کے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کافی فکر مند لگ رہی تھی۔

"یہ میں وہاں واک کر رہی تھی تو یہ اوپر سے گرا

ہے درخت سے۔ مجھے لگتا ہے وہاں اسی درخت پر ایک گھونسلہ ہے جہاں سے یہ گرا ہے۔ تو کیا ہم اسے باحفاظت درخت کے گھونسلے تک لے جا سکتے ہیں۔"

میں نے ایک ہی نظر میں اس لڑکی کا جائزہ لیا تھا۔ زندگی میں بہت کم میں نے سادہ چہرے دیکھے ہیں۔ یا پھر یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کل کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں اتنا مصنوعی پن آچکا ہے کہ کہیں سادہ چہرے نظر ہی نہیں آتے۔ مگر اس لڑکی کا صاف شفاف اور سادگی سے لبریز چہرہ مجھے بہت جانا پہچانا لگا تھا۔ ہوتا ہے نا کہ کبھی کچھ لوگوں کو آپ بغیر کسی وجہ کے جانتے ہوتے ہیں، اور ان سے مل کر آپ کو ایسے لگتا ہے جیسے آپ کی ان سے صدیوں پرانی واقفیت ہے......! یاقوت سے مل کر مجھے یہی محسوس ہوا تھا۔

"جی ہاں مجھے بھی یہی لگ رہا ہے آیئے مجھے دکھایئے وہ درخت کہاں ہے جہاں سے یہ آپ کو بچہ ملا ہے۔"

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس درخت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لان کے پرنٹڈ سوٹ میں ملبوس وہ لڑکی اس باغ کے سارے منظرنامے پر جیسے چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں کا حزن اور اداسی عجیب سے متاثر کر گئی تھی۔ میں نے آج تک کسی لڑکی کی آنکھوں میں اداسی نہیں دیکھی تھی اور آج جب میں دیکھ رہا تھا تو میرے دل میں ایک عجیب بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آم کے اس درخت کے پاس آئے تھے جہاں ایک چڑیا دیوانہ وار منڈلا رہی تھی۔

شاید وہ چھوٹا زخمی بچہ اس چڑیا کا تھا جو گھونسلے سے نیچے گرا پڑا تھا، آسمان کی چوٹی پر کہیں کہیں دودھیا بادل منڈلا رہے تھے اور ہلکی ہوا سے آم کے پتے ہل رہے تھے۔

"کیا آپ اس درخت پر چڑھ سکیں گے؟"

وہ بہت فکر مند اس انداز میں مجھ سے پوچھ رہی تھی جیسے اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس درخت پر چڑھ پاؤں گا یا نہیں شاید وہ میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی میں نے اس کی فکرمندی اور متفکر چہرے کو دیکھتے ہوئے مسکراتے اسے حوصلہ دیا تھا۔

"آپ بے فکر رہیں، بچپن میں، میں نے بھی بہت یہ کام کیا ہے۔ مجھے درختوں پہ چڑھنا آتا ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ میں آپ کا چڑیا کا یہ چھوٹا سا بچہ اس کے گھونسلے تک باحفاظت پہنچا دوں گا۔"

میری بات سن کر پہلی بار وہ مسکرائی تھی اور مجھے پہلی بار اس کی آنکھوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی اداسی کا تال میل بہت بھایا تھا۔

میں نے اپنے جوگرز اتار کر سائیڈ پہ رکھ دیے تھے اور میں بہت آرام سے درخت کے موٹے تنے پر چڑھنے لگا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد میں تنے پر چڑھ چکا تھا اور چڑیا کا گھونسلا میری دسترس میں تھا۔ وہ نیچے آرام سے کھڑی تھی میں نے اپنا ہاتھ نیچے کی جانب بڑھایا تھا۔

"کیا چڑیا کا بچہ میری ہتھیلی پر بٹھا سکتی ہیں؟"

اس نے نرمی سے اپنے دوپٹے کے پلو سے اپنی ہتھیلی سے چڑیا کا بچہ اٹھا کر میری ہتھیلی پر رکھ دیا تھا وہ ایک چھوٹا سا لمحہ تھا جو میری ساری زندگی پر محیط ہو گیا تھا، اور مجھے لگا تھا جیسے کائنات میں اس کے علاوہ کوئی خوب صورت لمحہ نہیں آئے گا۔

"کاش وہ پل ٹھہر سکتا......!" جب یاقوت مجھے وہ چڑیا کا چھوٹا سا بچہ تھما رہی تھی۔

جیسے ہی چڑیا کا زخمی بچہ اس کے گھونسلے تک باحفاظت حفظ و امان پہنچا کر نیچے اترا اور میں جاگرز پہن کر اس کے سامنے آیا تو وہ میرا شکریہ ادا کر رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں یہ میرا فرض بنتا تھا۔"

"بالکل میں یہی دیکھ رہی تھی دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔"

"نہیں، بس ہمیں ڈھونڈنے ہوتے ہیں ورنہ دنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔" میں نے اسے

مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔
"آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"
اسے جیسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا، مجھے لگا شاید وہ واقعی یہی سوال جاننا چاہتی تھی مجھ سے اسی سوال کا جواب کہ کیا واقعی دنیا میں ایسے لوگ ہوتے ہیں؟"
مجھے نہیں معلوم وہ کس ماحول میں رہ رہی تھی یا اسے اس بات پہ اعتبار کیوں نہیں تھا؟
"جی ہاں آپ دنیا گھوم کر دیکھیں پوری کائنات پھریں۔ آپ کو پھر معلوم پڑے گا کہ دنیا بہت سے اچھے لوگوں کی بھی جگہ ہے اور دنیا میں بہت سے ایسے اچھے دل والے لوگ پھر رہے ہیں جیسا کہ میں۔" میں نے شرارت سے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا تھا۔
وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔
"چلیں ٹھیک ہے میں اب چلتی ہوں۔"
"نہیں۔"
وہ جانے لگی تھی تو میں نے اسے پیچھے سے آواز دے کر بلایا تھا۔ وہی اداس آنکھیں مجھ پر ٹک گئی تھیں۔
"جی کیا بات ہے۔"
"آپ کا نام کیا ہے؟"
"میرا نام یاقوت ہے۔" وہ ہولے سے مسکراتے ہوئے واپس پلٹ گئی تھی۔
میں اسے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے باغ کے خارجی راستے کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ اس لڑکی کی چال میں عجیب سادگی، متانت، اور شاہانہ پن تھا۔ جیسے اسے اردگرد کے ماحول کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ میں مگن آرام سے چلتی ہوئی جا رہی تھی۔
ہلکی ہوا کی چھیڑ سے اس کا دوپٹا لہرا رہا تھا۔ میں حیران تھا مجھے زندگی میں بہت کم لڑکیوں نے متاثر کیا ہے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابھی تک کوئی ایسی لڑکی مجھے نظر ہی نہیں آئی تھی جو مجھے متاثر کرتی۔ یہ سادگی، یہ آنکھوں کی اداسی یہ متانت اور یہ عجیب سا اس کے کے گرد ہالہ...... پتا نہیں کیا چیز تھی میں بہت ہی جلد اس لڑکی سے متاثر ہو گیا تھا۔
میں، پچھلے کئی سالوں سے اس باغ میں آ رہا تھا اور میں جانتا تھا اور تقریباً کہ سب ہی لوگوں سے واقف تھا جو وہاں چہل قدمی یا جاگنگ کے لیے آتے تھے۔ لیکن لڑکی کا چہرہ میرے لیے نیا تھا۔ شاید وہ کچھ دن پہلے ہی اس باغ میں آنا شروع ہو چکی تھی اور آنے والے کچھ دنوں میں میں نے اسے اس باغ میں موجود پایا تھا۔ بس وہ چپ چاپ اپنے آپ میں مگن روش پر ٹہلتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا جیسے اسے دنیا، زمانے کی کوئی پروا نہیں ہے۔ کوئی کیسے دنیا زمانے سے بالکل بے پروا یا ناراض ہو کر ایک ہی سڑک پہ ایک ہی بار ایک ہی ٹریک پہ چلتا ہوا ہمیشہ معمول کے مطابق یہ کام کر سکتا ہے؟
☆☆☆
مجھے حیرت ہوئی تھی دن گزر گئے اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ ایک بار میں اسے پھر بات کروں۔ لیکن میری ہمت نہیں بن پا رہی تھی پھر ایک دن میں اس کے سامنے آیا تھا۔
"ہیلو جی! کیا آپ نے مجھے پہچانا ہے؟"
"جی میں نے آپ کو پہچان لیا آپ وہی ہیں نا؟"
"جی ہاں میں وہی ہوں۔"
وہی ہونے کی وہ جو ہماری کیمسٹری تھی ہم دونوں سمجھ گئے تھے۔ ہم دونوں وہی تھے۔ ہم اس بات پر مسکرا دیے تھے۔
"کیسے ہیں آپ؟"
"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"
"آپ کیسی ہیں؟"
"میں بھی ٹھیک ہوں۔"
"کیا چل رہا ہے آج کل لائف میں۔"
"کچھ نہیں میں فری ہی ہوتی ہوں مجھے اور کوئی کام نہیں ہے۔"

"تو کیا پڑھتی نہیں ہیں؟"
"بس میں بی اے کرلیا ہے اب تک اور اس کے علاوہ میں گھر کے کام وغیرہ کرتی ہوں۔"
"گھر کے کام مثلاً؟"
"کھانا بنانا صفائی وغیرہ بس یہی کچھ۔"
"ٹھیک آپ کے گھر میں کون کون ہے؟"
"بھائی بھابھی، بچے اور ابا ہیں۔"
"صحیح، ویسے کھانا تو میں بھی بنالیتا ہوں۔"
وہ حیران ہوگئی اسے یقین نہ آرہا ہو کہ ایک لڑکا اس کے سامنے یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ کھانا بنا سکتا ہے۔
"آپ بھی کھانا بناتے ہیں؟"
"جی ہاں میں بنا سکتا ہوں اس میں حیران ہونے والی کون سی بات ہے؟"
"مجھے لگا تھا کہ شاید کہ آپ کی بہنیں اور امی بناتی ہوں گی کیونکہ یہ عورتوں کے کام ہوتے ہیں۔"
"اب دنیا بہت آگے جاچکی ہے۔ انسان کی جو جو ضرورت ہو اسے خود پوری کرنا آنا چاہیے۔"
"اچھا لگا مجھے یہ سن کر۔"
اب جیسے وہ اطمینان سے وہ میری باتوں پر مسکراتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جواب دے رہی تھی۔ ساتھ ساتھ سفیدوں کے درختوں کی لمبی چوٹیاں آسمانوں تک پھیلی اور موسم میں کافی خوشگواریت تھی۔ جب ہم چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اس ٹریک پر چلنے لگے جہاں وہ معمول کے مطابق روز چلا کرتی تھی۔
"تو آپ کے گھر میں آپ کے امی لوگ کھانا نہیں بناتے؟"
"نہیں، وہ بھی بناتے ہیں لیکن انہیں اپنے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں آتا تو مجبوراً مجھے کھانا پکانا پڑتا ہے۔"
"تو کیا آپ اچھا کھانا بناتے ہیں؟"
"بالکل میں بہت اچھا کھانا بناتا ہوں۔"
"کیا کیا بنالیتے ہیں؟"
"میکرونی، اسپیگھٹی بنالیتا ہوں، بریانی بنالیتا ہوں اور کچھ سبزیاں بھی۔"
"مجھے سن کر بہت خوشی اور حیرت ہو رہی ہے۔ ورنہ میں نے کسی مرد کو آج تک خاص طور پہ کھانا بناتے نہیں دیکھا۔"
"مجھے شوق ہے خود کوکنگ کا، تو مجھے خود دوسروں کے ہاتھوں کا بنا ہوا کھانا پسند نہیں آتا اور میں کچھ کوکنگ کورسز بھی کرچکا ہوں اور کچھ یوٹیوب ویڈیوز سے ہیلپ لے کر خود بنالیتا ہوں۔"
"مجھے یہ سن کر بہت اچھا لگا ہے اور آپ کی یہی بات کہ انسان کو اپنی ضرورت کے مطابق سب کچھ آنا چاہیے۔ ورنہ وہ اکیلا پڑ جاتا ہے اور اسے سہاروں کی ضرورت پڑجاتی ہے۔"
یہ بات کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں پھر وہی اداسی کا عنصر ٹھہر گیا تھا۔ جیسے وہ خود کسی سہاروں کی زد میں تھی۔ میں چاہ کر بھی اس دن اس سے اس کی اداسی کا سبب نہیں پوچھ سکا تھا......!

☆☆☆

میرے گھر اس دن کھانے کی میز پر رات کو کوئلے والی بریانی میں نے سروکی تھی جو ہر کسی کو بہت پسند آئی تھی اور وہی بریانی انہیں کھلا کر میں نے ان کے سر پر جیسے بم پھوڑ دیا تھا۔
"میں سوچ رہا ہوں میں شادی کرلوں۔"
"کیا؟"
وہ میری دونوں بہنیں ہمیشہ کورس میں چلاتی تھیں۔ ہر کام انہوں نے ایک ساتھ کرنا ہوتا تھا۔ اس وقت بھی بریانی کا چمچہ منہ کی طرف جاتا ہوا ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ وہ ہکا بکا مجھے دیکھ رہی تھیں۔
"کیا مطلب ہے۔ لڑکی کہاں ہے؟ ہم کب سے کہہ رہے ہیں شادی کرلو شادی کرلو تب تو بات مانی نہیں اب کیسے آپ شادی کا سوچ رہے ہیں۔" وہ حیران و پریشان رہ گئی تھیں۔
امی بالکل مطمئن انداز میں بریانی کھاتے ہوئے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھیں۔
"سکندر! تم سچ کہہ رہے ہو، یا تم نے اداکاری

سیکھ لی ہے۔"
"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے سوچا ہے مجھے اب شادی کر لینی چاہیے۔"
"تو کیا تمہیں اب لگتا ہے کہ تم بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں اور تمہیں شادی کر لینی چاہیے۔" امی شرارت سے مسکرائی تھیں۔
اور وہ دونوں تو ابھی تک صدمے میں تھیں۔
"لڑکی کہاں ہے، کہاں رہتی ہے، کیا کرتی ہے؟ آپ نے خود چوری چوری ڈھونڈ لی ہمیں دکھائی بھی نہیں۔"
میں مطمئن انداز میں بریانی کھاتے ہوئے ان سب کے سوالوں کے جواب دینے کی تیاری کر رہا تھا۔
"خود کچھ دنوں پہلے ہی میں نے لڑکی کو دیکھا ہے اور کیسی ہے تو کا جواب ہے کہ اگر بات کروتو بہت پیاری ہے۔ مجھے بہت اچھی لگی ہے اور دوسری بات یہ کہاں کی ہے؟ تو دور کی ہے اتنے قریب کی نہیں ہے۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں اس کے ساتھ میری اچھی جوڑی رہے گی اور ہم دونوں چندے آفتاب اور مہتاب تو لگیں گے ہی مجھے لگتا ہے مجھے اسی لڑکی سے ہی شادی کرنی چاہیے۔"
"جی جی، بالکل مجھے لگتا ہے اب ہم سے مذاق کر رہے ہیں۔" وہ دونوں دوبارہ بریانی کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ جیسے انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔
"سچ کہہ رہا ہوں۔" پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے میں نے انہیں بالکل سنجیدہ انداز میں مخاطب کیا تھا۔ اب کی بار پھر وہ کورس میں چلائی تھیں۔
"آپ کو کیا لگتا ہے؟ ہم آپ کی بات کا یقین کر لیں گی۔"
"تو تم لوگوں کو یقین کر لینا چاہیے کیونکہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔"
"آپ نے پچھلے ماضی میں اتنے جھوٹ بولے ہیں کہ اب ہمارا آپ سے اعتبار ہی اٹھ گیا ہے۔"

"خیر، ایسی بھی کوئی بات نہیں لیکن یقین کرنا ہے یا نہیں لیکن کچھ دنوں تک میں تم دونوں کو تفصیلات سے آگاہ کر دوں گا۔"
"آپ کے پاس صرف اور صرف تین دن ہیں۔ تین دن کے اندر اندر ہمیں بتائیں اور ہم اس لڑکی سے ملنا چاہتے ہیں۔"
ان کی بات سن کر میں ایک دم بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ جو سوچ کل رات میں نے سوچی تھی اور وہ جس چیز کے لیے مجھے اتنا وقت چاہیے تھا۔ وہ تین دنوں میں کیسے مکمل ہو سکتی تھی۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے انہیں مخاطب کیا تھا۔
"نہیں تین دن بہت کم ہیں۔ مجھے ایک ماہ کا تقریباً وقت چاہیے۔"
"تب تک تو آپ بوڑھے ہو جائیں گے۔"
"پہلے میں چپ تھا شادی نہیں کرنی تو سب ٹھیک تھا۔ میں نے شادی کا نام لیا تو اب ایک ماہ میں بوڑھا ہو جاؤں گا۔ تم لوگ بھی نا بس چلو کوئی بات نہیں۔"
"ایک ماہ کا ٹائم لے لیں لیکن یہ بتا دیں اس کا نام کیا ہے۔" وہ خوشی خوشی مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔ امی بھی متوجہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اس کا نام بول دیا تھا۔
"یاقوت نام ہے اس کا۔"
مجھے یوں لگا تھا جیسے ہر طرف ایک خوشبو پھیل گئی ہو ہر طرف ایک چمبیلی کی خوشبو نے چٹکیاں لی ہو اور گلاب کی کلیاں کھل گئی ہوں۔
"یاقوت! کتنا پیارا نام ہے نا، کہوں تو مجھے لگتا ہے وہ اپنے نام سے کہیں زیادہ پیاری اور مکمل ہے۔"
☆☆☆
میں جس چیز کو سب سے زیادہ آسان سمجھ رہا تھا وہ میرے لیے سب سے مشکل ثابت ہوئی تھی مجھے لگا تھا مجھے بہت کم وقت لگے گا یاقوت کو اپنا دوست بنانے میں، لیکن اس کام میں مجھے ناکوں چنے چبوائے گئے تھے اور میں حیران رہ گیا تھا وہ عام لڑکی نہیں تھی

وہ عام لڑکی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ مجھے لگتا تھا جیسے وہ رشتوں پر اعتبار کرنا چھوڑ چکی تھی۔ اس کے انداز میں عجیب سی ایک آہ گھٹن اور ایک عجیب سا اضطراب تھا جیسے کوئی بھی اسے اپنا نہیں لگتا ہو۔

وہ اکثر ایک بینچ پر بیٹھ کر آسمان پہ اڑتے پرندے دیکھا کرتی تھی۔ یا پھر اس کی نگاہوں کا مرکز باغ میں کھیلتے ہوئے بچے ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھار وہ بس اس گھونسلے کی طرف آنکھ لگا کر بیٹھ جاتی تھی جہاں ہم نے زخمی چڑیا کا بچہ باحفاظت پہنچایا تھا۔

وہ کتنی الگ تھی سارے زمانے سے، آج تک میں نے کسی لڑکی کو آسمان پہ اڑتے پرندوں اور ان درختوں پیڑوں اور پودوں کی طرح متوجہ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ کہیں نہیں مجھے لگا تھا ہم دونوں میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔ جیسے میں نے گھر میں کچھ پرندے رکھے ہوئے تھے میں پرندوں کا شوقین تھا۔ وہ تو امی جان کی ڈانٹ کے بعد قید سب سے بری چیز ہوتی ہے۔ میں نے وہ سارے آزاد کر دیے تھے۔ لیکن مجھے بھی آسمان کی نیلی وسعتوں میں اڑتے ہوئے پرندے بہت پسند ہیں۔

اس کے علاوہ میں پھول پودوں کا تو بہت دیوانہ ہوں۔ اسی وجہ سے میں نے گھر میں اپنا ایک چھوٹا سا باغ بنا رکھا ہے۔ جہاں شام کی اکثر چائے ہم مل کر بیٹھ کر پیتے ہیں تب زندگی کتنی خوب صورت اور مکمل لگا کرتی ہے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ بھی شاید یوں ہی رنگوں خوشبو پھولوں کی دیوانی لڑکی ہے۔

آہستہ آہستہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ایکسیپٹ کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ مجھ سے بات چیت کرنے پر راضی ہو گئی تھی اور ہم دوست بنتے چلے گئے تھے۔

اکثر اوقات وہ گھر کی باتیں مجھ سے شیئر کرتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی سے تھکن اور اکتاہٹ کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔

''میں نہیں جانتی کیا وجہ ہے لیکن مجھے لگتا ہے اس گھر میں کسی روز میرا دم گھٹ جائے گا۔''

''تم ایسی باتیں مت کرو ہر بار تم ایسے کیوں کہتی ہو۔''

''تم اس گھر میں رہتے تو تمہیں پتا چلتا کہ وہاں کتنا ڈپریشن ہے۔''

''کیا ڈپریشن ہے؟''

''بتاؤ مجھے کھل کر بات کرو۔ آخر اب تو ہم دوست ہیں نا۔''

''کیا کھل کر کہوں تمہیں، اپنی بھابھیوں کی برائی کروں، اپنے بھائی کو برا کہوں، اپنے بھتیجی اور بھتیجوں کی بات کروں۔ تم کیوں چاہتے ہو میں اپنے سارے رشتے تمہارے سامنے بے نقاب کر دوں۔''

''کیونکہ میں تمہارا دوست ہوں۔ تمہارا دل ہلکا ہو جائے گا۔''

اداس آنکھوں میں جیسے پانی باہر آیا تھا۔

''میں تمہیں کیسے بتاؤں سکندر میں نے رشتوں کے ہاتھوں اپنا آپ گنوا دیا ہے کھو دیا ہے۔ اب میں چاہوں بھی تو اپنے آپ کو واپس نہیں پا سکتی یہ کیا کیسی زندگی ہے۔'' جہاں آپ ایک مزدور کی طرح کام کرتے ہیں اور آپ کو جواب میں لفظوں کی اجرت بھی نہیں ملتی۔ تعریف اور ستائش بھی نہیں ملتی۔ آپ کے کاموں میں مین میکھ اور کیڑے مکوڑے نکالے جاتے ہیں۔ آپ کو کچھ سمجھا ہی نہیں جاتا کیا یہی زندگی ہوتی ہے؟''

''تم اتنی پریشان مت ہو۔''

مجھے وہ بہت پریشان لگی تھی جب میں نے اسے حوصلہ دینے کے لیے چھوٹے چھوٹے قدم اس کے ساتھ بڑھاتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ شاید اس کے زخموں پر مرہم کا پھاہا رکھ دوں۔

''تم نہیں جانتے تم میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔''

''مجھے کیسے پتا چلے گا اور میں تمہارا مسئلہ کیسے حل کر سکوں گا؟''

''میرے مسئلے کا حل کسی کے پاس نہیں ہے۔''

وہ اپنے دوپٹے سے اپنی آنکھ کے کنارے صاف کرتے ہوئے جیسے اپنے آنسو مجھ سے چھپانا چاہ رہی تھی۔

آم کے دور تک پھیلے ہوئے بوڑھے درختوں پر کچھ کونجیں آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ اور سارے باغ میں جیسے ٹھنڈی ہوا کی لہریں چل رہی تھیں مجھے ایک پل کو لگا تھا جیسے وہ سارا باغ کھارے پانیوں میں ڈوب گیا ہے اس کی آنکھ کا پانی ہر چیز پہ حاوی ہو چکا ہے۔

''یقین کرو میں دوست ہوں تمہارا اور میں تمہیں سننا چاہتا ہوں بولو۔ پلیز مجھ سے بات کرو۔''

میں نے اسے اطمینان دلایا تھا، سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ کم از کم وہ مجھ سے بات کرنے پہ تو راضی ہو جائے اور پھر وہ آہستہ آہستہ اپنے آپ کو کمپوز کر رہی تھی۔

''میں زندگی میں بہت خوش تھی جب تک امی تھیں۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا امی کی وفات کے بعد بھائیوں اور بھابھیوں نے رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ بس یہی ہوتا ہے نا کہ اگر کسی کو مفت کے ملازم مل جائیں تو وہ پھر آپ کو ملازم ہی سمجھتا ہے۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں نے اپنے رشتوں کو مفت میں میسر آنا شروع کر دیا تھا۔ میرا بھی تو دل ہے۔ میں ان سے بہت پیار کرتی ہوں۔ سچ کہوں تو آج تک میں کسی سے نفرت کر ہی نہیں پائی۔ میری فطرت میں نفرت کرنا ہے ہی نہیں مجھے اپنے بھتیجے بھائی بھابھیاں بہت عزیز ہیں اور میں ان کے لیے جان دینے کو بھی تیار ہوں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میں جو کام ان کے لیے کرتی ہوں اس کے عوض وہ مجھے کوئی لالچ دیں۔ اجرت دیں، میں صرف محبت مانگتی ہوں۔ وہ میرا خیال تو رکھیں میں اتنا دن رات کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کبھی تو بھابھی پوچھیں تمہارا سر تو درد نہیں کر رہا؟ اور میری بھتیجیاں وہ مجھ سے قد میں برابر آ چکی ہیں۔ انہیں زمانے کے ہر فیشن رواج ہر چیز کا علم ہے، وہ باہر دنیا گھومتی ہیں بڑے بڑے کالجز میں پڑھتی ہیں اور انہیں سب پتا ہے اسٹیٹس، کلاس میں ان چیزوں سے ناواقف ہوں۔ آج کل کے زمانے کی ایک لڑکی کا ان چیزوں سے نابلد ہونا، ناواقف ہونا یہ آگے بہت مسئلے کھڑے کر سکتا ہے۔ کاش، کہ کبھی وہ کہیں پھوپھو تمہارے بال اسٹریٹ کر دیں۔ آپ کو کلینزنگ کی ضرورت تو نہیں؟ پھوپھو آپ ماسک لگائیں گی؟ آج ہم آپ کو میک اپ کریں، لیکن نہیں مجھ پر جیسے یہ ساری چیزیں بند ہو چکی تھیں۔ ابا میری وجہ سے ویل چیئر پہ آ گئے ہیں۔ مجھ سے ان کی حالت بھی نہیں دیکھی جاتی۔ ساری رات وہ بالکل بے چین رہتے ہیں۔ انہیں دمے کا مرض ہو چکا ہے کھانستے رہتے ہیں۔ میرے بھائیوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ بوڑھے باپ کے پاس بیٹھ جایا کریں۔''

وہ اپنے آنسو پونچھنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔

مجھے لگا کاش میں اس کی زندگی سے سارے دکھ الجھنیں، سب کچھ ختم کر سکتا۔ کتنی مکمل لڑکی تھی۔ اسے دیکھو تو ایسے لگتا تھا دل میں سکون سرائیت کر جاتا تھا۔ لیکن اب وہ میرے سامنے روتی ہوئی مجھے میرے دل کو عجیب دھڑکے میں ڈال رہی تھی۔ اس کا دکھ مجھے اپنا دکھ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے سسکیوں کی قطار کے درمیان میں بول رہی تھی۔ جیسے آج وہ سب کھل کر برس پڑے گی سب کہہ دے گی۔

''رات کو یقین کرو میں اور ابا ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ ہمارے پاس اور کوئی بات کرنے والا بھی نہیں ہوتا، بھائی اور بھابھیوں کو کوئی فکر نہیں ہے۔ اب تم دوست ہو تو تمہیں کہہ رہی ہوں میری عمر نکلی جا رہی ہے۔ بھائیوں اور بھابھیوں کو اپنی جوان ہوتی بیٹیاں نظر آتی ہیں مگر جوان ہوتی بہن نظر نہیں آتی۔ ابا میرے بارے میں بہت فکر مند رہتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے یہی وجہ ہے وہ دن بدن بیمار ہوتے جا رہے ہیں۔ کسی کو میری پروا نہیں اسی وجہ سے کہتی ہوں میرا نام یاقوت

نہیں ہونا چاہیے یاقوت بہت قیمتی ہوتا ہے اور میں تو ایک معمولی چیز ہوں جس کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔ تم کہاں سمجھو گے سکندر......! ہم لڑکیاں جب بے وقعت اور معمولی ہو جائیں تو پیچھے کچھ بھی نہیں بچتا۔ یہی چیز ہوتی ہیں۔ آگے زندگی مجھے بہت دھندلی نظر آرہی ہے۔"

اس شام وہ بہت اداس اور نڈھال لگی تھی۔

اس شام میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی میں نے صرف اسے سنا تھا اور اس پہ توجہ دی تھی کہ میں اس کی ایک ایک بات سنوں زندگی سے ہر ہر شکایت کہ اسے کیا کیا شکایتیں تھیں۔

یہ سن کر میں حیران رہ گیا تھا وہ کتنی بہادر لڑکی تھی ایک انسان رشتوں کے محاذ پر کہاں تک لڑ سکتا ہے مگر مجھے ماننا پڑ گیا تھا۔

وہ سادگی پسند اور وہ میرے دل کو اچھی لگنے والی حسین ترین لڑکی وہ دنیا کی سب سے پیاری لڑکی تھی۔ جو بہت بہادر تھی۔ اور زندگی میں میں نے بہادر لڑکیاں بہت کم دیکھی ہیں۔ مجھے وہ اچھی لگی تھی اور میں اس بات پہ بہت فخر محسوس کرتا ہوں کہ یاقوت میری دوست ہے۔

مگر کیا دوستی سے بڑھ کر بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ مجھے دوستی سے بڑھ کر بھی کچھ چاہیے تھا اسے مجھے اپنا شریک حیات بنانا تھا۔ مگر اس سے پہلے میں گھر والوں کو سب بتانا چاہتا تھا......!

☆☆☆

اس شام لان میں بیٹھ کر ہم چاروں نے صرف اور صرف یاقوت کو ڈسکس کیا تھا۔ وہ لڑکی جسے اپنے بارے میں یہ خیال تھا کہ اس کے بارے میں بات کرنا بھی کوئی پسند نہیں کر سکتا۔ وہ کبھی موضوع گفتگو نہیں بن سکتی وہ کبھی خاص نہیں ہو سکتی وہ کسی کو اچھی نہیں لگ سکتی، وہ قیمتی نہیں ہے۔

کاش اس وقت وہ آ کر دیکھتی ہم چاروں کو جو ہم سر جوڑے صرف اور صرف یاقوت کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ میری بہنیں بار بار مجھ سے پوچھ رہی تھیں، اس کی آنکھیں کیسی ہیں، وہ دکھتی کیسی ہے، وہ بولتی کیسی ہے اس کے بال کتنے لمبے ہیں۔"

میں ان کے ہر سوال کا تسلی سے جواب دیتا جا رہا تھا بہنیں تو فکر مند ہوتی ہی ہیں۔ مجھے معلوم تھا یہی ہوگا میں اس بات پہ بہت خوش ہوں ہمیشہ اور شکر ادا کرتا ہوں کہ اللہ نے مجھے سمجھنے والی فیملی سے نوازا جو ہمیشہ مجھے سمجھنے کی کوششوں میں لگی رہتی ہے اس سب سے قطع نظر امی نے صرف ایک بات پوچھی تھی۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور کہا تھا۔

"سکندر! وہ تمہیں پسند ہے نا۔ وہ تمہارے دل کو لگتی ہے نا۔ تم اسے پسند کر گئے ہو۔ تم نے اس سے محبت کی ہے نا......! تمہیں سکون دیتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے نا......! تم مطمئن ہو نا......! اگر ہاں تو ہم تمہارا رشتہ لے کر جاتے ہیں۔"

میں نے امی کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور میں نے انہیں کہا تھا۔

"جی امی اچھی لگتی ہے وہ مجھے۔ اسے دیکھتا ہوں تو مجھے سکون محسوس ہوتا۔ مجھے اس کا درد اپنا درد محسوس ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے میں اس کے ساتھ بہت خوش رہوں گا۔"

امی اور وہ تینوں میرے سامنے بیٹھے ہوئے اب میرے چہرے پر شاید روشنی دیکھ رہی تھیں اور وہ تینوں میری سہیلیاں تھی، دوستیں تھیں۔ بہنیں اور مائیں سہیلیاں، دوستیں بھی تو ہو سکتی ہیں جیسے ہم چار تھے۔

"اگر تم خوش ہو تو ہم بھی خوش ہیں اور یقیناً ہم اس کے رشتے کے لیے جائیں گے۔"

میں نے یاقوت کو کچھ نہیں بتایا تھا اور چوری سے چپکے سے ان کو بھیج دیا تھا، رشتے کے لیے، اور ان کے آنے تک میں جلے پیر کی بلی کی طرح سارے گھر میں گھومتا رہا تھا۔

وہ اتنا بڑا گھر مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا کیا ہوگا اگر انکار ہو گیا تو یاقوت نے کیا سوچا ہوگا اس کے بھائی کیا کہیں گے؟ اس کی بھابیاں مان جائیں گی؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مجھے لگ رہا تھا وہ میری

آخری بازی ہے۔ جان کی بازی جو میں نے لگادی ہے اور پھر بعد میں، میں نے تینوں کو آتے دیکھا تھا۔

مجھے وہ خوش، کھوئی کھوئی سی، کچھ مطمئن اور کچھ عجیب سی لگی تھیں۔ جیسے بے چین ہوں اور پھر ہماری شام کو وہیں میٹنگ ہوئی تھی۔

"یاقوت بہت اچھی ہے اس کی آنکھیں کالی سیاہ ہیں اور اس کی آنکھیں مجھے پسند آئی ہیں۔ اس کے بال بھی بہت پیارے ہیں۔ وہ بولتے ہوئے بھی بہت اچھی لگتی ہے اور مجھے لگتا ہے وہ تمہارے ساتھ سوٹ کرے گی لیکن مجھے لگتا ہے شاید اس کی بھابھیاں یہ رشتہ نہ ہونے دیں، مگر ہم کوشش جاری رکھیں گے۔ اس کے ابا مجھے بہت اچھے لگے۔ بہت ملنسار اور شفیق وہ بار بار شکر گزار ہو رہے تھے۔"

امی نے اطمینان سے کہتے ہوئے مجھے مطمئن کیا تھا اور وہ دونوں میرے دونوں ہاتھ تھام کر بیٹھی تھیں۔

"بھابھی! بہت اچھی ہیں بالکل سمپل سادہ ہمیں اچھی لگی ہیں۔ کوئی لڑکی اتنی سادہ اور دلکش کیسے ہوسکتی ہے۔ ان کے وجود میں عجیب طرح کی کشش تھی عجیب سا وقار تھا۔ ہمیں لگا جیسے وہ ہماری بھابھی بن کر ہمیں بہت خوش رکھیں گی اور ہمارا سرکل بہت اچھا ہوگا۔ ہم پانچ بہت اچھے رہیں گے۔"

میری بہنیں بھی مطمئن لگ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ کیا ہوسکتا تھا۔

"آپ کو پتا ہے انہوں نے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے پکوڑے، دہی بھلے اور نگٹس سرو کیے اور یقین کرو وہ آپ کے بنائے ہوئے نگٹس سے کہیں زیادہ اچھے نگٹس تھے آپ تو بس ایسے ہی بنا دیتے ہیں۔"

"ہاں تو اب بھابھی آجائے گی تو تم لوگوں کو میری چیزیں بری لگ رہی ہیں۔" میں نے انہیں چھیڑا تھا۔

"لیکن ایک بات ہے۔" امی نے باتیں کاٹ کر ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

"ہمیں بہت محنت کرنی پڑے گی کیونکہ اس کا ایک بھائی ملا ہے اور ایک اس کا بھائی کہیں باہر تھا تو وہ مجھے بڑا عجیب لگا۔ جیسے اسے اپنی بہن کی فکر ہی نہ ہو۔ اس کی بھابھیاں بار بار ہمارے گھر کے بارے میں، تمہارے کاروبار کے بارے میں پوچھ رہی تھیں اور اپنی بیٹیاں بار بار دکھا رہی تھیں۔ حالانکہ رشتے کی عمر تو یاقوت کی ہے نا لیکن وہ لڑکی چپ چاپ صوفے پہ بیٹھی رہی۔ جتنا عرصہ بیٹھی رہی جو سوال ہم نے کیا چپ کر کے اس نے جواب دے دیا۔ اس کے علاوہ اس نے کوئی اضافی بات نہیں کی۔ وہ اتنی چپ چپ سی کیوں ہے؟ اور تم نے سچ کہا تھا سکندر اس کی آنکھوں کی اداسی میرے دل پر بھی اثر کر گئی ہے میں چاہتی ہوں اس کی آنکھیں خوشی سے جھلملا اٹھیں اور مجھے یقین ہے ہمارے گھر آکر وہ بہت خوش رہے گی۔"

پھر ان باتوں کے بعد ہم نے اپنی محفل برخاست کر دی تھی اور ایک ماہ میں میرے گھر والوں نے مسلسل اس کے گھر کے چکر لگائے تھے۔ انہیں پہلے پہل مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن بعد میں یاقوت کے ابا ڈٹ گئے تھے اور سارا معاملہ بخیر و خوبی طے پا گیا تھا۔ شاید یہی زندگی ہوتی ہے جو آپ سوچتے ہیں آپ کو مل جاتا ہے۔

وہ کہتے ہیں نا اچھا گمان انسان کو اپنی چاہت کے قریب لے جاتا ہے۔ جیسے میرا گمان اچھا اور سچا تھا۔ یہی وجہ تھی میں برابر ان دنوں میں باغ میں یاقوت سے ملتا رہا اور میں اس بات پر ہنستا ہوں کہ اسے نہیں معلوم تھا حیات خان کون تھا وہ دل سے مجھے اپنا دوست مانتی تھی۔ وہ جو ڈھیروں باتیں کیا کرتے تھے وہ ایک ماہ میں جو ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے اور انہوں نے دنیا کی کوئی کتاب کوئی فلسفہ نہیں چھوڑا تھا۔ جو زندگی رشتوں پرندوں، پیڑوں، تتلیوں، بارشوں کی باتیں کرتے تھے۔ شاید یاقوت نے اسی دن ذکر کیا تھا کہ اس کے لیے کسی لڑکے کا رشتہ آیا ہے اور پہلی بار مجھے لگا جیسے اس کی آنکھیں

مطمئن سی ہوں جیسے وہ پرسکون سی ہو۔تو تب میں نے اسے مخاطب کیا تھا۔
"یاقوت! کیا تم نے لڑکا دیکھا ہوا ہے؟"
اس نے غور سے مجھے دیکھا تھا۔
"نہیں میں نے لڑکا نہیں دیکھا لیکن پتا نہیں کیوں یہ مجھے اندر سے مطمئن کر رہا ہے جیسے یہ بندہ یہ نام مجھے ویلیو دے گا۔ ہوتا ہے نا جیسے میں کہتی ہوں کہ میرا نام یاقوت ہے لیکن میں مہنگی نہیں ہوں قیمتی نہیں ہوں لیکن کیوں پتا نہیں مجھے لگتا ہے سکندر خان کے نام میں کچھ ہے۔ یہ نام میری حفاظت کرے گا اور مجھے وہ سب چیزیں دے گا جس کی میں خواہش مند ہوں۔ مجھے اس کے گھر والے بہت اچھے لگے بہت ملنسار۔اس کی بہنیں وہ تو مجھ سے نظریں تک نہیں ہٹا رہی تھیں اور اس لڑکے کی امی جو میری ہونے والی ساس ہے وہ تو ہر بار میرا ہاتھ پکڑ لیتی تھیں اور مجھے نہیں معلوم میری آنکھوں کو غور سے کیوں دیکھتی تھیں شاید انہیں میری آنکھیں اچھی لگی ہوں۔ میری آنکھیں اچھی ہیں حیات؟" وہ باتوں کو روک کر میری طرف دیکھنے لگی تھی اور میں نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔جھیل سی گہری آنکھیں جہاں ایک رات تھی پرسکون اور اور اس رات میں ایک چاند چمک رہا تھا خوشی کا اور بہت آسودگی کا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا تھا۔
"ہاں یاقوت، تمہاری آنکھیں بہت ہی پیاری ہیں۔"
وہ میرے نام سے واقف تھی، نام کے صرف ایک حصے سے......حیات سے......
نام کا پہلا حصہ اسے معلوم نہیں تھا۔سکندر......!
☆☆☆
وہ یاقوت کے گھر کی چھت تھی، جہاں کچھ سدا بہار پھولوں کے گملے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔آسمان کا نیلا نیلا اجلا ہوا سا رنگ آنکھوں کو عجیب سی راحت پہنچا رہا تھا۔ میں سیڑھیوں کی طرف سے مکمل پشت کیے ہوئے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔میرے عقب میں سیڑھیاں چڑھ کر کوئی اوپر آیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے دور تک کسی بھینے بھینے عطر کی خوشبو پھیلتی چلی گئی ہو اور پھر دھیرے سے، ہولے سے ایک آواز آئی تھی۔
چھن، چھن، چھن۔
وہ کانچ کی چوڑیوں کی کھنک دار آواز میرے دل میں اور پورے وجود میں جیسے ایک گدگدی سی بھر گئی تھی۔
"سنیں۔"
وہ اداس لڑکی کی آواز آج مجھے بہت مختلف لگی۔ٹھہری ہوئی سنجیدہ۔ میں نے پھر بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔
"آپ کھڑے کیوں ہیں؟ کرسی رکھی ہے وہاں بیٹھ جائیں۔تھک جائیں گے۔"
"جب تک آپ نہیں بیٹھیں گی تو میں آپ سے پہلے کیسے بیٹھ سکتا ہوں؟"
وہ تیزی سے عقب سے نکل کر سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ یہی کرے گی۔اس کے چہرے نے کئی رنگ بدلتے تھے۔ دھنک کے ساتھ رنگ۔وہ پتھر ہو گئی تھی شاک میں چلی گئی تھی۔
"آپ؟" یاقوت کا چہرہ آن کی آن میں کئی رنگ بدل رہا تھا۔
"ہاں میں سکندر حیات خان......" تنے ہوئے عضلات ایک ایک کر کے اپنی جگہ پر واپس آئے تھے۔وہ اپنے آپ کو کمپوز کر رہی تھی۔
"تو یہ آپ تھے۔" سکون کا سانس خارج ہوا تھا۔پھر وہی گھورآنکھیں پانیوں میں ڈوب گئی تھیں۔
"آپ نے ایسا کیوں کیا؟"
میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا تھا مگر میں خود ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑا رہا تھا۔
"بات بہت سادہ ہے۔ مجھے تم اچھی لگیں اگر تم ہضم کر سکو تو ایک اور بات بھی ہے کہ مجھے تم سے شدید محبت ہو گئی ہے اور اس لیے میں نے یہی بہتر سمجھا ہے کہ سیدھے طریقے سے، عزت والے راستے سے تم تک پہنچا جائے اور دیکھ لو میں پہنچ گیا۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکیاں لیتی ہوئی رو رہی تھی۔ رشتہ طے ہوگیا تھا تبھی میں نے گھر والوں کے سامنے یہ بات رکھی تھی کہ میں ایک بار یاقوت سے ملنا چاہتا ہوں اور اسی سلسلے میں ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ ویسے تو ہم باغ میں بھی ہر روز مل لیتے تھے مگر آج کی ملاقات الگ تھی۔ تعلق کی نوعیت بدلنے والی تھی۔ منظر بدل رہا تھا۔ حیثیت بدل رہی تھی۔

''تم رو کیوں رہی ہو۔ کیا میں تمہیں پسند نہیں ہوں؟ کیا تم انکار کردو گی؟''

میں نے تشویش لہجے میں بھر کر کہا تھا۔ وہ پھر بھی اپنے پسندیدہ مشغلے سے، رونے دھونے سے باز نہیں آئی تھی۔

چھت سے سامنے دور تک پھیلی سرمئی سڑک نظر آرہی تھی، جس کے کنارے لگے گل مہر کے نارنجی پھول آنکھوں کو بھلے لگ رہے تھے۔ بادلوں سے بالکل صاف نیلا نیلا آسمان سر پر کسی چھتری کی طرح تن کر کھڑا ہوا تھا۔

''پلیز تم رونا بند کرو۔ پہلے ہی تمہاری آنکھوں کی اداسی نے مجھے ادھ موا کر کے رکھ دیا ہے اب تمہاری آنکھوں کے دریا مجھے بہا کر لے جائیں گے۔ رحم کرو سکندر حیات خان پر، میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں ایک اچھا شوہر ثابت ہوں گا۔ میں تمہارا بہت خیال رکھوں گا۔ ڈسٹنگ کر لیتا ہوں، کھانا بنا لیتا ہوں، ڈرائیونگ کر لیتا ہوں، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہوں۔ بہت اچھی سیلری ہے میری۔ تمہیں لانگ ڈرائیو پر لے جاؤں گا۔ ہاکس بے چلیں گے۔ لان میں شام کی چائے پئیں گے۔ کٹلٹس بنا کر کھلاؤں گا۔ لیکن ایک چیز مجھے اچھی بنانی نہیں آتی نگٹس......''

میں نے آخر میں رونا منہ بنا لیا تھا۔ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے سوال کر گئی تھی۔

''مجھے تو نگٹس پسند ہیں۔''

''میں بنانا سیکھ لوں گا۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ میرے مقابل آ گئی تھی۔ وہ اداس آنکھیں آج ستاروں سے جگمگا رہی تھیں۔ مطمئن جیسے ساری پریشانیاں، تھکن سب چن لیا گیا ہو۔

''نہیں مجھے بنانے آتے ہیں۔''

خوشبوؤں نے چھت کا احاطہ کر لیا تھا۔

یاقوت واقعی قیمتی ہوتا ہے۔ خوب صورت بھی۔ انمول بھی۔

وہ سیڑھیاں اترنے لگی تھی۔ میں نے پیچھے سے پکارا تھا۔

''یاقوت! کیا تم اس رشتے پر راضی ہو؟'' وہ جاتے جاتے مڑ کر ہنسی تھی۔ کھلکھلائی تھی۔

''سوچ کر بتاؤں گی۔''

ہنسی مل جائے تو باقی کسی جواب کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں نے ٹھیک کہا ناں؟ یہی میری کہانی ہے۔

سکندر کی......اور، اور یاقوت کی......

ہم کبھی بھی عام، سستے، بے وقعت نہیں ہوتے۔ بنانے والے نے ہمیں بہترین طریقے سے بنایا ہوتا ہے بس وقت لگتا ہے، کبھی تھوڑا، کبھی بہت زیادہ...... جب ہمیں اوپر والا ہمارا خالق، انمول اور قیمتی کر دیتا ہے......!

یہ زندگی ہے، پرکشش، دلکش اور حسین......!

حوریہ بتول

قربانی اور کرونا

"شعیب! اتنی دیر کیوں لگا دی آنے میں؟"
وہ صبح نو بجے کا گیا تھکا ہارا گھر داخل ہوا۔ تو نمیرہ بجلی کی سی تیزی سے اس کی طرف لپکی اور بے چینی سے استفسار کیا۔

وہ دن بھر کی تھکاوٹ بھول کر حیرت سے اپنی پانچ سال پرانی بیوی کا نیا نویلا روپ دیکھنے لگا۔ پانچ سالہ ازدواجی زندگی میں اس نے نمیرہ کے رویئے میں انتظار کی عادت کو مفقود پایا تھا۔ اللہ خیر کرے۔ حیرت پر فکرمندی غالب آنے لگی۔

"کیا ہوا نمیرہ سب خیریت تو ہے نا؟" شعیب کے پریشانی سے پوچھنے پر نمیرہ نے جو بتایا ایک بار تو اس کا دل چاہا نمیرہ کا نہ سہی اپنا سر تو ضرور ہی دیوار میں دے مارے۔

"شیبی! زوہیب بھائی نے اس بار قربانی کے لیے ایک نہ دو پورے پانچ عدد بکرے لیے ہیں۔"

"تمہیں کیسے خبر ہوئی؟" شعیب نے ناگواری چھپاتے ہوئے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"تمہارے بھائی کی ساری آل اولاد دنیا کا ہر کام چھوڑ کر دھڑا دھڑ واٹس ایپ، فیس بک اور انسٹاگرام پہ اسٹیٹس لگا رہی ہے۔ ہائے زوہیب بھائی کی فیملی کو تو سارے خاندان کا دل جلانے کا ٹھیکا مل گیا ہے۔"

لاک ڈاؤن کے پیشِ نظر پورے خاندان میں سب ایک آدھ بکرا یا پھر گائے میں حصہ ڈالے بیٹھے تھے۔

"اور تم جانتے ہو عریشہ نے موٹے تازے خوب صورت بکروں کی تصاویر کے بعد کیا اسٹیٹس لگا رکھا ہے؟"

شعیب نے سر کو جنبش دے کر بتانے کا عندیہ دیا۔ حالانکہ نمیرہ کو اجازت دینے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

"اس بار بوجہ کرونا قربانی کا اہتمام تمام تر ایس۔او۔پیز کو مدنظر رکھ کے کیا جائے گا۔"

"اس کا تو صاف صاف مطلب یہی ہے کہ تمام رشتہ داروں کو دعوت پہ بلانے کے بجائے پاؤ بھر گوشت پہ ٹرخانے کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں۔"

"نمیرہ بچے کہاں ہیں؟" اس نے بات کو ٹالنا چاہا۔ وہ جانتا تھا اب ہر روز زوہیب بھائی کے گھر کا اسٹیٹس نامہ سننا پڑے گا۔ وہ ان ہی ڈیجیٹل مباحثوں سے بچنے کے لیے سادہ موبائل استعمال کرتا۔ لیکن اسے کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ نمیرہ خاندان کے ایک ایک بندے کے اسٹیٹس کا اسکرین شارٹ اسے دکھاتی اور خوب لڑتی۔ آج فلاں یہاں جا رہا فلاں واں جا رہا ایک میرے ہی موبائل کا اسٹیٹس باکس سنسان ہوتا ہے۔ تم کہیں لے کے جاؤ تو میں بھی بڑھا چڑھا کے اسٹیٹس لگانے کا شرف حاصل کر سکوں۔

نمیرہ کا میکا درجنوں افراد پہ مشتمل تھا اور خیر سے سسرال بھی۔ اس لیے آئے دن دل لگانے کو کسی نہ کسی کی جنگ چھڑی رہتی شعیب کا خاندان چھ عدد بھائیوں اور تین عدد بہنوں پہ مشتمل تھا۔ سونے پہ سہاگہ سب بہن بھائی لاہور میں ہی رہائش پذیر

تھے۔ سب ہی شادی شدہ اور آدھی آدھی درجن کی فوج لیے رہتے بھی جوائنٹ فیملی سسٹم میں تھے۔ بہنیں بھی بالترتیب پانچ، چار اور تین عدد بچوں کے ساتھ آئے دن میکے میں پائی جاتیں۔ سب سے بڑے زوہیب بھائی اپنی کنجوس فطرت کے باعث ''آفس دور پڑتا ہے گھر سے'' کہہ کر الگ شفٹ ہو گئے تھے۔

شعیب بینک میں اچھے عہدے پہ فائز تھا۔ بینک کی طرف سے فرنشڈ گھر ملا تو آنے جانے کا وقت بچانے کے لیے شالیمار سے مال روڈ شفٹ ہو گیا۔

نمیرہ اس تبدیلی کے سخت خلاف تھی۔ وہاں تو سب دیورانیاں جٹھانیاں کوئی نہ کوئی چٹ پٹا قصہ چھیڑے رکھتی تھیں۔ الگ ہو کر وہ ان سب معاملات سے دور نہیں ہونا چاہتی تھی۔ لیکن بھلا ہو واٹس ایپ فیملی گروپ کا جہاں پل پل کی خبریں کسی نیوز چینل سے بھی تیز ملتی تھیں۔ سسرال کا گروپ الگ اور میکے کا الگ تھا اس لیے دونوں اطراف کی خبریں متواتر ملتی رہتیں اور نمیرہ کا دل بھی خوب جلاتیں۔

☆☆☆

''حماد آج ''سکینڈ وائف'' گیا ہوا تھا۔'' نمیرہ نے اپنے بھائی کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔

شعیب جو آفس کی فائلوں میں سر دیے بیٹھا تھا

اس کی بات پہ غور کرنے کی زحمت کیے بغیر اسپرنگ کی طرح اچھلا
"تمہارے بھائی نے دوسری شادی کرلی اور تم اتنے فخر سے بتارہی ہو۔"
"تم مجھے کبھی آؤٹنگ پہ لے کر گئے ہوتے تو تمہیں پتا ہوتا۔ سکینڈ وائف ریسٹورینٹ کی حال ہی میں مال روڈ پہ اوپننگ ہوئی ہے۔ شوہر کی معلومات میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ شکوہ بھی ساتھ ہی نپٹایا اور عریشہ کا تازہ ترین اسٹیٹس دیکھنے لگی۔
زوہیب بھائی جو ہر سال بمشکل ایک من کی گائے لیتے تھے اس بار پانچ بکرے لے کر پورے سوشل میڈیا پہ خوب وائرل ہو رہے تھے۔ فیملی گروپ کی باتیں اجا گس میں کی جانے لگیں۔
"شعیب! اس بار ہم تین بکرے اور ایک گائے کی قربانی کریں گے۔" عریشہ کا تازہ ترین اسٹیٹس دیکھ کر نمیرہ نے شوہر کا بازو زور زور سے ہلاتے ہوئے جوش سے کہا۔
شعیب نے ناگواری سے نمیرہ کی طرف دیکھا۔ اور اسے جتاتے ہوئے کہنے لگا۔
"قربانی دکھاوے کے لیے نہیں ہوتی۔ لاک ڈاؤن لگنے والا ہے اس لیے میں اس بار ایک بکرے کی قربانی کروں گا۔ قربانی کے لیے رکھے باقی پیسوں سے غریبوں کے گھروں میں راشن تقسیم کروں گا۔"
شوہر کی بات پہ نمیرہ ایسے اچھلی جیسے شعیب نے خدانا خواستہ کسی ناگہانی آفت کی خبر سنادی ہو۔ چند لمحوں بعد ہوش بحال ہوئے تو موبائل بیڈ پہ پٹخ کر بولی۔
"میں ہرگز ایسی بے وقوفی نہیں کرنے دوں گی۔ زوہیب بھائی کے پانچ بکروں کے سامنے میں ایک بکرے کی تصویر اسٹیٹس پہ لگاتے ہوئے اچھی لگوں گی بھلا؟"
شعیب تاسف اور غصے کے ملے جلے تاثرات لیے بیوی کی کم عقلی ملاحظہ فرما رہا تھا۔
"تم جو مرضی کہو قربانی کے جانور میری مرضی سے آئیں گے۔" نمیرہ دوٹوک انداز میں کہہ کر ایک بار پھر موبائل کی بھول بھلیوں میں کھوگئی۔
☆☆☆
اگلے دن شعیب آفس سے آیا تو نمیرہ ایک بار پھر راہداری کے چکر کاٹتی نظر آئی۔ اللہ جانے بیگم صاحبہ نے آج کس کا اسٹیٹس دیکھ لیا۔ دل ہی دل میں اندازہ لگاتے شعیب خوش دلی سے اس کی طرف آیا۔
"آج کل بیگم صاحبہ مجھے کچھ زیادہ ہی یاد کرنے لگی ہیں۔"
نمیرہ نے اس کی بات کو نظر انداز کیا اور بے تابی سے بولی۔
"شیبی! عید میں تین دن رہ گئے ہیں۔ کب لاؤ گے قربانی کے جانور؟"
"آج ہی لے آؤں گا میں بکرا دیکھ آیا ہوں۔ کچھ پیسے کم تھے وہی لینے آیا ہوں۔" شعیب کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ نمیرہ کا واویلا شروع ہوگیا۔ شعیب کے لاکھ سمجھانے پہ بھی وہ مان کے نہ دے رہی تھی۔ شعیب کو دیر ہو رہی تھی اس نے سوچا آ کے منالوں گا اور وہ پیسے لے کر چلا گیا۔ موٹا تازہ بھورے رنگ کا بکرا لے کر گھر لوٹا تو گیٹ پہ لگا بڑا سا تالا اس کا منہ چڑھا رہا تھا۔
شعیب نے بکرے کو گیٹ کے ساتھ باندھا اور نمیرہ کا نمبر ڈائل کیا۔ تیسری بیل پہ فون اٹھا لیا گیا۔
"نمیرہ تم کہاں ہو؟"
"اگر میرے مطابق قربانی کرو گے تو ہی گھر آؤں گی ورنہ تو عید میں میکے میں ہی کروں گی۔"
نمیرہ نے دوٹوک انداز میں اپنی بات کہہ کر اس کی سنے بغیر کال کاٹ دی۔ شعیب کو اس کے رویے پہ غصے سے زیادہ افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے اتنے حسین تحفے قربانی کو ہم سوشل میڈیا کی نذر کرنے پہ تلے ہوئے ہیں۔ دکھاوے کی عبادت منہ پہ ماری جاتی ہے۔ اس کی ہر بچگانہ حرکت کو منٹوں میں معاف کردیا

کرتا تھا۔ لیکن اس بار وہ چاہتا تھا نمیرہ کو خود احساس ہو اسی لیے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

☆☆☆

نمیرہ اپنے فیصلے پہ اٹل رہی اور گھر واپس نہیں آئی۔ بڑی عید کے رنگ نمیرہ کی چھوٹی سوچ کے رنگوں میں گڈمڈ ہو کے رہ گئے۔ عید شوہر اور اپنے گھر کے بغیر بہت سونی گزری۔

عید کے ہنگاموں سے فارغ ہو کر موبائل اٹھایا اور ڈیٹا آن کر کے واٹس ایپ پہ چلی آئی۔ سسرالی فیملی گروپ طرح طرح کی گوسپ سے بھرا ہوا تھا۔ دو سو پچاس میسجز کے گول دائرے میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن آج اس کا دل کسی قسم کی گوسپ سے لطف اندوز ہونے کا نہیں تھا اس لیے گروپ اوپن نہیں کیا اور اسکرولنگ کر کے میسجز چیک کرنے لگی۔ صبا (نند کی بیٹی) کے چیٹ ہیڈ کو دیکھا ابھی کچھ دیر پہلے اس کے میسجز اور مس کالز آئی ہوئی تھیں۔ نمیرہ نے بے دلی سے اس کا چیٹ ہیڈ اوپن کیا تو اس کی طرف سے کیپشن کے ساتھ ایک ویڈیو بھیجی گئی تھی۔

"ممانی جان جیسے ہی میرے میسج دیکھیں فوراً سے ویڈیو دیکھیے گا دل خوش ہو جائے گا۔"

صبا سے تو اس کی خاص دوستی تھی۔ اندر کی خبریں زیادہ تر صبا ہی وائرل کرتی تھی۔ اور سونے پہ سہاگہ ہر خبر کی چٹخارے دار ویڈیو بنا کر بھیجا کرتی تھی۔

تجسس کے مارے نمیرہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ویڈیو ڈاؤن لوڈنگ پہ لگائی اور بے صبری سے انتظار کرنے لگی۔ نیٹ سلو تھا اس لیے پچیس ایم۔بی کی ویڈیو کے گرد گھومتا دائرہ بہت سست روی کا شکار تھا۔ دس منٹ کے صبر آزما انتظار کے بعد ویڈیو ڈاؤن لوڈ ہوئی۔ نمیرہ نے ایک سیکنڈ کی دیر کیے بغیر ویڈیو پہ کلک کیا۔ چمکتی دمکتی صبا نمودار ہوئی۔

"ممانی جان! آج تو بڑی عید کا مزا بھی بڑا تھا۔ ماما کئی دن سے پاپا کو قربانی کا جانور لانے کا کہہ رہی تھیں۔ بابا کی ٹال مٹول عید کا دن لے آئی بکرا نہ آیا۔

پاپا سے خوب لڑائی کے بعد ماما نے بھتیجی صاحبہ کے اسٹیٹس کا حوالہ دیا اور بن بلائے ہم سب کو زوہیب ماموں کے ہاں لے کر چلی گئیں۔ وہاں جا کر ہم پانچ تو کیا ایک بکرا بھی دیکھ نہ پائے۔ ہر سال کی طرح ایک مریل سی گائے کھونٹی سے بندھی نظر آئی۔ ہمیں دیکھ کر سب آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ میں بھی فرح کو لے کر چھت پہ جا پہنچی۔ چاکلیٹ کی لالچ میں اس نے دو منٹ میں سب اُگل دیا۔

"سب گھر والوں نے مل کر پلان بنایا تھا کہ اس بار خاندان والے نہیں آ رہے تو گوگل سے بکروں کی تصویریں نکال کر اسٹیٹس پہ لگا کے خوب شو ماریں گے۔ لیکن آپی آپ کیوں آ گئیں؟ دس سالہ فرح نے معصومیت سے پوچھا۔ ماما تو زوہیب ماموں سے خوب لڑیں اور اُلٹے پیروں گھر کی راہ لی۔" نمیرہ نے موبائل سائیڈ پہ رکھا اور سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ یہ ہم لوگ کس طرف جا رہے ہیں۔ اسلامی تہوار کو جھوٹ اور نمائش کا تہوار بنا لیا ہے۔ اور میں کتنی بے وقوف ہوں اس شو آف کے چکر میں اللہ کو بھی ناراض کیا اور شوہر کو بھی۔

بچوں کی عید الگ خراب کی۔ دونوں پورا دن باپ کو یاد کرتے رہے۔

شعیب ٹھیک ہی کہتا ہے۔ سوشل میڈیا کا غلط استعمال گلے کا پھندا بن جاتا ہے۔

نمیرہ کا گھر اور بچوں سے زیادہ دھیان موبائل میں لگا رہتا۔ دوسروں کی تصاویر دیکھ دیکھ کر وہ خود ساختہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتی اور شعیب سے بات بات پہ لڑتی تھی۔ اس نے سوشل میڈیا کو دیکھ کر کسی بھی سرگرمی میں حصہ لینے سے توبہ کی اور شعیب کا نمبر ملانے لگی۔ عید کا دوسرا دن وہ اپنی بے وقوفی کی نذر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆

آسیہ مرزا

میرے ہم نفس، میرے ہم نوا

ناولٹ

حیات علی کی تین بیٹیاں تھیں۔ یہ ایک متوسط گھرانہ تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ راحیلہ بیگم کے سگھڑاپے کا منہ بولتا ثبوت۔ اولاد کی تربیت میں کہیں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ نیلوفر تو تھی ہی ماں کی طرح صابر و شاکر اور ارسلہ نے اس کا لقب قانع آپا رکھ دیا تھا۔ اریبہ چھوٹی فرسٹ ائیر کی طالبہ تھی۔ بس پڑھائی اور موبائل گیمز سے دلچسپی تھی مگر اماں کا دردِ سر تو ارسلہ تھی۔

نیلوفر کی منگنی جہاں ہوئی تھی وہ لوگ بہت لالچی تھے اور آئے دن کوئی نہ کوئی مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ ارسلہ کو اس کی خالہ کا بیٹا سکندر پسند کرتا تھا لیکن غربت کی وجہ سے ارسلہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مہوش جیلانی اور اکبر جیلانی کے دو بچے ہیں، رومی اور آبص۔ آبص ایک حادثہ کی وجہ سے اپنی زندگی سے بے زار ہے۔

نادیہ شاہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ کالج کے ایک ٹور پر اس کی ملاقات آبص سے ہوتی ہے جہاں دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

آبص کی ماں کو اس رشتے سے اختلاف ہوتا ہے اور وہ نادیہ شاہ کے گھر جا کر اس کی بہت بے عزتی کرتی ہیں۔ جب وہ اس کے بھائی کو مروانے کی دھمکی دیتی ہیں تو مجبوراً نادیہ شاہ آبص کو چھوڑ دیتی ہے اور اپنا گھر بھی تبدیل کر لیتی ہے۔

ارسلہ کو اپنی دوست رومی کے بھائی آبص میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آتی ہے۔ جب اس کے گھر والے آبص کا رشتہ لے کر آتے ہیں تو وہ زبردستی اپنی بات منواتی ہے۔

ارسلہ کی شادی آبص سے ہو جاتی ہے لیکن وہ اس بات سے انجان ہے کہ آبص ایک حادثہ میں اپنی ٹانگ سے محروم ہو چکا ہے۔

ابا کو اکبر جیلانی کے آفس میں ایک جاننے والے سے علم ہوتا ہے کہ آبص تو کافی عرصے سے معذور ہے وہ بامشکل گھر پہنچتے ہیں اور اماں کو بتاتے ہیں۔ اماں ہمدردی کا اظہار کرتی ہیں اریبہ سے لیکن اریبہ کہتی ہے کہ وہ آج جو عیش کر رہی ہے، ان کے بیٹے کے اسی نقص کی وجہ سے کر رہی ہے۔

ارسلہ کا لالچ دیکھ کر مہوش کو اپنے کیے کا پچھتاوا ہے۔

نادیہ شاہ اپنی دوست کے ذریعے آبص کے بارے میں معلومات کرواتی ہے۔ وہ اس کو آبص کی شادی کی تصویریں سینڈ کرتی۔ نادیہ شاہ کی بات اس کے کزن حمزہ سے ہوجاتی ہے۔ نادیہ شاہ حمزہ کو اپنے ماضی کے بارے میں بتانے کی کوشش کرتی ہے لیکن بتا نہیں پاتی۔

نیلو کی زندگی شادی کے بعد چھوٹی موٹی تلخیوں کے ساتھ اچھی گزر رہی ہے۔ احمر اس کے لیے ایک ٹھنڈی چھاؤں کی مانند ہے۔

عقیلہ خالہ کی خواہش ہے کہ ارسلہ سے نہ سہی اریبہ کی شادی سکندر سے ہوجائے۔ انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار سکندر اور اپنی بہن راحیلہ سے بھی کردیا ہے۔ ارسلہ جب یہ سنتی ہے تو ان کے گھر جاکر سکندر کو بہت سناتی ہے۔

حمزہ نادیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن نادیہ اسے اپنے ماضی اور آبص کے بارے میں سب کچھ بتادیتی ہے۔ حمزہ نادیہ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

ایک شادی میں اتفاقاً نادیہ اور آبص کی ملاقات ہوجاتی ہے پھر وہ اکثر و بیشتر ملنے لگتے ہیں۔ نادیہ آبص کو اس کی ماں کے بارے میں سب کچھ بتادیتی ہے۔

ارسلہ کے یہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے وہ ابارشن کروانا چاہتی تھی۔ لیکن اس شرط پر رک جاتی ہے کہ بچہ ہونے پر آبص اسے ایک کوٹھی تحفہ میں دے گا۔

گھر دیکھ کر ارسلہ کا منہ بن جاتا ہے۔ وہ کسی بڑی کوٹھی کا تصور جمائے بیٹھی تھی یہ تو صرف چار سو گز کا بنگلا تھا۔ گھر آکر بھی اس کا غصہ کم نہیں ہوتا وہ گیلری سے نکل کر رہائشی حصے کی طرف جارہی ہوتی ہے تپتے دماغ کے ساتھ دو تین زینے پھلانگتی ہے اور اس کا پاؤں رپٹ جاتا ہے اور وہ آخری زینے پر گر جاتی ہے۔

اٹھارویں قسط

ارسلہ کی لگائی آگ بھڑک رہی تھی۔ نیلوفر کی ساس تو یوں بھی موقع کی منتظر تھیں کہ کس طرح نیلو کو احمر کی نظروں سے گرادیں اور اس کے میکے والوں کو گندہ کردیں۔ اب تو اچھا خاصا ان کی اپنی ہی عزت افزائی کرڈالی تھی ارسلہ نے، وہ بھڑک گئی تھیں۔ عجیب صورت ہوگئی تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا اماں حواس باختہ نظر آرہی تھیں۔ کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ اتنا بڑھ جائے گا۔

ادھر احمر کے تیور بھی بگڑ چکے تھے۔ وہ اپنی ماں کو لیے گھر سے نکلنے لگا نیلوفر اور اماں ان کے پیچھے لپکیں۔ مگر احمر نے نیلو کا ہاتھ خاصی رعونت اور ناراضی سے جھٹک دیا تھا۔ اماں کا ہاتھ پکڑا اور گیٹ سے نکل گیا۔

نیلو کی حالت تو غیر ہو رہی تھی۔ حالات بے حد سنگین صورت حال اختیار کر گئے تھے پورے گھر میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ ہر کوئی خوف زدہ تھا سوائے ارسلہ کے جو یہ تباہی پھیلا کر اپنا بیگ اٹھا کر ڈرائیور کے ساتھ سسرال نکل گئی تھی۔

”دیکھ لیا نا تم نے اس دعوت کا انجام۔“ ابا اماں پر گرج رہے تھے جو کرسی پر سر پکڑے بیٹھی تھیں۔

”بہت شوق تھا نا تمہیں نیلو کی ساس کو بلوانے کا، ان کو سر پر بٹھانے کا۔ دیکھ لیا انجام۔“

”مگر قصور نیلو کی ساس کا تو نہیں تھا اس کم بخت ماری ارسلہ کا ہے سب کیا دھرا اس کا ہے۔ دیکھا نہیں آپ

نے کتنی بدتمیزی کررہی تھی وہ۔" اماں روتے روتے سر اٹھا کر بولیں۔ پھر نیلوفر کی طرف دیکھا جو ایک طرف کھڑی بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں احمر کا رویہ گھوم رہا تھا۔ جس طرح اس نے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا اسے لگا جیسے وہ یکدم تپتی دھوپ میں اکیلی جا کھڑی ہوئی ہو۔

"ارے، اب بیٹھ کر ایک دوسرے کو الزام ہی دیتے رہو گے یا اس مسئلے کا حل بھی سوچو گے۔" عقیلہ خالہ فکرمندی سے اپنی جگہ سے اٹھیں اور اریبہ کے ہاتھ سے گلاس لے کر اماں کو پلانے لگیں۔

"ہمت کرو، کوئی حل سوچتے ہیں۔"

سکندر کمرے میں داخل ہوا تو بیک وقت سب کی نظریں اس پر اٹھیں۔ نیلوفر نے تڑپ کر جیسے اسے دیکھا تھا۔ سکندر کے بجھے بجھے انداز میں کمرے میں داخل ہونا اس کے دل کو دھچکے کی طرح لگا تھا۔ وہ احمر کے پیچھے گیا تھا یہ کہہ کر کہ وہ اسے سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ لے آتا ہے مگر اب اضطرابی انداز میں آ کر ایک طرف کھڑے ہو جانے پر نیلو کے ہی کیا عقیلہ خالہ کے دماغ میں بھی خطرے کی گھنٹی بج گئی تھی۔ جو موہوم سی امید تھی وہ بھی بجھ کر رہ گئی تھی۔

"کیا کہا احمر نے۔" نیلوفر اس کے نزدیک چلی آئی۔

"کیا کہے گا۔ اس کی اماں ہی کہے جا رہی تھی اور وہ سن رہا تھا میری طرح اور بات ہی ایسی تھی کہ میرے پاس تمہاری ساس کی باتوں کو جھٹلانے کے لیے دلیل نہیں تھی۔" وہ ہلکی سانس کھینچ کر کمرے سے جانے لگا۔

"مجھے کسی کی پروا نہیں ہے سوائے احمر کے۔ وہ بہت بدگمان ہو کر گیا ہے یہاں سے سکندر۔" نیلوفر لرزتی آواز میں گویا ہوئی۔ سکندر نے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا پھر اس کی طرف چلا آیا اور نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ تو اس نے اس کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹا کر اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا اور رندھی آواز میں بولی۔

"مجھے لے جاؤ سکندر، ابھی اور اسی وقت وہاں پر، میرا وہاں جانا ضروری ہے، مجھے جانا ہوگا۔"

"کیا...... ابھی، یہ کیا کہہ رہی ہو نیلو۔" سکندر نے تشویش سے اسے دیکھا۔

"ہاں ابھی اسی وقت اس سے پہلے کہ اس گھر میں اور احمر کے دل میں میری جگہ تنگ ہو جائے مجھے جانا ہوگا۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

اماں نے گھبرا کر اسے دیکھا اور کچھ کہنا چاہا کہ عقیلہ خالہ نے جلدی سے ان کے کندھے پر ہلکا سا ہاتھ کا دباؤ ڈال کر انہیں روک دیا اور نیلوفر کی بات کی تائید کرتے ہوئے بولیں۔

"نیلو کا فیصلہ بالکل درست ہے سکندر۔ اسے جانا چاہیے اسی وقت ورنہ نیلو کی ساس رات بھر بیٹے کے کان یکطرفہ بھرتی رہے گی۔ اسے نیلو سے متنفر اور بدگمان کر دے گی۔ آخر نیلو کو حق ہے اپنا دفاع کرنے کا۔" پھر نیلو کے قریب آئیں اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ تم جاؤ نیلو، معاملے کو افہام تفہیم سے سلجھانے کی کوشش کرو۔ خدا تمہاری مدد کرے۔ تم ایک باہمت اور باحوصلہ لڑکی ہو۔ یہ چھوٹی موٹی رکاوٹوں سے خوف زدہ مت ہونا نہ ہمت ہارنا یہ ہمیں مضبوط بناتی ہیں جینا سکھاتی ہیں۔ جاؤ شاباش۔"

"مگر امی......!" سکندر الجھی نظروں سے ماں کا چہرہ دیکھا پھر نیلو سے بولیں۔ "سوچ لو نیلو۔ ایسا نہ ہو تمہارے جانے سے معاملہ زیادہ خراب ہو جائے۔ احمر غصہ میں ہے ابھی۔ ناحق بے عزتی کر دے گا تمہاری۔ ابھی اپنی ماں کی بے عزتی پر بھڑکا ہوا ہے تمہارا جانا اور نہ بھڑکا دے اسے۔" سکندر کچھ مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا اور نیلوفر کے سسرال جانے کے حق میں نہ تھا۔ مگر نیلو بضد تھی۔

"ہاں آپی، ایسا کریں نا آپ احمر بھائی سے فون پر بات کر لیں۔ سکندر ٹھیک کہہ رہے ہیں جلد بازی سے کام نہ لیں تو اچھا ہے۔" اریبہ بھی سکندر کی بات کی تائید کرتے ہوئے بولی۔

''نہیں، میرا دل نہیں مان رہا بس مجھے جانا ہے اس سے پہلے کہ سب کچھ ختم ہوجائے اس آگ میں سب راکھ ہوجائے مجھے لے چلو سکندر میں صرف اس گھر میں ہی نہیں احمر کے دل میں بھی رہنا چاہتی ہوں۔'' وہ آنسو پونچھتے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔ ابا بھی چپ چاپ کمرے سے نکل گئے۔ گویا وہ بھی نیلوفر کے اس فیصلے سے متفق تھے۔

''جاؤ سکندر، اسے لے جاؤ اس کا اس وقت شوہر کے پاس ہونا ضروری ہے۔ عزت تو اب لگ ہی چکی ہے داؤ پر خدا بچانے والا ہے، جاؤ نیلو۔'' عقیلہ خالہ نیلو کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر تسلی آمیز انداز میں مسکرائیں۔

سکندر خاموشی سے کمرے سے نکل گیا، نیلو بھی اس کے پیچھے باہر نکل آئی۔

''ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہاں کیا حالات ہیں تم ایک کال کرلیتیں احمر کو تو اچھا رہتا۔ کچھ اس کے مزاج کا اور وہاں کے حالات کا اندازہ ہوجاتا۔'' بائیک پر بیٹھتے ہوئے سکندر نے کہا۔

''میں کرچکی ہوں مگر وہ میری کال ریسیو نہیں کررہے ہیں اور حالات اب مزید کیا خراب ہوں گے جو تھے وہ ہم سب نے دیکھ ہی لیا تھا۔ میری ساس موقع کی تاک میں تھیں انہیں مل گیا موقع۔'' وہ افسردگی سے کہتی چادر سنبھال کر بائیک پر بیٹھ گئی۔

''حالات ہی تو سنبھالنا چاہتی ہوں۔ احمر کا رویہ مجھے بہت تکلیف دے رہا ہے میں خوف زدہ ہوگئی ہوں۔ میں بالکل نہیں جانتی کہ مجھے دیکھ کر وہ کیا ری ایکٹ کریں گے مگر اب یہ بازی تو ہمیں کھیلنی ہی ہوگی۔ جھکنا تو پڑے گا اور اگر میرے ذرا سے جھکنے پر میرا گھر بچ جاتا ہے احمر کا دل صاف ہوجاتا ہے تو سودا مہنگا نہیں۔ تکبر سے گھر بکھر جاتے ہیں سنورتے نہیں ہیں۔'' پتا نہیں وہ خود کو حوصلہ دے رہی تھی یا سکندر کو۔

سکندر ہلکی سانس بھر کر رہ گیا۔ اس کے دل سے ارسلہ کے لیے نفرت کا ایک غبار سا اٹھ رہا تھا۔ اس کی بے حسی اور سنگ دلی پر بھر بھر کر غصہ آئے جارہا تھا۔ نیلوفر کی یہ حالت اسے افسردہ کررہی تھی۔

ابھی صبح تک وہ کتنی خوش اور مسرور دکھائی دے رہی تھی۔ اس ساس اور احمر کے گھر آنے کی خوشی میں وہ نہال تھی۔ اس کی ساس صاحبہ نے ان کے میکے کی دعوت قبول کرکے گویا اسے ہزار نفلوں کا ثواب بخش دیا ہو۔ وہ بہت خوش تھی اور ایک ایک کام اپنی نگرانی میں کروارہی تھی۔ اس کی پسند ناپسند کا اسے خیال تھا احمر کی عزت کا احساس تھا۔ وہ اپنے شوہر کو فقط اپنے دل میں ہی نہیں اپنے میکے میں بھی اونچا مقام دینا چاہتی تھی۔ احمر کی چھوٹی چھوٹی ناانصافیوں کو اس نے کبھی میکے میں ڈسکس نہیں کیا تھا نہ ساس کے رویوں کو موضوع گفتگو بناتی تھی۔ مگر ارسلہ کی بے مروتی، خودغرضانہ فطرت اور بداخلاقی نے سب کچھ تہس نہس کر ڈالا تھا۔ لمحوں میں ہی اس کی محنت کو رائگاں کردیا تھا کہ وہ کس قدر راجڑی نظر آنے لگی تھی اور اس پر ارسلہ کی بے اعتنائی اور بے حسی کا یہ عالم کہ ''وہ میں کیا کرسکتی ہوں اب۔'' کہہ کر اپنا بوریا بستر سمیٹ کر یہ جاوہ جا۔ نہ کوئی شرمندگی نہ احساس ندامت۔ نہ بہن کے حال مستقبل کا خیال۔

سکندر کو ارسلہ کے تصور سے ہی رگوں میں جلن محسوس ہونے لگی۔ اس نے پوچھا اچھا ہی ہوا ارسلہ جیسی سنگدل اور مفاد پرست لڑکی اس کی زندگی میں داخل نہ ہوئی۔ اسے خدا کے انصاف، اس کی حکمت اور اس کی چاہت پر یقین مزید پختہ ہوگیا تھا۔ اس کی ماں کی دعائیں جو اس کی بہتری بھلائی اور مخلص ہمسفر کے لیے مانگی گئی تھیں وہ قبول ہوچکی تھیں۔

''خدا وہ نہیں دیتا جو فقط ہم چاہتے ہیں رب وہ دیتا ہے جو ہمارے لیے بہتر ہوتا ہے۔'' عقیلہ خالہ نے اسے یہی سمجھایا تھا مگر اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ اس دھرتی کا سب سے دکھی انسان ہے۔ جو خالی ہاتھ اور خالی دل ہوکر رہ گیا ہے۔ سارا ظلم جیسے اس کی ذات پر ہوا ہو اور وہ زخمی زخمی ہوا اور یہ زخم بھی

نہ بھریں گے۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ اسے احساس ہونے لگا کہ بے شک رب ستر ماؤں سے زیادہ چاہنے والا ہے وہ بندے کو وہ دیتا ہے جو اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ اس نے اپنی سوچوں سے نکل کر بائیک نیلوفر کے سسرال کے گیٹ پر روک دی۔

نیلوفر نے جونہی گھر کے اندر داخل ہوئی اسے لگا اس کا پیر لڑکھڑا رہے ہیں۔ وہ زیادہ دیر کھڑی نہ رہ پائے گی۔ احمر دروازہ کھول کے منہ پھیر کر اندر چلا گیا تھا نیلوفر کسی مجرم کی طرح سر جھکائے اندر جونہی داخل ہوئی لابی کے صوفے پر بیٹھی ساس اسے دیکھتے ہی برافروختہ ہوگئیں۔ ''اب کس منہ سے چلی آئی ہو۔ شرم نہیں آئی تمہاری ماں کو کہ تمہیں بھیج دیا۔ ارے ذرا سی بھی عزت کا پاس ہوتا تو خود آتیں۔ معافی مانگنے۔ بچہ سمجھا ہوا ہے ہمیں کہ بہلانے چلی آئی ہو۔''

نیلوفر کو لگا گویا کھڑے کھڑے صور پھونک دیا گیا ہو اطراف کی دیواریں اسے خود پر گرتیں محسوس ہونے لگیں۔

''میں شرمندہ ہوں اماں یقین جانیے امی اور ابا بھی بے حد شرمندہ ہیں وہ نادم ہیں آپ سے معافی مانگ لیں گے۔'' نیلو جلدی سے ساس کے قدموں میں جا بیٹھی۔

سکندر اذیت سے لب بھینچ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ پھر احمر کی طرف مڑا جو دروازہ بند کر کے اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہا تھا وہ جلدی سے احمر کی طرف لپکا۔

''احمر پلیز! معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ اس سارے حالات میں نیلوفر کا کوئی قصور نہیں ہے اور نہ خالہ اور خالو کا۔ کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ ارسلہ اس طرح ری ایکٹ کرے گی۔'' وہ احمر کے سامنے رک کر رسان سے بولا۔

''تو قصور میری ماں کا بھی نہیں تھا کہ جو بھرے پورے گھر میں ان کی عمر کا بھی لحاظ نہ کیا جائے گا اور اس طرح ارسلہ ہو یا XYZ انہیں ذلیل کریں گے اور میں بے غیرت بیٹا بن کر سنتا رہوں گا۔'' وہ تو پہلے ہی بھڑکا ہوا تھا اماں نے پورے راستے آنسو بہائے تھے اور گھر آ کر منہ لپیٹ لیا تھا اور اب نیلو کو دیکھ کر اس کے دماغ میں پھر کھولن ہونے لگی تھی۔

''تمہاری ماں کو اتنا نہیں ہوا کہ ارسلہ کے منہ پر ایک تماچا رکھ دیتیں۔'' ساس صاحبہ نیلوفر کا ہاتھ اپنے گھٹنے سے نخوت سے جھٹکا۔ ''ہاں بھئی وہ کروڑ پتی بیٹی سے دب جو گئیں اس کا پیسہ کھاتی ہیں تو کہاں اس کی غلط باتیں غلط لگیں گی۔ جی بھر کر اس چھٹانک بھر کی لڑکی نے مجھے بے عزت کیا اور تم سب تماشا دیکھتے رہے اب میرا بیٹا بھی میرا ساتھ نہ دے یہی چاہتی ہو تم۔ وہ میرا خون ہے بے غیرت نہیں ہے۔''

''نہیں اماں! ایسے مت کہیں آپ کی عزت میری عزت ہے۔ خدا کی قسم میرا ابا میرے گھر والوں کا ایسا کوئی مقصد نہیں ہے آپ جو سزا دینا چاہتی ہیں مجھے دے دیں۔ مگر مجھ سے بدگمان نہ ہوں خدارا۔''

''بس بس ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور جا کر اپنی بہن کو لے آؤ یہاں آ کر معافی مانگے مجھ سے تب تک تم بھی مت آنا۔'' انہوں نے حکم نامہ جاری کر دیا۔ نیلوفر کا دل کانپ کر رہ گیا۔

''ہاں نیلو! اماں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ارسلہ کو امی سے معافی مانگنا ہوگی اس کی اس حرکت کو میں تب تک معاف نہیں کروں گا جب تک وہ یہاں آ کر اپنے کیے پر شرمندگی ظاہر نہیں کرتی۔'' احمر نیلوفر کے سر پر کھڑا خفگی سے بولا نیلوفر نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

تو گویا غیرت کے تقاضے زور پکڑ چکے تھے۔ اس کا ذہن سرپٹ گھوڑے کی طرح منفی رخ کی طرف بھاگ رہا تھا اس کی یہ لاتعلقی یہ بے گانگی اور کڑوا انداز اس کی کھلی ناراضی کا اظہار تھا۔ تاہم نیلوفر کی آنسوؤں سے لبالب

بھری نگاہیں احمر کے قدم کو لمحہ بھر ڈگمگا گئیں۔مگر دوسرے پل وہ نظریں چرا گیا۔
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں احمر؟ میرا قصور۔" اس کی آواز ٹوٹ گئی۔اس نے رخ پھیر لیا تھا۔
"مجھے اپنی ماں کی عزت اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اماں کا فیصلہ میرا فیصلہ سمجھو۔"
نیلوفر پر ہزار پتھر لڑھک گئے تھے۔ادھر سکندر بے بسی سے لب بھینچ کر رہ گیا اس کا دل چاہا لمحہ ضائع کیے بنا نیلوفر کو لے کر اس گھر سے نکل جائے مگر اسے نازک رشتے کا احساس اس کو کسی بھی جذباتی ردعمل سے باز رکھے ہوئے تھا۔
"ٹھیک ہے، ارسلہ کو معافی مانگنا ہوگی اس بات سے میں بھی اتفاق کروں گا مگر نیلوفر کو اس گھر سے نکالنے کا کوئی جواز نہیں بنتا احمر۔" اس نے اپنے طور پر آخری کوشش کی۔
"یہ اس کا بھی گھر ہے غلطی نیلوفر سے نہیں ہوئی تو اسے نکالنا ناجائز ہوگا احمر۔ یہ تمہاری بیوی ہے۔ عزت ہے تمہاری، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ماں کی عزت کرتے ہوئے بیوی کو بے عزت کرو۔ اسے گھر سے بے دخل کردو۔ جب کہ قصور اس کا ہرگز نہیں نکلتا۔"
"تم چپ کرو لڑکے، ہمارے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اماں بھبک کر صوفے سے اٹھیں۔ "تم میرے بیٹے کو ورغلانا چاہتے ہو میرے خلاف اسے زیادہ سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے اپنی بہن کو لو اور چلتے بنو یہاں سے۔" نیلو کی ساس تو شاید بیٹے کی شہ پا کر اخلاقیات کا ہر سبق بھلا بیٹھی تھیں۔ سکندر کا چہرہ اس ذلت پر لال ہو گیا۔
احمر جیسے شریف با اخلاق اور متحمل انسان کے لیے یہ ساری صورت حال خاصی تکلیف دہ تھی۔ ایک طرف اس کی آنسو بہاتی بے قصور بیوی کھڑی تھی جس کی کوکھ میں اس کا بچہ سانس لے رہا تھا اور ایسے حالات میں اسے اس طرح کے ٹینشن سے دور رکھنا اس پر لازمی تھا مگر دوسری طرف ماں کھڑی تھی جس نے دودھ نہ بخشنے کی قسم کھالی تھی اس کی عزت اور احترام بھی واجب تھا درمیانی کوئی راستہ اسے سجھائی نہ دے رہا تھا سوائے اس کے کہ ارسلہ آکر اس کی ماں سے معافی مانگ لیتی۔ وہ نظریں چرا کر کمرے سے نکل گیا تھا۔
نیلوفر سکندر کے ہمراہ نڈھال قدموں سے باہر کی جانب جانے لگی۔
"دیکھ لیا نا منع کیا تھا تمہیں اسی لیے کہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔" واپسی پر سکندر افسردگی سے کہہ رہا تھا مگر وہ تو خود دل گرفتہ سی تھی اس کا تو جیسے سارا مان ہی ٹوٹ گیا تھا وہ تو اس خوش فہمی میں تھی کہ احمر اس کے آنسوؤں کی لاج رکھ لے گا اور اس کی ماں کا غصہ ٹھنڈا کر کے معاملے کو سلجھا لے گا۔ اسے روک لے گا یوں جانے نہ دے گا۔
"میں تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ اگر ارسلہ تمہاری ساس سے معافی مانگنے پر تیار نہ ہوئی تو کیا ہوگا تمہارا۔"
سکندر کی بات نیلو کے دل پر پتھر کی طرح کھٹ سے لگی اس نے تڑپ کر سکندر کو دیکھا اس کے کندھے کو زور سے جکڑ لیا۔
"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ احمر اتنا احمق اور جذباتی نکلے گا۔ اس نے تمہاری اس کنڈیشن کا بھی خیال نہیں کیا۔ ٹھیک ہے ماں کا احترام اپنی جگہ مگر اس مسئلے کو انا اور غیرت کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے تھا۔ اس طرح تو گھر خراب ہو جاتے ہیں۔"
"خدا نہ کرے کہ میرا گھر خراب ہو۔" نیلوفر کی آنکھیں یکدم چھلک پڑیں۔ سکندر گھبرا گیا۔
"ارے نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا میں تو محض ایک بات کر رہا ہوں۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا احمر تمہیں چاہتا ہے

بس یہ اموشنل بلیک میل ہو رہا ہے چلو خیر۔ حوصلہ رکھو سب خیر ہوگی۔ اللہ سے بڑھ کر تو کوئی بھی طاقت ور نہیں منصف نہیں۔ وہ رحیم ہے، بگڑے کام وہی بنانے والا ہے تم پریشان نہ ہو۔ دو چار دن میں احمر کو عقل آجائے گا غصہ اتر جائے گا تو۔" وہ راستے بھر پھر اسے دلاسا دیتا رہا۔ اس کی تسلی کا معاملہ کرتا رہا۔ وہ سوچ رہی تھی دکھ اسے ساس کے الفاظوں نے نہیں پہنچایا تھا جتنا احمر کے رویے نے۔

"سکندر! یہ مرد جب دھوپ بنتے ہیں تو چھاؤں کا سارا احساس تک چھین لیتے ہیں۔" سکندر نے گھر کے سامنے بائیک روکی تو نیلو نیچے اتر گئی...... اور دل گرفتگی سے بولی اور آنسو پونچھتی اندر چلی گئی۔

سکندر افسردگی کے حصار میں چند لمحے کھڑا رہا۔

دھوپ تو وہی مرد بنتا ہے جو مضبوط شجر نہیں ہوتا۔ جس کی جڑیں اور شاخیں کمزور ہوتی ہیں۔

اس کی آنکھوں میں ریت سی چبھنے لگی اس نے نیلوفر کو کبھی روتے نہیں دیکھا تھا وہ تو ہمیشہ ایک صابر شاکر اور اپنے ہر دکھ کو چھپانے والی ہستی تھی۔ شاید احمر سے حد سے زیادہ توقعات باندھ لی تھیں اور انسانوں سے باندھی توقعات کا ٹوٹنا کوئی عجیب نہیں۔ اس نے ایک ہلکی سانس فضا کے سپرد کی اور بائیک اسٹارٹ کرلی۔

☆☆☆

"ارے واہ حد کرتی ہیں اماں آپ بھی میرا قصور کہاں سے نکل آیا جو سارا نزلہ مجھ پر ہی گرا رہی ہیں۔ بس رہنے دیں میں کوئی نہیں جاتی نیلو کی ساس کے گھر، پاگل کتے نے نہیں کاٹا مجھے جو اس دو ٹکے کی عورت کے آگے گڑگڑاؤں۔"

ارسلا نے غصے سے موبائل ہی آف کر دیا اور ایک طرف پٹخ دیا۔ اماں اسے فون کر کے بے نقط سنا رہی تھیں اور اصرار کر رہی تھیں کہ وہ نیلو کی ساس کو کم از کم ایک فون ہی کر دے۔ اس طرح شاید معافی تلافی ہو جائے۔ مگر یہ بات تو سنتے ہی اسے پتنگے لگ گئے۔

"کیا ہوا۔" آبص شاور لے کر نکلا تو وہ غصے سے بلبلا رہی تھی۔

"دیکھیں ذرا، نیلو کی ساس اچھا خاصا جھگڑا کر کے گئی ہیں اماں کے گھر سے اور الزام مجھ پر تھوپ دیا کہ میں نے ان کی بے عزتی کی ہے۔ ادھر اماں بھی مجھے بے نقط سنا رہی ہیں۔ بھاڑ میں جائے نیلو کی ساس اور خود نیلو۔ اب ان سے میں معافی مانگوں گی۔ سوچ بھی کیسے لیا اماں نے حد ہوگئی۔" وہ اٹھ کر بیگ کھول کر چیزیں ادھر ادھر کرنے لگی۔

"مسئلہ کیا ہے کچھ پتا تو چلے۔ کس بات پر جھگڑا ہوا ہے اور اس میں تمہاری انوالمنٹ کیا ہے۔" آبص کو تجسس ہوا۔ اس کی باتوں سے اس کے انداز پر۔

ارسلہ نے یکدم جیسے چونک کر آبص کی طرف دیکھا اور جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

"ارے کچھ نہیں بس یونہی یہ نیلو کی ساس جب بھی ہمارے گھر آتی ہے کوئی پنگا کر کے جاتی ہے۔ مجھ سے تو حد سے زیادہ جلتی ہیں جاسد عورت ہے خود تو ٹکا نہیں دیا بہو کو میرے امیر ہونے پر جلتی ہے۔"

"آنٹی کیا کہہ رہی تھیں تمہیں، معافی کس سلسلے میں مانگنی ہے۔" آبص گاؤن کی ڈوری کستا ہوا بیڈ پر آ گیا اور اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"ارے کہا نا۔ کوئی خاص بات نہیں ہے بس ذرا سی آؤ بھگت میں کمی رہ گئی تو میرے پیچھے ہی پڑ گئیں۔ مجھے برا بھلا کہنے لگیں اور اٹھ کر گھر سے چلی گئیں۔ ساتھ میں بیٹے کو بھی لے گئیں ہمراہ۔ ماں کا چمچہ۔" وہ پلٹ کر وارڈ روب کھول کر کپڑے نکالنے لگی۔

آبص کو اس کے ٹالنے والے انداز کی بخوبی سمجھ آ رہی تھی۔

''نیلو آپا کی ساس کو تو یوں بھی موقع چاہیے نیلو کو تکلیف دینے کا۔اس طرح کی چھوٹی موٹی باتیں اور جھگڑے تو چلتے رہتے ہیں نیلو کے سسرال میں۔'' وہ اپنا نائٹ گاؤن اٹھا کر باتھ روم میں جا گھسی۔

آبص کو پکا یقین تھا کہ اس جھگڑے میں سو فیصد اس کا کا ہاتھ رہا ہوگا۔ وہ نیلوفر کی فطرت کو جان گیا تھا اس عرصے میں۔ وہ سادہ سی پرخلوص اور بے ضرر سی لڑکی تھی۔ وہ ہلکی سانس بھر کر بستر پر دراز ہو گیا اور کروٹ بدل لی۔

''ارے یہ کیا آپ سو رہے ہیں۔'' وہ باتھ روم سے فارغ ہو کر بستر تک آئی تو آبص کو سوتے دیکھ کر جھلس کر رہ گئی۔

''اتنے دنوں کے بعد آئی ہوں۔ جاگیں گے نہیں باتیں واتیں کریں گے۔'' وہ جھنجلانے لگی۔

''مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے بہت اہم میٹنگ ہے ارسلہ بہت تھک گیا ہوں اب سونا چاہتا ہوں تم بھی سو جاؤ پلیز۔''

''ہاں میرے لیے تو آپ کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا بس پیسہ بنانے کی مشین ہیں آپ اپنے پیرنٹس کے لیے۔''

وہ کروٹ بدلے پڑا رہا۔ اس کی بڑبڑاہٹ اس کے کانوں میں دیر تک سنائی دیتی رہی۔ چاہتے ہوئے بھی وہ نیند سے بھری آنکھیں نہ کھول پا رہا تھا۔

☆☆☆

مہوش کو اس روز سے کھٹک سی پیدا ہو گئی تھی جب آبص نے نادیہ شاہ کا نام لیا تھا اور اب وہ پہلے کی طرح افسردہ مایوس اور تھکا ہوا نہیں دکھائی دیتا تھا۔ وہ آفس سے لوٹتا تھا تو لگتا جیسے ساری تھکن کہیں اتار آیا ہو ہلکے پھلکے کندھوں کے ساتھ وہ پرسکون دکھائی دیتا۔

مہوش رات اکبر جیلانی سے الجھ پڑیں۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ بیٹے کے رازداں بنے ہوئے ہیں مجھ سے چھپانے لگے ہیں باتیں۔ آبص کہاں جاتا ہے کس سے ملتا ہے سب جانتے ہیں آپ...... اس کے رویوں کی تبدیلی مجھے دکھائی دینے لگی ہے اور مجھ سے وہ اکھڑا اکھڑا رہنے لگا ہے۔ اس نے آپ کو ضرور کچھ بتایا ہوگا۔''

''میں بھی اتنا ہی جانتا ہوں جتنا تم جانتی ہو۔''

اکبر جیلانی نے ڈنر سے فارغ ہو کر خواب گاہ کا رخ کر لیا۔ مہوش بھی ان کے پیچھے گئیں شور مچاتیں۔ یہ بھی اچھا تھا ڈائننگ ہال میں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی موجود نہ تھا سب اپنے اپنے کمروں میں تھے، ملازم کوارٹرز میں جا چکے تھے، ایک نصیر کا کا ہی رہ گئے تھے جن سے کچھ بھی چھپا نہ تھا۔ رومی اپنے فیاسی کے ہمراہ ڈنر پر مدعو تھی کہیں۔ اور آبص اور ارسلہ اپنی خواب گاہ میں تھے۔ آبص تو نیند کی وادی میں کب کا اتر چکا تھا۔ عجیب بات تھی مہوش نے نوٹ کیا تھا آبص ڈنر کے بعد روم میں جاتے ہی سو جاتا تھا۔ پہلے تو اٹھ کر وہ اسے گیلری میں یا لابی میں جاگتا ہوا سگریٹ پھونکتا ہوا بے قرار دکھائی دیتا تھا مگر اب ارسلہ جاگ رہی ہوتی اور وہ نیند کے مزے لوٹ رہا ہوتا۔

ارسلہ کا تو جیسے سکون ہی اٹھ چکا تھا بہت کچھ پالینے کی خواہش اور کچھ نہ کر سکنے کی بے بسی اسے تڑپا رہی تھی۔ مہوش تو یوں بھی ارسلہ سے اب دور رہنے لگی تھیں۔

''دیکھ مہوش، آبص اگر خوش ہے، سکون میں ہے تو گاڈ سیک اس کے اس سکون کو اب برباد کرنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا۔ اب کوئی اور نئی سازش مت کرنا اس کے خلاف۔''

مہوش کو جارحانہ انداز میں خواب گاہ میں داخل ہوتا دیکھ کر اکبر جیلانی قدرت ناگواری سے بولے ان کا

انداز ہنسی آمیز تھا۔ مہوش لفظ "سازش" پر دھک سے رہ گئیں۔

"سازش، واٹ ڈو یو مین ...... میں نے کون سی سازش کی ہے اس سے پہلے کبھی۔" انہوں نے شوہر کو ناگواری سے دیکھا اور تن کر کھڑی ہوگئیں۔ اکبر جیلانی نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا استہزائیہ مسکراہٹ ان کے لبوں پر ابھر کر ٹوٹی تھی۔

"تم کیا سمجھتی ہو میں بے خبر ہوں۔ بے وقوف ہوں۔ اگر چپ رہا تمہارا پردہ ڈالتا رہا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ میں انجان بھی ہوں۔ بے خبر بھی ہوں تمہاری سازشوں اور ظالمانہ کارروائیوں کا بے شک مجھے بہت بعد میں علم ہوا، بلکہ علم مجھے کیا ہونا تھا جب میرے علم لایا گیا تب تک سب کچھ راکھ ہو چکا تھا، کچھ نہیں بچا تھا۔ اس لیے میں چپ رہا۔ کرید نہیں کی اور یہ بات آبص بھی جانتا ہے اس لیے تم بھی اپنی آواز کو پست کرلو تو اچھا ہے جتنا بلند کرو گی اتنا ہی نقصان کرو گی۔"

اکبر جیلانی جلال میں دکھائی دے رہے تھے پہلی بار وہ اتنے کڑے اور سخت دبنگ لہجے میں مہوش سے مخاطب تھے ادھر مہوش کو فقط ان کے جلال اور غصے نے ہی نہیں ان کے جملوں نے صدمے سے دوچار کیا تھا وہ شوہر کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ ان کے تو گمان میں بھی نہ تھا کہ۔ وہ بات جس پر پردہ پڑا تھا اتنے عرصے سے وہ تو کب کی آبص اور اکبر کے سامنے کھل چکی تھی۔ ان کی تنی ہوئی گردن ڈھیلی پڑ گئی۔ نگاہیں یکدم یکدم بدل کر دوسری طرف دیکھنے لگیں۔ میرے بچے کو چند خوش گوار لمحوں کی کتنی بھاری رقم چکانی پڑ رہی ہے اور جانے کب تک وہ ان شعلوں پر چلتا رہے گا۔ وہ انگارے جو تم نے اپنے ہی بچے پر برسائے ہیں اس سے اس کی روح سلگ رہی ہے۔"

اکبر جیلانی تاسف سے ہاتھ ملنے لگے۔ اور متاسفانہ نظروں سے بیوی کو دیکھا۔ جو دم سادھے کھڑی تھیں جسے اپنے دفاع میں کہنے کو کچھ نہ بچا ہو۔ سارا تنتنا ہوا ہو گیا تھا۔

"اس غیر بچی کے ساتھ تو تم نے جو ظلم کیا سو کیا مگر اپنے بیٹے کو بھی آگ میں دھکیل دیا۔ ذرا بھی تمہیں خیال نہیں آیا مہوش کہ فقط وہ لڑکی ہی نہیں آبص سے محبت کرتی تھی۔ آبص کی بھی وہ خواہش تھی، اس کی محبت تھی۔ کیسی عورت ہو تم مہوش۔ ماں ہو کر بیٹے کے جذبات کو نہیں سمجھ پائیں۔"

مہوش کو اپنے حواس معطل ہوتے محسوس ہو رہے تھے اس ذلت کا تو تصور بھی نہ تھا ان کے پاس اکبر جیلانی کی باتوں کو وہ جھٹلا نہیں سکتی تھیں۔ یہ تو اچھا تھا کہ وہ دھیمے لہجے میں بات کرنے والے آدمی تھے، ان کی آواز اتنی بلند نہ تھی کہ اس دروازے سے باہر جاتی۔ اگر وہ ان درودیوار کو ہلا کر بھی رکھ دیتے تو مہوش نے سوچا وہ حق بجانب ہوتے اور وہ انہیں روکنے کا حق کھو چکی تھیں۔ اکبر جیلانی ان کے نزدیک آئے۔ مہوش نے نظریں اوپر اٹھائیں پھر جھکا دیں۔

"یاد ہے تمہیں کہ بچپن سے لے کر جوانی تک کبھی بھی کسی بھی چیز کی آبص نے ضد نہیں کی۔ کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ کوئی نافرمانی حکم عدولی نہیں کی ہماری۔ پہلی بار اس نے ہم سے اپنے لیے کچھ مانگا۔ اپنی خوشی چاہی۔ اپنی مرضی کرنی چاہی۔ ایک پیارا سا خواب بن لیا تھا جس کی تعبیر کی تمنا کی تم سے اور تم نے وہ خواب پورا کرنے کے بجائے اس کی آنکھوں کو ہی بے نور کر دیا۔ اسے زندگی دینے کے بجائے زندگی سے بے زار کر دیا۔ تم ایک ظالم خود غرض اور مفاد پرست عورت ہو مہوش۔ جس کو بس اپنا ایگو، عزیز رہا اولاد نہیں۔ رومی نے جس کو پسند کیا تم بلا چوں چرا مان گئیں کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ بیٹی تھی اور آبص اس پر حکمرانی کیوں؟ وہ میرا فرماں بردار بچہ اپنا غم اپنے اندر سمیٹ کر روز مرتا ہے روز جیتا ہے اور تمہاری فرماں برداری میں ارسلہ جیسی عورت کو قبول کر لیا اس نے۔ اور کتنی قربانیاں چاہییں تمہیں اپنے اس لائق فائق فرماں بردار بچے سے۔"

"پلیز! چپ ہو جائیے اکبر، خدا کے لیے چپ ہو جایے۔" مہوش تکلیف اور ندامت کے احساس سے بلکنے لگیں۔ یہ جملے پتھر کی طرح ان کو زخمی کر رہے تھے شرمندگی انہیں بے حال کر رہی تھی۔ وہ نڈھال سی بیڈ کے کنارے بیٹھ کر رونے لگیں۔

"میں تو تمہیں سمجھ دار جہاندیدہ عورت سمجھتا رہا۔ اتنی مکاری کی امید نہیں تھی تم سے۔ تم نے اپنے مسلمان ہونے پر ہی نہیں اپنے عورت ہونے پر بھی دھبا لگا دیا ہے۔ میرا بھی اعتبار توڑ دیا مہوش...... سب ختم کر دیا تم نے۔ تمہاری نفرت تمہارا بغض اور کینہ سب کچھ برباد کر دیا ہے۔ تم بتاؤ کوئی حل ہے اس کا، تلافی کا کوئی راستہ ہے، ازالہ کی کوئی راہ بچی ہے تو بتاؤ مجھے، ورنہ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔"

اکبر جیلانی غصے اور نفرت سے چلائے۔ انہیں اپنے دماغ کی رگیں پھٹتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ کتنے دنوں سے بنا آتش فشاں آج پھٹ گیا تھا۔

"اکبر! مجھے معاف کر دیں۔" مہوش تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھیں لیکن ان کے قدم لڑکھڑا سے گئے اور انہوں نے کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ کر سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر جھکا لیا۔

امید ٹوٹتی ہے تو دل بھی ٹوٹ جاتا ہے جذبے مر جائیں تو روح بھی مر جاتی ہے۔

"میں مجرم ہوں آبص کی، مجھے معاف کر دیں اکبر، میں غرور اور تکبر کے نشے میں بھول گئی تھی کہ میں اس لڑکی کی تذلیل نہیں کر رہی ہوں اپنے بیٹے کی خوشیوں کو ڈس رہی ہوں۔ تقدیر بنانے والے کو میں اس لمحے بھول گئی تھی اور اپنے بیٹے کی تقدیر اپنے ہاتھوں سے لکھنے لگی تھی اور دکھ لکھ دیے بہت دکھ...... مگر یقین جانیے اکبر ایک پل میں بھی سکون سے نہیں جی پائی ہوں۔ اپنے بچے کو تکلیف میں دیکھ کر میں زخمی ہو گئی ہوں اندر سے۔ بہت نادم ہوں۔ شرمسار ہوں۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رونے لگیں۔

"ازالے کا اب کوئی راستہ نہیں رہا مہوش، تمہارا تڑپنا پلکنا بے معنی ہے۔" اکبر جیلانی افسردگی سے بولے۔

مہوش ان کے کندھے پر اپنا کانپتا ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسے نہ کہیں۔ اگر نادیہ شاہ اسے مل گئی ہے تو تلافی ممکن ہے۔" اکبر جیلانی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"آپ ہی نے تو کہا کہ وہ نادیہ شاہ سے ملتا ہے۔"

"ہاں۔" انہوں نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دی اور ہلکی سانس کھینچتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

"مگر وہ ملنے سے ہم کچھ اخذ نہیں کر سکتے۔ میں نے بس محسوس کیا وہ بہت خوش تھا اس روز۔" اکبر جیلانی کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔

"بہت خوش تھا میرے پوچھنے پر بتایا کہ وہ نادیہ شاہ سے ابھی مل کر آیا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک عرصے کے بعد رونق دیکھی میں نے وہ روشنی دکھائی دی جیسے دیکھے ایک زمانہ گزر گیا تھا۔" وہ مغموم انداز میں مسکرائے۔

"کہاں ملی اسے وہ اور کیا وہ اب بھی سنگل ہے اگر ایسا ہے تو۔"

"پتا نہیں۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مہوش کو مزید بولنے سے روکا۔

"کچھ پتا نہیں مگر یہی لگتا ہے کہ اس نے اب تک شادی نہیں کی ہوئی، ورنہ وہ آبص سے ہرگز نہ ملتی اور آبص کی آنکھوں میں امید کی لو نہ جاگی ہوتی۔" وہ کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر آ کر بیٹھ گئے۔ پھر تکیہ اونچا کر کے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔

"تو آپ معلوم کریں نا آبص سے۔ مجھ سے تو وہ بات نہیں کرتا۔ آپ پوچھیے۔ وہ نادیہ شاہ سے ملتا ہے تو کس مقصد سے۔ ہو سکتا ہے وہ فقط اچھے دوست کی طرح ملتے ہوں اور اگر ایسا نہیں ہے تو کیا نادیہ اس سے کوئی رشتہ جوڑنا چاہتی ہے اب۔"

اکبر جیلانی نے چونک کر مہوش کو دیکھا۔ مہوش یکدم نظریں چرا گئیں۔

''میں ارسلہ سے آبص کی جان ہر صورت میں چھڑانا چاہتی ہوں اکبر۔ تنگ آ چکی ہوں میں اس لڑکی سے۔ اسے ہماری تو کیا آبص کی بھی پروا نہیں ہے۔ سوچا تھا بچہ ہو جائے گا تو وہ سدھر جائے گی سب کچھ معمول پر آ جائے گا۔ سب نارمل ہو جائے گا مگر۔ اس کی ہڈ دھرمی کی وجہ سے۔ وہ ماں جیسا درجہ بھی نہ پا سکی۔ اب بہت ہو گیا ہے اکبر۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔''

''شٹ اپ مہوش، پاگل ہو گئی ہو کیا؟'' اکبر جیلانی یکدم انہیں ٹوک گئے۔ ''تم جب بھی سوچنا غلط ہی سوچنا۔ یہ ممکن نہیں ہے آج تک ہمارے خاندان میں طلاق جیسا قبیح فعل کسی نے انجام نہیں دیا اور جانتی ہو طلاق اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔''

''مگر میں ارسلہ کو آبص کی زندگی سے نکال کر ہی آبص کی خوشیاں لوٹا سکتی ہوں۔ یہ لڑکی اس گھر میں اور نہ آبص کے دل میں تھوڑی سی بھی جگہ بنا پائی ہے۔''

''شٹ اپ مہوش!''

''مگر اکبر......''

''پلیز......'' اکبر جیلانی نے ہاتھ اٹھا کر غصیلی نظروں سے مہوش کو گھورا، تو وہ آنسو پونچھتے ہوئے پلٹ کر واش روم میں جا گھسیں۔

اکبر جیلانی نے افسردہ سی سانس بھر کر تکیہ سیدھا کیا اور لیٹ کر آنکھیں بند کر گئے۔

''تم اپنی نفرت اور ذاتی بغض سے کبھی باہر نہیں نکل سکو گی مہوش۔'' وہ افسردگی سے سوچ کر رہ گئے۔

☆☆☆

صبا اکیڈمی سے بھاگتی ہوئی باہر آئی اس نے نادیہ شاہ کو باہر نکلتے دیکھ لیا وہ اس کے پیچھے لپکی مگر باہر آ کر اس کے قدم سست پڑ گئے۔ وہ آبص کی گاڑی میں بیٹھ چکی تھی دوسرے پل گاڑی اس کی آنکھوں کے آگے سے پانی کی طرح بہتی چلی گئی۔

''یہ کیا کرنے چلی ہو تم نادیہ شاہ۔'' اس طرح تو تم کبھی سکون نہیں پا سکو گی۔ وہ وہیں بینچ پر بیٹھ گئی۔

نادیہ شاہ صبا کو دیکھ چکی تھی۔ گاڑی آگے بڑھی تو وہ مضطربانہ انداز میں پیچھے دیکھنے لگی۔

''آبص! صبا نے مجھے تمہارے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے دیکھ لیا ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ اسے صبا کے دیکھ لینے کا خوف نہیں تھا مگر صبا کے دل توڑنے کا غم تھا۔ وہ صبا کو پہلے ہی خفا کر چکی تھی اور بقول صبا کے وہ اس کا اعتبار بھی توڑ چکی ہے۔

''میرا خیال ہے تمہیں اسے کلیئر کر دینا چاہیے کہ تم اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ تمہاری زندگی میں آنے والا میں ہی پہلا اور آخری مرد ہوں۔'' آبص نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بے اختیار چہرہ موڑ کر آبص کی طرف دیکھا تھا۔

''کیا یہ سچ نہیں۔''

وہ اپنی خوش نما آنکھیں براہ راست اس کی آنکھوں میں گاڑتے ہوئے بولا تو نادیہ شاہ کتنے ہی پل پلکیں جھپک نہ سکی جیسے طلسمی آنکھوں کے اندر مچلتے اعتماد اور جذبوں نے اس پر سحر طاری کر دیا ہو۔

''آنکھیں ہمارا وہ سچ ہے جو دل سے مشروط ہوتا ہے۔ آنکھیں ہمیں سچ بتاتی ہیں۔'' وہ اطمینان سے مسکرایا مگر نادیہ شاہ کا اطمینان غارت ہونے لگا۔ اس کی انگلیاں بیگ پر مضبوطی سے جم گئیں اور پلکیں جھک گئیں۔

''شاید یہی سچ ہے۔'' وہ ٹھہرے ٹھہرے میں بولی۔ مگر اس کے لہجے میں اعتماد مفقود تھا۔

وہ گاڑی ایک پارک کے کنارے روک چکا تھا اور اسٹیئرنگ پر دونوں کہنیاں ٹکا اس کی جھکی لرزتی پلکوں کو دیکھنے لگا۔

''تم نہ بھی کہتیں تو یہ سچ تمہارے چہرے پر پھیلا دکھائی دے رہا ہے تمہارے ہاتھوں کی اضطرابی جنبش اور ان لرزتی پلکوں میں دکھائی دے رہی ہے۔'' اس نے بیگ پر جمے اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''ارے، یہ ہم کہاں آ گئے ہیں۔'' وہ اس کی محویت توڑنے کی غرض سے اطراف نگاہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

وہ ایک قدرے پرسکون اور خوش نما پارک تھا جہاں اکا دکا لوگ ٹہلتے دکھائی دے رہے تھے کچھ درمیانی عمر کی خواتین اپنے آپ کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے تیز قدموں سے چلتی دکھائی دے رہی تھیں۔

''اس خوشگوار فضا میں ذہن و دل کی گھٹن کم ہوتی ہے۔'' وہ شیشہ اتار کر باہر جھانکتے ہوئے بولا۔

''میرے ذہن میں کوئی گھٹن نہیں ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''مگر میرے دل میں بہت حبس ہے۔ بہت گھٹن ہے میں تمہارے ساتھ وقت گزار کر اس گھٹن کو کم کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے یوں گہری سانس لی جیسے حقیقتاً اس خوشبودار ہوا اور روشنی کو پھیپھڑوں میں بھر رہا ہو۔ پھر مسکرا کر اپنے پیر پر ہاتھ مارا۔

''جب سے تم ملی ہو ان پیروں میں بھی جان آ گئی ہے تھراپی باقاعدگی سے کروا رہا ہوں۔ اب جینے کو دل چاہنے لگا ہے ایک عرصے بعد گاڑی خود ڈرائیو کر رہا ہوں۔''

''مجھے خوشی ہوئی۔'' وہ مسکرائی۔ ''مگر اس کا کریڈٹ تم مجھے کیوں دے رہے ہو۔ یہ سب تمہاری اپنی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔''

''ہاں، مگر محنت بھی تو آدمی اس وقت کرتا ہے جب اس کے سامنے کوئی مقصد ہو۔'' وہ دل آویز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بے مقصد زندگی تو محض بوجھ کی طرح ہوتی ہے جسے انسان بس اٹھائے اٹھائے گھومتا ہے۔ مقصد جینا سکھاتا ہے۔ جینے کا لطف بھی اٹھانا سکھاتا ہے لیٹس گو۔'' وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اترنے لگا۔ اب ساری باتیں یہیں بیٹھے بیٹھے ہی کر لیں گے۔''

''مجھے تو اچھا لگ رہا ہے یہاں بیٹھنا بھی۔'' اس نے ہلکی سی سانس کھینچی۔

اب تو بہت اچھا لگے گا نادیہ شاہ۔ دل خوش ہو اور ہم خیال ساتھی ساتھ ہو تو دھوپ بھی چھاؤں محسوس ہوتی ہے۔'' وہ دل آویز نگاہ ڈال کر مسکرایا اور اگنیشن سے چابی کھینچ کر نیچے اتر گیا۔

یہ سب تمہارے لیے
جان جاں یہ جہاں، یہ زمین آسماں
یہ میرے رات دن خاک میں تیرے بن
یہ میری زندگی، دوستی دشمنی
راستے واسطے سب تمہارے لیے
تم جو دیکھو تو میرے شب و روز کو
کوئی مطلب ملے
تم جو پوچھو تو میرے ہر اک حرف کو
کوئی رتبہ ملے کوئی نصب ملے

وہ اس کے ہمراہ دھیرے دھیرے چلتے گنگنا رہا تھا۔اس کی آواز میں خوشی جھلک رہی تھی۔وہ ہر خیال پر رکاوٹ سے بے نیاز تھا اس وقت نادیہ شاہ اس کے ہمراہ تھی اور یہی بات اسے مسرور کرنے کو دل مطمئن کرنے کو کافی تھی۔

تم جو سوچو میرے واسطے کچھ کبھی
میں ستاروں کو مٹھی میں بھر لاؤں گا
تم اگر ایک دن مجھ کو آواز دو
میں جہاں پر بھی ہوں، لوٹ کر آؤں گا
یہ میرے جسم و جاں میرے شعر و سخن
میری تنہائیاں بزم آرائیاں
اب تمہارے لیے
میں تمہارے لیے

وہ یوں خوش باش دکھائی دے رہا تھا جیسے اجاڑ اور وحشت ناک جنگل میں اچانک سے کوئی اپنا مل جائے۔ وہ جتنا خوش تھا اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔نادیہ شاہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی، وہ بار بار اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے لبوں پر سادہ بے ریا مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔وہ پہلے جیسا آبص دکھائی دے رہا تھا اس کے ہمراہ منچلا سا ہو جانے والا، بات بات پر فقرہ بول کر خود ہی محظوظ ہوتا، کوئی شعر برملا سنا کر اس کی شرم پر قہقہہ لگاتا۔اسے نگاہوں میں رکھتے ہوئے کوئی بہت ہی ذو معنی سی بات کہہ جاتا۔ہاں بس اب یہ تھا کہ وہ تیز دوڑ نہیں پا رہا تھا اسٹک کے سہارے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا تھا اور اس کے ہر قدم پر نادیہ شاہ سوچ رہی تھی۔اچھا ہی ہے وہ آہستہ آہستہ چلتا ہے وہ بھی تو دوڑنا بھول گئی تھی۔یا دوڑنا نہیں چاہتی تھی۔شاید وہ پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔وہ آگے دیکھ رہی تھی اور آگے کا سوچ رہی تھی۔پیچھے دیکھنے پر بہت تکلیف دہ منظر دکھائی دیتے تھے جن کی چبھن تو رگ رگ میں آج بھی اتری ہوئی تھی۔

"کم آن اسپیڈ پکڑو۔تم سے تیز تو میں چل رہا ہوں۔تمہارا لنگڑا ہیرو۔" وہ بہت آگے جا کر رک کر چہرہ موڑ کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھی اپنی سوچ میں محو۔اس کی اس بات پر اسے گھورنے لگی۔

"آئندہ اپنے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ برا مان کر بولی۔جواباً وہ کہنے لگا۔

"یہی سچ ہے اور یہی حقیقت اور انسان کو سچ سننے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔"

"ضروری نہیں کہ ہر حقیقت کو قبول کر کے اس کا مذاق اڑایا جائے۔"

"کم آن یار، میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔اوکے اب نہیں کہوں گا۔" وہ جلدی سے مسکین سی شکل بنا کر بولا۔وہ ہنس دی۔

"یہ بتاؤ آنٹی سے کب بات کرو گی۔" وہ دونوں ایک لکڑی کے بینچ پر آ کر بیٹھے تو آبص نے پوچھا۔

"کون سی بات۔" وہ چونکی مگر درحقیقت خود کو سنبھال رہی تھی۔

"میرے بارے میں کب بتاؤ گی۔" وہ اسی قلبی کیفیت سے بے خبر تھا۔

"ڈر لگتا ہے۔" وہ دھیرے سے بولی اور نظریں چرا کر سامنے دیکھنے لگی۔جہاں دو بچے بیڈ منٹن کھیل رہے تھے۔

"تم اگر اجازت دو تو میں آنٹی سے ملنے آجاؤں۔" وہ پرخیال انداز میں بولا۔
"ارے نہیں یہ غلطی مت کرنا۔" وہ جلدی سے بولی۔
"بات تو بہر حال کرنا ہوگی۔ میں زندگی گزارنا چاہتا ہوں اپنی پوری تمہارے ساتھ۔ پہلے بھی میں فیئر تھا اور اب بھی ہوں۔ آج بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔ تمہارے لیے مخلص ہوں پھر کیا قیامت ہے۔"
"اب وقت وہ نہیں رہا۔"
"مگر میں وہی ہوں۔"
"کیا کہو گے انہیں یہ بتاؤ گے کہ میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں ایک بیوی کی موجودگی میں تم اپنے مخلص ہونے اور وفادار ہونے کا کیا ثبوت دے سکتے ہو۔ انہیں کیسے قائل کر سکتے ہو۔ خود کو بے قصور کیسے ثابت کرو گے۔" وہ نا چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوگئی۔ شاید بے اختیاری کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔
آبص نے بے عنوان سی شرمندگی محسوس کر کے نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔
"سوری۔" نادیہ شاہ کو اپنے لہجے کی ترشی کا احساس ہوا تو اس نے نرمی سے اس کی اسٹک پر رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ جواباً وہ آزردگی سے مسکرا دیا۔
"بات کڑوی بھی مگر سچ تھی۔ میں شاید بھول گیا تھا کہ خود کو مخلص، باوفا اور سچا عاشق ثابت کرنے کے لیے میرے پاس اب کچھ نہیں بچا۔" وہ مسکرا رہا تھا عجیب خود آزار قسم کی مسکراہٹ تھی۔
"میری ماں نے میری زندگی بھی میری نہیں رہنے دی اور شاید اس میں قصور میری حد سے زیادہ بزدلی اور دنیا سے بے رغبتی کا ہے۔ میں تمہارا تو کیا اپنا بھی دفاع کرنے کے قابل نہیں رہا۔" وہ گھائل انداز میں ہنسا اور اپنی اسٹک سے مٹی پر لکیریں کھینچتے ہوئے ایک تکلیف دہ احساس سے گزر رہا تھا۔
"کاش میں خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑنے کی بجائے اپنے دل کی آواز پر جم کر کھڑا رہتا۔ اتنی کم ہمتی اور مایوسی میں نہ ڈوب گیا ہوتا تو آج ارسلہ جیسی لڑکی میری زندگی میں تو نہ ہوتی۔ ہم اکثر اپنی ناکامی کا الزام دوسروں پر لگاتے ہیں، اپنی بزدلی اور بے وقوفی کو نہیں ٹھہراتے۔ اپنے دل و دماغ پر اختیار چھوڑ کر اسے کسی اور کو سونپ کر پھر اپنی بربادی کا ذمہ دار اسے ٹھہرانے لگتے ہیں۔"
وہ سر اٹھا کر نادیہ شاہ کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اپنی کہی باتوں کی تائید چاہ رہا ہو۔ پھر ہلکی سانس سینے کی تہ سے کھینچ کر فضا کے سپرد کرتے ہوئے بینچ کی بے آرام پشت سے ٹیک لگالی۔
"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ اسے اتنا حزیں دیکھ کر دھیرے سے بولی۔ "میں تو بس مناسب وقت کا انتظار کر رہی ہوں۔ موقع دیکھ کر بات کروں گی۔" پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولی۔ "مگر اس سے پہلے تمہیں ارسلہ اور آنٹی کو میرے بارے میں بتانا ہوگا آبص۔"
وہ بولی تو آبص کے لیے یہ بات غیر متوقع ہرگز ثابت نہ ہوئی تھی چونکہ وہ خود بھی اسی نہج پر سوچتا آ رہا تھا۔ باپ کے علم میں تو یہ بات آ ہی چکی تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ مہوش کو بتا چکے ہوں گے۔ بس مسئلہ ارسلہ کا رہ جاتا تھا اور اسے اس بات سے اب کوئی سروکار نہ تھا کہ ارسلہ کا ردعمل کیا ہوگا۔ اسے ارسلہ کے کسی بھی ردعمل سے کچھ لینا دینا نہ تھا۔ وہ اس کی زندگی میں جبراً داخل کی گئی تھی تاہم اس نے اس رشتے کو نباہنے کی کوشش ضرور کی تھی مگر ارسلہ آج بھی اتنے ہی فاصلے پر تھی جتنا پہلے روز تھی۔
"ہاں ارسلہ سے میں بات کرلوں گا۔" وہ اسٹک پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اٹھتے ہوئے بولا۔
"کیا کہو گے تم اس سے۔" نادیہ کا دل لحظہ بھر لرزا تھا۔ اس کو اپنے اعصاب پل بھر سخت تاروں کی طرح اکڑتے محسوس ہوئے۔

"میرے پیش نظر اب میری ذات ہے، میں وہ ساری زنجیریں توڑ دینا چاہتا ہوں جس نے مجھے ایک عرصہ سے جکڑ رکھا ہے۔" اس کا لہجہ بے لچک تھا نادیہ کو اپنا دل بکھرتا ہوا محسوس ہوا۔

"کیا تم اسے ڈائیوارس دینے کا سوچ رہے ہو۔" اس نے دھڑکتے لہجے میں پوچھا۔ اور یوں خوف زدہ نظروں سے آبص کو دیکھا جسے وہ نادیہ شاہ نہ ہو بلکہ خود ارسلہ ہو۔ بکھر جانے اور ٹوٹ جانے کا خوف ہو۔

"تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ کوئی حل ہے۔ یوں بھی یہ رشتہ محض غرض کی بنیاد پر ہی قائم ہوا تھا۔ اسے مجھ سے نہیں۔ میری دولت سے دلچسپی ہے۔" وہ افسردگی سے گویا ہوا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے پارک سے باہر آ گئے۔ اس شادی سے میں نے یہ ریئلائز کیا کہ دلوں کا تعلق قربت یا فاصلوں کا متقاضی نہیں ہوتا۔ محبت ہو تو فاصلے بھی اسے مزید جلا ہی بخشتے ہیں اور کوئی قلبی جذبہ نہ ہو تو قربت بھی کوئی رنگ نہیں چھوڑتی۔ زندگی میں کوئی رنگ نہیں بھرتی بلکہ اسے مزید بے رنگ کر دیتی ہے۔"

نادیہ شاہ کا چہرہ ایک پل متغیر ہوا تھا وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"مجھے حیرت ہوتی ہے ارسلہ جیسی عورت پر جو تم جیسے شخص کو پا کر بھی نہ پا سکی۔ تمہاری قدر نہ کر سکی۔ تم تو وہ ہیرا ہو آبص جسے پانے کے بعد کسی بھی شے کی طلب ختم ہو جاتی ہے، دولت تو بہت ثانوی سی چیز ہے۔" اس کے لہجے میں حقیقی حیرت جھلک رہی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے آبص نے افسوس سے سر ہلایا۔

"لگتا ہے وہ بہت زیادہ خود پسند ہے بہت مغرور یا پھر اسے اپنے حسن پر گھمنڈ ہوگا۔ کچھ عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو تکبر کے زور پر دنیا پر حکومت کرنا چاہتی ہیں ہر شے کو ملکیت کے طور پر پانا چاہتی ہیں محبت کے بل بوتے پر نہیں۔"

"وہ فقط لالچی عورت ہے۔ میں نے اسے دولت پر مرتے مٹتے دیکھا ہے۔ اس کا خواب ایک پرسکون گھر نہیں بلکہ ایک مہنگا گھر۔ بلکہ بہت زیادہ پراپرٹی۔ جس کی وہ مالک ہو۔" آبص استہزائیہ انداز لہجے میں بولا اور سلگتے ہوئے سگریٹ لبوں سے لگا کر ہلکا سا کش لیا۔

"ایک بات کہوں آبص۔" نادیہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ وہ بہرحال بیوی ہے تمہاری حق رکھتی ہے تم پر۔ وہ جو چاہتی ہے تم اسے دے سکتے ہو تو پھر دے کیوں نہیں دیتے۔ ایک گھر جو اس کی خواہش ہے اس کا خواب ہے۔ اپنے شوہر سے ہی تقاضا کر رہی ہے اب یہ کوئی ایسی ظالمانہ خواہش بھی نہیں جو تم پوری نہ کر سکو۔"

وہ ارسلہ کے لیے تشویش میں مبتلا دکھائی دے رہی تھی۔ آبص اس کے اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے نرمی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"آبص! تم ارسلہ کو ڈائیورس نہیں دو گے۔" وہ یکدم تڑپ کر بولی تھی۔

آبص کو جھٹکا ہی لگا تھا۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کسی کو زخم لگا کر ہم امید کریں گے ہمارے زخم قدرت بھر جائیں۔ تو ایسا ممکن نہیں، میں ارسلہ کو اتنی بڑی اذیت سے دوچار نہیں کر سکتی۔" اس کا لہجہ مصمم تھا آبص اسے دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

ارسلہ کی اس درجہ ہٹ دھرمی اور بے رحمی پر اپنا پریشان ہو گئی تھیں۔ نیلوفر تو مایوس ہو کر کمرہ بند ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے ارسلہ سے احتجاج تک نہیں کیا جانتی تھی کہ بے سود ہوگا۔ اماں نے واویلا مچا لیا تھا ابا گھن گرج کر چپ ہو گئے تھے مگر اس کی ہٹ دھرمی قائم رہی۔

"احساس ہوتا تو یہاں تک نوبت کیوں آتی۔" نیلوفر کو ارسلہ سے کسی بھی اچھائی اور نیک دلی کی امید نہیں تھی امید تو اب احمر سے بھی توڑ چکی تھی۔

"ارے اس طرح بزدلی اور کم ہمتی سے بھی کسی کو حق ملا ہے بھلا۔ احتجاج تو تمہارا حق ہے جا کر ارسلہ کمینی کا منہ توڑ کر آ جاؤ۔ اور نہیں تو اس کے شوہر اور اس کی ساس کو جا کر بتاؤ اس کی حرکتیں۔ وہی اس کو سمجھائیں گے دھمکائیں گے۔ تم سے تو کچھ ہونے کا نہیں رہا احمر...... وہ بھی اتنا ہی بزدل ہے کم بخت مارا جو ماں کی سامنے ڈٹ کر کھڑا رہ سکے۔" اماں کا واویلا کچھ غلط بھی نہ تھا۔ "تم یوں منہ چھپا کر پڑی رہو گی۔ تمہاری ساس تو یہی چاہتی ہیں کہ تمہیں احمر کی زندگی سے نکال باہر کرے۔" وہ اماں کی ڈانٹ ڈپٹ اندیشے وہمے ڈھیٹ بنی سنتی رہی۔ اور پھر وحشت کے عالم میں بیڈ سے اتر گئی۔

محبت میں انسان اپنے نہیں دوسروں کے دل میں جیتا ہے وہ محبت میں اپنی ذات میں اس طرح تنہا ہو جاتا ہے کہ اگر مقابل اسے اپنے دل میں نہ سمیٹ سکا تو وہ بکھر جاتا ہے۔ ذلت کی یہ اذیت اسے مارے ڈالتی ہے۔ اور وہ بھی ایسی ہی اذیت سی دوچار تھی۔ ایسی ہی اذیت سے کٹ رہی تھی۔

اریبہ اس کی یہ حالت دیکھ کر خود بولائی بولائی پھر رہی تھی پھر کچھ سوچ کر اس کے پاس چلی آئی۔

"احمر بھائی ایسے تو نہ تھے، اتنے ظالم سنگ دل۔ ان کا تو ایک دن بھی آپی آپ کے بنا نہیں گزرتا تھا اور اب کہاں اتنے دن، انہوں نے پلٹ کر نہیں پوچھا......" اریبہ نیلو کے پاس چلی آئی۔ "آپ احمر بھائی سے رابطہ تو کریں۔ انہیں سمجھائیں۔ ارسلہ کے آسرے پر کب تک آپ یہاں اس طرح رہیں گی اور روتی رہیں گی۔ بھلا آپ کا قصور کیا ہے انہیں احساس دلائیں گے کہ آپ ان سے بہت محبت کرتی ہیں۔"

"احساس دلانے سے احساس نہیں پیدا ہوتا بیا۔ محبت ہوتی تو وہ ایک طرف جا کھڑے نہ ہوتے۔ انا کا مسئلہ نہ بنا لیتے۔ مجھے ہاتھ پکڑ کر گھر سے جانے کو نہ کہہ دیتے۔ معاملے کو سلجھانے کی کوشش کرتے۔ ایسی بے رخی نہ برتتے۔" وہ دل گرفتگی سے بولی۔

"آپا! وہ اپنی ماں کے بہکاوے میں آ گئے ہیں۔ آپ کوشش تو کریں۔ وہ مجبور ہو گئے ہوں گے۔ بہت تیز ہیں آپ کی ساس اور اگر احمر بھائی برے ہوتے تو یوں ہر بار آپ کے ساتھ نہ کھڑے ہوتے۔ یہ معاملہ ہی ایسا ہے اس میں سراسر قصور ارسلہ آپی کا ہے۔ انہیں نظر انداز مت کریں آپا۔ آپ احمر بھائی کو موردِ الزام کیوں ٹھہرا رہی ہیں۔ وہ مجبور ہو گئے ہیں اور ہمارے معاشرے میں اکثر شریف مرد اسی طرح مجبور ہو جاتے ہیں۔"

اریبہ کسی جہاندیدہ عورت کی طرح اسے سمجھا رہی تھی۔ نیلوفر کے دل پر اس کی باتیں اثر کرنے لگیں۔

"کل سکندر نے کیا کہا تھا آپ سے یاد ہے آپ کو۔" اریبہ نے اسے یاد دلایا۔ وہ خالی نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا کہا تھا؟"

"انہوں نے کہا تھا کہ مرد کے لیے جھکنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ محبت میں بھی وہ تن کر کھڑا ہوتا ہے۔ مگر جب عورت جھکتی ہے تو وہ اس کے لیے مضبوط ڈھال بن جاتا ہے۔ بے شک وہ سورج کی طرح گرم ہوگا۔ مگر سارے اندھیرے کاٹ بھی ڈالتا ہے۔"

"بیا میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں۔ بدگمان ہونے لگتی ہوں تو لگتا ہے بالکل اکیلے ہو گئی ہوں، بکھرنے لگتی ہوں۔" وہ یکدم کسی بچے کی طرح اریبہ سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"محبت کو رویوں میں مت ڈھونڈیں آپا۔ رویے حالات کے تابع ہوتے ہیں۔ کیفیات عارضی ہوتی ہیں۔ آپ احمر بھائی سے بدگمان نہ ہوں۔ ورنہ زندگی مشکل ہو جائے گی۔" وہ اسے پیار سے تھپکنے لگی۔ نیلو بے ساختہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ نیلو بے ساختہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"تم کتنی بڑی اور سمجھدار ہو گئی ہو بیا۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بے اختیار مسکرا دی۔ "سکندر نے تو بالکل

تمہیں اپنے جیسا بنادیا ہے۔" اس نے محبت پاش نظروں سے اریبہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو اریبہ جھینپ سی گئی۔ اس کے رخساروں پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ شرم کا خوب صورت رنگ۔ نیلوفر نے بے اختیار اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور پیشانی چوم لی۔

"ایک بات بتاؤں آپا۔ سکندر آج ارسلہ آپی کی طرف جائیں گے کہہ رہے تھے دعا کرنا۔ ارسلہ کو عقل آجائے اسے اگر منانے میں کامیاب ہوگیا تو اسے لے کر سیدھا نیلوفر کے سسرال جاؤں گا۔ کہہ رہے تھے دعا کرنا۔ اچھی خبر لے کر آؤں۔" اریبہ کی یہ بات سن کر نیلو کا دل دھک سے رہ گیا وہ بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھ گئی۔

"یہ کیا کرنے گیا ہے سکندر...... ارسلہ واویلا مچادے گی اور ناحق اس کے سسرال میں بھی یہ بات کھل جائے گی۔ کتنی سبکی ہوگی میری اریبہ۔"

"آپ کی کیوں ارسلہ آپی کی ہی ہوگی سبکی، اچھا ہے۔ سکندر آبص بھائی سے بھی بات کریں تو۔ ارسلہ آپا کو کوئی تو پریشرائز کرنے والا ہو۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا ہو۔ ان کی اس ہٹ دھرمی اور اکڑ سے آپ کا نقصان ہوجائے گا۔ خدانہ کرے مگر ڈر تو ہے نا۔ دیکھا نہیں آپ نے اماں اور ابا کی تو کسی بات کو خاطر میں نہیں لا رہی تھیں الٹا ان کی کال بھی ریسیو نہیں کر رہی ہیں اور صاف کہہ دیا اماں کو کہ میرا کوئی قصور نہیں سب کیا دھرا نیلو کی بزدلی اور احمر بھائی کی نالائقی اور اس کی ساس کی بے رحمی سے ہو رہا ہے۔" اریبہ جلے کٹے انداز میں بول رہی تھی۔ ارسلہ پر وہ سخت تپی ہوئی تھی پھر کچھ سوچ کر اٹھی اور ررائٹنگ ٹیبل پر رکھا نیلوفر کا موبائل اٹھا لائی۔

"یہ لیجیے۔ احمر بھائی سے بات کریں۔ نہیں تو میسج ہی سینڈ کردیں۔ مجھے یقین ہے وہ جواب ضرور دیں گے۔" اس نے موبائل نیلوفر کو پکڑا دیا۔ نیلوفر نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

اریبہ کی باتیں حوصلہ دے رہی تھیں۔ مگر وہیں کہیں خوف کی بھی سرسراہٹ تھی۔ موبائل پر اس کی گرفت سخت ہوگئی۔

اریبہ کمرے سے نکل گئی تھی اور جاتے جاتے دروازہ بند کرگئی تھی تاکہ وہ تسلی سے بات کرسکے۔ مگر نیلوفر گومگو کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔

☆☆☆

"تو تم نیلو صاحبہ کے سفیر بن کر آئے ہو میرے پاس اور مجھے یہ بتانے کے اس سارے تماشے میں سارا قصور میرا نکلتا ہے۔" ارسلہ سکندر کا مدعا جان کر جیسے پھنکاری تھی۔ اس لمحے سکندر اسے دنیا کا بدصورت آدمی لگ رہا تھا جو در حقیقت اسے اس کے رویوں کی بدصورتی کا احساس دلا رہا تھا۔ وہ اس کے ہمراہ کوٹھی کے باغیچے میں موجود تھی۔ سکندر کو اندر بلانے کا خیال بھی نہ آیا اور یہیں وہ اس سے لڑنے مارنے پر تیار ہوگئی تھی۔

"اس دو ٹکے کی فتنی عورت کے لیے تم مجھے ذلیل کرتے آئے ہو۔ اس کی کیا اوقات ہے کہ میں اس مہارانی سے معافی مانگوں گی۔ واہ، ارسلہ آبص اب اس عورت سے معافی مانگے گی۔ جو عزت کے بھی قابل نہیں ہے۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔

"بکواس مت کرو۔ یہ اکڑ تمہاری نیلو کا گھر خراب کرسکتی ہے اتنا مت اڑو کے پرواز ہی کھودو۔ راستہ ہے بھول جاؤ۔" سکندر نے تاسف سے اسے گھورا۔

وہ بہت دیر تک تحمل سے اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ چاہ رہا تھا معاملہ افہام و تفہیم سے طے ہوجائے اس کی عزت کا پاس بھی رہ جائے۔ مگر وہ مصر رہی کہ وہ بے قصور ہے اور کسی صورت نیلو کی ساس سے معافی نہیں مانگے گی۔ بلکہ ایک فون تک نہیں کرے گی۔

"تم جو بھی کہو۔ اس معاملے میں سراسر قصوروار تم ہو۔ تم نے گھر آئے مہمان کو بے عزت کیا اور نیلو تمہاری

بہن ہے کوئی غیر نہیں جس کے لیے تم ذرا سا جھک جاؤ گی۔ یاد رکھنا ارسلہ تمہاری لگائی ہوئی اس آگ سے نیلو کا نقصان ہوا تو تمہارا انجام بھی بہت برا ہوگا۔"

"تم مجھے دھمکی دے رہی ہو۔" وہ آپے سے باہر ہوگئی۔

"جا کر احمر کا گریبان کیوں نہیں پکڑتے، ہمت ہے تو اس کو جا کر دھمکیاں دو۔ بہت دم بھرتا تھا نیلو کی محبت کا، اس کے پلو سے ہر وقت بندھا رہتا تھا اب کہاں گئی اس کی محبت وہ سوتے کیوں خشک ہوگئے جو ہمہ وقت بہتے رہتے تھے۔" ارسلہ طنز سے ہنسی، طنز اس کے لہجے میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا سکندر اس کی بے حسی پر گنگ رہ گیا۔

"یعنی تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا اگر نیلو کا گھر خراب ہوتا ہو تو۔" وہ متاسفانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بات سنو سکندر۔" وہ جھلس کر رہ گئی تھی۔ "احمر کو نیلو سے اگر سچی محبت ہوگی تو وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا بلکہ الٹا اپنی ماں کی فیور کرنے کے بجائے نیلو کا ساتھ دے گا۔"

"اور اگر اس نے ایسا کچھ نہ کیا بہ صورت دیگر وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوا تو......!" سکندر نے گہری سانس کھینچ کر اسے گھورا۔

ارسلہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ سکندر کی کاٹ دار نگاہیں اسے اپنے جسم کے آر پار ہوتی محسوس ہونے لگیں۔

"تم تماشا دیکھتی رہو گی۔ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے چند چھینٹے بھی نہیں ڈالو گی۔ اپنا کوئی حصہ بھی نہیں ڈالو گی۔"

"تم سب بجھانے کی کوشش تو کر رہے ہو اس آگ کو۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولی اور کرسی سے اٹھنے لگی۔

"تمہاری لگائی ہوئی آگ ہے یہ، اسے تم کو ہی بجھانا پڑے گا ارسلہ۔" سکندر نے غصے سے اس کا بازو پکڑا اور اسے دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ بھنا گئی۔

"تم مجھے نیلو کی ساس کے آگے ذلیل کرنا چاہتے ہو بس۔ میں جھک کر اس عورت کو خود پر ہنسنے کا موقع دوں۔" "تو ایسا کبھی نہیں ہوگا سکندر۔" وہ سکندر کا ہاتھ جھٹک کر کرسی سے اٹھ گئی۔ سکندر کا دل چاہا اتنے زور کا تھپڑ اس کے منہ پر رسید کرے کہ وہ الٹ کر دور جا گرے۔

"یقین کرو، آج مجھے اپنے ان تمام لمحات پر پچھتاوا اور شدید افسوس ہو رہا ہے جو لمحات میں نے تمہیں چاہنے اور تمہارے بارے میں سوچنے میں گزار دیے تھے۔ انسان فقط ظاہر دیکھتا ہے اگر باطن میں جھانکنے کا ہنر سیکھ لے تو کبھی پچھتاوے اس کی جھولی میں نہ گریں۔" سکندر کے لہجے میں تاسف ہلکورے لے رہا تھا۔

"ٹھیک کہا آپ نے سکندر۔" آبص کی آواز پر دونوں چونکے۔ وہ ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا پھر سکندر کی طرف چلا آیا۔ ارسلہ آبص کو دیکھ کر یکدم حواس باختہ نظر آنے لگی۔

"قصور ہماری اپنی ہی آنکھوں کا ہوتا ہے سکندر، جو بینائی رکھنے کے باوجود اچھائی اور برائی میں تمیز نہیں کر پاتیں۔ ظاہر وضع قطع دیکھ کر باطن کی بدصورتی نہیں دیکھ پاتیں۔ اچھائی کی پہچان تو بہت دور کی بات، برائی کو بھی نہیں جان سکتیں۔ اینی ویز۔ کیسے آنا ہوا۔" وہ سر کو خفیف سی جنبش دے کر سکندر سے خوش آمدانہ مسکراہٹ کے ساتھ علیک سلیک کرنے لگا۔ "میں تو یونہی ایک بات کہہ رہا تھا تمہاری بات سن کر، سب خیر تو ہے۔" اس نے سکندر سے مصافحہ کرتے ہوئے اچٹتی نگاہ ارسلہ پر ڈالی۔

"تم اب جاؤ سکندر، میں اماں سے فون پر بات کرلوں گی۔ اور خالہ سے بھی۔" ارسلہ جلدی سے سکندر کی طرف دیکھ کر بولی۔ مبادا سکندر آبص کے سامنے مزید اس گفتگو کو جاری نہ رکھے۔

سکندر نے اس کی طرف دیکھا اور سوچا۔ کتنی فکر ہے تمہیں اپنی عزت کی اور اپنا گھر بچانے کی شوہر کے

سامنے سر اٹھا کر جینے کی۔

''ارے، ایسے کیسے جاؤ گے۔ بیٹھو اندر چل کر۔ چائے وائے پیتے ہیں۔'' آبص سکندر کو روکتے ہوئے بولا۔ ''مہمان ہیں آپ ہمارے۔''

ارسلہ اس صورت حال پر بے چین نظر آنے لگی تھی سکندر کو اس کی حالت اس بکرے جیسی نظر آنے لگی تھی جو یکدم چھری تلے آ گیا ہو۔ وہ دل ہی دل میں متاسف ہوا تھا۔ اتنی فکر وہ اگر نیلوفر کی بھی کر لیتی۔ تاہم اسے ارسلہ سے کوئی ذاتی بیر نہ تھا وہ اسے آبص کی نظروں سے گرانے نہیں آیا تھا فقط احساس دلانے آیا تھا، وہ آبص کے اصرار کے باوجود نہ رکا اور چلا گیا۔ راستہ بھر اس کا دماغ کھولتا رہا ارسلہ کی اس بے حسی پر۔ وہ بجائے خالہ کی طرف جانے کے اپنے گھر چلا گیا۔ اسے یقین تھا اریبہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ کوئی اچھی خبر سننے کی منتظر ہو گی۔ مگر اس کے پاس کوئی اچھی خبر نہ تھی۔

☆☆☆

''خیریت تو ہے سکندر کیوں آیا تھا خاصی ذومعنی باتیں کر رہا تھا۔'' آبص سکندر کے جانے کے بعد ارسلہ کو خاصی جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''ارے نہیں ...... '' وہ تو بس یونہی، خفا ہو رہا تھا۔ دراصل وہ لینے آیا تھا مجھے کہ خالہ مجھے یاد کر رہی تھیں۔ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے میں نے کہا کل آؤں گی۔ یوں بھی میری طبیعت کون سی ٹھیک ہے۔ کہ میں ادھر ادھر جاتی پھروں۔'' وہ خوب صورتی سے بات ٹال گئی۔ آبص دل ہی دل میں اس کے اعتماد کو سراہے بنا نہ رہ سکا۔

''چلی جانا اتنی محبت سے بلا رہی ہیں تو۔ یوں بھی کون سا تم کو پیدل جانا ہے۔'' وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''عبادت کرنا تو نیکی ہے اور رشتوں کی قدر کرنا سیکھو۔''

''آپ نے بڑے رشتے نباہ لیے۔'' وہ طنز سے ہنسی آبص کا اٹھتا قدم تھم گیا۔ اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

''کوشش تو بہر حال پوری کی تھی۔'' وہ کہتا آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

چاہت میں مر جاؤں لیکن نام سلامت رکھنا
میری جھولی میں مولا اک شام سلامت رکھنا
اس کو منانے کی کوشش میں جیون سارا بیتے
مشکل ہے لیکن بس ایک یہ کام سلامت رکھنا

نیلوفر نے کوئی چوتھی بار نمبر ڈائل کیا اور اب کے لائن کاٹی نہیں تھی اور اپنی ساری ہمتیں مجتمع کرنے لگی۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ چوتھی بیل پر اس کی مانوس آواز ابھری تھی۔

''ہیلو۔'' تھکی ہوئی بجھی ہوئی بے رونق سی آواز۔

''ہاں بولو نیلو۔'' چھوٹتے ہی اس نے یکسر بے کیفیت لہجے میں کہا۔

ادھر نیلوفر کے دل میں گویا خنجر ہی اتر گیا اس کی اس بے مہری، بے لچک اور بے فیض لہجہ سن کر، اس کی ناراضی ظاہر تھی، جو اسی کی روح میں نشتر کی طرح اتر گئی تھی۔ آنکھیں گویا چھلکنے کو بے تاب تھیں۔

''کیسے ہیں آپ۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔

''ویسا ہی ہوں جیسا تم چھوڑ کر چلی گئی ہو۔'' جواب آیا۔

''میں، میں چھوڑ کر چلی آئی ہوں۔'' نیلوفر کو دھچکا لگا۔
''آپ نے ہی مجھے جانے کو کہا تھا۔''
''میں نے کہا اور تم چلی گئیں۔'' وہ تو جیسے بھرا بیٹھا تھا اور یہ غصہ درحقیقت اس جدائی کے جاں سوز لمحات کا بخشا ہوا تھا۔ اس تنہائی و حشت کا تھا جو نیلوفر کے بناء اسے کاٹ رہی تھی وہ تو اس کا عادی بن چکا تھا۔ اس کے بغیر تو یوں تھا جیسے تیز ہوا میں آیا ہوا بے حال پتا۔
''تم رک سکتی تھیں۔ ضد کر کے تکرار کر کے ڈٹ جاتیں میں نے دھکے دے کر تو تمہیں نہیں نکالا تھا۔''
نیلوفر ششدر رہ گئی۔ اب یہ الزام بھی اس کے سر پر تھا کہ وہ کیوں چلی گئی۔ یعنی مارو اور رونے کی اجازت بھی نہیں۔
''آپ کی ماں کے لیے اس وقت میرا وجود ناقابل برداشت تھا۔ ان کا ساتھ آپ دے رہے تھے۔ ان کا فیصلہ آپ کا فیصلہ بھی تھا۔ یہ بات آپ کیوں بھول رہے ہیں۔''
''ہاں، میں غصہ میں تھا۔''
''مگر اس کے بعد بھی میں نے آپ کو میسجز کیے تھے مگر آپ نے جواب نہیں دیا مجھے۔'' نیلو اس کے لہجے کی گرمی کم ہوتے دیکھ کر ہمت سے بول گئی۔
''تمہارے ان میسجز کا میں کیا جواب دیتا۔ تم میری خاطر ارسلہ کو نہیں منا سکیں تو سوچو میں اماں کو کیسے جھکاتا۔''
''مگر احمر میں تو بے قصور ہوں پھر سزا مجھے کیوں مل رہی ہے میں کیوں آپ کی بے اعتنائی کا شکار ہو رہی ہوں۔ مجھ سے آپ بے رخی کیوں برت رہے ہیں۔'' وہ رو دینے کو تھی، آنسو بے آواز پلکوں کی باڑھ توڑ کر بہہ جانے کو مچل رہے تھے۔ خود کو مضبوط بنائے رکھنے کا عمل بکھرتا جا رہا تھا۔
''صرف اس لیے کہ تمہارے میکے والوں کو احساس ہو۔'' وہ جھلس کر بولا۔ ''تمہاری بہن کو اپنی غلطی کا احساس ہو۔ جو اخلاق کے سارے سبق بھلا بیٹھی تھی اس وقت یا شاید اسے یاد ہی نہیں کرائے گئے تھے۔''
اس کا یہ ذلت آمیز لہجہ نیلو کو کاٹ کر رکھ گیا۔
''میرے میکے والوں کو اس بات کا احساس ہے وہ نادم بھی ہیں مگر احمر آپ کی بے رخی سے معاملہ سلجھ تو نہیں جائے گا اور الجھ ضرور جائے گا۔ ایسے وقت مجھے اور میرے میکے والوں کو آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ آپ میرا حوصلہ ہیں احمر۔ میرا مان ہیں۔ میں ہزار بار اماں سے معافی مانگنے کو تیار ہوں۔ مگر آپ ارسلہ کی شرط رکھ کر میری زندگی کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ میں نہیں جانتی ارسلہ اپنی غلطی تسلیم کرے گی یا نہیں کرے گی۔ مگر میں اور میرا بچہ۔ اس شرط کی آگ کی نذر ہو جائے گا۔''
''خدا نہ کرے۔'' احمر یوں تڑپا گویا اس کی گردن پر خنجر رکھ دیا گیا ہو۔ میرا بچہ کیوں کسی آگ کی نذر ہونے لگا۔
''چلیں کہ اس بچے کی تو فکر آپ نے کی جو ابھی دنیا میں نہیں آیا۔'' وہ افسردگی سے ہنسی۔ ''میں تو یونہی خوش فہمی میں مبتلا رہی ایک عرصہ کہ میری فکر بھی ہے آپ کو۔''
وہ افسردگی سے بولی تو دوسری طرف چند لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ خاموشی کا یہ بوجھل لمحات مختصر رہے۔
''دیکھو نیلو! میں بہت پریشان ہوں بہت ٹینشن ہے مجھے ہمارے مسئلے کا حل تمہارے پاس ہے تمہارے میکے والوں کے پاس، ارسلہ بہن ہے تمہاری...... اسے تم سے محبت نہیں تو کم از کم ہمدردی تو ہو گی نا۔''
''مجھے اب کسی بھی رشتے پر اعتبار نہیں رہا ہے۔'' وہ دل گرفتگی سے بولی۔ ''اب تک اس رشتے کو بھی بہت مضبوط

اور پائیدار سمجھتی آرہی تھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کبھی بھی اور کسی بھی وقت انا اور غیرت کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔ باہمی یگانگت، محبت، مفاہمت، سب فقط کتابیں باتیں ہو کر رہ جائیں گی۔" افسردگی تھی کہ جاں تک اتر گئی تھی۔

احمر کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ اس کے آنسوؤں کا بہناوہ محسوس کر رہا تھا اس کے لہجے کا بکھراؤ اسے افسردہ کر رہا تھا۔

"میں خوش فہمی میں رہی احمر کہ آپ کسی بھی مشکل گھڑی میں مجھے اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔"

"میری مجبوری کو سمجھو نیلو، بدگمان مت ہو، میرے اردگرد اور بھی رشتے ہیں جن کا حق ہے مجھ پر، میں نظرانداز نہیں کر سکتا۔ میری ماں نے بھی مجھ سے بہت سی توقعات باندھ رکھی ہیں جن کو میں توڑ نہیں سکتا۔" وہ اداسی سے بولا۔

"ایک بیوہ عورت جس نے بچپن سے بیٹے کو سینے سے لگا کر رکھا اسے گرمی سردی سے بچا کر رکھا۔ ہر دکھ سے بچایا۔ ہر چھاؤں دینے کی کوشش کی۔ اسے ایک شجر بنایا، اس آس پر کہ وہ شجر بن کر ان کو چھاؤں دے گا۔ ان کے کمزور اور نحیف وجود کو ٹوٹنے بکھرنے نہ دے گا۔ بہت مان ہے انہیں بھی مجھ پر، ایک کروٹ کتنی راتوں کو سوتی ہے، ایک ماں جب بچہ پیٹ میں رکھتی ہے۔ تکلیف سہتی ہے ہر درد برداشت کرتی ہے اپنا نوالہ چھوڑ دیتی ہے مگر اس کا نوالہ اسے لا کر دیتی ہے۔ اس ہستی کے مجھ پر بہت سے حق ہیں نیلو...... میں نے بھی تمہارے ساتھ میں زیادتی نہیں کی اور نہ ہونے دی ہے ہر جگہ تمہارے ساتھ کھڑا رہا ہوں جہاں مجھے اپنی ماں غلط دکھائی دی ہے۔ میری ماں کی خدمت تم پر فرض ہے نہ واجب مگر تم ان کی خدمت کرتی رہی ہو۔ یہ تمہارا احسان ہے اور میں تمہارا احسان مند مگر یہاں ان کی عزت کا سوال تھا۔ اگر میں خاموش رہ جاتا تو ارسلہ جیسی سرکش لڑکیاں بزرگوں کی عزت کا پاس کرنا چھوڑ دیں گی۔ ماؤں کی ہر امید بیٹوں سے ٹوٹ جائے گی۔ وہ شاید بیٹے پیدا کرنے سے ہی خوف زدہ ہو جائیں گی۔ میں غلط نہیں ہوں نیلو...... ہاں میرا طریقہ کار کچھ غلط ضرور ہوگا۔ مگر رشتوں کو نباہنے کے لیے، بہت بار اپنی خواہشات کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے محبت کی لو نیچے کرنا پڑتی ہے۔ حالات کے تابع ہو کر جینا پڑتا ہے۔"

نیلوفر، احمر کی باتیں سن کر، ضبط نہ کر سکی اور رو پڑی۔

"تمہیں تکلیف دے کر میں خوش نہیں ہوں خود بھی۔ میں بے رحم نہیں ہوں۔ نہ خود غرض ہوں۔"

"جانتی ہوں مگر کیا کروں۔" وہ چیخنا چاہتی تھی مگر آواز آنسوؤں کی یورش سے بھرا گئی تھی۔

وہ بجھے اور دل گرفتہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "میں اگر تمہارے لیے شجر سایہ دار ہوں تو، اپنی ماں کے لیے دھوپ کیسے بن سکتا ہوں۔ تمہاری آنکھوں سے گرتے یہ آنسو مجھے تکلیف دے رہے ہیں نیلو۔ انہیں پونچھ لو۔" وہ نرمی سے بولا اور اس کی یہ نرمی نیلو کا دل پگھلانے لگی۔ وہ اور زور و شور سے رونے لگی تھی۔ کب کا رکا ہوا سیلاب ہر بند توڑ کر بہہ جانے کو مچل گیا تھا۔

"ہر مرد شادی عورت کو رلانے کے لیے نہیں کرتا، نہ کی تسکین کے لیے کرتا ہے۔ وہ بھی خواب دیکھتا ہے...... خوش رنگ خواب۔ اپنے ہمسفر کے ہمراہ ایک خوش گوار زندگی گزارنا چاہتا ہے اور ایسے میں اسے بھی دہری محنت کرنا پڑتی ہے۔ اپنی زندگی کو متوازن رکھنے کے لیے اور کبھی یہ توازن قائم رکھتے رکھتے وہ اندر سے کئی بار ٹوٹتا ہے، بکھرتا ہے۔ ماں کے سامنے ظالم بیٹا بنتا ہے تو کبھی بیوی کے آگے مجرم۔ حقوق کی پاسداری کرتے کرتے کبھی کبھی تو وہ اپنے کتنے ہی حقوق سے خاموشی سے دستبردار بھی ہو جاتا ہے۔"

لائن منقطع ہو گئی تھی مگر نیلوفر۔ موبائل پکڑے مضمحل افسردہ اور دل گرفتہ سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

آبص کے آگے ارسلہ کی ہٹ دھرمی واضح ہو چکی تھی وہ بات کھل چکی تھی اس نے نرمی سے اسے سمجھانا چاہا تھا کہ، وہ نیلو کی ساس سے سوری کر لے۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی انا کا مسئلہ نہ بنائے۔ اس طرح نیلو کو نقصان ہو سکتا ہے مگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔

''سکندر بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اگر معاملہ سیریس نہ ہوتا تو وہ کبھی یہاں نہ آتا۔ تمہاری اتنی منت سماجت نہ کرتا۔''

''بس رہنے دیں۔ اپنے مسائل جو حل نہ کر سکے ان کے گھر نہیں چلتے۔ دوسروں کے کندھوں کے سہارے سے بھلا زندگی گزرتی ہے...... ! گھر بس سکتے ہیں!'' وہ بے مروتی سے بولی۔

آبص کلائی سے ریسٹ واچ اتارتے ہوئے قدرے حیرت سے پھر متاسفانہ نگاہوں سے اس دیکھ کر رہ گیا۔ وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔ اور جب وہ چائے لے کر لوٹی تو آبص شب خوابی کا لباس تبدیل کر چکا تھا اور کسی کتاب کے ورق گردانی کر رہا تھا اسے دیکھ کر کتاب بند کر دی۔

''یہ چائے وائے رہنے دو۔ تم ادھر بیٹھو۔ مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے تم سے۔'' وہ یکدم سنجیدہ دکھائی دینے لگا تھا۔

''شکر ہے۔ مجھ سے بھی ضروری باتیں کرنے کا خیال آ گیا آپ کو ورنہ تو اپنے ماں باپ سے ہی میٹنگز ہوتی ہیں آپ کی۔'' وہ شاید کوئی موقع آبص کو شرمندہ کرنے کا زچ کرنے کا نہیں چھوڑتی تھی۔

آبص کے اندر سے آگ کی لپٹیں اٹھنے لگیں۔ تاہم وہ کسی بھی ردعمل سے باز رہا اور کچھ دیر سوچتا رہا کہ بات کہاں سے اور کیسے شروع کرے۔

ارسلہ اس کے نزدیک بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا وہ ابھی رومانس جھاڑے گا اور آج تو خود اس کا دل بھی چاہ رہا تھا وہ اس سے لگاوٹ ظاہر کرے۔ کوئی محبت بھرا لمس۔ کوئی مدھر سے جملے جو اس کے کانوں کو بھلے لگیں۔ وہ آنکھوں میں خمار بھر کر اسے دیکھنے لگی۔ اسے بھی اب آبص کی توجہ کی طلب ہونے لگی تھی۔

''آپ کچھ کہنا چاہتے تھے۔'' وہ اسے سوچوں میں غلطاں دیکھ کر دھیرے سے بولی۔ ''میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' دھیرے سے مسکرائی۔

آبص نے اس کی طرف دیکھا دوسرے پل اس کے چہرے اور آنکھوں سے چھلکتی سنجیدگی میں یکلخت اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے ارسلہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''ارسلہ! تم جانتی ہو کہ مجھے جھوٹ سے اور چیٹنگ سے نفرت ہے۔ میں ہر رشتے میں خالص رہا ہوں اور محبت نہ سہی تو نفرت بھی نہیں کر سکا ہوں تم سے۔ مگر تمہیں دھوکے میں بھی نہیں رکھنا چاہتا۔''

''یہ کس بات کی تمہید ہے۔'' ارسلہ اب ذرا پریشان نظر آنے لگی۔ آبص کے چہرے پر محبت کا نشہ نہیں بلکہ غیر معمولی پن دکھائی دے رہا تھا آنکھیں سلگتی سی محسوس ہو رہی تھیں جیسے بہت کچھ ضبط کر رہا ہو۔ اس کا دل بے نام اندیشے سے لرزا تھا پل بھر کو۔

''آپ کھل کر کہیے۔'' اب کے وہ پست آواز میں بولی۔ اس کے لبوں پہ کھلنے والی مسکراہٹ بھی گم ہو چکی تھی۔

''ارسلہ! میں تم سے نادیہ شاہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' چند لمحے توقف کے بعد وہ بولا۔

نادیہ شاہ کے نام پر ارسلہ کی ساری حسیات بیدار ہو گئیں۔ اس کے اعصاب پر یوں اثر ہوا جیسے وائلن کے اکڑے ہوئے تاروں پر کسی نے کھٹ سے ہاتھ مار دیا ہو۔ ہر تار جھنجھنا گیا ہو۔

''نادیہ شاہ۔'' اس کے لب ذرا سا کھلے۔

''ہاں، میں نادیہ شاہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ ہم دونوں ہی عنقریب شادی کر رہے ہیں۔'' آبص نے نہایت اطمینان سے کہتے ہوئے ارسلہ کا سارا اطمینان غارت کر دیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

نادیہ خان بلوچ

گوشت مبارک

''ہانی نی او ہانی......ادھر آؤ ذرا...... مجھے یہ لسٹ تو بنا کے دو جن کے گھر گوشت بھیجنا ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں تم ان کے نام تو لکھتی جاؤ......'' سکینہ بیگم نے انگلیوں پہ نام گنتے ہوئے ہانیہ کو آواز لگائی۔

ہانی نے صرف ''ہوں'' کہنے پہ اکتفا کیا......

کیونکہ وہ دانشور آن لائن تھی اور اس وقت اپنی دانش مندی کی پوسٹ لگانے میں مصروف تھی۔ ڈھیر سارے ادب احترام کے ساتھ اس نے لکھا۔

''قربانی خاص اللہ کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے عید کا گوشت فریزر میں رکھنے کے بجائے اصل حق داروں میں بانٹنا چاہیے۔''

اس کی پوسٹ میں ''لو اور کیئر'' ری ایکٹ ہونے لگا۔ جس طرح لائکس کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی اسی طرح ہانی کا خون بھی بڑھ رہا ہے...... مگر اماں کی آوازیں بھی مسلسل آ رہی تھیں۔ آخر موبائل چارجنگ پر لگا کے ہانی کو اٹھنا ہی پڑا۔

''جی اماں! کیا کہہ رہی تھی۔'' ہانی نے ماں کے قریب کرسی پہ براجمان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''یہ لے کاغذ پنسل اور نام لکھ......'' سکینہ بیگم نے اس کی طرف دستہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

ہانی پیچ نکال کے لکھنے لگی۔

''سب سے پہلے لکھو...... عبدالشکور صاحب، حاجی غفار، حاجی پیر بخش، عارف بڑھار، وقاص سبزی منڈی کا ٹھیکیدار...... حاجی راشد یال والا......''

جس رفتار سے سکینہ بیگم بتاتی گئیں ہانی ویسے ہی لکھتی گئی۔ جب پندرہ سے اوپر نام ہوئے تو ہانی بول پڑی۔

''اماں! یہ سب تو کھاتے پیتے گھرانے سے ہیں ان کے یہاں تو بیلوں کی قربانی ہوتی ہے اور تم انھی کے گھر گوشت بھیجو گی؟ یہ قربانی کا گوشت تو غریبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے نا!''

''تو چپ کر...... عالمہ فاضلہ نہ بن...... اگر ان کے گھر ہم گوشت بھیجیں گے تو وہ بھی تو واپس دیں گے نا...... دعا سلام بھی تو بڑھے گی۔'' اماں بیگم نے اپنا منصوبہ بیان کرتے ہوئے کہا......

''اماں! تو ایک بکرے کا گوشت کتنے گھروں میں پورا کرے گی؟ غریبوں مسکینوں کا حصہ بھی ایسوں کو دوں گی کیا؟'' ہانی نے پریشان ہو کے پوچھا۔

"تو بس لکھ ان کو بھی دیکھ لیں گے...... اس لیے تو میں نے مدرسے میں حصہ نہیں رکھوایا غریبوں مسکینوں کا تو وہ خود رکھ لیتے۔ کھال بھی ان کے کھاتے میں جاتی...... ہمیں بچتا کیا؟ داڑھ بھی گیلی نہیں ہوتی ہماری۔" سکینہ بیگم نے جل کے کہا۔ اور ہانی کو مزید نام بتانے لگیں۔

اماں کی باتیں سن کے ماہی کو اپنی سہیلیاں بھی یاد آنے لگیں۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اماں! میں اپنی دوست مہوش کا نام لکھ لوں؟ اس کے گھر بھی دے دیں گے۔"

سکینہ نے پہلے تو انکار کیا مگر پھر کہا "چلو لکھ دے مگر اسے بھی کہنا وہ بھی ضرور بھیجے......"

"ہاں اماں ضرور بھیجے گی۔ ان کا تو بیل ہے پورے کا پورا...... پکی سہیلی ہوں اس کی۔" ہانی نے سوچوں کے پتنگ اڑاتے ہوئے کہا۔

"اور اماں، ردا کا بھی لکھ دوں؟" ماہی ایک بار پھر سے بولی۔ مگر اس بار لفظ رک رک کے ادا کیے۔

"کون ردا......؟" پہلے مہوش اب ردا...... ایسا کر تو سب کا لکھ دے ردا کے چاچے مامے کا بھی......" سکینہ بیگم نے لسٹ چھینتے ہوئے کہا۔

"ردا کے ابو تو دبئی میں ہوتے ہیں ان کے یہاں ضرور اونٹ ہی ہوگا تب ہی کہہ رہی تھی میں تو......" ردا نے منمنا کے کہا۔

سکینہ بیگم کا غصہ برج خلیفہ سے چھلانگ لگا کے دبئی کے اونٹ پر جا بیٹھا۔ لسٹ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لو لکھ لو...... اب کوئی اور نام نہ لکھنے بیٹھ جانا۔"

ہانی نے فٹ سے لکھ کے لسٹ اماں کی طرف بڑھائی تو سکینہ بیگم بولیں۔ "گنو تو کتنے نام ہیں کوئی رہ تو نہیں گیا نا......!"

ہانی نے گن کے بتائے، پورے چھتیس نام تھے اور بکرا صرف ایک...... ہانی سوچنے لگی اماں کیسے پورا کرے گی گوشت؟ مگر یہ ہانی کا مسئلہ نہیں تھا۔ سکینہ بیگم کے پاس سارا انتظام تھا۔

سکینہ بیگم لسٹ پڑھتے ہوئے اپنے کمرے میں جانے لگیں تو ہانی نے آواز دی۔

"اماں! فریج تو ٹھیک کروا لے نا...... گوشت ہم کہاں رکھیں گے۔" ہانی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"آئے ہائے مجھے پاگل سمجھا ہوا ہے؟" پہلے فریج کی بات پکی کی ہے تیرے ابا سے پھر جا کے بکرا لیا ہے۔ آج ہی شام کو بندہ لے جائے گا دو دنوں میں بن جائے گا۔" سکینہ بیگم اطمینان سے بولیں۔

ماہی نے بھی سکھ کی سانس لی کیونکہ اس کا کاسمیٹک کا سامان گرمی میں پگھل رہا تھا اور اسے ٹھنڈی لپ اسٹک لگانے کی عادت تھی مگر اب ساری لپ اسٹک گلیسرین بنے ہوئے تھیں۔ چھری تیز کروانے سے پہلے اماں نے فریج بنوایا۔ کیونکہ وہ زیادہ ضروری تھا۔

☆☆☆

عید ہوئی بکرا کٹا...... حصے بٹے مگر سکینہ بیگم اپنی ہی بات پر قائم رہیں۔

جو بھی سوالی مانگنے آتا وہ کہتیں "ہم نے غریبوں کا حصہ نکال دیا ہے۔" چند ایک کے سوا سب خالی لوٹے۔

دوسری جانب سکینہ بیگم نے لسٹ کے مطابق سب کے گھر گوشت بھیجا، گھروں سے ان کو اچھا خاصا گوشت ملنے کی امید تھی مگر وہاں سے ایک بوٹی بھی نہ آئی۔ ان کی آدھی امیدیں باربی کیو میں جل گئیں مگر پھر بھی اتنا گوشت اکٹھا ہو گیا کہ ان کا فریج بھر گیا......

ہانی نے بھی مہوش اور ردا کے گھر گوشت بھجوایا مگر ردا کے ہاں سے برتن خالی لوٹے۔

سکینہ بیگم تپ کے بولیں۔

"ہانی تیرا بیڑا اتر جائے دیکھ تو نے اونٹ کا بولا تھا وہاں سے تو گکڑی کا بھی نہیں آیا......"

"ہاں اماں! تو ٹھیک کہتی ہے۔ یہ امیر لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں۔ انہی کے لیے تو کہا گیا ہے۔

"اندھے کیتی خیرات، ول ول ویڈوے لنڑیاں کوں۔"

ہانی نے بے موقع کہاوت جھاڑی مگر سکینہ بیگم جانے کیوں لال وسرخ ہونے لگیں۔

جب ہانی کے منے سے ذہن نے کہاوت کی تشریح کی ہانی کو پھر بس وہاں سے بھاگنے کا ہوش تھا۔

پیر پہ پیر رکھے وہاں سے دوڑ لگائی۔

سکینہ بیگم سب بھول بھال کے گوشت سنبھالنے لگیں۔ آخر برف کی جگہ فریج نے ایک ماہ تک گوشت ہی تو جمانا تھا...... دوسری جانب ہانی فیس بک پہ آن وارد ہوئی۔ نیوز فیڈ کی پہلی پوسٹ گوشت کے متعلق ہی تھی۔

"دسو دسو کتنا گوشت کھالیا اور کتنا فریج میں قید کرلیا۔"

ہانی نے فوراً اسے پہلے کمنٹ کیا۔

"بھئی ہم تو وہ ہیں جنہیں گوشت دیکھ کے ہی کچھ ہونے لگتا ہے...... لوگ پتا نہیں کیسے کھالیتے ہیں؟ جب عید کے دن گوشت نہیں کھایا جاتا تو فریج بھر کے کیا اچار ڈالنا ہے۔"

ہانی نے سنہرے ایموجی کے ساتھ سنہرے لفظوں میں خود کو برگر ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

حالانکہ...... حقیقتاً تو وہ یہ کمنٹ کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے سوئی کی مدد سے دانتوں میں پھنسی بوٹی نکال رہی تھی اور دوسرے جانب سکینہ بیگم تو رسے سے فریج باندھ رہی تھیں کیونکہ ایسے تو فریج کا دروازہ بند ہونے سے رہا......

☆☆☆

عید کو پندرہ دن گزر گئے مگر فریج کے اوپر مسلط وزن میں بس اتنا ہی فرق ہوا کہ اب رسا ہٹ چکا تھا۔ مگر فریج کھولنے پہ اب بھی ہر جگہ گوشت نظر آتا کہیں برف کی حالت میں تو کہیں سالن بنے......

ابھی آدھا گوشت ہی پیٹ کی نظر ہوا تھا کہ فریج صاحب اتنا ظلم نہ برداشت کرکے اور موڈ خراب کر کے بیٹھ گئے۔ سکینہ بیگم کو تو فکر لاحق ہوگئی کہ کریں تو کیا کریں؟

انہوں نے گوشت نکالا اور ہانی کو ان گھروں پر گوشت دینے بھیجا جنہوں نے عید کے دن بھی شاید ہی کھایا ہو......

"اماں! مجھے نہیں جانا۔ میں انہیں کیا کہوں گی؟ عید پہ تو بھیجا نہیں اب کیسے یاد آگئی......"

"تو کہہ دینا آپ لوگوں کا تو فریج ہے نہیں۔ امی نے کہا عید کے دن تو کسی اور کے گھر سے آہی جائے گا۔ یہی سوچ کے ہم نے آپ کا حصہ فریج میں رکھ دیا تھا......" سکینہ بیگم نے بہانہ پیش کیا۔ ہانی داد دیے بنا نہ رہ سکی۔ فوراً بولی۔

"واہ واہ بھئی واہ......" اور گوشت اٹھا کے چلتی بنی۔

کچھ تو سکینہ بیگم نے ابال کے دھاگے میں پرو کے سوکھنے ڈال دیا۔ کیونکہ سارے کا سارا محلے میں بانٹنے کی ان کی ہمت نہ تھی۔ جب شام کو یہ سیاپا مکا کے بیٹھیں تو دروازے پہ دستک ہوئی۔ ہانی نے جاکے دروازہ کھولا آگے ردا تھی۔ ہانی نے اسے گھر آنے کو کہا مگر وہ کہنے لگی۔

"جلدی میں ہوں تم یہ گوشت لے لو......"

"گوشت؟" ہانی نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں یار عید کے دن تو دینے آ نہیں سکی تو مما نے کہا فریج میں رکھ دیتے ہیں۔ بعد میں دے دیں گے۔ ویسے بھی تمہارے گھر فریج تو ایک ہی ہے کہاں گوشت کی جگہ بنتی ہے۔ تو سوچا اب دے آؤں ویسے بھی محرم شروع ہوگیا ہے۔ اسلامی سال کا پہلا دن ہے آج۔ تم پکالو...... آنٹی کو سلام دینا میں چلتی ہوں۔"

ردا چلی گئی مگر ہانی وہیں کی وہیں رہ گئی۔ اسے اس کے الفاظ کسی اور نے لٹا دیے تھے۔

کچن سے جھانکتے ہوئے سکینہ بیگم بھی چپ تھیں۔ گوشت وہیں پڑا تھا۔

☆☆

کنیز زہرا

سلکی بالوں کو ڈھیلی سی چٹیا کی شکل دے کر پیلا دوپٹا اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پہ ناقدانہ نگاہ ڈال کر پھر مطمئن ہوتی باہر نکل آئی۔ طاہرہ کچن میں ناشتا بنانے میں مگن تھیں۔ وہ ان سے اجازت لیتی بیرونی دروازے کی طرف بھاگی۔

"انابیہ! رکو تو آج پھر ناشتا کیے بنا جا رہی ہو۔ کتنا سمجھایا ہے کہ کچھ پہلے اٹھ جایا کرو کہ ناشتا تو کرنا نصیب ہو جائے مگر نہیں۔ وقت کے وقت اٹھتی ہو پھر ہوا کے گھوڑے پہ سوار خالی پیٹ نکل جاتی ہو۔" طاہرہ نے کچن کے دروازے میں سے ہی اسے نروٹھے انداز میں روکا۔

"ارے امی! میں اسکول میں کھا لوں گی نا...... کچھ نا کچھ۔ بے کار پریشان ہوتی ہیں آپ اور صبح کی نیند تو میں قربان کر ہی نہیں سکتی۔ صبح کے وقت پانچ منٹ کی نیند بھی نعمت غیر مترقبہ لگتی ہے۔" کچن کے دروازے تک آ کے اس نے لاپروائی سے وضاحت دی اور اپنے بیگ میں چیزیں دیکھنے لگی جن کے بنا وہ گھر سے نہیں نکلتی تھی۔

"تمہیں یاد ہے نا، آج لنچ پہ صنوبر آ رہی ہے۔ ارقم نے کچھ سامان بھجوایا ہے تمہارے لیے وہ دینے۔ بے چاری بچی ہے تو ارقم سے چھوٹی مگر اپنا گھر بھولے تمہاری بڑی نند کا کردار ادا کر رہی ہے۔ میں تو کہہ رہی تم آج نہ ہی جاتیں۔ وہ کیا سوچے گی کہ وہ اتنے دنوں بعد آئی اور بھابھی صاحبہ گھر میں ہی نہیں۔" طاہرہ کے متفکر لہجے میں ہلکی سی سرزنش تھی۔

"امی! آپ فکر مت کریں میں جلدی آ جاؤں گی۔ اصل میں آج میں منگنی کی تصاویر ساتھ لے جا رہی ہوں۔ سنبل کافی دن سے اصرار کہہ رہی ہے کہ میں اسے شادی کی تصاویر دکھانا ہی نہیں چاہتی۔ آج میں نہ گئی تو وہ میرا گلا ہی دبا دے گی۔"

انابیہ نے چشم تصور میں اپنی صراحی جیسی گردن کو سنبل کے خوں خوار لمبے ناخنوں والے پنجے میں جکڑے دیکھا اور جھرجھری لے ڈالی۔

"پھر تو تمہیں واقعی جانا چاہیے۔ مخلص دوست بھی اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ ان بچیوں کو بھی شوق ہوگا اپنی دوست کی خوشی دیکھنے کا۔" اسے ناصحانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے طاہرہ چولہے کی طرف پلٹیں۔

وہ ان سے اجازت لیتی گھر سے نکل آئی۔

وہ جب اسکول پہنچی پہلے پیریڈ کی بیل بج چکی تھی۔ اگلے دو گھنٹے اس کے بہت مصروف گزرے۔ تیسرا پیریڈ خالی تھا وہ اسٹاف روم کی طرف چلی آئی۔ جہاں سنبل فریال اور نایاب پہلے سے موجود خوش گپیوں میں مگن تھیں۔

"ارے واہ واہ...... لیں حاضرین، تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ گیا۔ آج تو پکچرز دکھائے بنا اور ٹریٹ دیے بنا تمہاری جان نہیں چھوٹنے والی۔" سنبل اسے دیکھتے ہی خوب چہکتے ہوئے نان اسٹاپ شروع ہو چکی تھی۔ باقی دونوں بھی مسکرا دیں۔ وہ سنبل کے ساتھ کی سیٹ سنبھال گئی۔

"تمہاری وجہ سے ہی تو آج آئی ہوں ورنہ چھٹی

ناولٹ

کر لیتی آج۔ اصل میں آج صنوبر آپی آرہی ہیں۔ ارقم نے کچھ سامان بھجوایا ہے میرے لیے وہ دینے۔"
ارقم کے نام پہ اس کے گلابی پڑتے چہرے کو دیکھ کے سب نے لمبی سی "اوہ" کی ہانک لگائی۔
"بہت مہربانی جنابہ کی اب شرافت سے تصاویر نکالو ورنہ پھر کہوگی دن دھاڑے بیگ پہ ڈاکا پڑ گیا۔" سنبل نے پھلجھڑی چھوڑی تو پھر قہقہہ پڑا۔
"جی مس انابیہ! ذرا ہم بھی تو دیکھیں آپ کے "وہ" دیکھنے میں کیسے ہیں۔" نایاب نے بھی دلچسپی سے اس کے شرم سے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ کے ریکارڈ لگایا۔
"بھئی ہماری انابیہ اتنی پیاری ہے اس کے "ان" بھی تو اچھے ہی ہوں گے۔"
فریال نے فرط مسرت سے انابیہ کے گندمی چہرے پہ کھلتی آلو ہی چمک کو دیکھ کے شرارت سے کہا۔
اس نے بیگ میں سے البم نکالا اور کھول کے ان سب کے سامنے کر دیا۔
سامنے ہی پکچرز میں سی گرین کلر کے فینسی ڈریس میں ملبوس انابیہ غضب ڈھارہی تھی تو ساتھ ہی بیٹھے ارقم رحمان کی چھب بھی نرالی تھی۔ اس کے خوشی کے رنگوں سے سجے چہرے پہ گھنی مونچھیں اس کے چہرے پہ اتنی سوٹ کر رہی تھیں جیسے کسی ماہر مصور نے اس کے چہرے کی مناسبت سے بنائی ہوں۔ آنکھوں سے جھلکتی سچی خوشی اس بات کی غماز تھی کہ انابیہ کا ساتھ اس کے لیے کسی انعام سے کم نہیں۔ غرض یہ کہ انابیہ روایتی سنگار میں اگر کسی دیس کی شہزادی لگ رہی تھی تو ارقم رحمان بھی کسی اپالو سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ جس نے دیکھا اس نے ان کی جوڑی کی تعریف کی۔ انہیں خوش رہنے کی دعا دی۔
"بھئی بیہ! بہت ہی اچھی پکس ہیں منگنی کی۔ مگر خوشی کی خبر تو ٹریٹ کے بنا ادھوری ہوتی ہے نا۔ اس لیے جلدی سے منگوالو جو کھلانا چاہتی ہو ہمیں پھر مابدولت نے گھر بھی جانا ہے۔ تمہاری بھی تو نند منتظر ہوگی کہیں ارقم بھائی کو شکایت ہی نا کر دے۔"
البم اسے تھماتے ہوئے سنبل نے پھر سے ہانک لگائی۔
"وہ ایسی نہیں ہیں۔" انابیہ نے مختصر مگر پرزور احتجاج کیا تھا۔
"اچھا جی کچھ عرصے بعد پوچھوں گی۔ شادی کے بعد تم نے ہی اپنی نند کی برائیاں کرنی ہیں ہمارے ساتھ۔" نایاب نے بھی اسے کہنی سے ٹھوکا مارتے ہوئے گل افشانی کی تو وہ ہنسی دباتی اٹھ کھڑی ہوئی۔
اس نے اس دن چکن رول منگوائے تھے۔ سب جلد ہی اس کا پیچھا چھوڑ کے پیٹ پوجا میں لگ گئیں۔
وہ طاہرہ اور آفاق کی اکلوتی بیٹی تھی۔ چونکہ آفاق صاحب نے اسے نازوں سے پالا تھا سو اس کے بی ایس سی کرتے ہی اسے اسی کی خواہش پہ جاب کی اجازت بھی دے دی۔ سو اس نے مقامی اسکول میں جاب کر لی۔ دو سال پہلے اس کی منگنی اس کے چچازاد ارقم رحمان سے ہوئی تھی۔ جو دبئی میں انجینئر تھا۔ چونکہ منگنی پہ مختصر افراد بلائے گئے تھے سو انابیہ اپنی اسکول فرینڈز کو نہیں بلا پائی۔ اور سنبل جو اس کی بیسٹ فرینڈ تھی اس کے پیٹ میں تب سے ہی منگنی کی تقریبات کی تصاویر دیکھنے کے مروڑ اٹھ رہے تھے۔
☆☆☆
اس نے سنک میں رکھے گندے برتن دھونے شروع کیے تو شجاع بھی اس کے پیچھے کچن میں ہی چلا آیا۔ شجاع نے آج اس کی فرمائش پہ بریانی بنائی تھی جو بہت عمدہ بنی تھی۔ سو آج برتن دھو کے رکھنے کی باری ارقم کی تھی۔ پردیس میں وہ ہی تو ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ وہ دونوں چار سال سے یہ روم شیئر کر رہے تھے۔ اب تو یہ حال تھا کہ بیماری میں ایک دوسرے کا ماؤں کی طرح خیال رکھتے۔ اور ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا تو جیسے لازم و ملزم تھا۔ ابھی بھی نفاست پسند ارقم رحمان کو ایپرن پہنے برتن دھوتے دیکھ کے شجاع کے منہ سے ہنسی کا فوارہ نکلا تھا جو ارقم کے گھورنے پہ حد ادب ہوتا ختم ہو گیا۔
"واہ یار! نصیب بھی کیا کیا رنگ دکھاتا ہے۔ ماؤں کے شہزادوں کو دیس نکالا دے کر ان سے

جھوٹے برتن دھلواتا ہے۔" فریج سے سیب نکال کے مختصر سی کچن شیلف پہ بیٹھتے شجاع نے بظاہر ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے مگر مسخرے انداز میں کہا۔

"کیوں بھئی، برتن دھونے میں کیسی شرم؟ ہمارے گھروں میں ہماری مائیں اور بہنیں بھی تو دھوتی ہیں۔ ہم لوگ دھولیں گے تو ہماری شان تھوڑا ہی گھٹ جائے گی۔" ایڑیوں کے بل گھومتے ہوئے ارقم نے گویا اسے شرمندہ کیا تھا۔ پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔ تم جیسا عام سا شخص تو برتن دھو بھی لے تو کیا فرق۔ لیکن مجھ جیسے ڈیشنگ شخص سے تو برتن نہ دھلواتی نا یہ پھوٹی قسمت۔" ہزار کوشش کے باوجود اس بار شجاع کے لہجے میں غیر سنجیدگی جھلکی تھی۔ ارقم مڑے بنا اس کی شرارت سمجھا تھا۔ مڑ کے دیکھ لیتا تو ہنسی روکتا شجاع کا سرخ پڑتا چہرہ سارے راز کھول دیتا۔

"ہاں عام سا ہی تو ہوں اسی لیے ایک پل کو بھی تمہارا میرے بغیر گزارا نہیں۔ حتیٰ کہ پاکستان بھی اکیلے نہیں جانا چاہتے۔ مجھے ساتھ لے جانے کی رٹ لگائے ہوئے ہو۔" دھلے برتنوں کو کچن ٹاول سے صاف کر کے ریک میں سجاتے وہ ہونٹوں پہ ہنسی دباتا سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"ہاں پاکستان تو میں تمہارے بنا نہیں جانے والا۔ تمہیں چھٹی لینی ہی ہو گی۔ ویسے بھی میری شادی میں تم نہ آؤ یہ میں ہونے نہیں دوں گا۔ اور اس بار شادی کیے بنا میں واپس بھی نہیں آ سکتا۔ امی کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوا کے رہتی ہیں۔" شجاع نے دوٹوک لہجے میں کہتے ہوئے ازسرنو اصرار کیا۔

"واہ یعنی شادی تمہاری ہے اور لیو میں لے کر کمپنی کو نقصان کرواؤں۔ یہ تو وہ ہی بات ہو گئی بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ۔" ارقم نے نیم سنجیدہ انداز میں کہتے فلاسک میں پانی بھرا اور سوئچ آن کر دیا۔

"تو تم بھی شادی کر کے آنا نا۔ ویسے بھی دو سال ہونے لگے ہیں تمہاری منگنی کو کب تک خیر مناؤ گے۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ شادی کی ڈیٹ میری شادی کے ایک ہفتے بعد کی رکھنا تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے کی شادی پہ خوب بھنگڑے ڈال سکیں۔" اس کے ہاتھ سے بھاپ اڑاتی چائے کا کپ تھامتے شجاع نے جیسے چٹکیوں میں بات اڑاتے ہوئے قابل قبول حل اس کے سامنے رکھا۔

"ہاں یار! امی تو میری بھی شادی پہ بہت اصرار کر رہی ہیں۔ تایا جی بھی دبے لفظوں میں شادی کا کہہ چکے ہیں ابو جی سے۔" ارقم نے قدرے جھینپتے ہوئے بتایا تو شجاع نے اس کے انداز پہ چھت پھاڑ قہقہہ لگایا۔

"بس تو پھر سوچ اس بارے میں اور ہاں یہ باقی ماندہ برتن دھو کے کچن سے نکلنا۔ پھوہڑ عورتوں کی طرح مجھے صبح سنک میں یہ فلاسک اور یہ کپ نظر نہ آئیں سمجھے۔" دانستہ رعب دار لہجہ اپناتے شجاع نے اسے ہدایات دیں اور کمرے کی طرف چل دیا۔ ارقم بھی مسکراتے ہوئے شیلف سے ہی ٹیک لگا کے گرم چائے کی چسکیاں بھرنے لگا۔

☆☆☆

"ارے یار ارقم! یہ تمہارے سیل پہ پاکستان سے کال آ رہی ہے دیکھو کہیں بھابھی نا کر رہی ہوں کال۔" اس نے چائے ختم ہی کی تھی کہ شجاع اس کا موبائل لیے کچن میں آیا۔ موبائل رنگ کر رہا تھا۔

"نہیں یہ انابیہ کا نمبر نہیں۔ کوئی انجان نمبر ہے۔ لاؤ دیکھتا ہوں کس کا ہے۔" ارقم نے اس سے موبائل لے کر ریس کیا تو شجاع کچن سے نکل گیا۔ شجاع کی یہ ہی بات اسے بہت پسند تھی وہ تجسس نہیں کرتا تھا۔

"ہیلو، السلام علیکم۔ جی کون؟" مختصر مگر محتاط لہجے میں بات کا آغاز کرتا ارقم انجان نمبر پہ کچھ الجھا تھا۔ یہ ہی الجھن اس کے لہجے سے جھلکی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ ارقم بھائی! کیسے ہیں آپ میں سحر بول رہی ہوں۔" مقابل کی کھنکتی ہوئی نسوانی آواز سن کے وہ کچھ متحیر رہ گیا۔ جہاں تک اسے یاد تھا وہ کسی سحر کو نہیں جانتا تھا نہ آج سے پہلے یہ آواز سنی تھی۔

"جی میں بالکل ٹھیک ہوں مگر معذرت میں

آپ کو نہیں جانتا۔" ارقم نے قدرے سنجیدہ لہجے میں مکمل لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ مگر مقابل پہ اس کی بات کا چنداں اثر نہ ہوا۔

"بس دیکھ لیں پھر۔ آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کا نام بھی جانتی ہوں اور آپ کی ساری فیملی تک سے واقف ہوں۔"

کھلکھلاتی ہوئی سی مندر کی مدھر گھنٹیوں جیسی کھلکھلاہٹ پہ وہ بری طرح چونک کر خاموش ہوا تھا۔

"اوہو آپ تو پریشان ہو گئے۔ گھبرایئے نہیں میں انابیہ کی دوست ہوں۔ حال ہی میں اس نے ہمارا اسکول جوائن کیا ہے۔ پھر پتا چلا وہ منگنی شدہ ہے آپ کی منگنی کی تصاویر بھی دیکھیں ہم نے۔ آج اس سے نمبر لیا آپ کا سوچا فون کر کے منگنی کی مبارک دے دوں۔" پھر مسکراتے ہوئے وضاحت دی گئی تھی۔ ارقم کا ذہن بل میں ہلکا پھلکا ہوا تھا۔

"جی جی۔ ضرور۔ کیوں نہیں۔ انابیہ نے جاب جوائن کرنے کا بتایا تھا مجھے۔ مگر بھی یہ اتفاق نہیں ہوا کہ اس نے آپ کا ذکر کیا ہو۔" ارقم نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

"ارے وہ بہت ریزرو ہے۔ وہ تو آپ سے معمول کی باتیں بھی کم ہی کرتی ہوگی۔ فرینڈز کا ذکر کیا کرے گی۔" سحر کے بالکل صحیح اندازے پہ وہ حیران رہ گیا۔

"جی کچھ ایسا ہی ہے وہ بہت شائی ہے۔ جب بھی بات ہوتی ہے چند الفاظ کے سوا کچھ نہیں بولتی۔" انابیہ کے ذکر پر ملتفت انداز میں بتاتے ارقم کی آنکھوں میں انابیہ کا گندمی مگر پرکشش چہرہ جھلملایا تھا۔

"انجان ہونا بھی بعض دفعہ کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ انسان بڑے بڑے دکھوں سے بچ جاتا ہے۔" ایئر پیس میں گونجتی سحر کی بات پہ وہ ششدر رہ گیا۔

"کیا مطلب......؟ میں سمجھا نہیں۔" ارقم کے منہ سے الجھن میں لپٹا استفسار نکلا تھا جس کے جواب میں ایک لمبی سماعتوں کو چیرتی خاموشی در آئی۔

"ارے۔ میرا بیلنس اینڈ ہو گیا۔ بڑے دلچسپ انسان ہیں آپ باتیں کرتے وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ اچھا یہ بتائیں کہ کیا میں کبھی کبھی آپ سے بات کر سکتی ہوں۔" اس کا سوال خوب صورتی سے ٹالتے ہوئے وہ اجازت لے رہی تھی۔

"جی کیوں نہیں ضرور۔ آپ انابیہ کی دوست ہیں اس رشتے سے میرے لیے بھی آپ بہنوں کی طرح ہی ہیں۔ آپ جب چاہیں کال کر سکتی ہیں۔" دانستہ لہجے کو خوش گوار بناتے ہوئے اس نے کھلے دل سے اجازت دی تھی۔

پھر ایسا روز ہونے لگا وہ اسے کال کرتی حال احوال پوچھتی۔ کچھ الجھی سلجھی باتیں کر کے اسے حیران کرتی۔ وہ گھنٹوں یہ گتھی سلجھاتا رہتا پھر اکتا کے اپنے کام میں مگن ہو جاتا۔

☆☆☆

ارقم نے اس کے لیے اسٹائلش سا اسمارٹ فون بھیجا تھا۔ جس کی اپنی میموری سو جی بی تھی۔ اور اس موبائل میں ارقم کی اتنی تصاویر تھیں کہ اس کی میموری فل تھی۔ بچپن سے لے کر اب تک کی کچھ تصویروں پہ سے لی گئی تھیں کچھ موبائل سے۔ اس موبائل میں ارقم رحمان کی زندگی کی ہر ساعت تھی۔ وہ موبائل جب سے بیہ کے پاس آیا تھا وہ اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھتی تھی۔ یہ تحفہ نہیں اعتبار تھا جو بیہ نے بینت کے دل کے ایک کونے میں بصد احترام رکھ لیا تھا۔

ابھی بھی وہ سرخ اور سفید امتزاج کے نفیس سوٹ میں ہلکا سا میک اپ کیے تیار کھانے کی میز کے پاس کھڑی توس کو دانتوں سے کتر رہی تھی۔ جب طاہرہ بیگم ڈائننگ روم میں داخل ہوئیں۔

"ماشاءاللہ آج تو بہت پیاری لگ رہی ہو۔ کوئی فنکشن ہے اسکول میں کیا۔" دل ہی دل میں اس کی بلائیں لیتے طاہرہ نے فرط انبساط سے ایک نظر اسے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"ارے امی! بھول گئیں آپ۔ میں نے بتایا تو تھا نایاب کی منگنی ہوئی ہے وہ آج اچھے سے ریسٹورنٹ میں لنچ کروا رہی ہے سب کو۔ یہ ابھی پہنا

نہیں تھا سوچا آج پہن لوں۔" رسانیت سے وضاحت دیتی وہ چائے کا کپ اٹھا گئی۔
"وہ اتنی چاہت سے بلا رہی ہے تمہیں ضرور جانا چاہیے۔ لیکن یاد سے شام سے پہلے گھر آنا ہے تم نے۔" محبت سے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے وہ حسب سابق نصیحت کرنا نہ بھولیں۔
"میں لنچ کرتے ہی ابو کو فون کر دوں گی وہ مجھے پک کر لیں گے ریسٹورنٹ سے آپ بالکل بھی پریشان مت ہوں۔" اس نے بشاشت سے کہتے چائے کا آخری سپ لیا۔
طاہرہ کا چہرہ طمانیت کے گہرے احساس سے بھر گیا۔ وہ جانتی تھی ماں کو اس کی فکر ہے اس لیے سمجھاتی ہیں۔
وہ انہیں خدا حافظ کہتی گھر سے نکل آئی۔
مین سڑک پہ آتے ہی ٹریفک کا بے ہنگم شور جیسے اس کی سماعتوں کا امتحان بن گیا۔ رہی سہی کسر خوانچہ فروشوں کی کراری آواز نے پوری کر دی۔ صبح کی معطر فضا گاڑیوں کے دھوئیں سے آلودہ ہو رہی تھی۔ پرندے جو خالق حقیقی کی مدحا سرائی میں مگن تھے ان کی چہکاریں اس ہنگامہ خیزی میں کہیں دب کے رہ گئی تھیں۔ آہ بھر کر اس نے سوچا۔ بے چارے پرندے بھی انسانوں کی خود غرضی سے کتنے تنگ ہوں گے۔
اسکول پہنچنے تک وہ خوب بدمزا ہوئی۔ یہ تو روز کے معمول کی بات تھی۔ مگر وہ تھی کہ روز ازسر نو سلگ اٹھتی۔ وہ اسکول پہنچی تو دو اکٹھی ٹیچرز لیو پہ تھیں۔ ناچار اسے ان کے پیریڈ بھی لینے پڑے۔ موڈ جو پہلے ہی خراب تھا اور کرکرا ہو گیا۔ چھٹی کے بعد وہ کلاس سے نکل کر اسٹاف روم میں بیٹھی ہی تھی کہ اس کا موبائل رنگ کرنے لگا۔ ارقم رحمان کالنگ پڑھ کر اس کی ساری بے زاری اڑن چھو ہو گئی۔
"السلام علیکم۔" اپنی خوشی آواز کی ساری کھنکھناہٹ پس پشت ڈالتے ہوئے وہ کال ریسیو کر کے محتاط لہجہ اپنا گئی۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو۔" ہمیشہ کی طرح اس کی جھجک کو شرم پہ محمول کرتا ارقم شگفتہ لہجے میں پوچھ گیا۔
"میں بالکل ٹھیک۔ آپ نے اس وقت فون کیا، خیریت ہے۔" انابیہ نے اچنبھے سے گھڑی دیکھ کے پوچھا۔ ارقم اس وقت عموما اپنی ڈیوٹی پہ ہوتا تھا اور کال کرنا تو کجا اٹینڈ بھی نہیں کرتا تھا۔
"ہاں ایک خوشخبری سنانی تھی تمہیں۔ میری پندرہ دن بعد کی فلائٹ کنفرم ہو گئی ہے۔ پندرہ دن کے بعد میں اپنے گھر ہوں گا۔" ارقم کے لہجے میں کھنکتی خوشی تب سرد پڑ گئی جب انابیہ نے اس بات کا جواب بھی ہنکارا ابھر کے ہی دیا۔
"کیا ہوا؟ آپ کو خوشی نہیں ہو رہی۔"
کچھ لمحوں کی جان لیوا خاموشی کے بعد ارقم کی آواز میں پھنکارتے ہوئے شک کے ناگ انابیہ لیے دیے رہنے کے چکر میں محسوس ہی نہیں کر پائی۔
"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کا گھر ہے آپ واپس آ سکتے ہیں۔ یہاں میرے خوش ہونے نہ ہونے کی بات کہاں سے آ گئی۔"
ارقم کو اس کا یہ سپاٹ لہجہ پہلے سے زیادہ چبھا۔ وہ مزید کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ایئر پیس سے جاری ہونے والی کال منقطع ہونے کی ٹون اسے حیرت میں ڈال گئی۔ تب ہی سامنے سے نایاب آتی دکھائی دی۔
"ہو گئیں فری، چلو چلیں۔" عجلت میں کہتی وہ اس کا ہاتھ کھینچنے لگی تو انابیہ متحیر رہ گئی۔
"رکو تو باقی سب کو تو آنے دو۔ سب اکٹھے ہی جائیں گے نا۔" رسان سے کہتی وہ اسے روکنے کی سعی کرنے لگی۔
"اوہو باقی سب خود آتی رہیں گی انہیں ریسٹورنٹ کا راستہ آتا ہے۔ سب کے پاس کنوینس بھی ہے۔ تم تو اکیلی آتی ہو نا اس لیے تم میرے ساتھ چلو گی۔ چلو اب میری کزنز انتظار کر رہی ہوں گی۔" نایاب نے تلملاتے ہوئے تفصیل بتائی اور اسے گھسیٹتے ہوئے باہر کی جانب بڑھی۔

اس بار وہ بھی بنا کوئی احتجاج کیے اس کے پیچھے گھسٹنے لگی۔

نایاب کو لیے فائیو اسٹار ہوٹل پہنچی۔ وہ باتوں کے دوران اندر پہنچیں۔ اندر صرف ایک ٹیبل بک تھی۔ انابیہ حیران رہ گئی۔

''نایاب! یہ سب کیا ہے۔ تم نے تو کہا تھا تم نے اپنی منگنی کی خوشی میں سب کو انوائٹ کیا ہے۔ تمہاری کزنز تمہارا ویٹ کر رہی ہیں۔'' اسے جانچتی نگاہوں سے دیکھتی انابیہ کے لہجے میں ہلکی سی سرزنش تھی۔

''ہاں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میری منگنی تو ابھی ہوئی ہی نہیں۔ تم بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتی شرارت سے مسکراتی ریسپشن کی جانب بڑھی۔

انابیہ آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے میں مگن تھی جب ویٹر ان کی میز پہ کیک رکھ گیا جس پہ جلی حروف میں ''ہیپی برتھ ڈے انابیہ'' لکھا تھا۔ ویٹر کے جاتے ہی نایاب ہاتھ میں پھولوں کا بہت ہی خوب صورت بوکے تھامے اس کے سامنے رکھی کرسی قدرے اس کی جانب موڑتے ہوئے اس پہ براجمان ہوگئی۔

''اس سب کی کیا ضرورت تھی یار! اسکول میں سب نے میری سالگرہ منائی تو تھی۔ تمہیں الگ سے یہ تکلف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' فرط مسرت سے ممنون نگاہیں اس پہ جمائے انابیہ اسے ٹوک گئی۔

''منائی ہوگی مگر میں تو شامل نہیں تھی نا۔ لیو یہ تھی میں اس دن۔ اچھا چھوڑو ساری باتوں کو یہ میں تمہارے لیے لائی تھی۔ تمہارا گفٹ مجھ پہ ڈیو ہے جلد تم تک پہنچے گا۔ ابھی تم یہ رکھو۔'' وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتی سرخ گلابوں کا بوکے پیش کر رہی تھی۔

انابیہ جو پھولوں کی شروع سے دیوانی تھی۔ پھول دیکھ کے اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا تھا۔ کٹورا سی آنکھوں میں جھلکتی نمی ان میں ہیرے کی کنی سی شفاف چمک بھر لائی تھی۔

''ارے پگلی! تم نے میرے لیے اتنا کچھ کیا ہے۔ اب گفٹ کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے بھی پرخلوص لوگوں کی محبت ہی ان کا گفٹ ہوتی ہے۔''

''نہیں۔ کچھ چیزیں سامنے والے کا حق ہوتی ہیں۔ اور انہیں ہر صورت ان تک پہنچنا ہی چاہیے۔ اور میرا گفٹ تو ہے ہی ایسا جس کی تمہیں بہت ضرورت پڑنے والی ہے۔'' ذو معنی انداز میں کہتی نایاب کے لہجے پہ انابیہ ٹھٹکی تھی۔

''ہیں۔ ایسا کون سا گفٹ ہے جس کی مجھے ضرورت پڑنے والی ہے۔'' الجھ کے اسے دیکھتی انابیہ کے لہجے میں تحیر تھا۔

''بس ابھی نہیں بتا سکتی۔ سرپرائز خراب نہیں کرنا میں نے اپنا۔ چلو تم کیک کاٹو تاکہ ہم کیک سے انصاف کر سکیں۔'' کھلکھلا کے بات مکمل کرتی نایاب نے اسے تیز دھار نفیس سی چھری پکڑائی۔ کچھ دیر میں وہ لوگ کیک کاٹ چکی تھیں۔ پھر باتوں اور نایاب کی طرف سے دیے گئے پرتکلف لنچ کو انجوائے کرتے ہوئے کب وقت گزرا اسے پتا بھی نہیں چلا۔

☆☆☆

دن پر لگا کے اڑے تھے۔ ارقم رحمان پاکستان آ چکا تھا۔ اسے آئے بھی ایک ہفتہ ہو رہا تھا۔ مگر عجیب بات تھی کہ اس نے نہ کال کی تھی نہ ہی ہر بار کی طرح طاہرہ اور آفاق سے ملنے آیا۔ انابیہ خدشات سے بوجھل دل لیے دن سے رات کر دیتی۔ اس دن بھی وہ رات کے کھانے کے بعد بچوں کی کاپیاں چیک کرنے بیٹھی تو کب رات کے دو بج گئے خبر ہی نہ ہوئی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ درد اور تھکن سے اکڑتی کمر بستر پہ ٹکاتے ہی صبح کی خبر لاتی۔ مگر ذہن و دل میں اس قدر اضطراب برپا تھا کہ لیٹتے ہی بے چینی حد سے سوا ہوگئی۔ وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔ سائیڈ ٹیبل پہ پڑا موبائل ہاتھ میں لیے وہ آنگن میں نکل آئی۔

سامنے ہی سرخ چمکیلی اینٹوں جڑے چکنے فرش پہ چودھویں کے چاند کا عکس تھا۔ پورے چاند کی آدھی رات اپنی تمام فسوں خیزی سمیت کائنات پہ جلوہ گر

تھی۔ سفید دودھیا چاندنی جیسے اپنی اجارہ داری پہ نغمہ سرا تھی۔ اور کائنات کا ذرہ ذرہ جیسے اس خوب صورت احساس میں بھیگتا خود سپردگی کے عالم میں دم بخود سا رقص کناں تھا۔ کبھی کبھی چلنے والے ہوا کے دلفریب جھونکے میں کسی کے لبوں سے نکلے دھیمے سروں کی سی راگنی تھی۔ ہوا کے دوش پہ لہراتا پتا اس کے چہرے سے ٹکرا کے زمین بوس ہوا تھا۔

اس نے سر اٹھا کے دیکھا آسمان کے وسط میں پورے طمطراق سے سجا چاند گویا اسے دیکھ کے مسکرایا تھا۔ اسے شروع سے یہ منظر بہت بھاتا تھا مگر آج جیسے اس کے افسردہ دل میں خوشی کی کوئی کونپل نہ کھلی۔ اس کے ساکت ہونٹوں پہ ہنسی کی کوئی کلی نا چٹخی۔ اس نے گھبرا کے دل میں جھانکا جہاں کسی کا انتظار دل میں درد کے پنجے گاڑے یوں پیوست تھا گویا آج روح میں اتر جائے گا۔

وہ گھبرا کے صحن میں بچھے تخت پہ بیٹھ گئی۔ جھجکتے ہوئے موبائل سے ارقم کا نمبر نکالا اور ڈائل کیے بنا پیچھے کر دیا۔ پچھلے ایک ہفتے سے یہ ہی تو ہو رہا تھا۔ وہ دل پہ لکھا نمبر نکالتی پھر ڈائل کرنے کی ہمت خود میں نا پا کے موبائل واپس رکھ دیتی۔

کوئی دسویں کوشش کے بعد اس نے وہ مانوس نمبر ملا ہی لیا تھا۔ یوں کہ موبائل کان سے لگا تھا اور آنکھیں سختی سے بند تھیں۔ مگر کان اس نرم لہجے سے محروم ہی رہے یہاں تک کہ گھنٹی بج بج کے ساکت ہو گئی۔ پھر اس نے وہ نمبر دیوانوں کی طرح بار بار ملایا مگر پانچ دس بار رنگ کرنے کے بعد اب آف جا رہا تھا۔ کوئی بے یقینی سی بے یقینی تھی کہ وہ بند نمبر کو بھی ملاتی جا رہی تھی۔ دفعتاً اسے احساس ہوا اس کے گال بھیگ رہے تھے۔ اس نے دائیں ہاتھ کی پوریں چہرے پہ پھیریں تو حیران رہ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔

"اب کیوں رو رہی ہو تمہاری خود ساختہ انا اور اصولوں کی وجہ سے ہی تو یہ دن دیکھنا پڑا تمہیں۔" دل نے یک لخت اسے خود احتسابی کے حصار میں دھکیلا۔

یک لخت وہ اٹھ کے ٹہلنے لگی۔ رات کی خوب صورتی اور لطافت یکا یک کہیں جا سوئی تھی۔ ماحول پہ اداس رت چھائی تھی۔ نا جانے کیوں مگر فضا میں نوحوں کی اداسی رچی تھی۔ سبز پتوں نے جیسے ساکت ہو کے اس کے بے چینیوں میں ڈوبے وجود کو دیکھا تھا۔

فضا میں تہجد کی اذان گونجی تھی۔ اندیشوں سے بلبلاتے دل کو جیسے روزن ملا۔ وہ سرعت سے اٹھی اور وضو کر کے نماز ادا کی پھر سارے آنسو رب کے حضور بہا کے ہلکی پھلکی ہو گئی۔

☆☆☆

اگلا دن چھٹی کا تھا۔ سارے ہفتے کے رکے ہوئے کام نبٹاتے کب سہ پہر ہو گئی پتا ہی نہیں چلا۔ دوپہر کے کھانے کے برتن دھو کے اس نے چائے بنانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ دروازہ بج اٹھا۔

"ارے اقدس! تم۔ بڑے دن بعد چکر لگایا۔ آ گئی یاد باجی کی۔" اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ارقم سے چھوٹا اقدس بڑا سا سیاہ بیگ تھامے کھڑا تھا۔ اسے سرزنش کرتی وہ اسے لاؤنج میں لے آئی جہاں آفاق ٹی وی دیکھ رہے تھے جبکہ طاہرہ مختلف سبزیوں سے نبرد آزما تھیں۔

"بس اپیا! کیا بتاؤں کہ آج بھی کس وجہ سے آیا ہوں۔" اقدس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اس نے ٹھٹک کے لاؤنج میں داخل ہوتے اقدس کو حیرت سے دیکھا تھا۔

"ارے۔ اقدس بیٹا آیا ہے۔ آؤ آؤ بیٹا۔ بیٹھو، تمہارا فیورٹ کرکٹ میچ آ رہا ہے۔ چلو دونوں مل کے دیکھتے ہیں۔ ساتھ تمہاری اپیا کے ہاتھ کی چائے ہو گی سمجھو موجیں ہی موجیں۔" اقدس کو اٹھ کے تپاک سے گلے لگاتے آفاق نے خوش دلی سے کہہ کے اقدس کو ساتھ ہی بٹھا لیا۔ انابیہ مسکراتی ہوئی کچن میں چائے بنانے چل دی۔

"بھابھی کو لے آتے ساتھ۔ اور یہ کیا اتنا بڑا بیگ کیا پھر بھابھی نے کچھ کہہ دیا ہے۔" اقدس کے

پیروں کے پاس پڑے بیگ کو دیکھ کے خوشگوار لہجے میں طاہرہ پوچھنے لگیں۔ اقدس اکثر گھر سے ناراض ہو کے آ جاتا اور یہ بھی خوب مہمانداری کرتے اور اس کی لایعنی شکایتیں سن کے مسکراتے رہتے۔

"نہیں۔ تائی امی! اس بار بات اس سے بھی زیادہ سنگین لگ رہی ہے۔ مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا میں آپ سب کو کیسے بتاؤں۔" اقدس کے افسردہ لہجے میں ان کہا دکھ تھا۔ طاہرہ پریشان ہو اٹھیں۔

"اقدس بیٹا! بتاؤ کیا بات ہے۔ میرا دل بیٹھ رہا ہے۔" سبزی چھوڑ چھاڑ کے طاہرہ مضطرب لہجے میں استفسار کر رہی تھیں۔ جبکہ آفاق بھی ٹی وی بند کر کے اقدس کی طرف متوجہ تھے۔

"امی نے مجھے یہ منگنی کا سامان واپس کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ آپ لوگ آج سے یہ رشتہ ختم سمجھیں۔" مختصر مگر دوٹوک انداز میں بتاتا وہ بنا کسی سے نظر ملائے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ آفاق اور طاہرہ کے ہوائیاں اڑتے چہرے پہ نظر ڈالنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ کچن میں ابلتی چائے کو دھندلی آنکھوں سے دیکھتی انابیہ کا دل گویا دھڑکنا بھول گیا۔

"مگر ہوا کیا ہے، یہ تو بتا دو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی ہفتہ پہلے ہی تو بھابھی کا فون آیا تھا کہ وہ شادی کی تاریخ رکھنے آئیں گی جلد۔" طاہرہ کے جیسے کلیجے پہ ہاتھ پڑا تھا۔ وہ بے اختیار اٹھ کے اقدس کا بازو تھام گئیں۔ سارا خاندان اس منگنی سے واقف تھا۔ اب یکلخت رشتہ ٹوٹ جانے پہ جو باتیں بنی تھیں وہ ناقابل برداشت تھیں۔

"میں کچھ نہیں جانتا تائی امی! مجھے کوئی کچھ بتا ہی نہیں رہا۔ بس گھر میں اتنی ویرانی اور خاموشی ہے جیسے کوئی مرگ ہو گئی ہو۔ کوئی بہت بڑی بات ہوئی ہے۔ ارقم بھائی جب سے آئے ہیں ان کی ایک ہی ضد ہے وہ یہ رشتہ نہیں رکھنا چاہتے۔ ابو نے چچا کو آنے کا کہا ہے تاکہ سب بڑے مل کے ارقم بھائی کا موقف جان سکیں۔"

اقدس کے لہجے میں گہری یاسیت تھی جس کے سائے آفاق اور طاہرہ کے چہرے پہ پھیلتے چلے گئے۔

ادھر اقدس نے گھر سے قدم نکالے ادھر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے پہ ڈولتی انابیہ کے توازن برقرار رکھنے کی غرض سے پھیلے ہاتھ چائے والی چھوٹی سی پتیلی پہ لگے اور ابلتی ہوئی گرم چائے کی پتیلی الٹ کے انابیہ کے پیروں پہ گری۔ اس کے ہونٹوں سے سسکی تک نہ نکلی۔ شاید وہ جس اذیت سے گزر چکی تھی یہ نئی اذیت اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ شیلف سے ٹیک لگائے بیٹھتی چلی گئی۔ جبکہ چھناکے پہ اندر آتے طاہرہ اور آفاق انابیہ کی حالت پہ دق سے رہ گئے۔ بلند آواز میں روتی طاہرہ دیوانہ وار انابیہ کی طرف بھاگی تھیں۔ جو دونوں ہاتھ پہلو میں گرائے یوں بیٹھی تھی جیسے کوئی خبطی ہو۔

☆☆☆

دوسرے دن آفاق صاحب ارقم کے گھر گئے تو ان کے بے حد اصرار پہ جو وجہ ارقم نے بیان کی وہ سن کے آفاق تو آفاق رحمان صاحب بھی ششدر رہ گئے۔ انابیہ ان کے سامنے پل کے بڑی ہوئی تھی وہ کیسے مان لیتے کہ ان کی بھتیجی کے کردار میں کوئی جھول ہو سکتا ہے۔

جبکہ آفاق کی حالت یک لخت دگرگوں ہوئی تھی۔ انہیں رشتہ ختم ہونے کا سن کے اتنا دکھ نہیں ہوا تھا جتنا اس بے بنیاد الزام کو سن کے ہوا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ رشتے کے ٹوٹنے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی تھی۔ وہ بحیثیت ایک باپ بھی اپنی بیٹی پہ شک نہیں کر سکتے تھے جبکہ وہ کل سے انابیہ کی حالت بھی دیکھ رہے تھے۔ وہ مزید ایک لفظ بھی بولے بنا اپنی جگہ سے اٹھے تھے کہ صدمے سے کانپتے ہوئے بری طرح لڑکھڑائے ساتھ ہی بیٹھے رحمٰن صاحب نے سرعت سے اٹھ کے انہیں سہارا دیا اور اپنے ساتھ صوفے پہ بٹھا لیا۔

ارقم کے چہرے پہ ان کی بگڑتی حالت نے ایک پل کے لیے بے چینیاں بوئی تھیں پھر از لی بے

حسی غالب آگئی۔
"رحمن! مجھے کئی لوگوں نے خبردار کیا کہ ارقم یونہی شادی سے اجتناب نہیں برت رہا یہ اس رشتے پہ آمادہ ہی نہیں جبھی کیریر بنانے کے جھوٹے دلاسے دے کر ٹال رہا ہے۔ مگر میں نے کسی کی بات کو سننے سے زیادہ اپنے خون پہ بھروسا کیا اس کی بات کو فوقیت دی۔ کیا خبر تھی کہ ایک دن اس نام نہاد رشتے کا اختتام یوں جھوٹے الزام کی بنیاد پہ ہوگا۔"
چھلکتی ہوئی ملامت بھری نگاہ ارقم پہ ڈالتے ہوئے وہ چھوٹے بھائی سے مخاطب تھے۔ رحمن کے ماتھے پہ یکلخت عرق ندامت کے قطرے چمکے۔
"مجھے معاف کیجیے گا تایا جان! مگر ہم بعض دفعہ حالات کو جذبات کی عینک پہن کے پرکھ رہے ہوتے ہیں تب ہی سچائی تک نہیں پہنچ پاتے۔ اور یہ رشتہ یہیں ختم ہو جائے اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔ جب یہ اس رشتے پہ آمادہ ہی نہیں تو زبردستی یہ رشتہ جوڑ بھی لیا جائے تو اس کا اختتام ذلت اور رسوائی ہی ہوگا۔ پھر کیوں نا ابھی اسے عزت سے ختم کر دیا جائے۔" ارقم رحمان اب اپنی جگہ سے اٹھ کے آفاق کے سامنے کارپٹ پہ دوزانوں بیٹھا کہہ رہا تھا۔
"تمہیں اگر انابیہ سے بہتر کوئی مل گئی تھی تو ویسے کہہ دیتے میری بیٹی پہ اتنا گھناؤنا الزام لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ تمہیں نہیں پتا کہ بیٹیوں کے معاملات کتنے نازک ہوتے ہیں۔ لڑکی کا کردار اوس کے پہلے قطرے کی مانند نازک اور شفاف ہوتا ہے جس پہ پڑنے والا الزام کا ایک سیاہ چھینٹا بھی اس کی ساری حیات داغدار کر سکتا ہے۔ ارقم رحمان مجھے مر کے بھی تم سے یہ امید نہیں تھی۔ اگر آج یہ رشتہ ختم ہوگا تو اس کے ساتھ باقی سب رشتے بھی اپنی موت آپ مر جائیں گے۔" آفاق کے چہرے پہ پسپائی اور بے بسی عود کے آئی تھی۔
ارقم نے بے بسی سے خاموش بیٹھے رحمان صاحب کی طرف دیکھا جنہوں نے فوراً ہی منہ پھیر کے ناراضی کا اظہار کیا۔ ارقم نے دونوں مٹھیوں میں اپنے سر کے بال تھام کے گویا نوچ ہی ڈالے۔
"یاد رکھنا ارقم! اگر تمہاری وجہ سے میرے بھائی نے مجھے چھوڑا تو معاف میں تمہیں بھی نہیں کروں گا۔ اور نافرمان بیٹا میری میت کو بھی کاندھا دے مجھے منظور نہیں۔" رحمان کے منہ سے نکلے الفاظ گویا جلتے ہوئے انگارے تھے جو ارقم رحمان کی روح تک کو جھلسا گئے۔
"تایا جان! میں کوئی بچہ نہیں ہوں جو کسی بے بنیاد بات پہ برسوں کا رشتہ توڑ دوں۔ پختہ ثبوت ہیں میرے پاس مگر میں چاہتا تھا کہ خاندان کی لڑکی کا بھرم قائم رہے۔ لیکن اب جبکہ بات خونی رشتوں کے ٹوٹنے پہ آگئی ہے تو تمام حقیقت کھولنا میرے لیے ناگزیر ہو گیا ہے۔ یہ تصویریں دیکھیے کیا انہیں دیکھنے کے بعد بھی آپ مجھے ہی قصوروار ٹھہرائیں گے۔"
اپنی جگہ پہ واپس بیٹھتے ہوئے ارقم نے جیب سے موبائل نکال کے گیلری اوپن کی اور کچھ تصاویر نکال کے آفاق صاحب کے سامنے کیں۔
آفاق صاحب نے لرزتے ہاتھوں سے موبائل تھاما۔
وہ کسی ریسٹورنٹ کا منظر تھا جس کے سجے سجائے ٹیبل کے پاس رکھی کرسی پہ نک سک سے تیار وہ لڑکی بلاشبہ انابیہ ہی تھی۔ مگر اس کی مدمقابل کرسی پہ براجمان انابیہ کو بوکے پیش کرتا کیمل کلر کی شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس خوش شکل سا نوجوان اجنبی تھا۔ آفاق صاحب کی بے یقین نگاہیں بوکے وصول کرتی خوشی کے احساس سے مغلوب بیٹی کے چہرے پہ پیوست تھیں۔ یہ ان کی بیٹی تھی جس کی ہنسی اس کی آنکھوں میں ہیروں کی کنی سی چمک بھر دیتی تھی۔ آج ناجانے کیا ہوا تھا کہ یہ مسکراہٹ ان کے دل پہ انگاروں کی سی جلن چھوڑ رہی تھی۔ انہوں نے بے اختیار اذیت سے آنکھیں موندھی تھیں۔ اگلی دو تصاویر بھی مختلف اینگل سے اسی منظر کو پیش کر رہی تھیں۔
"اب یقین آیا آپ لوگوں کو۔ میں کوئی پاگل تو

نہیں کہ بچپن کا رشتہ بے وجہ توڑ دوں۔ یقین جانیں تایا ابا! میں بھی تصویریں دیکھ کے شاکڈ تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے خاندان کی لڑکی ہماری ہی ناک کے نیچے ہماری عزت کا تماشا بنائے اور ہمیں خبر ہی نہ ہو پائے۔ معاف کیجیے گا مگر آپ کی تربیت میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور رہ گئی ہے۔"

آفاق صاحب کے رنگ بدلتے چہرے سے بے نیاز انہیں ان کی کوتاہی کا احساس دلاتا جیسے ہی ان کی طرف متوجہ ہوا، چونک گیا۔ آفاق کی رنگت غیر معمولی پھیکی پڑ رہی تھی۔ وہ سرعت سے اٹھ کے چھوٹے سے کارنر ٹیبل پہ رکھے گلاس میں پانی انڈیلتا ان کے لبوں کو لگا گیا۔ کچھ دیر میں ہی ان کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔

"ارے بھائی! آپ یہاں ہیں میں آپ کو سارے گھر میں ڈھونڈ آیا۔ آج صنوبر اپیا نے بلایا تھا اپنے گھر بھول گئے آپ۔" دھاڑ سے دروازہ کھول کے اندر آتے اقدس کی شتر بے مہار چلتی زبان پہ ارقم کا ماتھا شکنوں سے اٹا تھا۔

"اقدس! نظر نہیں آ رہا یہاں سب بڑے بات کر رہے ہیں۔ کیا افتاد آ پڑی کہ تم یوں مخبوط الحواس ہو رہے ہو۔ کل چلے جائیں گے وہاں ابھی جاؤ تم۔"

ارقم نے اپنے اندر کی ساری کھولن اقدس پہ ہی نکال دی۔ جو عزت افزائی پہ قدرے سہم کے مڑنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر ٹیبل پہ پڑے موبائل کی اسکرین پہ ظاہر ہوتے منظر پہ جم گئی۔ وہ فوراً آگے بڑھ کے موبائل تھام کے بغور دیکھنے لگا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کی آنکھوں کی پتلیاں پہچان کے سب رنگوں سے بھری تھیں۔ کئی دنوں سے الجھتا دماغ جیسے یکلخت سارے سرے پا گیا تھا۔

"اچھا تو یہ وجہ تھی منگنی توڑنے کی۔ مگر بھائی کیا شک اور مفروضے کی بنیاد پہ زندگیوں کے فیصلے کرنا دانش مندی ہے۔" وہ مستحکم مگر سوالیہ لہجے میں موبائل تھامے ارقم کے سامنے کھڑا تھا۔

"آنکھوں دیکھا جھوٹ نہیں ہوتا بچے۔ اور زندگی اتنی بھی ارزاں نہیں ہوتی کہ اسے خاندان کی عزت اور جھوٹی انا کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔" ارقم اب کے دھیمے شگفتگی سے پر مگر سرد لہجے میں اپنے تئیں اقدس کو لاجواب کر گیا تھا۔

"بھائی! مجھے یقین ہے کہ یہ پکچرز ایڈیٹ کی گئی ہیں۔ کیونکہ میں اس لڑکے کو پہچان گیا ہوں۔ کچھ گلیاں دور ہی تو اس کا فوٹو شاپ ہے۔ میں ایک بار دوست کے ساتھ گیا تھا۔ مانیں نہ مانیں کچھ ایسا ہے جو بہت غلط ہے۔ میری مانیں تو ابھی چلیں پتا لگ جائے گا اصل معاملہ کیا ہے۔"

اقدس کی بات پہ رحمان صاحب اور فائق اچنبھے سے اسے دیکھنے لگے۔ جبکہ ارقم کے ہونٹوں پہ طنزیہ مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

"دل بہلانے کو یہ خیال اچھا ہے غالب۔ بالفرض یہ سب سچ ہوا تو اس لڑکے کے سامنے بھی ذلیل ہوں گے ہم، یہ ہی چاہتے ہو تم۔ کیوں انا بیہ کو اس کی زندگی اس کی مرضی سے نہیں جینے دیتے۔" ارقم اس وقت بدگمانی کی انتہا پہ تھا۔ بولا تو گویا زہر ہی اگل بیٹھا۔

اقدس نے ملامت بھری نظر بھائی کے روٹھے چہرے پہ ڈالی۔

"تم کوئی جائے یا نہ جائے میں تو ضرور جاؤں گا۔ پتا تو چلے کہ معاملہ ہے کیا جو بات خاندان کی عزت تک آ پہنچی ہے۔ تایا ابو، ابو آپ آئیں میرے ساتھ۔" اقدس انہیں اشارہ کرتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرہ چھوڑ گیا۔

رحمان اور فائق نے بھی اس کی تقلید کی تو ناچار ارقم بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔ وہ جب مطلوبہ شاپ پہ پہنچے تو کوئی رش نہیں تھا۔ سوئے اتفاق وہ لڑکا بھی موجود تھا۔ ارقم اور اقدس نے چھوٹتے ہی اسے گھونسوں اور لاتوں پہ رکھ لیا۔ رحمان صاحب نے اندر کی طرف سے شاپ کا دروازہ بند کر دیا۔

ارقم نے مغلظات بکتے ہوئے ساری بات اسے گھونسوں کے وار کر کے سمجھائی تو لڑکا جو ان

دونوں کے بدترین تشدد کے آگے مزاحمت بھی نہیں کر پا رہا تھا یکلخت ان کے قدموں میں گرا۔

''مجھے معاف کر دیں آپ لوگ۔ یقین جانیں میں نے جب سے یہ جھوٹی تصاویر ایڈیٹ کی ہیں میں خود بھی چین سے نہیں ہوں۔ مگر میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے یہ کرنے کے لیے میری منگیتر سحر نے کہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ لڑکی کسی اور کو پسند کرتی ہے سو زبردستی کی شادی رکوانے کے لیے یہ کرنا لازمی ہے۔ میں نے اسے لاکھ سمجھایا مگر وہ بضد تھی کہ دوست کی زندگی ہر صورت بچانی ہے۔'' ہاتھ جوڑ کے گڑگڑاتے ہوئے تیمور نے ساری بات من وعن انہیں بتا دی۔

''بتا، یہ سحر کون ہے۔ کس نے دشمنی نکالی ہمارے گھر کی لڑکی سے۔ بتا کون ہے کہاں رہتی ہے یہ سحر ورنہ جان لے لوں گا تیری۔'' اقدس نے تیمور کے نیل زدہ زخموں سے پُر چہرے پہ ایک گھونسا اور جڑتے پوچھا۔

''تو لے لو میری جان۔ میری یہ ہی سزا ہے میں نے انجانے میں بہتان لگایا ہے کسی نیک سیرت پہ۔ مگر اپنے خاندان کی لڑکی کا ذکر میں بھی زبان پہ نہیں لاؤں گا چاہے میری جان چلی جائے۔'' دوٹوک لہجے میں کہتے تیمور آنکھوں میں سرکشی تھی۔

''تو آج جائے گا ہی تو جان سے۔'' عالم جنون میں کہتے ارقم نے تیمور کا گلا گھونٹنا چاہا تو رحمان صاحب فوراً بیچ میں آئے۔

''بس کر دو ارقم! ہماری بچی کی کوئی غلطی نہیں یہ ثابت ہو گیا ہمارے لیے بس اتنا کافی ہے۔ چلو تم گھر اب۔'' ارقم کو پیچھے دھکیلتے رحمان نے کہا تو اقدس بول پڑا۔

''ایسے کیسے بابا! پولیس بلوائیں اسے پولیس کے حوالے کریں۔ اسے سحر کا ایڈریس کیا اس کی نانی دادی سب یاد آ جائیں گی۔ ایسے طوطے کیسے طرح اگلے گا یہ۔'' اقدس نے چٹکی بجاتے ہوئے جھلتی نگاہ زمین پہ کراہتے تیمور پہ ڈال کے کہا۔

''تب ارے بابا! ٹھیک کہہ رہے ہیں اقدس! معاملہ بیٹی کی عزت کا ہے پھر بات جتنی اچھلے گی ہماری اتنی ہی بدنامی ہو گی۔ خدا پہ چھوڑ دو میری جان بس چلو یہاں سے۔'' کب سے خاموش کھڑے آفاق اقدس کا ہاتھ تھامے شاپ سے نکل گئے باقی سب نے بھی ان کی تقلید کی۔

ارقم اب شرمندہ تھا۔ پتا نہیں بعض دفعہ انسان اپنے ہی دماغ کی تراشیدہ دلیلوں کی انگلی تھامے یقین کے آسمان پہ کیوں جا پہنچتا ہے۔ پھر ان ہی کو کل جان کے باقی ہر دلیل رد کرتا جاتا ہے۔ آنکھ تب کھلتی ہے جب یقین کے آسمان سے یکلخت گماں کی زمین پہ پٹخا جاتا ہے۔ اور باقی پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں بچتا۔

☆☆☆

آج کا دن ہی عجیب تھا گھٹن زدہ سا۔ پچھلے صحن میں کھلتی کھڑکی کا منظر انابیہ کے سامنے واضح تھا۔ آسمان بادلوں سے اٹا پڑا تھا پھر بھی جیسے کائنات کسی نادیدہ شکنجے میں جکڑی محسوس ہوتی تھی۔

آسمان پہ اڑتے پرندے بھی پیاس سے نڈھال ہو کر چونچیں کھولے زمین کی طرف پرواز کرتے اور چھتی منڈیروں پہ پانی کی تلاش میں پھدکتے۔ طاہرہ بیگم کی عادت تھی منڈیر پہ مٹی کے پیالے میں پانی رکھتی تھیں۔ جو گرمی کی وجہ سے منٹوں میں کھولنے لگتا تھا۔ مگر طاہرہ گرم پانی گرا کے ٹھنڈا پانی رکھتی رہتی تھیں۔ آج وہ کٹورا خالی تھا اور چڑیا کی تڑپ دیدنی۔

انابیہ کا پیر اب قدرے بہتر تھا مگر دوا کے زیر اثر ہلکی غنودگی میں مدغم ذہن کبھی لاؤنج میں بیٹھی متفکر سی طاہرہ کو دیکھ کے الجھتا کبھی چڑیا کی تڑپ پہ جھنجھنا اٹھتا۔ ان کا گھر کچھ اس طرز پہ بنا ہوا تھا کہ گھر کے عین وسط میں ایک بڑا سا ہال تھا جو بیک وقت سٹنگ روم ٹی وی لاؤنج کے طور پہ استعمال ہوتا تھا۔ سب کمروں کے دروازے لاؤنج میں ہی کھلتے تھے۔ جبکہ گھر کے آگے اور پیچھے چھوڑے گئے صحن میں خوب سبزہ اور ایک دو درخت تھے۔

اس کی آنکھ نادیدہ شور سے کھلی تھی۔ جانے

کتنے گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب دوا کا اثر ختم تھا اور اس کا ذہن ہلکا پھلکا۔ باہر موسم یکلخت بدلا تھا۔ ہوا کی تال پہ ناچتے پتوں کی سرسراہٹ میں عجیب سا ردھم تھا۔ گرمی سے بلبلاتی چڑیا بھی جانے کہاں کی پرواز میں مگن تھی۔ ہوا میں گھلی گرد اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔

"اٹھ گئیں بیہ تم۔ تمہارے لیے کچھ لاؤں کھانے کے لیے۔" اسے سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے طاہرہ نے پوچھا تو اس نے سر نفی میں ہلا کے انکار کیا۔

"نہیں امی! یہ کب کھانے کا ٹائم ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔ جب مجھے بھوک ہوگی کہہ دوں گی۔"

اس کے چہرے پہ جھلکتے اطمنان کو دیکھتے وہ افسردہ سی کمرے سے نکل گئیں۔ وہ جانتی تھیں یہ طوفان کے بعد کا سکون تھا۔ انہوں نے کہیں پڑھا تھا کہ درد جب حد سے بڑھتا ہے تو سکون میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ بھی رات اتنا روئی تھی کہ آنسو اب بہنے سے انکاری تھے۔

"ایک تو فائق صاحب بھی کبھی نہیں سدھر سکتے۔ صبح سے رحمان کی طرف گئے ہیں اب تک نہیں پلٹے ہیں۔ نہ ہی فون کر کے واپسی کا وقت بتایا ہے۔" وہ اب لاؤنج میں جلے پاؤں کی بلی کی مانند ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہی تھیں۔

انابیہ نے پھر سے بے تاثر نگاہیں کھڑکی سے باہر جما دیں۔ جہاں ہوا نجانے اب کس بات پہ ناراض سی درختوں کو اکھاڑنے کے درپے تھی۔ پرندے بھی سہم کے نجانے کہاں چھپ گئے تھے۔
فضا میں گھلی گرد گویا کائنات پہ چھا سی گئی تھی۔ سرکش ہوا نے سارے جہان کا گند ایک ہی بگولے میں لا کے ان کے صحن میں پٹخا تھا۔ شکر تھا کہ ہوا کا رخ اس کے کمرے کی طرف نہیں تھا ورنہ منٹوں میں کمرہ مٹی سے اٹ جاتا۔

اسے شروع سے آندھی سے خوف آتا تھا۔ اس نے کھڑکی سے نظر آتے منظر سے آنکھیں چرائیں اور ابھی آنکھیں موندھی ہی تھیں کہ ہوا سے بجتے دروازے کی زوردار دستک پہ دہل کے اٹھ بیٹھی۔ جبکہ طاہرہ بڑبڑاتی ہوئی مین دروازے کی طرف بڑھیں۔

"دستک بھی کتنی عجیب چیز ہوتی ہے نا۔ کون جانے اس کے پیچھے چھپا پیغام دل کو خوشی سے بھر دے گا یا غم کی صورت روح تک میں پنجے گاڑ کے دل و دماغ کو مفلوج کر کے رکھ دے گا۔" انابیہ کانپتے دل سے سوچ کے رہ گئی۔ اذیتوں کے در پھر اس پہ کھلے تھے۔

"ایک کال تو کر دیتے پتا بھی ہے میں پریشان ہو جاتی ہوں۔ ایک انابیہ کی پریشانی اس پہ یہ طوفانی موسم پھر آپ بھی غائب۔ کہاں پتا کروں کیا کروں آپ کو فکر ہی نہیں حد ہے لاپروائی کی۔" لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے طاہرہ زہرخند لہجے میں آفاق پہ برس ہی پڑیں۔

جبکہ صوفہ پہ براجمان ہوتے آفاق کھل کے مسکرائے تھے۔ پھر پرجوش انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کے مٹھائی کے ڈبے میں سے برفی نکال کے طاہرہ کے منہ میں ڈالتے گویا ہوئے۔

"اہلیہ! آج تمہاری کوئی بات بری نہیں لگ رہی۔ بس منہ میٹھا کرو اور جا کر شکرانے کے نفل ادا کرو۔ خدا نے ہم پہ بڑا کرم کیا ہماری بیٹی پہ لگے بہتان کو غلط ثابت کر دیا۔ بھائی صاحب اور بھابھی بہت جلد آئیں گی ارقم اور انابیہ کی شادی کی تاریخ لینے۔" سارا قصہ من و عن سناتے ہوئے آفاق کے چہرے پہ گویا دنیا جہان کی سرشاری تھی۔

انابیہ کے چہرے پہ ناگواری سی پھیل گئی۔ جو شخص بچپن سے اسے جانتے ہوئے بھی بے بنیاد شک پہ برسوں کا رشتہ بنا سوچے سمجھے ختم کر دے وہ اس کے ساتھ کے قابل ہی کب تھا۔ دل کے مکیں جب روح میں چھید ڈالنے لگیں تو اپنی حیثیت کھو دیتے ہیں۔

"الٰہی تیرا شکر ہے تو نے دلوں سے بدگمانی کی

دھند ہٹادی۔ اس کرم پہ تو واقعی سجدہ شکر لازم ہے۔ پر سمجھ میں نہیں آتا وہ لڑکی تھی کون اور اس کی ہماری بچی سے کیا دشمنی تھی جو اس مردود نے میری بچی پہ اتنا گھناؤنا الزام لگایا۔" طاہرہ نے آفاق صاحب کے مقابل کاؤچ پہ ٹکتے ہوئے پوچھا۔

انابیہ نے اذیت سے کراہ کے آنکھیں موند لیں۔ دو آنسو پلکوں کی باڑ پھلانگتے اس کے کملائے ہوئے زرد چہرے پہ پھیلتے چلے گئے۔ اسے اس انجان لڑکی سے گلہ نہیں تھا اسے تو اپنوں سے شکایت تھی جن کے سامنے اس کی زندگی گزری تھی۔

"کوئی سحر نام کی لڑکی ہے کہاں رہتی ہے یہ نہیں پتا لگ سکا۔ حالانکہ ارقم اور اقدس اس لڑکے کو ادھ مرا چھوڑ کے آئے ہیں۔ مگر آفرین ہے اس لڑکے تیمور پہ کہتا رہا جان سے مار دو پر خاندان کی لڑکی کا تماشا نہیں بنانے دوں گا۔" آفاق کے لہجے میں تیمور کے لیے ستائش تھی۔

طاہرہ ازسرنو خدا کا شکر ادا کرنے لگیں جبکہ انابیہ کے ذہن میں جیسے جھماکا ہوا۔

"خدا اس منحوس لڑکی کو غارت کرے جس نے ہماری بیٹی کا برا چاہا۔ خدا کرے اسے بھی کبھی خوشی کا ایک لمحہ نصیب نہ ہو۔" طاہرہ آبدیدہ لہجے میں دامن پھیلائے اب ان دیکھی لڑکی کو بددعائیں دینے میں مگن تھیں۔

"نہیں بھلی لوک! بیٹیوں والے کبھی کسی کی بیٹی کا برا نصیب نہیں مانگتے۔ بس سجدہ شکر ادا کرو خدا نے ہماری تربیت کو سرخرو کیا۔" انہیں ٹوکتے آفاق اذان عصر پہ لبیک کہتے اٹھ کے باہر کی طرف چل دیئے۔

طاہرہ بھی دل سے توبہ کرتے اپنے کمرے میں نماز کے لیے چل دیں۔

☆☆☆

اودے اور کالے بادلوں سے اٹا آسمان چھاج بھر بھر کر مینہ برسا رہا تھا۔ بارش میں بھیگی چڑیا جیسے ہی درخت کی شاخ پہ بیٹھ کر پتوں میں چھپنے کی کوشش کرتی، ہوا کا تیز جھونکا شاخ کو بری طرح جھنجوڑ کے رکھ دیتا۔ تب ہی چڑیا نے متوحش ہو کر لمبی پرواز بھری اور اڑ کر برآمدے کے ستون پہ آبیٹھی۔

انابیہ کا پاؤں اب بالکل ٹھیک تھا۔ پھر بھی وہ اسکول نہیں گئی۔ ابھی بھی وہ کافی دیر سے برآمدے کی دہلیز پہ کرسی ڈالے پاؤں صحن میں برستی تیز بارش میں رکھے بیٹھی تھی۔ تیز ہوا کے جھونکے سے بارش کی پھوار اس کے بند آنکھوں سے لڑیوں کی صورت بہتے آنسوؤں کا بھرم رکھ رہی تھی۔ تب ہی دفعتاً اس کے ہاتھ میں تھما موبائل بجا تھا۔ ایک ہفتے کے اندر یہ کوئی اک ہزارویں کال تھی۔ موبائل کی رنگ بج بج کے خاموش ہو چکی تھی مگر اس نے حسب سابق ریسیو نہیں کی۔

کچن میں چائے کے ساتھ پکوڑے بناتی طاہرہ کئی بار آ کے اسے دیکھ چکی تھیں۔ مگر ٹوکنے کی ہمت خود میں نہیں پاتی تھیں۔ آفاق صاحب کے واپس آنے میں ابھی ٹائم تھا۔ بارش کم ہوتے ہوتے آخر رک گئی تھی۔ انابیہ نے سارے صحن میں وائپر لگا دیا۔ انابیہ ابھی وائپر رکھ کے بیٹھی ہی تھی کہ دفعتاً دروازہ ہلکی دستک کے بعد کھلتا چلا گیا۔ اور کھلے دروازے سے صنوبر اور نگینہ چچی اندر آتی دکھائی دیں۔ وہ پرتپاک انداز میں پہلے کی طرح ان سے ملی تھی۔

"ماشاء اللہ اب تو میری بیٹی کی طبیعت بالکل ٹھیک لگ رہی ہے۔" نگینہ انابیہ کو محبت سے ساتھ لگائے لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ طاہرہ بھی دوپٹے سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے لاؤنج میں آ کے ان سے محبت سے ملیں۔

"چچی! آپ کیسی ہیں۔ آپ تو بالکل چکر نہیں لگاتیں ہماری طرف۔ چلیں کتنے دن...... بہت جلد ہم آپ کی قیمتی چیز چرا کے لے جائیں گے۔ پھر تو آیا کریں گی نا آپ۔" پرجوش لہجے میں کہتی صنوبر برقعہ اتار کے صوفے کی سائیڈ پہ رکھنے لگی۔ جبکہ نگینہ مسکراتے ہوئے ساتھ والی چیئر پہ ٹک گئیں۔

"ارے کیا کروں بیٹا! یہ گھٹنوں کے درد نے تو

میری جان ہی لے لی ہے۔ میں جلد لگاؤں گی چکر ابھی تو میں پکوڑے بنا رہی ہوں تم اچھے وقت پہ آئی ہو۔ تم بیٹھو میں لاتی ہوں۔'' طاہرہ کن انکھیوں سے انابیہ کو دیکھتے ہوئے کچن میں چلی گئیں۔

انابیہ پچھلے کئی دن سے بارہا اس رشتے سے انکار کر چکی تھی۔ انہیں ڈر تھا کہ وہ ان لوگوں کے سامنے کچھ ایسا ویسا نہ کہہ دے۔

''انابیہ بیٹا! اگر اب تم بہتر ہو تو ہمارے ساتھ کل مارکیٹ چلو۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ اپنی بہو کے لیے پوری مارکیٹ خرید لوں۔ ارقم کی چھٹی میں اب صرف ڈیڑھ ماہ باقی ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں اسی دوران شادی کر دیں۔ تا کہ وہ واپس جاتے ہی تمہارے ویزے کے لیے اپلائی کر دے۔'' رسان سے کہتے ہوئے نگینہ نے دانستہ بات کا آغاز سرسری انداز میں کیا تھا۔ ورنہ طاہرہ ان تک انابیہ کا انکار پہنچا چکی تھیں۔

''چچی! آپ اپنی بہو کے لیے جو چاہیں شاپنگ کریں۔ جیسی چاہیں تیاری کریں مگر کچھ بھی تیاری کرنے سے پہلے لڑکی ضرور ڈھونڈ لیں۔ کیونکہ میں اب اس رشتے پہ خود کو منا نہیں پا رہی۔ آپ میری طرف سے انکار سمجھیں۔'' دوٹوک لہجے اور واضح انداز میں بات کرتی وہ سپاٹ چہرے سے اپنا موقف بیان کر گئی۔

''مگر بیٹا! میں نے تو ہمیشہ تمہیں ہی اپنی بہو کے طور پہ سوچا ہے۔ اب میں کیسے کوئی اور لڑکی ڈھونڈ لوں۔ تم ہی میری بیٹی ہو اور تم ہی بہو بھی بنو گی۔'' نگینہ نے بڑے مان سے محبت بھری دھونس جماتے ہوئے کہا۔

''بے شک۔ میں ابھی بھی آپ کی بیٹی ہوں۔ مگر کبھی بھی بہو نہیں بن سکتی۔ رہ گئی بات سوچنے کی تو دنیا میں بعض دفعہ انسان ایسے حالات سے بھی گزرتا ہے کہ جن کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔''

انابیہ کی بات پہ بے بسی کی انتہا پہ پہنچی نگینہ نے مدد طلب نظروں سے خاموش بیٹھی صنوبر کو دیکھا اور طاہرہ کے پاس کچن میں چلی گئیں۔ کہ بہرحال وہ بھی جانتی تھیں کہ انابیہ کتنی تکلیف میں ہے۔ صنوبر آنکھ کے اشارے سے انہیں تسلی دیتی میدان میں اتر آئی۔

''ارقم کی غلطی اتنی بڑی تو نہیں تھی کہ اس کو اتنی بڑی سزا دی جائے۔ پھر جو تصاویر اسے بھیجی گئی تھیں۔ انہیں دیکھ کے کوئی بھی بدگمان ہو جاتا۔ ویسے بھی ارقم کی غلط فہمی کی سزا ہمیں تو مت دو۔ ہم تو تم سے پیار کرتے ہیں نا گڑیا!'' صنوبر نے سامنے کاؤچ پہ بیٹھی انابیہ کے ہاتھ تھام کے لاڈ سے کہا۔

''یہ ہی تو مسئلہ ہے اپیا! میں نے آپ لوگوں کو کوئی بھی سمجھا ہی نہیں تھا۔ آپ سب تو میرے اپنے تھے۔ میں نے آپ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے عمر کی منزلیں پار کیں۔ آپ کی گود میں کھیل کے بڑی ہوئی۔ آپ لوگوں نے ہی من گھڑت بات پہ یقین کیا اور مجھے غلط سمجھ بیٹھے۔ ایک پل کے لیے بھی یہ نہیں سوچا کہ مجھ پہ کیا گزرے گی۔ آپ بتائیں آپ کے اپنے آپ کو یوں بے اماں کرتے تو آپ کے دل پہ کیا گزرتی۔'' گلوگیر لہجے میں ''کوئی بھی'' پہ زور دیتی وہ صنوبر کو لاجواب کر گئی۔

''میں تو بس اتنا جانتی ہوں گڑیا! کہ انا اور غصے میں کیے گئے فیصلوں پہ ہمیں اکثر شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ ایک غلطی ارقم نے کی ایک تم کرنے جا رہی ہو۔ میں نہیں کہتی کہ تم ارقم کو معاف کرو۔ اس کی غلطی معافی کے قابل ہے بھی نہیں۔ تم اسے جو چاہے سزا دو مگر شادی سے انکار مت کرو۔'' صنوبر نے التجائیہ انداز میں کہا۔

انابیہ اٹھ کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ بیڈ پہ گرتے ہی آنسوؤں کا ایک ریلا تھا جو امڈ کے آیا۔ وہ بیڈ پہ اوندھی گری کافی دیر روتی رہی۔ جانے کتنی ساعتوں کے بعد دروازہ کھول کے طاہرہ اندر داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے آفاق صاحب بھی تھے۔ انابیہ جلدی سے اٹھ کے طاہرہ گود میں سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جبکہ آفاق صاحب کارنر چیئر سنبھال چکے تھے۔

"میں جانتی ہوں بیٹا! تم پہ کیا بیت رہی ہے۔ بلاشبہ تم اپنے فیصلے میں حق بجانب ہو مگر پھر میں یہ ہی کہوں گی تم اپنا فیصلہ بدل دو۔" طاہرہ نے اس کے آنسوؤں سے بھیگے گلابی چہرے سے نظر چراتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

"آپ جانتی ہیں کہ میں حق بجانب ہوں۔ پھر بھی آپ مجھے اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کے لیے کہہ رہی ہیں۔ اور یہ بھی کہتی ہیں کہ مجھ پہ جو گزر رہی ہے اس سے واقف ہیں۔" ان کی گود سے اٹھتی اب وہ اپنی متورم شکوہ کناں نگاہیں ان کے چہرے پہ گاڑتی سوال کر رہی تھی۔

"ہاں۔ میں پھر بھی یہ ہی کہوں گی۔ کیونکہ یہ ہی تمہارے اور ہمارے حق میں بہتر ہے۔ میں کھانا لگا رہی ہوں آپ دونوں آجائیں۔" طاہرہ بات مکمل کرتے ہی کمرے سے نکل گئیں۔

"دیکھو بیٹا! طاہرہ بالکل درست کہہ رہی ہیں۔ پچھلے دنوں جو کچھ بھی ہوا وہ ہم دونوں گھروں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اگر یہ رشتہ ٹوٹا تو تجسس کے مارے خاندان والے اس ٹوہ میں لگ جائیں گے کہ رشتہ ٹوٹنے کی اصل وجہ کیا تھی۔

آج نہیں تو کل اصل بات سب کے علم میں آئے گی۔ یوں ایک بے بنیاد شک دو گھروں کی عزت کو دنیا کی ٹھوکروں میں لے آئے گا۔ وہ الزام جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں وہ زبان زد عام ہو کر ہماری بدنامی کا باعث بنے گا۔ دنیا ہم پہ تھوکے گی جو مجھ سے بالکل سہا نہیں جائے گا۔ بے شک تم اپنے فیصلوں میں با اختیار ہو مگر یہ سوچ لینا کہ تم ارقم کو ٹھکرا کے اپنی انا کو تسکین دے کے زیادہ خوش رہو گی یا اپنے باپ کی خاطر اپنی انا کو مار کے زیادہ خوش رہو گی۔ فیصلہ اب بھی صرف تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اور دنیا کی اونچ نیچ سمجھانا میرا فرض تھا اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم پہ کوئی دباؤ ڈالوں گا۔ آج ہی کیا زندگی کے ہر موڑ پہ اپنے ہر فیصلے میں تم مجھے اپنے ساتھ کھڑا پاؤ گی۔" ایک طویل جملے میں گہری بات سمیٹتے آفاق اس کے سر پہ دست شفقت رکھتے کمرہ چھوڑ گئے۔

بیٹیاں تو ہوتی ہی موم کی گڑیا جیسی ہیں۔ ذرا سا مان اور محبت دے کر جس طرف چاہیں موڑ لیں۔ اور جو سخت لہجے میں حکم صادر کریں تو رو رو کے خود کو ختم کر ڈالیں۔

اس رات انابیہ نے جتنا سوچا فیصلہ آفاق صاحب کے حق میں ہی کیا۔ اسے فیصلے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اس پہ فیصلہ تھوپا نہیں گیا تھا۔ آفاق چاہتے تو باپ ہونے کی حیثیت سے فیصلہ سنا کے انکار کی گنجائش بھی ختم کر سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے وہ کیا جو ایک باپ کا فرض تھا۔ زمانے کی اونچ نیچ سمجھا کے ہر فیصلے میں اولاد کا ساتھ دینا ہی ہر باپ کا فرض ہوتا ہے۔ پھر وہ اولاد کی ڈھال ہوتا ہے اولاد کے ہر اچھے اور برے فیصلے میں بھی۔ انابیہ ہی کیا دنیا کی ہر لڑکی اتنی محبت اور مان پہ پسپائی اختیار کر لی سو انابیہ نے بھی کی۔

☆☆☆

رات ہونے والی بارش کا اثر ابھی بھی باقی تھا۔ گو بارش نہیں ہو رہی تھی۔ مگر گھنے بادلوں نے سورج کی کرنوں کو بھی زمین اور زمین والوں کو پگھلانے سے باز رکھا ہوا تھا۔ سبک خرام ہوا میں روح تک اترنے والے سکون کی لہریں تھیں۔ یوں گویا کائنات میں سرخوشی کا رنگ گھلا تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ دل پہ موسموں کی رعنائیاں اور سختیاں بہت اثر کرتی ہیں۔ اس کے دل کے سکون کی وجہ تو رات والا فیصلہ بھی تھا۔

اس وقت بھی وہ ہلکے سروں میں گنگناتے ہوئے آئی لائنر لگا رہی تھی۔ اس تیاری بس لپ پنسل اور آئی لائنر تک ہی محدود ہوتی تھی۔ اسے شروع سے میک اپ میں بس یہ دو چیزیں پسند تھیں۔ تب ہی ہلکی دستک کے بعد ناشتے کی ٹرے تھامے طاہرہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

"یہ تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا اسکول جاؤ گی تو تمہاری ذہن سے یہ قنوطیت چھٹے گی۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی کہ اتنے دنوں میں روز مجھ سے بھی پہلے اٹھ کے ناشتا بناتی تھیں آج کہیں طبیعت خراب نہ ہو۔ سو میں ناشتا بنا کے یہیں لے آئی کہ دونوں ماں بیٹی ساتھ کرتے

ہیں۔'' اسے ڈارک مونگیا کلر کے سادہ کاٹن کے سوٹ میں تیار دیکھ کے طاہرہ پُرشفقت لہجے میں بولیں۔ درحقیقت وہ رات کے اپنے سخت لہجے پہ پشیمان تھیں۔

''نہیں امی! میں اسکول نہیں جارہی۔ ویسے ہی اپنی ایک دوست کے گھر جارہی ہوں۔ اس کی ایک امانت ہے میرے پاس وہ لوٹانی ہے۔ کافی دن سے جانے کا سوچ رہی تھی جا نہیں پا رہی تھی۔'' رسان سے کہتے انابیہ نے بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے ٹرے اپنی طرف بڑھائی۔ جس میں بھاپ اڑاتا انڈا پراٹھا اور اشتہا انگیز خوشبو اڑاتی الائچی والی چائے تھی۔

''چلو جہاں بھی جانا چاہو جاؤ۔ کہتے ہیں نہ ماحول بدلے تو انسان کا ذہن پرسکون ہوجاتا ہے۔ اور وہ بہتر فیصلے کر پاتا ہے۔'' اس کے ساتھ ناشتا شروع کرتے طاہرہ نے ڈھکے چھپے الفاظ میں بات شروع کرنا چاہی اسی لمحے انابیہ کا نوالا لیتا ہاتھ ایک پل کے لیے تھما تھا پھر وہ اسی رغبت سے کھانے لگی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتی اس کے موبائل کی ٹیون بج اٹھی۔ حسب معمول موبائل اسکرین پہ ارقم کالنگ لکھا تھا۔ اس نے کال دوسری ہی بیل پہ ریسیو کی تھی مگر اپنی جگہ سے اک انچ بھی ہلے بغیر۔

''جی ارقم! السلام علیکم...... کہیے۔'' شرم اور جھجک سے مبرا لہجہ ارقم تو ارقم طاہرہ کو بھی حیران کرگیا۔ کہاں تو وہ ارقم کی ہزار باتوں کا ایک ہوں ہاں میں جواب دیتی تھی کہاں آج خود سے بات کا آغاز کررہی تھی۔ ناشتا ہوچکا تھا۔ طاہرہ برتن اٹھاتے ہوئے مطمئن سی کمرے سے نکل گئیں۔

''وعلیکم السلام۔ میں بالکل ٹھیک ہوں میں تم سے......'' ارقم نے گمبھیر لہجے میں بات کا آغاز کرنا ہی چاہا تھا کہ اس نے بات بیچ میں کاٹ دی اور قدرے سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

''ارقم رحمان! معافی غلطی کی ہوتی ہے گناہ کی نہیں۔ اور کسی پہ بہتان لگانا گناہ کبیرا ہے جس کی معافی خدا کے پاس بھی نہیں۔ ویسے بھی غلطی تو میری بھی تھی میں یہ سمجھتی تھی دنیا والے برے ہوتے ہیں اپنے نہیں۔ یہ بھول گئی تھی کہ اس جہان میں کب کون دنیا والوں کی صف میں کھڑا ہو کے دل کو کتنی گہری ٹھیس پہنچا دے کچھ خبر نہیں ہوتی۔'' آنکھوں میں بے ساختہ در آنے والی نمی کو اندر دھکیلتے ہوئے انابیہ نے معتدل مگر بے لچک لہجے میں کہا۔

ارقم دم بخود رہ گیا۔ وہ تو اسے اس کی غلطیاں یاد دلا کے خود کو کسی حد تک حق بجانب ٹھہرانے آیا تھا۔

''تمہاری ہر بات ٹھیک ہے۔ مگر غلطی واقعی تمہاری بھی تھی۔ میں نے جب بھی تمہیں فون کیا تم نے ہمیشہ لیا دیا انداز اختیار کیا۔ بے شک میں تمہارا منگیتر تھا مگر کزن بھی تو تھا۔ کزنز تو ہر خوشی اور غم شیئر کرتے ہیں۔ گھنٹوں بات کرتے ہیں۔ تمہارے اس رویے کی وجہ سے میں اس لڑکی کی باتوں پہ یقین کر بیٹھا۔ میں جانتا ہوں مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی ہے مگر اللہ کے لیے مجھے معاف کردو۔ جب سے سب بات کھلی ہے گھر میں کوئی بھی مجھ سے مخاطب ہونے کا روادار نہیں۔ تم معاف کردو گی تو سب کردیں گے خدا بھی۔'' وہ مدلل انداز میں اسے اس کی غلطی جتاتا آخر میں ملتجی انداز میں گویا ہوا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں ارقم! شاید کچھ غلطی میری بھی تھی۔ باقی میں نے آپ کو معاف کیا خدا بھی آپ کو معاف کرے۔ مگر ایک بات یاد رکھیے گا کبھی بھی زندگی میں آپ پہ مان قائم نہیں کرپاؤں گی۔ کیونکہ آپ اپنے ہاتھوں سے اس مان کو چکنا چور کر چکے ہیں۔'' انابیہ نے فراخدلی سے اپنی غلطی مانتے ہوئے اسے معاف کیا تھا۔ وہ گویا ہواؤں میں اڑنے لگا۔ مگر انابیہ کے اگلے ہی جملے نے جیسے اسے فلک سے زمین پہ لا پٹخا تھا وہ کراہ کے رہ گیا۔

''اور یہ میری سب سے بڑی بدنصیبی ہوگی۔ میری یہ سزا ابھی بہت کم ہے کیونکہ انجانے میں ہی سہی میں نے بہتان لگایا اور میں تمہیں جیت کے بھی ہاروں میری یہ ہی سزا ہے۔ میں کل ہی امی ابا کو شادی کی تاریخ لینے کے لیے بھیج دوں گا کہ بہرحال اب میں اپنی طرف سے ہر ممکن کفارے کی کوشش کروں گا۔'' یاسیت سے

بھرپور لہجے میں کہتے اس نے کال ڈراپ کردی۔

وہ اماں سے اجازت لیتی گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ ٹھیک آدھے بعد وہ نایاب کے گھر تھی۔ لوئر مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھنے والی نایاب کا گھر بھی ویسا ہی تھا جیسے اس طبقے کے بیشتر گھر ہوتے ہیں۔ سیلن زدہ دیواریں اپنی بے قدری پہ ماتم کناں تھیں۔ جگہ جگہ سے ٹوٹے فرش ان کی مفلسی کا چیخ چیخ کر اعلان کررہے تھے۔ مختصر سے صحن سے گزر کر تنگ سا برآمدہ آتا تھا جس کے ایک جانب اوپن کچن تھا جو میل اور گندے برتنوں سے اٹا تھا۔ پھر چھوٹا سا کمرہ جس کی چھت اتنی چھوٹی تھی کہ گمان ہوتا کہ ہاتھ اوپر کرنے سے پنکھے میں آ کے کٹ جائے گا۔ سفید میل میں ڈوبے پردے بدبو کے جھونکے لٹا رہے تھے۔ نایاب کے چار بہن بھائی اسکول گئے تھے۔ جبکہ دو ننگ دھڑنگ بچے صحن میں اسٹاپو کھیل رہے تھے۔

سارے گھر کا جائزہ لیتی انابیہ کی بے یقین نگاہیں نایاب کے جھکی آنکھوں شرمندہ چہرے پہ ٹھہر گئیں۔ جبکہ نایاب کی ماں اس سے پرتپاک انداز میں ملتے ہوئے اسے بوسیدہ سے صوفے پہ بٹھا کے ابھی چائے بنانے گئی تھیں۔

"یہ تھی وہ امارت جس کا اسکول میں تم پرچار کرتی تھیں۔ اسکول میں آئے روز ہم فرینڈز کو وجہ بے وجہ ٹریٹ دیتے تمہیں اس گھر کی مفلسی کا خیال نہیں آتا تھا۔" یہ وہ پہلا باقاعدہ جملہ تھا جو اس گھر میں آکے پہلی بار اس نے نایاب سے کہا تھا۔

"تم نے محرومیاں نہیں دیکھیں بیہ! اسی لیے تم کہہ سکتی ہو۔ تم میری طرح بچپن سے ہر محرومی کو ترسی ہوتیں تو تمہیں اندازہ ہوتا کہ دل صبر کرتے کرتے پتھر کا کیسے ہو جاتا ہے۔ حالات سے سمجھوتا بھی ایک حد تک ہوتا ہے پھر دل چاہتا ہے حالات کا رخ اپنی طرف موڑ لے پھر چاہے اس کوشش میں جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔" سفاک لہجے میں کہتے ہوئے وہ امڈ آنے والے آنسو بے دردی سے پونچھ گئی۔

"مگر کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ تم کسی پہ بہتان لگا کے اس کی خوشیاں خاک میں ملا دو...... کیا تمہیں نہیں لگتا کہ یہ خودغرضی کی انتہا ہے؟" انابیہ کے سوالیہ لہجے میں بلا کی بے بسی تھی۔

"تم قسمت کی دھنی ہو انابیہ بی بی! جو تمہیں ارقم رحمان جیسے ویل سیٹلڈ خوبرو شخص کا ساتھ نصیب ہوا۔ تمہیں بھی میرے گھر کی غربت اور خوشیوں میں سات حصے برداشت کرنے پڑتے اس پہ پھر تیمور جیسے نو بہنوں کے بھائی کا ساتھ ملتا تو میں پوچھتی کہ تم کیا سوچتیں۔" بپھرے لہجے میں کہتی نایاب سحر کہیں سے بھی ایک ذہین ٹیچر اور حساس شاعرہ نہیں لگ رہی تھی۔ سحر اس کا تخلص تھا۔ بہت کم لوگ اس کے مکمل نام سے واقف تھے۔

"نایاب سحر! میں تم سے یہاں حساب لینے آئی تھی مگر تمہارے حالات اور تمہاری بے حسی دیکھ کے تم پہ ترس آرہا ہے۔ جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا میرا خدا بھی تمہیں معاف کرے۔ کچھ لوگ فطرتاً سنگ تراش ہوتے ہیں۔ قسمت کو بھی وہ چمکیلا سفید پتھر سمجھ بیٹھتے ہیں جسے وہ اپنی منشاء کے مطابق تراش سکتے ہیں۔ مگر اسی وہم میں اس پتھر سے ٹھوکر کھا کے منہ کے بل گرتے ہیں۔" اس نے ملامت بھری نظر اس کے جھکے چہرے پہ ڈالتے ہوئے بیگ تھاما اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مگر ایک بات یاد رکھنا قسمت کی دھنی میں نہیں مجھے ارقم جیسے شکی شخص کا ساتھ ملا۔ اور میرے جیسی اصولوں پہ مرنے والی لڑکی کے لیے یہ سب سے بڑی ہار ہے۔ تم نے جسے ہیرا سمجھ کے مجھ سے چھیننا چاہا وہ تو پتھر نکلا...... اور جسے تم بے قیمت پتھر سمجھ کے ٹکراتی رہیں وہ جان کی قیمت پہ بھی تمہارا بنا بنانے سے انکاری رہا۔ قدر کرنا اس ہیرے کی۔"

نایاب پہ سوچ کے کئی دریچے کھولتی وہ اس گھر سے نکلتی چلی گئی۔ باہر چلتی خوب صورت ہوا نے اس کے روئی کے گالے کی طرح ہلکے پھلکے ذہن و دل پہ بڑا خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ بااعتماد قدم اٹھاتی انابیہ گھر کی طرف روانہ تھی۔

☆☆

اُمِ اقصیٰ

ذاتِ عورت

بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر سوپ کا باؤل اور پانی کا گلاس رکھ کر ایک نظر اس نے مجازی خدا کو دیکھا وہ سیدھا لیٹا تھا اور آنکھیں بند تھیں اس نے داہنا ہاتھ اس کی آنکھوں کے آگے لہرایا۔ مجازی خدا نے آنکھیں کھولتے ایک دم سے ہاتھ تھام لیا۔ نیند کا خمار لیے آنکھوں میں کیا کچھ نہ تھا۔ مگر اسے یہ جاننے میں قطعی کوئی دلچسپی نہ رہی تھی کہ اس کے مجازی خدا کی آنکھوں میں کیا ہے۔ اسے تو اس کے بولے الفاظ سے کوئی غرض نہ رہی تھی۔ مردہ رشتہ تھا جو سانسوں کی ڈور سے بندھا تھا۔

"پلا دیں سوپ......" وہ تحمل سے جہاں بھر کی نمی آنکھوں میں سموئے بولا۔

وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ بے جان انداز میں بیڈ کے کنارے ٹکی، باؤل ہاتھ میں لیا اور چمچہ سے سوپ منہ میں انڈیلنے لگی۔

اس کی من اندر خواہش لپکی وہ اسے سوپ پلاتے کوئی لفظ کہے، کوئی میٹھا سا لفظ، کوئی شہد آگیں بول۔ شیرے سے لہجے میں مصری کی ڈلیوں جیسے لفظ۔ خواہش کرلاتی رہی اور وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ سوپ ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سوپ کا باؤل اٹھا کر بے تاثر چہرے کی ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

"جھلیا دل کیا خواہشیں کرتا ہے تو بھی۔" اس نے اپنے آپ ہی خود کو ڈپٹا اس کے دل کی حسرتوں کے قیمتی بیج، اس کی بیوی کے دل کی بنجر زمین میں پڑے یونہی رلتے تھے۔ لاکھ توجہ کا پانی ڈالتا تھا مگر خواہش کی کونپل اگ کے ہی نہ دیتی تھی۔

☆☆☆

وہ تتلی کے سات رنگوں جیسی تھی۔ موہنی، کومل، سندر، ہنس مکھ، البیلی، کامنی اور خوش رنگ مدھر سا ہنستی اور بے تحاشا بولتی۔ آواز ملائم ریشم سے یا گرتی آبشار سی یا کن من بارش سی یا...... یا چڑیا کی چہکار سی، کوئل کی کوک سی...... ارے ہاں مرغزاروں میں برف باری سی بھی تو...... کوئی ماورائی حسن کی یا لک تھی نہ ناولوں کی ہیروئن، عام سی ہو کر خاص لڑکی تھی۔ سچی اور سیدھی

مکمل ناول

بات یہ کہ جوانی دورآغاز تھا۔ جوانی جوگدھی پر بھی حسن لے آئے۔ ہرنی کو مست چال چلا دے۔ مورنی کو ناگن ناچ نچوادے۔

"رمین! تھوڑا ہنسا کرو۔" امی کہتیں۔

"اب ہنسنے پر بھی پابندی۔" وہ ٹھنک جاتی۔

"رمین! تھوڑا بولا کرو۔" دادی اوب جاتیں۔

"بولنا بھی بند......" وہ روہانسی ہو جاتی۔

"میری گڑیا تو بولتے اور ہنستے ہی اچھی لگتی ہے۔" ابا کہتے اور وہ کھل جاتی۔

"میری بہنا! چپ ہو تو پورا شہر بے رونق لگتا ہے۔" بجو کہتیں اور وہ کھلکھلا جاتی۔

"میری بہنا ہنسے نہ تو جھرنوں کو بہنا کون سکھائے۔" بھیا کہتے اور وہ قہقہہ لگا کر ہنستی، قل قل کرتی ہنستی امی خائف ہی ہو جاتیں۔

"زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے رمین، اور مردہ دل کے ساتھ جینا......، رمین اللہ! تم پر ہمیشہ رحم کرے۔"

وہ گھر بھر کی بہت لاڈلی نہیں تھی مگر اس کی سنی جاتی تھی اور مانی تو ضرور ہی جاتی تھی کہ کیونکہ خیر سے چوتھی کلاس سے اول آ رہی تھی اور میٹرک میں تو پورے شہر کے اکیس اسکولز میں سے اول آئی تھی۔

ایف ایس سی کے رزلٹ کا انتظار تھا اس کو......

اور اس سے زیادہ گھر بھر کو بھی، کب رمین کا رزلٹ آئے اور دوبارہ سے کالج سدھارے اور گھر بھر کے التوا کا شکار کام انجام کو پہنچیں۔

کالج میں بھی وہ چہکتی چڑیا تھی۔ کوئی بھی فنکشن ہوتا یا مقابلہ جات، طالبات ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ رہتیں۔

"رمین ہے ناں۔"

اور رمین وہ تو گویا ہمہ وقت تیار تھی۔

"رمین تم اتنا سارا کچھ کر کیسے لیتی ہو؟ پوزیشن بھی انچ بھر نہیں سرکتی۔" ساتھی طالبات پوچھتیں۔

"بس جو صرف کرنے کے لیے دماغ دیا گیا ہے اسے خرچ کرتی ہوں۔" وہ اٹھلاتی کہتی۔

رمین پارہ تھی۔ رمین جادو تھی۔ اور رمین کو سب قابو میں کرنا آتا تھا پھر وہ پڑھائی ہو، غیر نصابی سرگرمی ہو، دوست یا رشتہ دار۔ چھوٹوں کی وہ آئیڈیل تھی اور بڑے اس سے مرعوب تھے۔

ارے ارے آپ تو بور ہی ہونے لگے۔ چلیں ٹریک پہ آتے ہیں۔

☆☆☆

رات کے لمحے نوزائیدہ بچے کی مانند پل بھر کو حیرانی سے تکتے اور آگے سرک لیتے۔ رمین کارپٹ پہ نوٹس کی بکس کا پلندہ بکھیرے الجھی ہوئی تھی۔ ساری بکس ایک بار پڑھ لی تھیں، اہم ابواب پر بھی ایک نظر مار لی تھی۔ اہم ترین سوالات دہرانا باقی تھے۔

"رمین......"

امی کی آواز پر وہ بے طرح چونکی۔

"رمین رات کے دو بج گئے ہیں۔ بس کرو اب سو جاؤ جا کر۔"

"امی! بس تھوڑی سی دیر اور...... پھر تہجد پڑھ کر سوؤں گی۔" وہ بے حد مصروف انداز میں بولی۔

چند منٹ بعد امی کھجور کا شیک لیے آئیں۔

"نیند آنکھوں میں ہوگی تو لکھوگی کیسے۔" سو جاؤ اب، تھوڑا دماغ فریش ہوگا پھر صبح۔"

"ٹینشن سے نیند کہاں آتی اب، جب پیپر سامنے آتا ہے ناں تو نیند فوراً بھاگ جاتی ہے۔" شیک پیتے وہ بتا رہی تھی۔

"اللہ میری بیٹی کو بی ایس سی میں بھی اچھے نمبروں سے کامیاب کرے۔" امی نے با آواز بلند دعا دی۔

"اچھے نمبر نہیں امی...... پوزیشن ...... اچھے نمبرز کی ساتھ پوزیشن۔" رمین نے تصحیح کی۔

"ان شاء اللہ۔" امی نے صدق دل سے دعا دی۔

☆☆☆

"لکھا رکھا ہے عہد ترک الفت
مگر دل دستخط کرتا نہیں ہے

واہ واہ واہ...... کیا اعلا ذوق پایا ہے مس رحمین چہار نے...... کالج گراؤنڈ میں وہ نوٹس بکھرائے بیٹھی تھی۔ پاس ہی مرحا نیم درازسی اس کی ڈائری پڑھ کم اور انجوائے زیادہ کر رہی تھی۔ جس میں فقط شاعری ہی لکھی ہوئی تھی۔
رحمین نے نوٹس سے نگاہیں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا اور دوبارہ سے نوٹس پہ متوجہ ہوئی۔
پھوٹ پڑتا ہے درد کا چشمہ
یاد جب ایڑیاں رگڑتی ہے
"یار! یہ حرکتیں تمہاری ہم فیلوز سے مخفی ہیں۔" مرحا نے اٹھتے ہوئے شکوہ کیا۔
"یہ حرکتیں میں نے اپنے مجازی خدا کے لیے سنبھال رکھی ہیں۔" وہ اترائی۔
"مجازی خدا اگر جو مزاجی خدا نکل آیا تو......" مرحا نے ڈرایا۔
"مزاج درست کرنے آتے ہیں۔" رحمین نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔" مرحا پھر سے ڈائری کھولتے کھلکھلائی۔
"ویکم پارٹی پر کیا پہن رہی ہو۔" مرحا کو ایک دم سے یاد آیا تو اس کے نوٹس سمیٹتے ڈائری اوپر رکھ کے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
"ابھی تو بہت دن ہیں۔" رحمین بھی ریلیکس ہو کر بیٹھی۔
"بہت کہاں یار صرف نو دن، میچنگ ڈھونڈتے پتا بھی نہیں چلنا۔" مرحا کے لہجے میں پریشانی عود کر آئی۔
"میرا تو کچھ دیسی پہننے کا موڈ ہو رہا ہے اس بار۔"
"تمہارا مطلب شلوار سوٹ اور پراندہ۔"
"ارے نہیں، کلیوں والا فراک، چوڑی دار پاجامہ، بھر بھر کے چوڑیاں، نگوں والا کھسہ۔" رحمین جوش سے بتانے لگی۔
"میں تو ولایتی سے کام چلالوں گی۔ اس سب میں تو بہت دیر لگے گی۔" مرحا مصنوعی آہ بھرتے بولی۔

☆☆☆

پارٹی والے دن رحمین نے سب چیزیں بیڈ پہ پھیلائیں اور فراک پریس کرنے لگی۔
"یہ اتنا کچھ تم پہن رہی ہو آج؟" امی سب دیکھ کر پریشان ہوئیں۔
"خیریت امی؟" رحمین ان کی پریشانی پہ پریشان ہوئی۔
"کنواری لڑکیوں کو اتنا سنگار زیب نہیں دیتا۔" امی ایک ایک چیز کو اٹھا کے دیکھ رہی تھی۔
"امی اتنا کچھ کہاں ہے؟ یہ دوپٹا بھی تو چیک کریں جس نے سب سنگار چھپا لینا ہے۔"
"اچھا یہ ایئر رنگ ہٹاؤ...... کوئی سادہ ٹاپس پہنو۔" امی نے اس کے باہو بلی سہاروں والے ایئر رنگ ایک طرف کیے۔
"اور یہ اتنی چوڑیاں......! یہ سادہ ریشمی چار پانچ پہن لو، اتنے بھاری سیٹ پہننے کی کوئی ضرورت نہیں۔"
"یہ فراک بھی سائیڈ پہ رکھ دیتی ہوں اور یہ کھسہ بھی بلکہ ایسا کرتی ہوں جاتی ہی نہیں ہوں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ روٹھی سی بیڈ کے کنارے ٹکی۔
"کوئی مت کی بات نہ پلے باندھنا۔ جلدی تیار ہو کے آؤ، بابا ویٹ کر رہے ہیں۔" امی چوڑیاں اور ایئر رنگ اٹھائے باہر آئیں۔
"کیوں بچی کا دل خراب کر رہی ہو۔ پہننے دو جو پہنتی ہے۔" باہر بابا سب کچھ سن رہے تھے۔
"ابھی سب پہن لے گی تو شادی کے بعد دل ہی اوب جائے گا۔ بیاہی بیٹیاں سہاگ سنگ سنگار کیے بجتی ہیں۔"
"دیکھوں کہیں ناراض نہ ہو بیٹھی ہو۔" بابا اندر کی طرف بڑھتے بولے۔

☆☆☆

دروازہ سال خوردہ تھا اور زنگ آلود بھی دستک کو اٹھے ہاتھ لرزتے تھے اور دروازے تک جاتے

جھجکتے بھی عزم پختہ تھا اور ارادے میں استقلال بھی......

دستک ایک تواتر سے جاری تھی، دستک دیتے ہاتھ کانپتے بھی تھے کہ کہیں دروازہ ٹوٹ ہی نہ جائے اور دروازے کی ساتھ بھرم بھی۔ وہ مکین کے دروازہ کھلنے کے تاثرات پڑھنا چاہتا تھا۔

''کیا کبھی دروازہ کھلے گا بھی؟'' ڈرتے ڈرتے اس نے خود سے پوچھا تھا۔

اگر کھل بھی جائے گا تو اندر اس قدر گرد ہوگی کہ چیزیں شناخت کھو چکی ہوں گی۔ بیٹھنے کو فٹ زمین بھی نہ ملے گی۔

بھلے نہ ملے، اس کے لیے یہی کافی ہوگا کہ مکین نے اپنے ہاتھوں سے خود اس کے لیے دروازہ کھولا، مگر وہ کھولے نا تب، وہ تو نجانے کب سے دل کا دروازہ اس کے لیے بند کر چکی تھی۔

☆☆☆

بابا نے اس کے صبیح چہرے کو ملاحت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

''اللہ میری بیٹی کو کامیاب کرے۔'' رحمین کے ماتھے پہ بوسہ دیتے انہوں نے دعا دی۔

''اللہ میرے والد بزرگوار کو اجر کریم سے نوازے......'' سیدھے ہوتے رحمین نے بھی انہی کے سے انداز میں دعا کی۔

''وہ کس لیے بھئی......'' بابا نے اٹھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''اپنی بیٹی کو اتنے پیار اور ناز و نعم سے پالنے اس کے ناز اٹھانے اور ہر خواہش پوری کر دینے کے لیے۔''

''وہ تو ہر باپ کوشش کرتا ہے بیٹا......''

''پر میرے بابا تو سب سے زیادہ کوشش کرتے ہیں۔''

بابا نے پیار سے اس کے محبت بھرے چہرے کو دیکھا جس گھر میں جائے گی میٹھی سی محبت بھری روشنی سے گھر کو منور کر دے گی۔ بابا اسے پوائنٹ کی طرف بڑھتے دیکھتے سوچ گئے۔

☆☆☆

''ارے، نیلی باجی آئی ہیں۔'' شام کو اسائنمنٹ مکمل کر کے رحمین اندر سے نکلی تو ہمسائی کو دیکھ کر خوش ہوئی۔

''کیسی ہیں آپ!'' ان سے ملتے رحمین گرم جوشی سے بولی۔

''چل رہا ہے سانسوں کا سلسلہ......تم سناؤ۔'' نیلی باجی کچھ اداس دکھائی پڑیں۔

''بجو جیسے حالات ہیں آپ کے بھی۔ وہ بھی حال پوچھنے پہ حالات بتانے لگتی ہیں۔'' رحمین نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''ایک بندہ نہ سنبھالا گیا تم لوگوں سے......''

''ایک بندہ ہی اگر اپنے اندر پورا روایتی سسرال ہو تو......'' نیلی کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھریں۔

''تو ہتھیار استعمال کرو ناں......'' رحمین نے مفت کا مشورہ دیا۔

''ہتھیار......؟'' نیلی کی آنکھیں باہر کو لپکیں۔

''پہلا حسن کا ہتھیار، دوسرا ذہانت کا، تیسرا کھڑاپے کا اور بندہ چاروں شانے چت۔'' رحمین نے قہقہہ لگایا۔

''ایسے نہیں ہوتا ڈیئر......'' نیلی جانے کے لیے اٹھی، اگلا ایک ہی ہتھیار سے ہمیں ہمارے سارے ہتھیاروں سمیت پٹخ ڈالتا ہے، اور وہ ہے بے عزتی کا ہتھیار نیچا دکھانے کا ہتھیار۔''

انسان کو چیلنج کرنا آنا چاہیے۔ رحمین بے وجہ دل میں سوچ گئی۔

☆☆☆

امی بابا کی حرکتیں کافی روز سے ہی مشکوک چل رہی تھیں۔ فائنلز کے بعد آخر کار بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔ اس کے لیے آنے والے پروپوزلز میں سے ایک کو منتخب کر لیا گیا تھا۔

میر سالک دو بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔

باپ تھے نہیں۔ دونوں بہنیں دو بھائیوں سے بیاہی تھیں۔اور اٹلی میں ہوتی تھیں۔ بچے چھوٹے تھے اور دونوں جاب کرتی تھیں۔ ماں پر اصرار جاری تھا کہ ان کے پاس آجائیں۔اور ماں کو سالک کی شادی کا انتظار تھا۔ ذاتی گھر تھا اور سولہویں گریڈ کی ذاتی مطلب سرکاری نوکری تھی۔ دیکھنے میں بھی ٹھیک ٹھاک تھے۔اماں نے تصویر دکھائی تو بغور دیکھتے رحمین گویا ہوئی۔

''اچھا ہے پر ہیرو نہیں لگتا...... خیر میں اسے ہیرو بنادوں گی۔''

''کہیں زیرو ہی نہ بنا دینا۔'' بھیا نے شرارت سے کہا۔

''مجھے اپنی بیٹی پر پورا بھروسا ہے، جیسے تعلیمی میدان میں یہ اول رہی ہے بالکل ایسے عملی زندگی میں یہ کامیاب ترین ہوگی۔ خوشیاں پھیلائے گی۔'' بابا نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ رحمین نے بھیا کو دیکھ کر فرضی کالر اکڑائے۔

''اتنی بھی کیا جلدی ہے امی!'' اگلے دن بجو کو پتا چلا تو امی پر بگڑیں۔

''جلدی کہاں؟ بائیس سال کی تو ہوگئی ہے عمر بھی مناسب ہے تعلیم بھی مکمل ہے۔ پھر دیر کیوں کریں؟''

''پھر بھی امی بہتر ہوتا اسے چند سال اور انجوائے کر لینے دیتے۔ شادی کے بعد تو یہی حال ہوجاتا ہے۔'' بجو نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

''چند سال ہیں مشکل تمہارے، رمیز کا کاروبار چل نکلا تو سب حالات بہتر ہوجائیں گے۔'' امی نے بجو کو تسلی دی۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو......'' بجو نے صدق دل سے آمین کہا۔

''تم بھی آسانی سے مان گئیں، مجھے لگا تم ابھی رضا مند نہیں ہوگی۔'' رحمین رات کو بجو کے ہاتھ لگی تھی۔

''اور آپ کو ایسا کیوں لگا۔'' رحمین نے اک ادا سے پوچھا۔

''یونہی مجھے لگا تم ابھی لائف کو انجوائے کرنا چاہو گی۔''

''میں شادی کر کے لائف انجوائے کرنا چاہوں گی۔''

''شادی کے بعد اور انجوائے منٹ......؟'' بجو تلخی سے ہنسیں۔ ''شادی نوجوان لڑکیوں کی توقعات سے بالکل مختلف چیز ہے۔ذمہ داریوں کا انبار۔''

''بجو! کرنی تو ہے ناں، ابھی سہی......'' ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹتے رحمین گویا ہوئی تھی۔

☆☆☆

وہ حیا کا گھونگھٹ اوڑھے بیٹھی تھی۔ حیا کا گھونگھٹ جو خواہشات، آرزؤں اور ان چھوئے جذبات سے بنا ہوا تھا۔ میر سالک کا چہرہ رحمین نے تصویر میں دیکھا تھا اور سراپا بے خواب آنکھوں سے بنا تھا۔ ذرا سی دیر بیتی تو وہ مجسم اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ پرنور جذبات دل میں لیے پرشوق نگاہوں سے دیکھتا ہوا۔ گھونگھٹ الٹایا جا چکا تھا جذبات خواہش اور آرزوئیں آنکھوں کے راستے دل میں پناہ گزین ہوگئی تھیں۔

''خوب صورت لگ رہی ہیں آپ۔'' میر سالک نے تعریف کی۔

''میں ہوں بھی......'' رحمین کی زبان بے ساختہ مچلی تھی۔

''خوب صورت ہیں، تو یہاں ہیں ناں۔'' برجستہ جواب آیا۔ بات برائے بات کی گئی تھی مگر رحمین کو کچھ برا لگا تھا نجانے کیوں؟ الفاظ یا لہجہ؟ پتا نہیں کیا۔

''گویا حسن پرست ہیں آپ؟''

''ہر ذی شعور ہے......خیر میں نے ویسے ہی کہا۔ آپ کا تعلیمی ریکارڈ خاصا شاندار ہے محنتی تھیں یا نقل وغیرہ مارتی تھیں۔'' میر سالک کی آنکھوں میں شرارت عود کر آئی۔

''نہ محنتی ہوں نہ نقل مارتی ہوں۔''

''پھر......؟'' اس نے سوالیہ نگاہیں رحمین کی گھنی پلکوں پہ بچھائیں۔

''میں بہت ذہین ہوں۔'' اور میر سالک کھل کر ہنسا تھا۔

''تھک چکی ہوں گی آپ، ان لوازمات کو ہٹا لیجیے میں بھی ذرا چینج کر آؤں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

ان لوازمات کو ہٹانے میں مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔ رحمین کہنا چاہتی تھی پر اس نے کہا نہیں، کیونکہ یہ بات کہنے والی تھی ہی نہیں، محسوس کرنے والی تھی اور عمل بھی۔

☆☆☆

وہ سحر خیز تھی اور اب دوپہر ہونے کو آئی تھی سب سوئے ہوئے تھے۔ ابھی چند سیکنڈ پہلے بیداری کا عمل شروع ہوا تھا۔ رحمین نے نماز پڑھ کر قرآن کی تلاوت کر لی اب کافی دیر سے صوفے پہ بیٹھی تھی۔ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتی۔ پھر بیٹھ جاتی، میر سالک بھی چینج کر کے ابھی باہر نکلے تھے۔

''بھابھی! یہ چائے لیجیے...... ناشتے میں ابھی دیر ہے۔ اس کی چھوٹی نند کافی لوازمات لائی تھیں ٹرالی میں چائے کے ساتھ۔''

''میر صاحب کو بلوا لیتے ہیں۔'' رحمین سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''وہ ڈرائنگ روم میں دوستوں کے ساتھ چائے پی رہے ہیں۔'' نازنین باجی بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ''کوئی بات نہیں جی ساری زندگی تو تمہارے ساتھ ہی پینی ہے۔''

''آپ بھی لیں ناں باجی کچھ......'' رحمین نے آفر کی۔

''لینا کیا ہے کچھ...... مجھے تو یہاں کچھ بھی پسند ہی نہیں آتا۔ بیکری سے اچھے والے بسکٹ منگوائے ہیں لیکن پھر بھی ناقص بالکل، وہاں اٹلی میں ایسے خستہ اور تازہ بسکٹ ہوتے ہیں کہ مزا ہی آ جاتا ہے۔ مجھے اور بچوں کو تو یہاں کی عادت رہی ہی نہیں۔'' چائے پیتے نازنین باجی نزاکت سے بتا رہی تھیں۔

''کتنا عرصہ ہو گیا ہے آپ کو وہاں گئے؟'' رحمین نے پوچھا۔

''چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ آپی نازیہ تو چھ سال سے وہاں ہیں۔''

''صحیح ہے، پھر آپ کا تو جلدی چکر لگ گیا ہے۔''

''سالک کی شادی کی وجہ سے آئی ہوں جلدی...... ورنہ میری تو ابھی وہاں جا کے پاکستانی میل ہی اتری تھی۔''

چائے پیتے رحمین کو زور کا اچھو لگا۔ ایکسکیوز کرتی وہ جلدی سے واش روم کی جانب بڑھی۔ بیسن کے شیشے سے خود کو دیکھتے اسے ایک بار پھر زور سے ہنسی آئی۔ جسے بمشکل رحمین نے روکا۔

بڑی نند نازیہ، نازنین کے بالکل ہی الٹ تھیں۔ تھوڑی کم گو تھیں۔ باتوں میں حیثیت نہ جتلاتی تھیں۔ ہاں مگر آنکھوں میں اور تاثرات سے سب کو تین فٹ دور کیے رکھتی تھیں۔ بیٹھنے سے پہلے جگہ کو گھورتیں، آنکھوں کے تاثرات سے ان دیکھی گرد جھاڑتیں اور پھر بیٹھتیں، ایسے ہی بات چیت کرنے کا انداز تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اگلے کو تاڑتیں، ٹٹولتیں اور حد میں رہنے کا کہے جاتیں۔

اللہ ہی اپنا کرم رکھے رحمین تم پر ہمیشہ...... ورنہ یہ نندیں تو۔'' باہر نکلنے سے پہلے اس نے شیشے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھ کر تسلی دی۔

اپنی نندوں کی باتوں سے وہ پریشان بالکل بھی نہ ہوئی کیونکہ اپنی سبھاؤ والی فطرت سے آگاہ تھی۔ جب میں ہی ان سے نرمی، پیار، خلوص اور محبت بھرا برتاؤ رکھوں گی تو یہ پھر کیسے نہ میرے ساتھ ٹھیک رہیں گی۔ چہرہ تولیے سے تھپتھپاتی وہ باہر نکلی۔

''سنو رحمین......'' نازنین باجی اس کی طرف پلٹی تھیں۔ یہ سامنے والا گھر ہماری نند ماریہ کا ہے۔ بڑی ہی گھنی اور کمینی فطرت کی ہے۔ اس سے میل جول کم رکھنا...... اور ہمارے گھر کی کوئی بھی بات اس

سے شیئر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"جی باجی!" رحمین خاموشی سے سن گئی۔

اسے رات ولیمے کے فنکشن کے لیے تیار ہونے پارلر جانا تھا۔ میر سالک ابھی تک نہ آئے تھے۔ ڈرائیور باہر انتظار کر رہا تھا۔ دو تین بار پیغام بھیجا تو وہ اندر آئے۔

"میں تیار ہونے پارلر جا رہی ہوں۔"

"ہاں ...... تو جاؤ۔" وہ بے فکری سے بولے تھے۔

"ہاں تو جاؤ......" بس رحمین کے اندر اسی کی تکرار ہو رہی تھی۔ وہ تو کچھ اور ہی توقع پالے بیٹھی تھی کہ میر سالک اسی کے ساتھ ناشتا کرتے گپ شپ لگاتے، زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتے ...... مگر......

عورت کی شادی کے بعد حس سماعت اور حس گفتار جتنی بیدار ہوتی ہے مرد کی اسی قدر سو رہتی ہے۔ کبھی کسی کی کہی بات اسے بے تحاشا یاد آئی۔

☆☆☆

پہلی دعوت ماریہ باجی کی طرف سے تھی۔

ابھی ایک گھنٹے تک نکلنا تھا۔ رحمین نے اپنے اور میر سالک کی کپڑے نکال کر بیڈ پر پھیلا رکھے تھے۔ خود وہ اپنے بال ڈرائی کر رہی تھی۔

"تم یہ پہن رہی ہو آج؟" نازیہ باجی اس کے کپڑوں کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

"جی۔" رحمین نے بیڈ کی طرف دیکھا، بلو کلر کی کتان سلک کی سادہ مگر اسٹائلش سلی ہوئی قمیض تھی ساتھ کیپری اور فینسی سا پانچ رنگوں کا گوٹہ کرن لگا دوپٹا۔

"دکھاؤ، کیا پہن رہی ہو آج؟" نازیہ باجی کے جاتے ہی نازنین باجی اندر آئی تھیں۔

"یہ تو بالکل مناسب نہیں رہے گا۔" وہ خود ہی آگے بڑھ کر وارڈ روب کھول کر کھڑی ہو گئیں۔

"ہوں یہ ٹھیک ہے۔" انہوں نے گرے کلر کی گورے کے کام والی میکسی نکالی۔

"یہ ہیوی نہ ہو جائے گی۔ صرف دعوت ہی تو ہے کون سا کوئی فنکشن ہے۔" رحمین متذبذب تھی۔

"بالکل بھی نہیں اور ہاں میک اپ بھی اچھا سا کرنا، جیولری ولیمے والی پہن لینا۔ گولڈ کے تو سارے سیٹ ہلکے بنوائے ہیں تم نے، کنگن گولڈ کے یاد سے پہن لینا۔" وہ تمام ہدایات دیتے ہوئے باہر نکلیں۔

"اف!" رحمین سر ہاتھوں میں گرائے صوفے پہ بیٹھی۔ "کوئی بات نہیں نندوں کو ارمان ہوتا ہی ہے بھابھی کو تیار دیکھنے کا۔" خود کو تسلی دیتی وہ میک اپ کے لوازمات سے نبرد آزما تھی۔

"یہ کیا تم چھمک چھلو بن کے جا رہی ہو، بھئی ہم صرف دعوت پر جا رہے ہے ماریہ باجی کے گھر کوئی فنکشن نہیں ہے۔" میر سالک چینج کرنے اندر آئے تو اسے دیکھ کر ہنس دیے۔

"نازنین باجی کی چوائس ہے انہوں نے سب نکال کر دیا ہے۔" ناچاہتے ہوئے بھی رحمین کے لہجے میں بیزاری سی در آئی۔ میر سالک خاموشی سے کپڑے اٹھائے واش روم کی جانب بڑھ گئے۔

"ماریہ باجی نازیہ اور نازنین باجی کی باتوں کے برعکس اسے تو سادہ سی ہی لگی تھیں۔ پرخلوص اور پرتکلف بھی...... کھانا بہت ہی زبردست، اتنے زیادہ آئٹمز اور اتنے ہی لذیذ۔ ماریہ باجی کے دو ہی بچے تھے حورین اور ریان۔ حورین بڑی جبکہ ریان چھوٹا تھا۔ چھوٹا سا مگر ضرورت سے زیادہ صاف ستھرا گھر......"

"ماریہ باجی! آپ کا گھر بہت پیارا ہے۔" رحمین تعریف کیے بنا نہ رہ پائی۔

"ہماری مسز کو تو پسند ہی نہیں حالانکہ۔" جواد بھائی (ماریہ باجی کے شوہر) بولے۔

"مجھے اصل میں بڑے بڑے گھر پسند ہیں۔ کشادہ ڈرائیوے بڑے بڑے لانز۔" ماریہ باجی ہنس کر بولیں۔

"آتے جاتے رہنا اب۔ گیٹ تک چھوڑنے آتے ہوئے وہ بولیں۔"

"جی ضرور۔" رحمین خوش دلی سے بولی۔

اس نے محسوس کیا نازیہ باجی اور نازنین دونوں کا رویہ ماریہ باجی سے لیے دیے سے تھا۔ دونوں بچوں کو گھر چھوڑ گئی تھیں۔ نازیہ باجی تھوڑا سا کھا کے بچوں کا بہانہ کر کے گھر واپس آ گئی تھیں۔ نازنین باجی ساتھ رہی تھیں مگر کوئی بات نہ کی تھی۔

"رحمین بھابھی کو ہم شاید اچھے نہیں لگے ہم سے کبھی ہنس کے بات نہیں کی۔ ماریہ سے تو بڑا ہنس ہنس کے بول رہی تھیں۔" رات سب بیٹھے چائے پی رہے تھے جب نازنین بولیں۔

"آپ کو میرا ماریہ باجی سے بولنا اچھا نہیں لگا۔"

"کیوں نہیں میں تو یہی کہتی ہوں سب سے یونہی ہنس ہنس کے بولا کرو۔"

"جی۔" رحمین نے سر ہلایا۔

میر سالک ٹی وی کی طرف متوجہ تھے۔ وہ سب کے خالی کپ لیے کچن کی جانب آئی۔

"چھوٹے شہر کی ہے ناں ابھی سب کچھ خود ہی سمجھانا پڑتا۔ آج ماریہ گھر جانے کے لیے اتنے بے ڈھنگے کپڑے نکالے کیا سوچتی ماریہ۔" نازنین اپنے تئیں دھیمے سے بول رہی تھیں۔

"کل امی بابا سے ملنے چلی جاؤں۔" رات لیٹتے ہوئے رحمین نے پوچھا تھا۔

"آٹھ دن بعد امی اور باجیوں کی فلائٹ ہے بہتر ہوتا یہ سارا وقت تم یہاں گزارتیں۔"

"میری کچھ چیزیں ہیں وہاں بس ایک رات کے لیے، بھیا کل کہیں جا رہے ہیں۔ یہیں سے گزرنا ہے انہیں، ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے، لیکن پلیز آتے ساتھ ایک کام کرنا۔"

"جی......"

ایک آدھ بستر یا کمبل وغیرہ اور نکال لو...... اپنے لیے۔

"یہ ڈبل کمبل ہے۔"

"مجھے عادت نہیں ہے۔" میر سالک تکیہ اونچا کرتے بولا۔ رحمین کی آنکھیں بے ساختہ نمکین پانیوں سے بھر آئیں۔ وہ کیا کچھ نہیں چھوڑ آئی تھی پیچھے اور......

☆☆☆

رحمین کچھ مسئلہ ہے؟ رات وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھی جب امی نے پوچھا۔

"نہیں تو امی!" رحمین حیران ہوئی۔

"تمہارے بابا بھی پوچھ رہے تھے۔ پوچھوں تم سے اتنی چپ چپ سی کیوں ہو؟"

ارے نہیں امی! ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔ تھکاوٹ ہے بس۔" وہ امی کا ہاتھ تھامے انہیں تسلی دے رہی تھی۔

"نہ کوئی زیور پہنا ہے نہ میک اپ نہ فینسی کپڑے اوپر سے چہکتی مینا چپ ہے۔ خوشی کا اندازہ کیونکر ہو؟" امی اب باقاعدہ لتاڑ رہی تھیں۔

"امی! ہیوی پہن کر دل اکتا گیا تھا آج ہی تو کچھ ریلیکس فیل ہو رہا۔ وہاں آنٹی، نازنین اور نازیہ باجی ہیوی کپڑے میک اپ جیولری سب پہنوا کے رکھتی ہیں۔"

"اچھی بات ہے ناں بیٹا، بیاہی بیٹیوں پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ شادی ہوتے ساتھ ہی یہ جھوٹ بولنا جو سیکھ جاتی ہیں۔ سو لوگ ان کی خوشی کا اندازہ ان کی ہنسی کی کھنک، چوڑی کی کھنک، جھمکوں کی ہلار اور کپڑوں کی چمک دمک سے لگاتے ہیں۔"

"چلیں، میں صبح اٹھتے ہی یہ سب پہن لوں گی۔ پھر خوش۔" رحمین نے پھر سے سر ان کی گود میں رکھا۔

"امی......"

"جی ......" ان کی بالوں میں تیرتی انگلیاں رکیں۔

"شادی اتنی بھی اچھی چیز نہیں ہوتی جتنا کنواریوں کو چاہ ہوتی۔" رحمین کے لہجے میں نامعلوم اداسی تھی۔

"رحمین! تم مجھے پھر سے ڈرا رہی ہو۔" امی کے

لہجے میں نامعلوم خوف ابھرا، جبکہ رحمین کھلکھلا کر ہنس دی۔

"پگلی۔" امی نے پیار سے چپت رسید کی۔

☆☆☆

دستک دیتے ہاتھ پل کے پل ٹھہرے۔

"میری مسلسل دستک سے مکین کہیں اوب ہی نہ جائے۔" سوچ کا کوندا اس کے دل کو ڈرا گیا۔

ہاتھ اس نے دروازے پر پھیلائے اور اوپر ماتھا ٹیک دیا۔ جیسے کسی درگاہ میں مرشد کے حضور کوئی مرید التجا کرتا پایا جاتا ہے۔ ہاں وہ بھی تو مرید ہی تھا اس گھر کا۔ جو گھر خدا کا بھی مسکن ٹھہرا ہے۔

دروازے کی درز سے اس نے ذرا سا اندر جھانکا۔ اس کی توقعات سامنے سچائی کا چولا اوڑھے پڑی تھیں۔ جالے تھے اور بے حد تھے، بے توجہی کے جالے، گرد تھی تو حد سے سوا تھی، بے قدری کی گرد، بے عزتی کا گند اور ان سب سے اوپر غصے کی چادر تنی ہوئی تھی۔ جیسے اسٹور میں سبھی چیزوں کو بڑی سی چادر نے ڈھکا ہوتا ہے۔

☆☆☆

"لگادیں......" رحمین نے مہندی اور ہتھیلی دونوں سالک کے آگے پھیلائی تھیں۔

"کیا......؟" میر سالک نے حیرانی سے دیکھا۔

"مہندی، پھول بوٹے، نام، کچھ بھی۔" وہ آلتی پالتی مارے بالکل سامنے بیٹھی۔

"مجھے نہیں لگانا آتی۔"

"جیسی بھی۔" رحمین کا اصرار جاری رہا۔

"ہٹاؤ بھی......" وہ موبائل لے کر بیٹھ گئے۔

اس نے خود اپنے آگے ہتھیلی پھیلائی اور مہندی سے نقش ونگار بنانے لگی۔

"اوہ یس، دیکھیے میر صاحب کتنی زبردست لگی ہے حالانکہ اتنے عرصے بعد لگائی۔" مہندی رکھتے ہی وہ سالک کی طرف پلٹی مگر تب تک وہ سو چکے تھے۔

صبح اٹھتے ہی رحمین نے سب سے پہلے اپنا ہاتھ دیکھا جہاں خوب صورت رنگ سے پھول بوٹے اپنی بہار دکھلا رہے تھے۔

سالک واک کے لیے جا چکے تھے وہ بھی منہ دھو کر کچن میں چلی آئی۔ کل شام آنٹی، نازنین اور نازیہ باجی کی فلائٹ تھی۔ وہ سب کے لیے ناشتا بنانے لگی۔ سارا دن روزمرہ کے امور سرانجام دیتے سالک کو چائے پانی پکڑاتے وہ لاشعوری طور پر اپنے ہاتھ سراہے جانے کی منتظر رہی۔ مگر ادھر جامد خاموشی تھی گویا کوئی نوٹس ہی نہیں۔ اسے چھوٹی چھوٹی خوشیاں کشید کرنا، چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خاموش ہونا۔ سراہنا، روٹھنا، منانا، اٹھلانا پسند تھا مگر سالک اس معاملے میں بالکل ٹھس تھے۔ اب بندہ شوہر سے بھی ناز نخرے نہ کرے تو آخر کس سے کرے......؟

دوپہر کے کھانے میں جو کہ شام سے ذرا قبل ہی کھایا گیا تھا۔ رحمین نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ اور کیا بھی سب اکیلے ہی تھا۔ باقی سب پیکنگ میں مصروف تھیں۔ کھانے کے بعد سب کو چائے دے کر خود وہ اپنے بیڈروم میں چلی آئی۔ کندھے دکھ رہے تھے اور کمر تو گویا ٹوٹنے کو بالکل تیار۔ بیڈ پر لیٹتے ہی غنودگی نے آلیا۔

آنکھ کھلی تو وہ اچھا خاصا سو چکی تھی۔ بال سمیٹتے وہ باہر آئی دروازے پہ اپنا نام سنتے رکی۔ نازنین کی آواز بھی۔

"اور زیادہ ناز نخرے بھی اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ کل کو تمہیں ہی تنگ کرے گی۔ ابھی یہی دن ہیں جن حالات میں رکھو گے اس کی عادی ہو جائے گی......اور ماریہ سے زیادہ ملنے جلنے مت دینا۔"

رحمین نے ذرا سا آگے ہو کر دیکھا سالک سر جھکائے سب کے نرغے میں تھا۔

"اوہ! تو مائنڈ تھیراپی چل رہی ہے۔" رحمین واپس آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔

☆☆☆

ایک نامعلوم سی اداسی گھر کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ میر سالک نے آج چھٹی کی تھی۔ رحمین کا اپنا

دل بھی اداس سا تھا۔ رونق کسے اچھی نہیں لگتی اس کا گھر سونا ہو جاتا تھا۔ سب نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا تھا۔ دو گھنٹے رہ گئے تھے، وہ نازنین کے بیٹے کو گود سے اتار کے اندر آئی۔ کپڑے چینج کیے بالوں کو رول کر کے کیچر میں جکڑا۔ ہلکی سی لپ اسٹک لگائی تبھی میر سالک اندر آئے موبائل چارجنگ سے اتارا ایک نظر اسے دیکھا اور باہر چلے گئے۔

''اسے مت لے جاؤ۔ ہم کھل کے آپس میں گپ شپ کر لیں گے۔ وہ ہینڈ بیگ کی اسٹریپ سے ابھی باہر آئی جب اس نے نازیہ باجی کی آواز سنی۔''

''آپا! وہ تیار ہے۔'' سالک منمنایا۔

''سب ریڈی ہے۔'' رحمین سالک کے قریب جا کر پوچھ رہی تھی۔

''رحمین! ایسا ہے کہ تم رہنے دو۔''

''خیریت ہے؟'' رحمین کو شاک لگا۔

''وہ ایکچوئیلی گاڑی میں جگہ نہیں ہے۔'' سالک نے بودا سا بہانہ گھڑا۔

''دونوں گاڑیوں میں جگہ نہیں ہے۔''

''سامان کافی زیادہ ہے ناں ...... تم تھک جاؤ گی بہت۔''

''اب اس بات سے زیادہ کیا مجھے تھکائے گا۔'' رحمین دل میں سوچ گئی۔

سب سے مل کر گیٹ لاک کر کے وہ بیڈ روم میں آ گئی۔ وہ کبھی اس طرح اکیلی نہ رہی تھی عجیب ہی لگ رہا تھا۔ نہ دھیان بٹ رہا تھا نہ توجہ نہ ٹی وی دل بہلا رہا تھا۔ اور موبائل بھی تنہائی دور کرنے سے قاصر تھا۔

☆☆☆

جھنجھلا کے ہاتھ رحمین نے نیچے گرائے تھے۔ یہ بال اسے اکثر ہی وبال لگتے سلجھاتے سلجھاتے بازو باقاعدہ درد کرنے لگتے۔ ایک تو لمبے دوسرا انتہائی گھنے۔

''میر صاحب!'' ایک ہاتھ سے دوسرا بازو دباتے اس نے سالک کو پکارا تھا۔

آفس کی فائلوں میں گم سالک نے ''ہوں۔'' کہا۔

''ہیلپ می ......'' رحمین کی دہائی پہ سالک نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

شرارت آنکھوں میں بھرے رحمین آگے بڑھی اور سالک کے بے حد قریب بیٹھتے بالوں کا ڈھیر اس کی گود میں گرایا۔

''رحمین ......'' وہ غصے سے چلائے۔

''کیا؟'' رحمین اس کے غصے سے خائف ہوئی۔

''کیا ہے یہ، آفس کی فائلز ہیں۔'' فائلز جھاڑتے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ گیلے بالوں سے خراب ہو جاتیں تو۔''

''ہوئیں تو نہیں ناں ......''

''اور اگر ہو جاتیں تو ...... کیا مسئلہ ہے بولو۔''

''کچھ نہیں ......'' نمکین پانیوں کو پپوٹے کے دروازے سے پیچھے دھکیلتے وہ رخ موڑ گئی۔

''رحمین ......'' سالک نے تنبیہہ کی۔

''یہ بال نہیں سلجھ رہے تھے۔''

''عجیب عورت ہو اپنے بال بھی نہیں سنبھال پاتیں۔'' سالک بڑبڑائے۔

''عورت نہیں ہوں میں۔'' وہ تڑخ کے بولی سارا غصہ الفاظ میں در آیا۔ میر سالک بے ساختہ ہنس دیے۔ تو رحمین کے لبوں پر بھی مسکراہٹ رینگ گئی باوجود اس کے کہ دل میں اندر کہیں چھوٹا سا مان ٹوٹ پھوٹ سا گیا تھا۔

☆☆☆

تنہائی اور ناسازیٔ طبع دونوں نے مل کر اس کی حالت خاصی خستہ کر رکھی تھی۔ سالک بھی فرینڈلی مزاج کا نہ تھا کہ اس کا جی بہلائے رکھتا سارا دن وہ پڑی رہتی یا پھر پورے گھر میں بولائے پھرتی ...... شام میں سالک اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تو ڈاکٹر الٹا سالک پہ بگڑی۔

''اتنی کمزور ہو رہی ہیں۔ آپ خیال کیوں نہیں رکھتے اس کا۔''

''یہ خود ہی کچھ کھاتی ہی نہیں ہے۔''

”بیمار بندہ خاک کچھ کھائے گا۔ آپ کا فرض ہے اس کا خیال رکھنا۔ اسے کھلانا پلانا۔“ نسخہ لکھ کر دیتی ڈاکٹر کہہ رہی تھی۔

”کیا کھانا ہے بتادو...... پھر میڈیسن لینی ہے۔“

”میرا دل نہیں چاہ رہا کچھ بھی کھانے کو......“ رحمین بے زاری سے بولی۔

”بریانی......!“

”نہیں......“

”سینڈوچ بنادوں؟“

”بالکل بھی نہیں۔“

”کوئی فروٹ......؟“

”میر صاحب! میرا واقعی بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا۔“ رحمین نقاہت سے بیڈ پر لیٹی۔

سالک خاموشی سے کچن کی جانب آ گیا چند منٹس بعد آیا تو اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی جس میں سیب کی قاشیں کالی مرچ اور نمک لگی تھیں۔

”اٹھو یہ کھالو۔“ اس نے پلیٹ آگے بڑھائی۔

”سیب کو دیکھ کر میرا ازیادہ برا حال ہوتا ہے۔“

”کھٹاک......“ رحمین جھٹکے سے اٹھی، پلیٹ زور سے دیوار پر ماری گئی تھی جو کئی حصوں میں بٹ چکی تھی۔

”نخرے ہی نہیں ختم ہوتے۔“ غصے سے بڑبڑاتے سالک دروازہ زور سے بند کرتے باہر چلے گئے۔

بہتے آنسوؤں کے ساتھ اور ایک پرانی یاد لیے رحمین اٹھی تھی۔

”بیٹا! بخار میں زیادہ کھاتے ہیں تا کہ زیادہ انرجی آئے اور بخار فوراً بھاگ جائے۔ وہ سیکنڈ ایئر میں تھی جب اسے عام موسمی بخار ہوا تھا۔“

”چلیں، تھوڑا سا دلیہ کھالیں۔“

”بابا! مجھے کڑوا لگتا ہے۔“ اس نے پلیٹ کھسکائی۔

”چلو یہ انگور کھالیں......“

”نہیں۔“

”سینڈوچ......“

”نہیں۔“

”کھچڑی......؟“

”نہیں ناں......“

”بتادیں جس پہ دل کر رہا۔“

”کسی پہ بھی نہیں۔“

”بیگم! سیب کاٹ کے لادیں۔“

”میں نہیں کھاؤں گی۔“

”بابا اپنے ہاتھ سے کھلائیں گے۔“

”پھر بھی نہیں۔“

”یہ لیں......“ امی نے پلیٹ آگے رکھی۔

”ٹی وی بھی آن کردیں۔“ بابا نے امی سے کہا۔

”چلو دونوں باپ بیٹی ٹی وی دیکھتے ہوئے کھاتے ہیں۔“ بابا نے قاش اس کی سمت بڑھائی۔ ان کے کندھے پہ سر رکھے رحمین نے منہ کھولا۔

ٹوٹی کرچیاں سامنے ہی بکھری تھیں۔ نجانے لڑکیاں شوہروں میں باپ کو کیوں ڈھونڈنے لگتی ہیں۔

☆☆☆

”تم تو آتی ہی نہیں ہو میں نے کہا میں ہی پتا کر آؤں۔“ ماریہ باجی آتے ہی شکوے شکایات کرنے لگی تھیں۔

”ایسی حالت میں کچھ کرنے کو دل کرتا ہے نہ ہی کہیں آنے جانے کو......“ رحمین اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔

”کہیں آنے جانے سے بلکہ دھیان بٹ جاتا ہے اور یہ کیا رف سا حلیہ بنایا ہوا ہے۔ چلو اٹھو شاباش چینج کر کے آؤ۔ میں چائے بناتی ہوں ہم دونوں کے لیے۔“

”میں آپ کے لیے چائے بنادیتی ہوں۔“

”تکلف نہیں کرو۔ تایا جان کا گھر تھا بچپن سے آنا جانا بھی ہے اور کچن میں بہت بار پکا کے سب کو کھلایا ہوا بھی ہے۔ نازیہ اور نازنین دونوں باقی

معاملات میں تیز ہیں مگر کچن کے کاموں کی چور ہیں۔ میں بخوشی پکا دیا کرتی تھی جب بھی تائی جی کو ضرورت ہوتی تھی۔" ماریہ باجی اٹھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"چائے نہیں پی جائے گی مجھ سے۔"

"کوئی شیک یا جوس وغیرہ......"

"آپ خود ہی فریج میں دیکھ لیں۔"

"کوئی فریش کلر پہننا۔" ماریہ باجی نے جاتے جاتے تاکید کی۔

"یہ قلفہ رکھا ہوا ہے۔"

رحمین نے ایک کاہی پنک کلر سوٹ نکالا جس پہ شیشے کا کام تھا ساتھ ٹشو کا دوپٹا۔

"جی باجی! میر جی لائے تھے میرا دل نہیں چاہا۔"

"قلفہ شیک بنا رہی ہوں پھر۔"

"بہت ہیوی ہو جائے گا۔" بال بناتے رحمین نے دہائی دی۔

"تم ہاف گلاس لے لینا۔"

ہلکی سی لپ اسٹک لگا کر جب وہ باہر آئی تو ماریہ باجی کی تعریف پہ جھینپ گئی۔

"دیکھنا کتنا فریش فیل کرو گی اب تم۔" ماریہ باجی اسے گلاس تھماتے ہوئے کہا۔

"میر صاحب کے آنے کا وقت ہے ابھی تک آئے ہی نہیں۔"

تبھی ڈور بیل بجی اور سالک اندر آئے۔

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔" ماریہ باجی نے اسے چھیڑا۔

"السلام علیکم! ماریہ باجی! کیسی ہیں آپ؟" سالک بیگ سائیڈ پہ رکھے صوفے پہ بیٹھے۔

"کرم اللہ پاک کا......" رحمین کچن سے شیک لے آئی۔

"کیسا سالک صاحب؟"

"زبردست۔"

"میں آپ کی بیوی کی بابت پوچھ رہی تھی۔" ماریہ باجی نے چھیڑا۔ سالک خاموشی سے شیک پیتے رہے۔

"میں چلتی ہوں بچے آنے والے ہوں گے۔" ماریہ باجی اٹھیں تو رحمین انہیں گیٹ تک چھوڑنے کے لیے آئی۔

"یہ کیوں آئی تھیں؟"

رحمین واپس آ کر بیٹھی تو میر سالک درشت لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

"ویسے ہی آئی تھیں۔" رحمین میر سالک کے لہجے پہ حیران تھی۔

"تمہیں منع کیا تھا ناں اس سے میل جول رکھنے پر، نازنین اور نازیہ آپی کے ان کے ساتھ اتنے ایشوز رہے ہیں۔"

"لیکن میرا تو کوئی ایشو نہیں ہے۔" رحمین نے جرح کی۔

"تو کیا تم اس گھر کا حصہ نہیں ہو یا باجی کو اس گھر کا حصہ دار نہیں سمجھتیں۔"

"میں صرف یہ کہہ رہی ہوں۔ وہ ہمارے ہمسائے ہیں ہمیں ان کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے ہیں۔"

"بس بحث کیے جاتی ہے یہ نہیں کہ شوہر ایک چیز سے منع کر رہا ہے تو رک جاؤ۔"

لیکن کوئی وجہ بھی تو ہو۔ وہ کہنا چاہتی تھی پر اس سے کہا نہ گیا۔

☆☆☆

اس نے مبہم سے واضح ہوتی اس دستک کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی سنا تھا۔

"اب پلٹے ہو مسافر جب عمر رہی نہ موسم نہ ہی بہاریں۔" وہ بے زاری سے دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"نہ چاہ رہی ہے نہ امنگ نہ ہی آرزو، خوشیوں کی تتلیاں خوش رنگ پنکھ کھو چکی ہیں۔ خزاں بہاروں پہ حاوی ہے برسوں سے رنگ اپنی اہمیت اور قدر نہ ہوتے دیکھ کر کسی اور جہاں کو سدھار چکے ہیں۔ لبادہ سیاہ ہے میرا، سیاہ پوش اجڑے دیار سے اب کیا لینا

دینا۔"

☆☆☆

اپنے وجود کے حصے کو اس نے تشکر آمیز لبوں اور نم آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کیا واقعی وہ اس قابل تھی کہ دنیا کا سب سے بڑا رتبہ اسے دے دیا جاتا۔ اور آخرت کی سب سے بڑی چیز اسے تھما دی جاتی۔ وہ بھی قدموں کے نیچے۔

"الٰہی تیرا شکر......" اس کی بیٹی نہ صرف صحت مند تھی بلکہ بے حد خوب صورت بھی۔ اس کا دل شکر سے بھرا رہتا اگر جو وہ لوگوں کے رویے نہ محسوس کرتی۔

پہلی ہی بیٹی...... اسے لوگوں کی سوچ پہ گھن آئی۔ میر سالک بھی اتنے خوش نہ دکھائی پڑتے تھے جتنا انہیں ہونا چاہیے تھا۔

"میر صاحب......" وہ کسی کام سے اندر آئے تھے جب رحمین نے پکارا۔ "آپ خوش نہیں ہیں بیٹی پا کر؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

"نظر نہیں آتے خوش۔"

"خوش ہوں لیکن بیٹا ہوتا تو زیادہ اچھی بات تھی۔"

رحمین چپ کی چپ رہ گئی۔

تین دن امی اس کے پاس رہیں۔ پھر وہ چلی گئیں تو ایک جز وقتی ملازمہ آ جاتی۔

پہلا بچہ ہونے کے باعث رحمین کو انجل میر کو سنبھالنے میں کافی مشکل پیش آتی۔ ایک دن ماریہ باجی چلی آئیں۔ رحمین نے انجل کو نہلا کے لٹایا ہی تھا۔ ان کو بیٹھنے کا کہہ کر وہ بچی کو کپڑے پہنانے لگی۔

"ایسے نہیں پہناؤ، پہلے مالش کرو۔"

"نہانے کے بعد......!" ماریہ باجی کی بات پر اس نے حیرانی سے دیکھا۔

"ہاں، تم آئل لے کر آؤ میں کرتی ہوں۔"

ماریہ باجی انجل کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئیں۔ ٹانگوں پہ اچھی طرح مالش کر کے ڈائپر لگایا۔ الٹا کمر پر ہلکے ہلکے ہاتھ پھیرنے لگیں۔

رحمین بغور دیکھ رہی تھی تبھی رانی (ملازمہ) موبائل لے آئی۔ نازنین کی کال تھی رحمین نے وہیں کھڑے رسیو کی، ویڈیو کال پر پیچھے کا منظر باآسانی نظر آ رہا تھا پھر بھی نازنین باجی نے پوچھ ہی لیا۔

"یہ ماریہ اکثر ہی آئی رہتی ہے۔"

"جی کبھی کبھار آ جاتی ہیں اور آج تو بہت اچھا ہوا آ گئیں انجل کو اتنی اچھی مالش کر رہی ہیں۔" رحمین اپنی سادگی میں بتا گئی۔

چند ایک ادھر ادھر کی باتیں کر کے نازنین نے کال بند کر دی۔

"اپنی امی کے ہاں کب جا رہی ہو؟" رحمین کے بیٹھتے ہی انہوں نے پوچھا۔

"پرسوں ان شاء اللہ۔"

"اچھی بات ہے دیکھنا اب خوب سوئے گی تمہارے ہٹلر آنے والوں ہوں گے ایسے گھور کے دیکھتے ہیں۔ چلتی ہوں میں تو۔"

"ارے نہیں، آفس سے تھکے آتے ہیں سو آپ کو فیل ہوا ہوگا۔" رحمین کو خواہ مخواہ شرمندگی ہوئی۔

"ہے نا......" ماریہ باجی جاتے ہوئے عام سے لہجے میں بولیں۔

"ماریہ باجی آئی تھیں آج؟" آفس سے واپسی پہ ٹائی کی ناٹ کھولتے سالک پوچھ رہے تھے۔

"آپ کو کس نے بتایا؟" وہ حیران ہوئی۔

"جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔"

رحمین کو سمجھ میں نہیں آیا ان کے لہجے میں غصہ کیوں تھا۔

"جی آئی تھیں۔"

☆☆☆

میر سالک کو آفس میں کچھ ضروری کام تھا سو اسے لینے بھیا آئے تھے۔ سالک لنچ ٹائم میں تھوڑی دیر کے لیے اسے سی آف کرنے آئے تھے۔ سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا بھیا باہر گیٹ کے پاس

کھڑے تھے۔

''میں نے کافی سارے سالن فریز کر دیے ہیں۔ فارون پرسن کے ٹیگ والے آپ اکیلے کے لیے ہیں۔ فارٹو اور مور پرسن والے آپ کے ساتھ اگر کوئی ہو تب کے لیے ہیں۔'' رحمین کو جاتے جاتے بھی کئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

''دودھ والا دودھ بوائل کر کے دیا کرے گا روز یاد سے پی لیا کرنا......''

''اور کچھ......'' اس کے چند منٹ توقف پہ سالک نے چھیڑا تھا۔

''اور مجھے یاد کرتے رہنا......'' وہ کہنا چاہتی تھی مگر ان کے رشتے میں ابھی اتنی بے تکلفی آئی ہی نہ تھی۔ کہ کوئی خوش کن بات اگلے کے موڈ کی پروا کیے بغیر کہہ دی جاتی۔

''انجل کا خیال رکھنا......'' گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے سالک نے بچی کے ماتھے پہ بوسہ دیتے ہوئے کہا تو رحمین کی آنکھیں تفخر سے نم ہوئیں۔

''میں کچھ زیادہ ہی سالک سے بدگمان رہتی ہوں۔'' گاڑی کے ساتھ سوچ بھی رواں ہوئی۔

بابا ابھی کام پر تھے اور امی نے اس کے لیے ڈھیروں اہتمام کر رکھا تھا۔ انجل کو امی کے حوالے کر کے فریش ہو کر آئی تو بابا بھی آتے دکھائی دیے۔

''آج بھی کام پر تھے آپ؟'' وہ نروٹھے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''گھر میں سے نہ کٹتا بیٹا۔ انتظار کا ایک پل کئی گھنٹوں پہ محیط ہوتا۔ ایک دن تین دن کے برابر ہوتا۔ ماشاء اللہ، میرے باغیچے کی چہکار آئی ہے۔'' بابا اس کے ماتھے پہ بوسہ دیتے بولے۔

''واہ واہ! شادی کے کمال، بلی کی گھنٹی، باغیچے کی چہکار بن جاتی ہے۔'' بھیا نے تان اڑائی۔

''پرائی چہکاروں کے آسرے پہ مت رہیں۔ اپنی چہکار بھیا کی دلہن کی صورت لے آئیں اب۔''

''توبہ توبہ، ابھی کہیں تو گھر میں سکون نے ڈیرے ڈالے ہیں فوری رخصت کر دیں کیا؟''

''میری رحمت اپنی رحمت کے ساتھ آئی ہے۔'' ادھر آؤ میرے پاس مجھے دو انجل اور خبردار ہم نانا نواسی کو گھنٹہ بھر سے پہلے کسی نے پیچانا بھی تو۔'' بابا انجل کو لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھے تو رحمین ان کے اتاؤلے پن پہ ہنس دی۔

کھانا کھا کے سب لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ بابا سنگل صوفے پہ بیٹھے تھے۔ رحمین ان کے گھٹنوں پہ بازو رکھے نیچے کارپٹ پہ بیٹھی تھی۔ ساتھ والے صوفے پہ امی دھیان کمرے کی جانب کیے بیٹھی تھیں جہاں انجل سو رہی تھی۔ بھیا ٹانگیں لمبی کیے موبائل میں گم کارپٹ پہ بیٹھے تھے۔ مدھم آواز میں ٹی وی چل رہا تھا۔ تبھی امی کے فون کی گھنٹی بجی۔

''سالک کی کال آ رہی ہے لو تم بات کرو۔'' امی نے موبائل ان کی جانب بڑھایا۔

''رحمین نے نا سمجھی سے گود میں پڑے موبائل کی ساکت اسکرین کو گھورا۔''

''مجھ سے بات کرنا ہوتی تو میرے موبائل پہ کرتے ناں۔''

''السلام علیکم۔ سالک بیٹے۔'' امی نے کال اٹھائی تھی۔

''کرم اللہ کا، آپ سناؤ بیٹے۔''

''جی جی کرو......''

''کیا؟ کیسے مطلب۔'' امی نے حیرانی سے رحمین کی جانب دیکھا کبھی امی کی طرف متوجہ ہوئے۔

''میں پوچھوں گی۔ مجھے تو کبھی اس نے کچھ بتایا ہی نہیں۔'' امی باہر کی جانب چل دیں۔ رحمین کا دل اندر سے کانپا کچھ انہونی سی تھی۔

''سب خیریت تھی ناں بیٹے۔'' بابا جھک کر اس کا چہرہ دیکھتے پوچھ رہے تھے۔

''جی بابا......'' وہ یہی کہہ پائی، سب کا دھیان باہر ہی تھا۔ قریب دس منٹ بعد امی آئی تھیں۔

''رحمین! تمہاری بہت شکایتیں کر رہے تھے سالک۔'' امی قصداً مسکرائی تھیں۔

''کیا؟'' رحمین کی آواز گویا کسی کنوئیں سے آئی

تھی۔
''یہی کہ اپنا خیال نہیں رکھتی ہو، نہ کھانے پینے کا، نہ دوا وغیرہ کا۔''
''دیکھی میں کیوں رنگ کیسا پیلا ہو رہا ہے، رحمین کا۔'' بابا بولے تھے۔ ''کھایا پیا کرو بیٹا۔''
''جی بابا......'' رحمین نے امی کی جانب دیکھا تو انہوں نے نگاہ چرائی۔ بات کچھ اور تھی۔
رات امی رحمین کے کمرے میں ہی سونے آ گئیں انجل کی وجہ سے کہ کسی چیز کی ضرورت وغیرہ نہ ہو۔
''یہ ماریہ باجی کا کیا سین ہے؟'' رات کمبل میں لیٹتے امی پوچھ رہی تھیں۔
''کیوں کیا ہوا؟''
''تم بتاؤ تو......'' امی نے اصرار کیا۔
''سالک نے آپ سے یہ کہا...... اوہ مائی گاڈ!'' دکھ تھا اور شدید تھا۔ شدید حیرت سے اس سے آگے بات بھی نہ کی گئی۔
سالک بہت غصے میں تھا اور کہہ رہا تھا کہ تم اس کی بات کی پروا نہیں کرتی ہو۔ اسے نہیں پسند تمہارا ماریہ باجی سے زیادہ میل جول ......تم پھر بھی ہر دوسرے دن انہیں گھر بلائے رکھتی ہو۔ خوش گپیاں کرتی رہتی ہو۔''
''ایسا کچھ نہیں ہے امی، نازنین اور نازیہ باجی کی درحقیقت ماریہ باجی سے نہیں بنتی انہوں نے ہی سالک سے کہہ رکھا ہے کہ میں ان سے نہ ملوں اور امی میں ملتی بھی نہیں۔ سوائے ایک بار دعوت کے میں تو آج تک ان کے گھر بھی نہیں گئی۔ وہ کبھی کبھار خود آجاتی ہیں تو بول لیتی ہوں۔ گھر سے نکالنے سے تو رہی۔ حالانکہ وہ جب بھی آتی ہیں تو میری بہت ہیلپ کرتی ہیں۔'' آنکھوں کے علاوہ رحمین کا لہجہ بھی نم تھا۔
''لیکن پھر بھی بیٹا، احتیاط کیا کرو اور کسی دن موقع دیکھ کر ماریہ کو نرم لہجے میں بتا بھی دینا۔''
''بات بڑی تھی نہ دل آزاری کی مگر رحمین کو سالک کو رویہ بہت بری طرح چبھا تھا۔ اس نے ماریہ سے میل جول پہ ناپسندیدگی کا اظہار ضرور کیا تھا۔ اگر وہ سختی سے کہتے بھی تو وہ گھر بھی نہ آنے دیتی۔ رحمین کی وہ لگتی ہی کیا تھیں۔ مگر اس طرح کسی اور سے اپنا معاملہ ڈسکس کرنا بھلے وہ رحمین کی امی ہی ہوں۔ رحمین کو اس پوری رات نیند نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

دوپہر لاؤنج میں وہ ٹی وی آن کیے بیٹھی تھی۔ جب اس کے ساتھ کوئی آ کے بیٹھا تو وہ چونکی بابا تھے۔
''میری بیٹی اتنی خوش کیوں نہیں دکھتی جتنا تصور میں میں سوچا کرتا تھا۔''
''بے فکری کا دور اور ہوتا ہے بابا، جب قہقہے ابل پڑتے تو بے تاب ہوتے ہیں۔ یہ ذمہ داریوں کا دور ہے میرا۔ قہقہوں کی عمر گزر گئی ہے۔'' بابا کے کندھے پہ سر رکھے وہ بولی۔
''مجھے لگتا ہے بیٹا، میں تمہارے معاملے میں کچھ غلطی کر گیا ہوں۔'' بابا آزردہ تھے۔
''ایسا کچھ بھی نہیں ہے بابا! میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔'' رحمین سیدھی ہو بیٹھی۔
''قہقہوں کی عمر گزر گئی۔ ٹھیک ہے مان لیا تمہاری آنکھیں اتنی بے رنگ سی کیوں ہیں؟ ایسے لگتا ہے جیسے برسوں انہوں نے کوئی خوش رنگ سپنا نہیں دیکھا، تم تو تتلی کی مانند اڑا کرتی تھیں چڑیا کی مانند چہکتی تھیں۔ آبشار سی بہتی تھیں، ایک دم سے ندی سا ٹھہراؤ، شام کا راہ بھولا ہراساں پرندہ دکھتی ہو۔''
اگر ہمیں لگتا ہے، ہم اپنے ہی بڑوں سے باتوں میں جیت سکتے ہیں، خوش گوار لفظوں سے ان کا خیال بٹا سکتے ہیں تو قطعاً غلط لگتا ہے، ان کا برسوں کا تجربہ ہماری ہر چیز سے بھاری پڑتا ہے۔
رحمین نے سر دوبارہ بابا کے کندھے پہ رکھا ان کا بازو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیا۔ دو بے رحم آنسو اس کا پول کھولتے بابا کے بازو کی آستین میں پیوست ہوئے۔
وہ کیا بتاتی کہ وہ چاہی گئی عورت نہیں تھی۔ اس

کوسالک کا نام ملا تھا، مان نہیں۔ اس کے سر پہ ردا تھی جس کے خار اسے بری طرح چبھتے تھے، وہ سراہی نہیں گئی تھی۔ اسے پیار کے بول ملے تھے نہ چاہت بھرے لہجے۔ ایسے ہی تھا جیسے کسی خوب صورت باغ سے خوب صورت پھول والا پودا اکھیڑ کے صحرا میں لگا دیا جائے اور زندہ رہنے کے ضروری لوازمات اسے ملتے رہیں تو زندہ تو شاید وہ رہ جاتا ہے مگر صحرا کی تپش اور دھول سے اپنا رنگ وروپ کھو بیٹھتا ہے۔

''میری بیٹی مجھے معاف کرنا۔'' زیرلب بڑبڑاتے بابا نے اس کا ماتھا چوما تھا۔

☆☆☆

اس کا ہلکا پھلکا سا وجود ہوا میں ہلکورے بھرتا پھرتا تھا۔ اچانک کسی کھٹکے سے اسی کے وجود کو جھٹکا لگا۔ انجل کو تھپکتے اسے بھی اونگھ آ گئی تھی۔ دروازہ ناک ہو رہا تھا یہ سالک کے آنے کا وقت نہیں تھا۔ دوپٹا اوڑھتی وہ دروازے تک آئی میجک آئی سے دیکھا تو ماریہ باجی تھیں وہ چند پل تذبذب میں کھڑی رہی اور پھر بالآخر ایک فیصلہ کر کے دروازہ کھول ہی دیا۔

''بڑی کنجوس ہو بھئی۔ بھائی کی منگنی کا لڈو تک نہ بھیجا میں تو اتنے دن انتظار میں رہی۔'' ماریہ باجی بے تکلفی سے کہہ رہی تھیں۔

''جی بس دھیان نہیں رہا۔''

''مبارک ہو بے حد، اللہ آنے والے قدم مبارک کرے۔''

''شکریہ......''

دونوں آمنے سامنے صوفوں پہ بیٹھی تھیں۔ رحمین کی حالت ایسی تھی کہ ابھی بھاگ اٹھے گی۔ تبھی اس کی نگاہ وال کلاک پہ پڑی میر سالک کے آنے میں آدھا گھنٹہ رہ گیا تھا۔

''ماریہ باجی......'' انگلیاں مروڑتے وہ کنفیوز تھی۔

''کیا بات ہے رحمین؟''

''آپ پلیز یہاں نہ آیا کریں۔''

ماریہ باجی گنگ سے اسے دیکھے گئیں۔

''وہ اصل میر صاحب کو پسند نہیں آپ کا آنا......انہوں نے منع کیا ہے۔''

''تو وہ خود کہہ دیتے تمہیں کیوں آگے کر رہے ہیں۔'' وہ اٹھ کے جاتے ہوئے بولیں۔

''ماریہ باجی......'' اس نے پیچھے سے آواز دی۔

''آئی ایم ساری......''

''اٹس اوکے......'' ماریہ باجی قریب آئیں اس کا کندھا تھپکا اور پلٹ گئیں۔

رحمین نم آنکھوں سے انہیں جاتا دیکھے گئی۔

''کیا ہوا کون ہے ہسپتال میں......؟'' رحمین کافی بنا کر لائی تو میر سالک کو حیران سا کال سنتے پایا۔

''میر صاحب کیا ہوا۔''

''کال ڈراپ ہو گئی ہے اور میرے پاس بیلنس بھی نہیں۔''

''ہوا کیا ہے؟'' وہ سائیڈ ٹیبل پہ کافی رکھتے پریشان ہوئی۔

میر سالک اس کے قریب آئے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کچھ بولتے بولتے رکے اور آگے بڑھ گئے۔

''میں لوڈ کروا کر آتا ہوں۔''

''کیا ہو سکتا ہے؟'' وہ سوچتے ہوئے صوفے پہ بیٹھی۔ چند ہی پل ہوئے ہوں گے جب کوئی گیٹ کھولتا تیزی سے آیا۔

''میر جی......!'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر وہ ماریہ باجی تھیں اسے شدید حیرت ہوئی۔ وہ آتے ہی اس کے گلے لگ گئیں۔ رحمین نے نوٹس کیا وہ رو رہی تھیں۔

''تمہارے بابا نہیں رہے رحمین، ہارٹ اٹیک سے ان کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔''

زمین قدموں تلے سے کیسے نکلتی ہے آسمان کیسے چھنتا ہے آج حقیقتاً رحمین کو پتا چلا تھا۔ ایک دم سے اس کا وجود ہلکا ہو گیا۔

☆☆☆

ہر رشتے کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اگر وہ پورے کر لیے جائیں تو رشتہ بھی عمدگی سے اور خوب صورتی سے نبھتا ہے ورنہ نبھانے والے تو نباہ کرتے ہی رہتے ہیں۔ رحمین کی زندگی کا خوب صورت ترین رشتہ چھنا تھا، آتے آتے صبر بھی آ ہی رہا تھا۔ پانچ ماہ ہو گئے تھے پر ایک چبھن اور پھانس تھی جو کبھی کبھار کلبلاتے کیڑے سی الجھن پیدا کرتی تھی۔ کاش میر ایک بار صرف ایک ہی بار اسے اچھی طرح دلاسا دیتا، خوش کن لفظوں کا سہارا دیتا۔ اسے کہتا میں ہوں نا رحمین۔ باپ سی شفقت نہ بھی دے پاؤں تو تحفظ ان سے بڑھ کے دوں گا۔ ان سی محبت نہ بھی دوں تو عزت ان سے بڑھ کے دوں گا۔ مگر مادیت پرستی کی انتہا تھی۔ اس کی ساس اور نندوں نے فون پہ رسمی سی تعزیت کی تھی اور شوہر تیسرے دن بعد سے ہی نارمل تھے۔ اس کا جی چاہتا وہ اپنے بابا کی ڈھیروں باتیں کرے مگر سنتا کون......؟ ایک دو بار اس نے ذکر کرنا چاہا بھی تو سالک نے کوئی اور بات چھیڑ دی۔ اس کے بعد سے رحمین انجل کے ساتھ میر کی غیر موجودگی میں باتیں کرتی اور کرتی ہی رہتی۔

ایک ہفتہ رہ گیا تھا بھیا کی شادی میں۔ امی کی تنہائی کا احساس کر کے بھیا مان ہی گئے تھے شادی کے لیے بابا کے ہی دور پار کی کزن امی نے بھیا کے لیے پسند کر رکھی تھی۔

''میر جی! مجھے شاپنگ کے لیے جانا ہے۔ رات کھانے کے بعد وہ سالک سے کہہ رہی تھی۔''

''کیا لینا ہے؟''

''انجل کی شاپنگ کرنی ہے اور بھیا اور امی کو دینے والا سوٹ چاہیے۔ اپنا تو وہی چلا لوں گی میں سب۔''

''ٹھیک ہے۔ کل ماریہ باجی کے ساتھ چلی جانا۔''

رحمین کا پارہ ایک دم سے چڑھا وہ کیا کٹھ پتلی تھی جس سے روک دیا جاتا ہے بغیر وجہ ہی ملنے سے وہ رک جاتی اور جب اجازت دے دی جاتی مل لیتی۔ اس کے کوئی جذبات احساسات نہیں تھے کیا؟

''آپ چلے چلتے ساتھ، ماریہ باجی کو خود ہی تو ملنے سے منع کر رکھا ہے۔''

''میرے پاس ٹائم نہیں آگے تمہاری مرضی۔'' وہ روکھے سے لہجے میں بولے۔

''آپ آفس سے آجائیں گے پھر چلے جائیں گے۔ آپ ہوں گے انجل کے پاس۔''

''اس کو ساتھ ہی لیتی جانا مجھ سے نہیں سنبھلے گی۔'' سالک نے کورا سا جواب دیا۔ وہ پیسے مانگنا چاہتی تھی مگر اس کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

صبح ناشتے کے بعد میر نے خود سے والٹ نکال کے پیسے اسے تھما دیے وگرنہ وہ تو دوبارہ بھی ہمت نہ کر پاتی۔

واکنگ ڈسٹنس پہ ہی مارکیٹ تھی مگر اتنا سا چلنے پر ہی رحمین کا سانس پھول گیا۔ حالانکہ ماریہ باجی نے آدھے راستے سے انجل کو بھی اس سے لے لیا تھا۔ پہلی شاپ پہ ہی وہ بے دم ہو کر بیٹھ گئی۔

''ماریہ باجی! آپ خود ہی پلیز کچھ بھی پسند کر لیں، میری تو طبیعت بہت خراب ہو رہی۔''

ماریہ باجی نے ہی امی اور بھائی کا سوٹ پسند کیا۔ شاپ سے نکلے ہی تھے کہ سامنے فوڈ کارنر تھا۔ ماریہ باجی اسے لیے اندر گھسیں آؤ جوس پی لیں پہلے ایپل کا فریش جوس پیتے ہی اسے زور کی ابکائی آئی اور وہ واش روم کی سمت بھاگی۔

''صبح آلو کا پراٹھا کھا لیا تھا ہیوی سا۔ آئی تھنک فوڈ پوائزننگ ہو رہی......'' واپس آ کر ماریہ باجی کے پاس بیٹھتے ہوئے بے دم سی وہ بولی۔

''آر یو شیور......؟'' انہوں نے رحمین کو جانچا۔

''مطلب......؟'' رحمین کنفیوز ہوئی۔ ''اوہ، مے بی......'' رحمین کو اب سمجھ آئی تھی۔

''انجل کی شاپنگ کر لیں پھر چیک اپ بھی کروا لیتے ہیں۔'' باجی نے اس کی گود سے انجل کو پکڑا۔

شاپ کے اندر داخل ہوتے ہی رحمین اجل کو لیے صوفے پہ جا بیٹھی اور لسٹ ان کو پکڑا دی۔ عجب بیزاری تھی وہ ارد گرد پھرتے لوگوں کا جائزہ لیے گئی۔ اولاد کا بوجھ عورت ہی ڈھوتی ہے ہمیشہ۔

تبھی ماریہ باجی سب کچھ لیے آ گئیں۔ اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر انہی کے اصرار پر کلینک چلی آئی۔ پازیٹو رپورٹ اس نے بے تاثر چہرے کے ساتھ پکڑی۔ ماریہ باجی نہ صرف اسے چھوڑنے آئی تھیں بلکہ سب شاپنگ سمیٹ کر بھی گئی تھیں۔

"تم لیٹ جاؤ، کچھ دیر بچے آنے والے ہوں گے میں ذرا گھر جا کر کچن دیکھ لوں۔"

لوگوں کو از خود پرکھنا چاہیے ماریہ باجی کتنی اچھی نیچر کی ہیں ناں، ایک بار رسمی طور سے جتایا بھی نہیں کچھ بھی۔ خدا انہیں اجر دے۔" گہری نیند میں جانے سے پہلے رحمین نے انہیں دعا دی۔

☆☆☆

بھیا کی شادی خیر و عافیت سے انجام پائی تھی۔ مومنہ بھابھی کسی مومن سا دل لیے ہوئے تھیں۔ پاکیزہ، شفاف اور وسیع۔ جہاں بابا کے لیے دل اداس تھا وہیں امی اور بھیا کے لیے اسے تسلی ہوئی تھی۔ وہ فقط تین دن پہلے آئی تھی۔ سالک مہندی کی رات پہنچے تھے۔ رحمین کی طبیعت عجیب بوجھل اور بیزار تھی وہ خود کچھ دن رکنا چاہ رہی تھی۔ ولیمے کی رات سالک مہمانوں کو نبٹاتے ہوئے آئے۔

"ہاں کیا ارادے ہیں؟"

"میں کچھ دن رکنا چاہ رہی ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو......؟"

"مرضی ہے تمہاری......" مرضی مسلط کرنے والا مرضی تمہاری کہہ کر جا چکا تھا۔

رحمین بجھے دل کے ساتھ روم میں آئی۔ نجانے میر صاحب کو ہر وقت کس چیز کا غصہ رہتا ہے۔ وہ خوش گواریت سے بات چیت کیوں نہیں کرتے؟ وہ جیسا چاہتے رحمین جان مار دیتی ویسا بننے کو۔ مگر سارا مسئلہ ہی تو یہی تھا کہ رحمین آج تک جان ہی نہ پائی

تھی کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ باوجود انتہائی کوشش کے۔

سالک کا رویہ اس کے اندر چڑچڑاہٹ اور غصہ بھرتا جا رہا تھا۔ وہ سوفٹ اور فرینڈلی نیچر کی تھی۔ مگر جانے کیوں اب غصیلی اور روکھی ہوتی جا رہی تھی۔

آج پانچواں دن تھا اسے امی کے ہاں، ان پانچ دنوں میں ہر دن اس نے کم از کم پندرہ پندرہ بار تو کال ضرور ہی کی تھی مگر سالک نہ تو اس کی کال پک کر رہے تھے نہ ہی میسج کا رپلائے کر رہے تھے عجیب ہی طریقہ تھا اسے اذیت میں رکھنے کا۔ ایسا نہیں تھا کہ رحمین کے بغیر اسے کچھ مشکل پیش آ رہی ہو یا وہ اس کا عادی ہو۔ لنچ ہمیشہ آفس میں کرتے تھے۔ ناشتا بھی موڈ ہوتا تو خود ہی بنا لیتے۔ وہ بس ہمیشہ رحمین کو ٹینشن میں رکھنا چاہتے تھے۔

دو چار دن اس نے بھی پروا ہی نہ کی پھر پریشان رہنے لگی۔ ایک دن ہمت کر کے امی کو بھی نرم لفظوں میں بتا ہی دیا۔ وہ حسب توقع فوراً ہی پریشان ہو گئیں۔

"بیٹا! یہ رویہ تو قطعاً غلط ہے جب ان کا موڈ ٹھیک ہو۔ انہیں سمجھایا کرو۔ بتایا کرو۔"

"ان کا موڈ ٹھیک ہوتا ہی کب ہے امی ......" رحمین تلخی سے بولی۔

"اتنی ذہین ہو تم ...... مجھے اور تمہارے بابا کو تو فخر تھا تمہاری ذہانت پر، اپنے ذہن سے سوچو کوئی حل تو ہو گا ناں۔"

"ذہانت کی حد ہوتی ہے امی، جہالت کی نہیں۔ ذہانت تو ایک دو دلائل کی مار ہے فقط اور جہالت لا محدود۔ وہ مجھ سے دلائل سے بات ہی نہیں کرتے ہر بات میں جہالت اور پھر غصہ......"

"صبر کرو بیٹا، اللہ ہدایت دے گا۔ تمہاری بجو بھی کتنی پریشان رہتی تھیں ناں اللہ نے سب حالات ٹھیک کر دیے۔"

"حالات سہنے آسان ہیں امی، پر لوگ سہنے مشکل، کٹھن بے حد اور مرد کو سہنا تو بہت ہی کٹھن ہوتا ہے۔ اور جہاں تک صبر کی بات ہے امی، جوانی کے

سال صبر کے لیے نہیں ہوتے۔ جوانی کا صبر انسان کا دل مار دیتا ہے۔"

تبھی بھیا اندر آئے تھے۔ اجل کو اپنے اوپر بٹھائے وہ بے تکلفی سے بیڈ پر لیٹے تھے۔

"امی! آج تو آپ کے ہاتھ کی گلابی چائے پینے کو دل کررہا۔"

"میں بنالاؤں؟" رحمین اٹھی تھی۔

"پلیز، میں معدہ واش نہیں کروانا چاہتا۔" انتہائی غیر سنجیدہ بات انہوں نے سنجیدگی سے کہی تھی۔

"میں بنا کے لاتی ہوں، امی اٹھ کھڑی ہوئیں۔"

"سب سیٹ ہے ناں بہنا....." امی کے جاتے ہی بھیا نے پوچھا۔

"جی....." رحمین نے سر جھکایا۔

"سالک بھائی کی کال آئی تھی۔" رحمین نے بے یقینی سے بھیا کو دیکھا۔

"کہہ رہے تھے اگر تمہارا دل بھر گیا ہے یا تم آنا چاہتی ہو تو وہ آکر لے جائیں؟" رحمین سے کچھ بولا نہ گیا۔ اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر آئیں۔

"کوشش کیا کرو جو باتیں اسے ناپسند ہیں وہ نہ کرو۔" رحمین کو لگا تھا بھیا کچھ اور کہتے کہتے رکے تھے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"صبح کچھ ٹائم کے بعد وہ لینے آئیں گے تیاری رکھنا۔"

☆☆☆

ناشتے کے بعد سے ہی رحمین نے پیکنگ کرنا شروع کردی۔

"کہاں کی تیاری ہے؟" امی نے حیرانی سے پوچھا۔

"گھر کی....."

"سالک آرہا ہے لینے..... کال کی تھی؟"

"جی میسج ملا ہے آج دوپہر کے بعد آئیں گے۔"

"چلو پھر میں مومنہ کے ساتھ مل کر کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔"

"بھابھی ابھی ابھی آئی ہیں۔ اچھا نہیں لگتا اور پتا نہیں میر جی کھانا کھائیں گے بھی کہ نہیں۔"

"داماد کے آگے کھانا تو رکھنا ہی پڑتا ہے کھائے یا نہ کھائے اس کی مرضی..... امی کچن کی جانب چل دیں۔"

میر سالک آئے سب سے نارملی ملے۔ شام ان کے ساتھ ڈھلی تھی گھر پہنچنے تک اجل کو سلا کر وہ باہر آئی تو سالک لیپ ٹاپ کھولے بیٹھے تھے۔

"کافی یا چائے؟"

"کافی....." انہوں نے لیپ ٹاپ پر سے نگاہیں ہٹائے بنا کہا تھا۔

اپنے لیے چائے کی طلب سے منہ موڑ کر اس نے دو مگ کافی بنائی تھی۔ سالک کا مگ اسے تھما کر وہ بھی پاس ہی بیٹھ گئی۔

"میر صاحب....." مگ کے کنارے پہ انگلی پھیرتے وہ الفاظ جوڑ رہی تھی۔

"ہوں....." کافی کا گھونٹ بھرتے انہوں نے ہنکارا بھرا۔ وہ نیچی نگاہیں کیے الفاظ ترتیب دیتی رہی۔

"کہو....." سالک نے ایک نظر اسے دیکھا۔

"آپ نے بھیا کو کال کی تھی؟"

"ہوں کی تھی۔"

"آپ مجھے کال کرلیتے۔"

"تمہارے موڈ کا مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔" وہ لاپروائی سے بولے۔

"کال کرتے تو پتا چل جاتا ناں۔"

"کیوں، تمہارے بھائی کو کردی ہے تو کیا قیامت آگئی ہے؟"

"نہیں۔ قیامت تو نہیں آئی۔ آپ سے ایک ریکویسٹ کرنی ہے۔"

"بول چکو۔"

"ہمارا کوئی بھی ایشو ہو یا کوئی بھی بات، آپ مجھ تک رکھا کریں پلیز۔ بھیا کو کال مت کیا کریں۔"

ایک تو مناسب بھی نہیں لگتا، دوسرا بھیا کی اپنی مصروفیات ہیں۔"

"اچھا تو اکیڈمی چلانے والے مصروف رہنے لگے ہیں۔" سالک کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

"اکیڈمی چلانے والے نے اپنا ذاتی گھر اور اچھے ماڈل کی گاڑی بھی لے لی ہے۔" رحمین نے کہا تھیں کیونکہ وہ واقعی اپنے رشتے میں خوش گواریت چاہتی تھی۔

"آج انجل کے کپڑے نہیں چینج کیے؟" شام کو سالک نے اسے گود میں لیا تو فوراً پوچھا۔

"آج طبیعت بہت خراب رہی میری۔ بڑی مشکل سے کھانا بنایا اور سارا دن لیٹی رہی۔" رحمین کی آواز بھی بوجھل سی تھی۔

"چینج کروا دو بھئی۔" انہوں نے اسے واپس لٹایا، بچی ہمکنے لگی۔ وہ ہمت کر کے اٹھی۔ صاف کپڑے لا کر سالک کے قریب صوفے پر رکھے۔

"کر دیں گے چینج؟" اس نے بڑی امید سے پوچھا۔

"کر دو، خود ہی......" وہ موبائل میں مصروف بولے۔

رحمین بجھے دل کے ساتھ بیٹھ کر انجل کو چینج کرنے لگی۔ میلے کپڑے اٹھائے، وہ باہر نکلنے کو تھی جب سالک نے پکارا۔

"ایک کپ چائے بنا دو، ساتھ کوئی کباب وغیرہ بھی فرائی کر لانا۔"

رحمین ست قدموں سے واپس مڑی۔ ایک بندے کو احساس تھا ہی نہیں تو وہ کیا دلاتی اور کسے چیخ چیخ کر بتاتی کہ وہ ٹھیک نہیں ہے؟ چائے اور کباب بنانے میں ہی وہ ہانپ گئی۔

"کل ڈاکٹر کو چیک اپ کرواتی ہوں۔ شاید ایچ بی کی کمی کی وجہ سے اس قدر تھکاوٹ ہو رہی ہے۔" وہ چائے لے کر آئی تو سالک کال پر مصروف تھا۔ چائے ان کے قریب رکھ کر وہ بیڈ پر انجل کے پاس آ بیٹھی۔

"سنو، یہ لسٹ ہے۔ نازیہ باجی کو کچھ چیزیں چاہئیں، صبح مارکیٹ جا کر لے آنا۔ لاکر سے پیسے لے لینا۔" سالک نے پاس آ کر لسٹ تھمائی۔ رحمین نے تکیے کے نیچے گھسا دی اور آنکھیں موند لیں۔

صبح سالک کو ناشتا دینے کے بعد وہ دوبارہ آ کر لیٹ گئی۔ آج بھی طبیعت بیزار سی ہی تھی مگر کل سے کچھ بہتر تھی۔ بارہ بجے کے قریب انجل کے رونے پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ آڑو کا دو گلاس جوس بنایا۔ انجل کو چینج کر کے فیڈر میں جوس ڈال کر، واکر میں بٹھایا۔ تین دن ہو گئے تھے، ماسی نہیں آ رہی تھی۔ مشین کپڑوں سے فل ہوئی پڑی تھی۔ واشنگ مشین لگا کر وارڈروب کا جائزہ لیا۔ سالک کی ایک پینٹ اور ایک ہی شرٹ پریس ہوئی پڑی تھی۔ کل جمعہ ہے تو کرتا شلوار پہنیں گے، کلف لگا سفید کرتا شلوار نکالا۔ ایک نظر پورے گھر کا جائزہ لیا۔ صفائی آج اسکپ کرتی ہوں۔ انجل واکر پورے گھر میں گھمائے پھر رہی تھی۔ رحمین مسکراتے ہوئے اسے دیکھتے کام کیے گئی۔

کپڑے دھل چکے تو کچن میں آ گئی۔ ایک طرف دال پکنے کو رکھی، دوسری طرف چاول ابلنے کو اور خود سلاد بنانے لگی۔ سب پکانے کے بعد ایک نظر پورے گھر کا جائزہ لیا۔ بدن تھکاوٹ سے چور سہی پر اپنے گھر کے کام کی الگ ہی خوشی ہوتی ہے۔ انجل کو گود میں لیے وہ لاؤنج میں ہی صوفے پر بیٹھ کے تھپکنے لگی۔ ہلکی آواز کے ساتھ ایل ای ڈی متحرک تھی۔

ابھی بھی آنکھ لگنے کے قریب تھی، جب مین گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ رحمین نے آنکھیں کھول کر وال کلاک کی جانب دیکھا۔ سالک کے آنے کا وقت تھا۔

انجل کو بیڈ روم میں لٹا کر آئی تو سالک بھی منہ ہاتھ دھو کر آ چکے تھے۔

"آج تو بڑی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"آج بہت دل سے بنایا ہے میں نے۔"

"گویا پہلے بے دلی سے بناتی تھیں؟"

"ہوں......کبھی کبھی۔" وہ ہنسی تھی۔

"دال چاول، سلاد، لیموں کا اچار......" رحمین بھی ساتھ دینے لگی۔

"مارکیٹ سے ہوا آئی تھیں آپ؟" سالک خوش ہوتا تو اسے آپ سے مخاطب کرتا تھا۔

"کون سی مارکیٹ......" نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے وہ الجھی تھی۔

"رات کو لسٹ دی تھی ناں۔"

"اوہ نو......" رحمین نے سر پکڑا۔ "بالکل ہی ذہن سے نکل گیا تھا۔"

سالک نے چمچہ زور سے پلیٹ میں پٹخا۔

"اک ذرا سا کام نہ ہو سکا تم سے۔" وہ انتہائی غصے سے بولے۔

"آپ ابھی کھانا کھالیں، ہم دونوں جا کر لے آتے ہیں۔ روز روز ماریہ باجی کو زحمت دینا اچھا نہیں لگتا۔" رحمین نے اپنی دانست میں انہیں پرسکون کرنا چاہا۔

"اپنے کاموں کے لیے تو ضرور زحمت دے لی جاتی ہے۔"

"ہم ابھی چلتے ہیں ناں۔"

"مجھ سے نہیں جایا جاتا۔ پہلے آفس میں سر کھپاؤں پھر بازاروں میں۔"

"چلو، کل لے آؤں گی۔" رحمین نے نوالہ منہ میں رکھا۔

"نازیہ باجی پہلے ہی کہہ رہی تھیں۔ لے آئے گی تمہاری بیوی؟" سالک نے قند زہر میں بھگو کے طنز مارا۔

"ہاں تو جب نازیہ باجی کو اعتبار ہی نہیں مجھ پر، تو کہتی کیوں ہیں۔" رحمین کا پارہ ہائی ہوا۔

"کون سا مر جاؤ گی ان کی دو چار چیزیں لا کر۔"

"مر ہی جاؤں گی...... نوکر نہیں لگی ہوئی ان کی۔" بے وجہ ہی غصے میں اس کے منہ سے نکل گیا۔

"وہی تو سمجھتی ہو خود کو۔" سالک غصے میں چلایا۔

"خود وہ یہ سمجھتی ہیں مجھے۔ نہ بابا کی وفات پر آئیں، نہ بھیا کی شادی پر۔ چلو اور نہ سہی، ایک کال ہی کر دیتیں مبارک باد کی۔ پر نہ جی۔"

"تو بھی سیدھے منہ بات کی ہو ان سے، اتنی دوستی رکھی ہو تو ہی نا۔"

"ہاں، جب لسٹیں تھمائی جاتی ہیں تب تو دوستی ہوتی ہے ناں۔"

"دو تین بار لا کر اتنا احسان جتانے کی کیا ضرورت ہے، نہ لاتیں۔"

"نہ لا کر دیکھ رہی ہوں نا نتیجہ۔"

"مجھے پہلے ہی شک تھا، جان بوجھ کر نہیں لائیں تم۔" سالک نے رحمین کے غصے کی آگ پر پیٹرول چھڑکا۔ رحمین حسب سابق بھڑکی۔

"ہاں، نہیں لاتی جان بوجھ کر...... کر لو جو کرنا ہے۔"

"کاش میرے بس میں ہوتا تو بہت پہلے کر لیتا۔ تجھ جیسی مصیبت سے جان چھوٹ گئی ہوتی میری۔"

"تو چھوڑ دو ناں......"

"چھوڑ رہا ہوں...... دفع ہو جاؤ...... زندگی کی سب سے بڑی ٹینشن ہو تم۔ رہنا بھی کون چاہتا ہے تمہارے ساتھ۔"

رحمین اٹھ کھڑی ہوئی۔ انجل اونچی آوازوں سے ڈر کر رونا شروع ہو گئی تھی۔

"کر رہا ہوں تمہارے بھیا کو فون۔ دفان ہو جانا۔" رحمین نے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ موبائل پر کال ملا رہا تھا۔ انجل روئے جا رہی تھی مگر اس کے پاؤں زمین پر ہی گڑے تھے۔

"ہاں یار! تجھے اللہ کا واسطہ ہے، اس مصیبت کو لے جاؤ یہاں سے۔ میرا جینا حرام کر رکھا ہے اس نے۔" سالک چھوٹتے ہی کہہ رہا تھا۔

"ہوا جو بھی ہے، تم آؤ اور لے جاؤ اسے......"

اس نے موبائل جیب میں رکھا اور مردانگی کے زعم میں اندر چلا گیا۔

دکھ بے یقینی کی بکل مارے چپ تھا۔ میکانکی انداز میں انجل کو فیڈر بنا کر دیا۔ اس کی ذات کے پرخچے اڑ چکے تھے۔ ہوا سے بھی ہلکا وجود لیے وہ بیٹھی تھی۔ نکاح کے دو بولوں پر شیطانی لہجہ حاوی ٹھہرا تھا۔ اسے بے ساختہ سالک سے نفرت محسوس ہوئی۔ ایک بیگ میں اپنے اور انجل کے چند جوڑے رکھے۔ بھیا کہیں نزدیک ہی تھے، پریشان چہرہ لیے آن پہنچے۔ سالک نہایت کروفر سے ملے۔

''ہوا کیا ہے؟''

''میں روز کی کل کل سے تنگ آچکا ہوں۔ زندگی میں سکون رہا ہی نہیں۔''

بھیا نے رحمین کی جانب دیکھا۔ اس نے نگاہیں جھکالیں اور وہ کرتی بھی کیا؟

''یار! اس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔ ایسی چھوٹی موٹی باتیں تو ہو ہی جاتی ہیں۔''

رحمین نے بے بسی سے بھیا کی جانب دیکھا اور کبھی کبھار وہ سوچا کرتی تھی، کاش وہ لڑکا ہوتی۔ لڑکوں کی زندگی کتنی آسان ہوتی ہے۔

انہیں سسرالیوں کی باتیں نہیں سننا، سہنا پڑتیں مگر انہیں بیٹیوں اور بہنوں کے سسرالیوں کی جو سننا ہوتی ہیں۔ صرف بیٹیوں کو ہی نہیں بیٹی ہونے کا خراج بھگتنا پڑتا، بیٹوں کو بھی باپ اور بھائی ہونے کی حیثیت سے بہت کچھ برداشت کرنا ہوتا۔

''ابھی فی الحال اسے لے جاؤ یہاں سے۔ مجھے اس کے علاوہ کچھ نہیں سننا۔'' سالک کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

بھیا چند لمحے سر جھکائے بیٹھے رہے پھر ہاتھ پاکٹس میں ڈالے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''چلیں۔''

رحمین در و دیوار پر ایک اداس نگاہ ڈالتی بیگ اور نگل کو لے آئی۔

☆☆☆

''بیٹا! کیا سوچا ہے پھر تم نے، آئندہ زندگی کے بارے میں......'' اسے آئے گیارہواں روز تھا، جب فلک آفتاب اچک لینے کو تھا۔ وہ اداس شام کا حصہ بنی ٹیرس پر بیٹھی تھی۔ امی اس کے قریب کرسی رکھ کر بیٹھیں۔

''میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے امی! لیکن وہاں جانے کو بھی اب میرا دل نہیں کرتا۔''

''تو کیا تم یہاں تاعمر رہ لوگی، بھائی بھابھی کے در پر؟''

''مجھ سے سالک کی باتیں نہیں سنی جاتیں؟''

''تو کیا زمانے بھر کی باتیں سن لوگی؟''

''کچھ عرصہ ادھر رہوں گی تو شاید اسے قدر اور عزت ہو جائے میری۔''

''جسے تمہاری موجودگی میں قدر نہ ہوئی، غیر موجودگی میں خاک ہوگی۔ بیٹیاں شادی کے بعد اپنے ہی گھر میں بھلی لگتی ہیں اور بیٹیوں کو اپنے گھر ہی جانا ہوتا ہے اور بھلا ان کا ٹھکانا ہے کہاں۔ میرا تو یہی مشورہ ہے کہ اپنا دل وسیع کرلو اور سالک کے گھر کی گنجائش پیدا کرلو۔ اولاد بہت بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔''

''تب ہی انہوں نے ایک بار بھی کال کر کے انجل کا حال نہیں پوچھا۔''

''ابھی وہ غصے میں جو ہے۔ مرد کے لیے اولاد چھوڑنا مشکل نہیں ہوتا۔ عورت کے لیے کٹھن ترین ہوتا ہے۔ چند ایک باتیں ہی ہیں ناں سالک کی نامناسب۔ تم دل بڑا کر کے انہیں اسی طرح قبول کرلو۔ عورت ہی گھر کے لیے قربانی دیتی ہے۔ آج تم سے سالک کی چند نامناسب باتیں برداشت نہیں ہوتیں، کل کو زمانے کی ڈھیروں نامناسب زہریلی باتیں برداشت کرلوگی تم؟ اپنے بچوں کے لیے کڑوا گھونٹ پیو۔ سالک کی سب باتیں بھلا دو۔ تھوڑی برداشت پیدا کرو اور تھوڑا نظر انداز کرنا سیکھو۔ زندگی سہل ہو جائے گی۔''

''امی! وہ مرد ہے اور قوی ہے۔ میں عورت ہوں اور کمزور ہوں۔ وہ میری ناسازی طبع میں اور تھکاوٹ میں اونچی زبان نہیں برداشت کر سکا، میں اس کا کیا کچھ نہیں برداشت کرتی۔''

''ازل سے دستور چلا آرہا ہے بیٹا! عورت سب برداشت کرتی ہے اور اسے ہی برداشت کرنا ہوتا ہے۔ مذہب عورت کو بہت حقوق دیتا ہے مگر معاشرہ سارے حقوق مرد کو دیتا ہے۔''

''امی! میں خوش نہیں رہ پاؤں گی وہاں۔ اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں گی۔''

''زمانے بھر کی نگاہوں سے گر کر رہنے سے کہیں بہتر ہے، اپنی نگاہوں میں گر کر رہنا۔ طلاق یافتہ عورتوں کو معاشرہ ہر روز ''ستی'' کرتا ہے۔ کبھی لفظوں سے تو کبھی نگاہوں سے۔ تمہاری بھابھی کو ابھی یہی پتا ہے کہ طبیعت کی خرابی کے باعث تم یہاں کچھ روز رہنے آئی ہو۔ میں تمہارے بھیا کو کہتی ہوں سالک کو فون کرے۔ تم بھی ہمت کرو میری بچی! ایک بار کال کر کے ایکسکیوز کر لو۔''

رحمین میز کا کنارہ کھرچتے آنسو بہانے لگی۔ امی نے ڈھیر ساری نمی اپنے اندر اتاری اور وہاں سے اٹھ گئیں۔

''آئی ایم سوری! آپ مجھے اور انجل کو لے جایے۔'' رات سونے سے پہلے اس نے میسج کیا تھا۔

خدا جانے بھیا اور سالک کی کیا بات ہوئی تھی، مگر رحمین کو اتنا یقین تھا کہ بھیا نے منتیں ہی کی ہوں گی۔ تیسرے روز سالک منہ بنائے ہوئے آیا اور خاموشی سے اسے لے گیا۔

عورتوں کا جنازہ ہی ایک بار اٹھایا جاتا ہے، ورنہ مرتی تو وہ کئی بار ہیں۔ رحمین نے جاتے ہوئے ایک آوارہ آنسو سوچ سمیت خاموشی سے جھٹکا۔

☆☆☆

رحمین خاموشی کی بکل سے چہرہ بھی چھپائے رکھتی تھی۔ اس کی چپ سے سالک کے غصے کا گراف ضرور نیچے آیا تھا۔ عزت اور قدر اب بھی البتہ اتنی ہی تھی۔ تتلی اپنے رنگوں کے ساتھ ساتھ پر بھی کھو چکی تھی۔ بچے بڑے ہو رہے تھے، اب ان کے سامنے کیا تماشا کرتی۔ احساس کرنے کی چیز ہوتا ہے، دلانے کی نہیں۔ اس کی ساس دائمی گھر سدھار چکی تھیں اور نندیں اپنی جوان اولاد کی الجھنوں میں مصروف تھیں۔ رحمین کے سر میں جھلکتی چاندی اس کے کئی رازوں کی امین تھی اور اسے بردبار دکھاتی تھی۔

ماریہ باجی کی بیٹی حورین کی پچھلے ہفتے ہونے والی شادی نے انہیں بطور ہمسائے بھی خوب تھکا ڈالا تھا۔ نازیہ باجی اپنی کسی مصروفیات کی وجہ سے آنہ سکی تھیں۔ نازنین باجی کا ڈیرہ اپنی شادی شدہ بیٹی کے گھر پر تھا۔ باقی مہمانوں کا آنا جانا سارا دن ان کے گھر بھی لگا رہتا۔ تھکاوٹ تو ابھی بھی تھی مگر رحمین نے آج اپنے گھر دعوت رکھی تھی۔ وجہ ریان کی سعودیہ میں جاب تھی اور دو روز بعد اسے چلے جانا تھا۔ ماریہ باجی اور جواد بھائی بھی ان کے ساتھ ہی عمرہ کی ادائی کے لیے جا رہے تھے۔

مسالا جات رحمین نے رات کو ہی پیس لیے تھے۔ دعوت شام میں تھی مگر صبح سے وہ کچن میں تھی۔ ایک کپ چائے کی طلب کو دباتی۔ اسٹیم روسٹ کے لیے چکن فرائی کرنے کے لیے دوسری طرف پائے ابلنے کو رکھے، تب ہی انجل کچن میں آئی۔

''مما پلیز، آپ نے تو اس دعوت کو سر پر سوار کر لیا ہے۔ تھوڑی دیر تو ریسٹ کر لیں۔''

''بہت کام باقی ہے انجل!'' رحمین مصروف نظر آئی۔

''کم آن مما! دعوت شام کے بعد ہے، ابھی بارہ بجے ہیں۔''

''تمہیں اپنے کام یاد ہیں ناں؟''

''بالکل، سب سیلڈ اور ڈیزرٹ میری ذمہ داری۔ دیکھیے گا کتنی مزے مزے کے بناتی ہوں۔''

تب ہی احد دہائی دیتا اندر آیا۔ ''مما پلیز، اس چڑیل سے کہیں ایک جگہ سکون سے بیٹھ کر مجھے لسٹ تھما دے۔ تیسری بار مجھے مارکیٹ بھیجا ہے اس نے۔'' سرخ لوبیا اور چقندر میز پر تقریباً پٹخے تھے۔

''جب جو کچھ یاد آئے گا تب ہی بتاؤں گی بھی تو......''

''خدا جانے ایف ایس سی میں لاہور ڈویژن

میں پہلی پوزیشن کیسے لے لی۔ چار چیزیں تو یاد رہتی نہیں۔"
"تمہیں تو سب یاد رہتا ہے نا، پھر بھی بمشکل پاسنگ مارکس لیے۔" انجل نے چڑایا۔
"پاسنگ مارکس نہیں، ہائی فرسٹ ڈویژن۔" احد نے جاتے جاتے بھی تصحیح کرنا ضروری سمجھا۔
"مما! آجائیں، تھوڑی دیر کو اندر۔" انجل نے لوبیا پانی میں بھگو کر رکھا اور جاتے ہوئے بولی۔
"یہ میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ کر آتی ہوں۔" رحمین نے فرائی چکن پیسز میں سب مسالا جات مکس کیے۔
"میں اوپر والے کچن سے آپ کے لیے چائے بنا کر لا رہی ہوں۔ یہاں تو جگہ نہیں ہے۔"
رحمین نے مسکراتے ہوئے تشکر انگیز سے باہر جاتی انجل کو دیکھا۔ شکل میں بالکل باپ پر تھی اور ذہانت میں ماں پر۔
"اللہ نصیب اچھے کرے، سدا ٹھنڈی چھایا میں رکھے۔ بیٹیاں اس لیے بھی ہمت والی بہت ہوتی ہیں کہ ماؤں کے بند لبوں سے سدا دعائیں جو پاتی ہیں ورنہ تو ان پر آئے دکھ کوئی قوی ہیکل پہاڑ بھی نہ سہہ پائے۔" رحمین انجل کو دعائیں دیتے سوچ گئی۔

☆☆☆

کھانے کے بعد سب لاؤنج میں بے تکلفی سے بیٹھے تھے۔ حورین کا شوہر جنید خاصی چلبلی فطرت کا تھا۔ باتوں کے دوران بھی حورین کو نگاہوں کے بیٹھے سے حصار میں رکھا ہوا تھا۔ سچی خوشی سے چمکتا حورین کا چہرہ۔ رحمین نے نظر لگ جانے کے ڈر سے جی بھر کے دیکھا بھی نہیں۔ چاہی گئی عورتوں کے انداز ہی الگ ہوتے ہیں۔ ان کی ہنسی جھرنے کے شفاف پانی سی ہوتی ہے اور دل کی خوشی آنکھوں سے روشنی بن کے پھوٹ رہی ہوتی ہے۔ حورین کے پرنور چہرے سے ہوتی نگاہیں گرین ٹی لاتی انجل پر رکیں۔
"اللہ میری بیٹی کے نصیب بھی "چاہی گئی عورت" کی حیثیت سے لکھے۔" رحمین نے فوراً سے دعا دی اور اس سے بڑی دعا بیٹی کے لیے کیا ہوگی بھلا؟
"ریان! تمہارا تو پاکستان آجانے کا ارادہ تھا نا۔" جواد سے باتیں کرتے سالک کو ایک دم سے یاد آیا تو صوفے کو ٹیک لگائے میٹرس پر بیٹھے ریان سے پوچھا۔
"جی انکل! اصل میں چند مہینوں تک میری پروموشن متوقع ہے۔ پروموشن کے بعد ہی اسلام آباد سب آفس میں ٹرانسفر کے لیے اپلائی کروں گا۔"
"میں تو بہت دعائیں کرتی ہوں۔ بیٹیاں تو ہوتی ہی پرائی ہیں ہمارا تو بیٹا بھی پرایا ہوگیا۔" ماریہ باجی نم آنکھوں سے کہہ رہی تھی۔
رحمین نے گردن موڑ کر ریان کی جانب دیکھا جو انجل سے کپ پکڑتے آنکھوں ڈھیروں چمک لیے ہوئے تھا۔ وہم تھا یا حقیقت؟ رحمین نے اس چوری کو راز کی مانند دل کے نہاں خانوں میں چھپالیا۔ انجل ٹرے لیے اس کے پاس آئی تھی۔ سادہ معصوم بے ریا چہرہ۔
قہوے کے بعد گفٹس کے لین دین کا دور چلا تھا۔ رحمین نے سب کے لیے گفٹس لیے تھے۔ ماریہ باجی کے لیے، جواد کے لیے، حورین اور جنید کے لیے بھی۔
"میرے لیے......؟" ریان چلایا۔ ماریہ نے تنبیہی نگاہوں سے دیکھا۔
"ہم بھی خالی ہاتھ ہیں بھئی۔" احد ہاتھ دکھاتا اس کے قریب بیٹھا۔ جواد انکل نے انجل کو کیش دیا تھا۔
"تمہارے لیے بہت ساری دعائیں۔" حورین نے اسے چھیڑا۔
"کیوں، تمہیں دعائیں نہیں لگتیں کیا؟" ریان نے برا منایا۔
"آپ کچھ کارکردگی دکھائیں پہلے۔" انجل مسکراتے ہوئے بولی۔ "حورین آپی کی شادی ہوئی ہے، انکل آنٹی عمرہ کے لیے جارہے ہیں۔" مزید

وضاحت کی۔
"پھر تو میری دعوت بھی نہیں بنتی تھی۔"
"وہ ہم سے غلطی ہوگئی۔" احد نے سر دھنا۔
ریان نے دھپ رسید کی۔
اب اگلی بار پاکستان آئیں تو میرے لیے آئی فون لیتے آیے گا۔ میں بھی آپ کے لیے کرتا شلوار لے کر رکھوں گا۔ اس بے اعتباری قوم پر نہیں رہنا ہم نے اب۔" احد نے ڈیل کرنے کے انداز سے کہا۔
سب ان کی باتیں انجوائے کر رہے تھے۔
☆☆☆
"اس میں فش ہے، یہ کڑاہی ہے۔ پائے، مکس، سبزیاں، بیسن کا حلوہ۔ سوجی کا حلوہ اور ڈرائی فروٹ۔" سب پلاسٹک کے ڈبوں میں پیک کر کے الگ بیگ میں رکھتے ہوئے رحمین انجل کو بتارہی تھی۔
"ٹیگ بھی لگادیے ہیں۔"
"تھینک یو سو مچ مما جانی! اب ایگزامز کے بعد ہی چکر لگے گا میرا۔" انجل ان کے گلے میں بانہیں ڈالتی ہوئی بولی۔
"آ بھی جاؤ۔ مصیبت جاتے جاتے بھی وقت لیتی ہے۔"
"احد......!" سالک نے تنبیہہ کی۔
"جا تو رہا ہوں بابا! کس قدر اہم میچ تھا میرا، مس کروادیا۔" خفا لہجہ......
انجل کو ہاسٹل چھوڑنے تو سالک ہی جا رہے تھے مگر ایک دم سے بی پی شوٹ ہونے کے باعث احد کو بھیج رہے تھے۔ اس کا کوئی فٹ بال میچ تھا آج۔
"بابا! شام والی میڈیسن...... میں آپ کو کال کر کے یاد دلاؤں گی بلکہ ویڈیو کال کروں گی۔ میرے سامنے لیجیے گا۔ بہت ڈنڈی مار جاتے ہیں آپ۔" سالک سے ملتے انہیں میٹھی سی ڈانٹ بھی پلا رہی تھی۔ رحمین گیٹ تک چھوڑنے آئی اور ڈھیروں دعائیں پڑھ کر پھونکیں۔
"انجل کے ایگزامز کب ختم ہو رہے ہیں؟" رحمین اندر آ کر صوفے پر بیٹھی ہی تھی کہ سالک نے پوچھا۔
"اگلے ماہ کی سترہ کو۔"
"آج چھ تاریخ ہے۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ ہی ہے۔"
"ہوں......"
"میرے آفس کولیگ علوی صاحب ہیں ناں، وہ ہمارے گھر آنے کا کہہ رہے تھے انجل کے رشتے کے سلسلے میں۔"
"ابھی تو پڑھ رہی انجل!" رحمین ایک دم سے اس فیصلے پر حیران ہوئی۔
"میڈیکل کے تین سال مکمل ہوگئے ہیں، چوتھا سال بھی تقریباً مکمل ہی ہوگا۔ امتحانات کے بعد ہی تاریخ رکھیں گے۔ ہاؤس جاب شادی کے بعد کرے گی۔ میں اصل میں چند ماہ میں ریٹائرمنٹ کا سوچ رہا ہوں۔ کچھ سیونگز ہیں اور ریٹائرمنٹ سے ملنے والا سب پیسہ انجل کی شادی کے بعد بزنس میں انویسٹ کردوں گا۔ بزنس کا بھروسا نہیں، انجل کی شادی ہو چکی ہوگی تو فکر اترا ہوگا۔"
"تمہاری نظر میں ہے کوئی رشتہ؟"
"فی الحال تو نہیں۔"
"دیکھ لو، اپنے حلقہ احباب میں بھی اور علوی کی فیملی سے بھی مل لیں گے پر جو مناسب لگا، فائنل کردیں گے۔"
"آپ نے تو میرے ہاتھ پاؤں پھلا دیے ہیں، بہت تیاریاں ہوتی ہیں کرنے والی۔" رحمین گھبراہٹ سے بولی تھی۔
"ریلیکس۔ ہم کوئی تاریخ فائنل نہیں کر رہے۔ صرف پلاننگ ہی ہے، باقی جو اللہ کو منظور۔" پھر بیڈروم میں جاتے ہوئے بولے۔ "پانی پلوادیں، میں تھوڑا ریسٹ کرلوں پھر ہٹلر صاحبہ کی کال آجائے گی۔"
رحمین کی نگاہوں میں وہ ایک پل آتا رہا، جب انجل کو دیکھتے وقت ریان کی آنکھوں میں ہیرے بھرے تھے۔

”کیا پتا، وہ میرا وہم ہو محض۔ لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان آج کل تک اتنا تو چلتا ہی ہے وگرنہ ماریہ باجی کچھ ذکر کرتیں۔ دو سال ہوگئے ہیں ریان کے اسلام آباد ٹرانسفر کو، ڈیڑھ سال سے ماریہ اور جواد بھائی بھی اسلام آباد میں ہی سیٹل ہیں۔ مے بی انہوں نے کوئی پسند کرلی ہو۔“

دن بھر کی ایسی سوچوں نے رحمین کو نڈھال کر ڈالا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا تو رات نو بجے لاؤنج میں اکیلے بیٹھے ماریہ باجی کو کال کر ہی ڈالی۔

”سب خیریت ہے ناں ماریہ باجی؟“ دوسری بار اس نے احوال پوچھا تھا۔

”جی، سب خیریت۔ بس جواد کی طبیعت اوپر نیچے ہوتی رہتی۔ عمر کے تقاضے ہیں، نبھانے ہیں۔“

”ماریہ باجی! آپ کا چکر نہیں لگتا ہماری طرف۔“

”ابھی ارادہ تو نہیں ہے، کیوں خیریت؟“

”اصل میں آپ سے ایک مشورہ کرنا تھا۔“

”کیسا مشورہ؟“

”انجل کے ایک دو پرپوزل آئے ہیں اس سلسلے میں۔“ رحمین نے جھوٹ سچ بتایا۔

”اچھا، ماشاء اللہ۔ ویسے جلدی نہیں ہے ابھی؟“

”نہیں نہیں ماریہ باجی! درحقیقت انہوں نے صرف پیغام بھیجا ہے آنے کے لیے۔ ہمارا سال تک ارادہ ہے انجل کی شادی کا۔ آپ کو پتا ہے امی تو معذور پڑی ہیں، عقل بوجھ بھی وہ نہیں رہی۔ بھابھی ابھی ایسے کسی مرحلے سے گزریں نہیں۔ سو نزاکتیں ہوتی ہیں دیکھنے، پرکھنے والی۔ اس لیے سوچا آپ سے مشورہ کرلوں۔“ رحمین کچھ جھجک بھی رہی تھی۔

”کب آنا ہے ان لوگوں نے؟“

”ابھی کنفرم نہیں۔ انجل کے ایگزام چل رہے ہیں، اگلے ماہ کی سترہ کو آخری پیپر ہے۔ وہ آئے گی تب ہی شروع کریں گے یہ سلسلہ۔“

”ارے، ابھی تو بہت دن ہیں۔ میں جواد سے مشورہ کروں گی، اگر ان کی طبیعت سنبھلی رہی تو آ بھی جاؤں گی۔ تم پریشان مت ہونا۔“ ماریہ باجی تسلی دے رہی تھیں اور رحمین کو جو ایک موہوم سی امید تھی، وہ بھی دم توڑ گئی۔

☆☆☆

اٹھارہ تاریخ کو انجل آئی تھی۔ رحمین نے اسے سرسری سا بتا رکھا تھا۔ بیس کو علوی صاحب کی فیملی انوائٹڈ تھی۔ رحمین ماریہ باجی کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکی تھی، جب بیس کی سہ پہر ماریہ باجی، جواد بھائی اور ریان سمیت آئی تھیں۔

”رحمین! خدا معلوم میرے ذہن میں یہ بات کیوں نہ آئی، وہ تو ریان اور حورین نے کہا تو ذہن اس طرف گیا۔ انجل کو اپنے ریان کے لیے مانگنے آئے ہیں۔ درحقیقت انجل وہ چھوٹی سی گڑیا ہی تھی ابھی میرے دل میں۔“

”میرے لیے تو یہ بہت خوشی کی بات ہے مگر سالک نجانے کیسا سمجھیں؟“

”بیٹی کی زندگی کا سوال ہے، اب بھی ڈرو گی..... ایک مسئلہ ہے نازنین نے اپنی بیٹی کا ریان کے لیے کہہ رکھا ہے۔ اللہ اس کی بیٹی کا نصیب اچھا کرے، لیکن میرا ذہن نہیں ہے۔ ساری عمر باہر پلی بڑھی ہے، مجھے سادہ مزاج لڑکی چاہیے۔ اگر تو سالک مان جاتا ہے تو میں انگوٹھی پہنا کر ہی جاؤں گی۔“

جواد نے ہی سالک سے بات کی تھی۔ سالک نے اس کی رائے پوچھی تھی۔ اس نے خوش دلی سے ہاں کی۔ انجل کا جواب بھی مسکراہٹ تھا۔ ریان کے پاؤں تو زمین پر نہ پڑتے تھے۔ علوی صاحب سے معذرت کرلی گئی۔ کھانے کے بعد سب لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ انجل کمرے میں تیار ہو رہی تھی۔ سبھی چہروں پر مسکان تھی۔ ذرا ہی دیر میں وہ آ گئی تھی۔ پنک ٹشو سوٹ پر وائٹ اور پنک پرل کا کام تھا اور ہم رنگ ٹشو کا ہی دوپٹا۔ بغیر میک اپ کے خوب صورت ہیئر اسٹائل۔

”ماننا پڑے گا لڑکیوں کی پھرتی کو۔ لگتا ہے

ریان بھائی نے میری طرح منہ بھی دھونے کی زحمت نہیں کی۔" احد انجل کی تیاری پر بولا۔
"میں اچھا نہیں لگ رہا کیا؟" ریان احمد کے کان میں گھسا۔
"اپرووآپ ہو چکے ہیں، تیار ہوں یا نہ ہوں ایک ہی بات ہے۔ پک اچھی آنے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے ویسے۔"
ماریہ نے اٹھ کر دونوں کو ایک ساتھ صوفے پر بٹھایا اور بیگ سے انگوٹھی نکال کر ریان کو پکڑائی۔ ریان نے انجل کی انگوٹھی میں ڈالی اور اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلایا۔ انجل سمیت رحمین بھی کنفیوز ہوگئی۔
"احد! ایک منٹ رنگ دو اپنی۔" انجل نے دھیمے سے احد کو کہا۔
"لے لو...... مگر ڈبل کر کے واپس دینا۔"
"کوئی موقع جانے نہ دینا لالچی فطرت دکھانے کا۔"
"کیا کروں، سالی کا رول بھی تو مجھے ہی پلے کرنا ہے ناں۔" احد کی بات پر سب ہنس پڑے۔
سالک کی نگاہیں سب کے خوش اور مطمئن چہروں پر سے ہوتی ہوئی رحمین کے چہرے پر رکیں۔ خوش، مطمئن اور خوب صورتی کے ملاپ نے ایک الگ ہی روپ دیا تھا اسے۔
یہ چہرہ اسے آج سے پہلے کبھی اتنا خوب صورت نہ لگا تھا یا شاید اس نے ہی اسے نہیں دیکھا کبھی غور سے۔ سب کچھ پس منظر میں چلا گیا تھا۔ انجل کی دھیمی مسکان، احد اور ریان کی میٹھی نوک جھوک۔ جواد اور ماریہ کے خوش چہرے...... بس ایک چہرہ سب پر حاوی تھا۔ ایک مسکان سب سے نمایاں تھی۔ ایک وجود نے سب کو بھلا دیا تھا۔ رحمین تھی وہ......
یہ اتنی خوب صورت تھی، مجھے اتنے عرصے پتا ہی نہ چل سکا۔ سالک اپنی کیفیت پر خود ہی حیران تھا۔

☆☆☆

عورت اپنی طرف اٹھتی ہر نگاہ کو پہچان جاتی ہے۔ نگاہ کے اندر رنگ سے بھی خوب ہی واقف ہوتی ہے۔ سالک کی والہانہ اور نثار ہونے والی نگاہوں سے بھی خوب آگاہ تھی۔ بہانے سے پاس بٹھائے رکھنا، بے وجہ باتیں کرنا۔ اس کی رائے کو اہمیت دینا، اکیلے میں وہ بس مسکرا دیا کرتی اور یہ مسکراہٹ ہر طرح کے طنز اور ستائش سے پاک ہوتی۔
عورت کو مرد کی ضرورت سب سے زیادہ جوانی میں ہوتی ہے اور مرد کو بڑھاپے میں۔ وہ اپنا دور گزار چکی تھی اور دل کے دروازے بھی عرصہ دراز ہوا بند کیے ہوئے، اب تو گھن سے بوسیدہ بھی ہو چکا ہوگا سب۔ رحمین نے خود کو دونوں بچوں کے ساتھ بہلا لیا تھا۔ اس کے بچے اس کے لیے اپنی ذات سے بھی زیادہ اہم ہو گئے۔ اپنی ذات تو وہ ماہ و سال کی دھول میں بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔
ویسے بھی ایک عورت کے اندر سب سے زیادہ مضبوط جذبہ ممتا کا ہوتا ہے۔ یہ جذبہ سب جذبوں پر حاوی ہوتا ہے۔ اس کے ہوتے کوئی اور جذبہ نہ بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔
رحمین آہستہ آہستہ انجل کی شادی کی تیاریوں میں تھی۔ جب ایک روز ماریہ باجی کا روتے ہوئے فون آیا۔ جواد کی طبیعت زیادہ ہی خراب تھی۔ انجل بھی ان دنوں گھر پر تھی۔ آناً فاناً سب نے اسلام آباد جانے کی تیاری پکڑی۔
دوپہر ایک بجے نکلے اور شام ڈھلے پہنچے تھے۔ رحمین اور سالک تو ہسپتال میں ہی ماریہ کے پاس رک گئے تھے جبکہ احد اور انجل گھر آ گئے تھے۔ انجل آتے ہی کچن میں گھس گئی اور سوپ وغیرہ بنانے لگی۔ چند منٹس بعد حورین بھی روتی ہوئی صورت لے کر آ گئی۔ اس سے مل کر ہسپتال ہی چلی گئی۔ ریان گھر سے کچھ ضروری اشیاء لینے آیا تھا، وہ انجل کی آمد سے لاعلم تھا۔ کچن میں پانی پینے آیا اور اسے دیکھ کر حیران ہوا۔
"یہ ہسپتال جاتے ہوئے سوپ لیتے جایئے گا۔" احوال پوچھ کر وہ بولی تھی۔

"پر پاپا تو ابھی آئی سی یو میں ہیں۔"

"ایک آدھ گھنٹے میں پرائیوٹ روم میں شفٹ کردیا جائے گا۔ میں ان کی کنڈیشن دیکھ کر آئی ہوں۔"

"تھینک یو...... اور تمہیں اس طرح دیکھ کر بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

انجل دھیمے سے مسکرادی۔

رات نو بجے کا وقت تھا۔ وہ صوفے پر پاؤں رکھے بیٹھی تھی، جب حورین تیزی سے آتی دکھائی دی۔ انجل بے ساختہ سیدھی ہوئی۔

"جواد انکل کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہیں۔ بول رہے ہیں، تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا اور احد کہاں ہے؟"

"اندر لیٹا ہوا ہے۔"

"اسے بولو، گاڑی نکالے۔ ہمیں ہسپتال جانا ہے۔"

"آپ آئی کیسے ہیں؟"

"جنید کے ساتھ۔ وہ کسی اور کام کے لیے گئے ہیں۔" وہ عجلت سے کہتی اندر گئی۔ انجل اور احد کو گاڑی میں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے، جب وہ تیزی سے آتی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں سرخ کامدار دوپٹا تھا۔ احد نے گاڑی بڑھائی۔

"پاپا کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے مگر وہ مایوس کن باتیں کررہے ہیں۔ بیماری نے انہیں نڈھال کردیا ہے۔ انہوں نے فرمائش کی ہے کہ تمہارا اور ریان کا نکاح ابھی ان کے سامنے کیا جائے...... تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں انجل؟" اس کی چپ پر انہوں نے پوچھا تھا۔

"نہیں......" اس نے سر جھکائے کہا۔

"آئی نو، لڑکیوں کے بہت سے ارمان ہوتے ہیں۔ ہم رخصتی بہت دھوم دھام سے کریں گے۔"

"اٹس او کے حورین آپی!" انجل نے ان کا ہاتھ تھاما تھا۔

وہ صوفے پر کامدانی دوپٹا اوڑھے بیٹھی تھی۔ اس کے دائیں بائیں مما اور بابا تھے۔ نکاح خواں ابھی رخصت ہوا تھا اور احد سب کو مٹھائی کھلا رہا تھا۔

"جواد انکل کی بیماری تو بہانا بنی ہے، اصل میں تو نیت کو بھاگ لگتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر کی نکاح کے لیے، ہسپتال سے بہتر جگہ کیا ہوگی بھلا۔" احد نے چٹکلا چھوڑا۔

"ماریہ! میرے بیٹے بہو کو یہاں بیڈ پر میرے قریب بٹھاؤ۔ جی بھر کر دیکھ لوں۔"

"میرے خیال میں گھر جاکر ہی سیلیبریٹ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نے ڈسچارج لیٹر تھمادیا ہے۔" جنید اندر آتے بولا۔

پوری رات سب باتیں کرتے رہے۔ فجر کے بعد سوئے اور دوپہر کو ناشتے کے بعد واپس ہولیے۔

اگلی صبح پانچ بجے خبر آئی کہ جواد انکل کا انتقال ہوگیا ہے۔

☆☆☆

"انجل! اللہ کا واسطہ ہے، کچھ تو میری مدد کروادو۔" رحمین اس کے کمرے میں آکر اس پر بگڑی۔

"مما! سب کچھ کروا تو رہی ہوں آپ کے ساتھ مل کر۔"

"اور برائیڈل ڈریس ابھی تک آرڈر نہیں کیا تم نے۔"

"اب کہاں ٹائم ہے آرڈر کا۔ کل شام جاکر ریڈی ٹو ویئر لے آئیں گے۔"

"آکر کراکری کی پیکنگ کروادو۔"

رحمین کے پیچھے وہ روم میں جانے لگی تھی، جب بابا نے پکارا۔

"برائیڈل ڈریس لینے آج شام کو جانا ہے۔"

"نہیں بابا! کل شام کو۔ آج مجھے پارلر جانا ہے۔"

"اپنی مما کے لیے ایک خوبصورت اور ہیوی سا ڈریس لے لینا۔ جیولری وغیرہ بھی۔" انہوں نے والٹ سے رقم نکال کردی۔

"بابا! وہ ہیوی ڈریسز نہیں پہنتیں۔"
"اسی لیے تو آپ سے کہا ہے۔ میں نے کل صبح چھ بجے نکل جانا ہے۔ فرنیچر وغیرہ لے کر وہیں سیٹ کروا کر آؤں گا۔"
انجل نے مسکرا کر بابا کو دیکھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ مما کے لیے سرپرائز پلان کر رہے ہیں۔ ان کی ضروریات سے ہٹ کر اپنی خواہش سے کچھ لے کر دے رہے تھے۔
"آپ میرے ساتھ پارلر ہی جائیں گی بس۔" رخصتی کے روز انجل نے ماں کے سامنے فرمائش کی۔
"اچھا نہیں لگتا۔ سب کچھ سادگی سے کر رہے ہیں۔ ابھی جواد کی ڈیتھ کو وقت ہی کتنا گزرا ہے۔" رحمین متامل تھی۔
"چھ ماہ ہو گئے ہیں اور یہ دکھ تو اب ساری زندگی رہنے والا ہے۔ بالکل ہلکا سا پارٹی میک اپ کرواؤں گی آپ کا۔"
اور پھر سالک کو ہال میں وہ چہرہ نظر آیا تھا اور سب کچھ پس پشت چلا گیا تھا۔ جسے وہ اپنی وقتی جذباتی کشش سمجھ رہا تھا۔ وہ جذبہ دراصل کتنا قوی تھا۔ اسے اب اندازہ ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا، ساری دنیا پس پشت چلی گئی۔ صرف رحمین ہی ہر چیز پر حاوی تھی۔ سب بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ سب میکانکی انداز میں ہو رہا تھا۔ کھانا کھلایا جا چکا تھا۔ رخصتی ہو رہی تھی اور پھر رخصتی بھی ہو گئی۔ دو آنسو بہاتی آنکھیں منظر نامے پر ابھری تھیں۔ وہ بے ساختہ آگے بڑھا اور رحمین کے شانے پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھا۔ رحمین نے چونک کر دیکھا۔ یہ انداز اسے اس قدر اجنبی لگا تھا کہ اس کا ہاتھ اس نے دھیرے سے سرکا دیا۔

☆☆☆

"مجھے ابھی شادی کرنا ہی نہیں چاہیے تھی۔" کب سے رونے پیٹنے مچاتی انجل نے بات کا لب لباب نکالا۔
"کیسی بات کر رہی ہو انجل؟" اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے رحمین نے گھبرا کر ریان کی جانب دیکھا۔
"کہنے دیں آنٹی! یہ تو سب سہہ بھی رہی ہے اور ہم سنیں بھی نا۔" ریان نے نرمی سے کہا۔
"اصل میں سب کچھ ایک دم جمع ہو گیا ہے۔ انجل کی طبیعت، اوپر سے نائٹ ڈیوٹی۔ امی کی بگڑتی حالت اور میرا آؤٹ کے سلسلے میں کبھی اس شہر تو کبھی اس...... گھن چکر بن کے رہ گئی ہے بے چاری۔ میں تو خود بہت شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔ اس کو وہ ذہنی اور جسمانی سکون نہیں دے پایا جو اس کا حق ہے۔" ریان حقیقتاً شرمندہ نظر آ رہا تھا۔
"خیر ہے، میں تو ویسے ہی بول رہی تھی۔ رات کی ڈیوٹی نے بہت تھکایا ہے مجھے۔"
"میں آجاؤں تم لوگوں کے پاس۔"
"نہیں مما! اس مہینے کے اینڈ سے میرا ٹائم منتھ اسٹارٹ ہو جائے گا۔ میں چھٹی کے لیے اپلائی کردوں گی۔ آپ تو اسی روز آئیے گا، جب ہم نیکسٹ رتبے پر فائز ہو جائیں گے۔"
"انجل! آپ کچھ دن رکیں گی ناں؟" ٹی وی دیکھتے سالک نے گردن موڑ کے پوچھا۔
"مشکل ہے بابا!" انجل نے ریان کو دیکھتے ہوئے کہا۔
سالک کی نگاہ ریان پر پڑی اور ذہن تیزی سے کئی سال طے کرنے لگا اور اگر کبھی رات کے کسی پہر یا دن کے کسی مصروف لمحے میں اچانک مجھے اس کا فون آئے اور کہا جائے۔ خدا کا واسطہ ہے، اسے لے جایئے یہاں سے...... آپ کی بیٹی میرے لیے مصیبت بن گئی ہے تو......
درد کی ایک لہر دوسری جانب سے اٹھی تھی۔ نگاہوں میں معافیاں بھر کے اس نے رحمین سے التجا کی تھی۔ اسے جانے اس کی آنکھوں میں کیا نظر آیا تھا کہ نظریں پھیر لیں۔
عورت معاف کر بھی دے تو کبھی بھلاتی نہیں ہے۔

☆☆☆

''سنو......'' رحمین انہیں بی پی کی میڈیسن کھلا کے پلٹی تھی کہ سالک نے زمانے بھر کی نرماہٹ لہجے میں بھر کے پکارا تھا۔
''جی......'' وہ پلٹی۔ ایسا ''جی'' جس میں شدت تھی نہ حدت۔
''وہ ایک بارتم کچھ بتارہی تھیں ناں کالج فنکشن میں جب تمہاری دوست کے اوپر کوک گرگئی تھی اور......''
''اور آپ موبائل کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور شو دیکھنے لگے تھے۔'' رحمین نے جتایا نہ تھا، صرف بتایا تھا۔
''پھر سے بتاؤ ناں۔'' سالک نے والہانہ اصرار کیا تھا۔
''اس واقعے پر ماہ وسال کی اتنی گرد ہے کہ اصل روپ ہی کھو گیا ہے۔''
''اور وہ کالج میں سب کیا کہا کرتے تھے تمہیں؟''
''یاد نہیں......'' نرم لہجے میں کہتی وہ آگے بڑھی۔ ''ذریت رو رہی ہے، اسے دودھ بنادوں۔'' وہ پہلو بچاکے نکلی۔
انجل کے گھر جڑواں بیٹا بیٹی آئے تھے۔ اس کی شکل کا خیال کرتے رحمین آتے ہوئے ذریت کو ساتھ لیتی آئی تھی۔ زاریان کو انجل ماریہ مل کے سنبھال لیتے۔
پکارا تو مجھے بھی تم بڑے اچھے انداز میں کرتی تھیں۔ میر صاحب اور میر جی۔''
عرصہ ہوا، سالک کو اس انداز سے پکارے گئے کو......
ایسا نہیں تھا کہ رحمین اس سے کوئی بدلہ لے رہی تھی۔ یا نامناسب برتاؤ کرتی تھی۔ وہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی اور بہت اچھے سے رکھتی تھی۔ ہاں مگر اس کے تقاضے بدل گئے تھے۔ وہ...... وہ مانگ رہا تھا جو کبھی اس نے رحمین کو دیا ہی نہیں تھا۔ خوش گوار یت بھری لمبی واک، کنوار پنے کے قصے، میوزک لانگ ڈرائیو...... کندھے پر تھپکی۔ ہاتھوں سے ہاتھ سہلانا۔ کان کے پیچھے بال اڑسنا اور سب سے بڑھ کر میں ہوں نا، میں سب سنبھال لوں گا۔ میں جانتا ہوں...... تم اہم ہو...... سب سے پہلے تم...... جیسے جادو نما الفاظ۔

☆☆☆

انتہائی سرد رات تھی۔ ہیٹر آن تھا جس کی وجہ سے کمرا گرم تھا۔ سرد خاموشی ہر طرف حائل تھی۔ جب اس نے رحمین سے کافی کی فرمائش کی تھی۔
ذریت کو اس کی گود میں ڈالتے وہ کافی بنانے گئی تھی۔ سالک کے بھاری ہاتھ کی نرم تھپک سے وہ فوراً سو گئی تھی۔ ماتھے پر بوسہ دے کر اس نے اسے کاٹ میں لٹایا۔
''سو گئی؟'' کافی تھماتے رحمین نے تصدیق کی۔
''ہوں......'' سالک نے سر ہلایا۔
وہ ذریت کی بات کرتی تھی۔ انجل کی کرتی تھی۔ احد کی کرتی تھی مگر وہ کبھی سالک کی سالک سے بات نہیں کرتی تھی۔ سالک نے شکوہ نگاہوں سے بھرا اور رحمین کی جانب اچھالا۔
رحمین کی نگاہیں مسکرائیں اور تحریر ابھری۔
''اب...... اب کیا باتیں کروں...... اب تو باتیں ختم ہو گئیں؟''
''باتیں تو کبھی ختم نہیں ہوتیں۔''
''ہاں، مگر باتیں مر جاتی ہیں کیونکہ ان پر جذبے حاوی ہو جاتے ہیں۔''
''مجھ سے تو چنیز الہڑ جوانی جیسی فرمائش کرو۔'' آنکھوں میں خواہش ابھری۔
''جب الہڑ جوانی ہی نہ رہی تو فرمائشیں کیا؟''
''کیا مجھے معاف نہیں کرو گی؟'' آنکھوں نے التجا کی۔
''معاف کیا......'' آنکھیں نرمی سے جھکیں۔
''بھلاؤ گی نہیں؟'' ایک اور التجا۔
''بھلا دیا۔''
''تو......''

"تو......؟"

"آؤ، سب نئے سرے سے شروع کریں۔"
آنکھیں پرجوش ہوئیں۔
جواباً رحمین کی آنکھیں اس قدر ہنسیں کہ ان میں نمی جھلکنے لگی۔

"آپ ایک انتہائی بوسیدہ، جگہ جگہ سے پھٹی، گرد سے اٹی کتاب پڑھنا چاہتے ہیں اور چاہتے کہ لطف بھی ملے۔" آنکھیں بتلاتے ہوئے پھر ہنس پڑیں۔

"کیا کروح محاسبہ کرنا تو چاہتا ہوں۔" آنکھوں میں بے بسی جھلکی۔

"محاسبے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ وقت پر نہ کیا اور جب کچھ بچا ہی نہیں۔"

"تو محاسبے کے لیے تیار ہو۔" جواباً آنکھوں میں بھی بے بسی تھی۔
رحمین نے نگاہیں پھیر لیں۔
اب لوٹے ہو بھٹکے مسافر جب کچھ بچا ہی نہیں۔ کتنے موسم بہار لیے آئے اور رنگ سمیٹے لوٹ گئے۔ اب تو خزاں کے ڈیرے، وقت، جذبے رنگ سب وقعت کھو بیٹھے ہیں۔ جب جذبے لٹانے کا وقت تھا، سب جذبے دل کے اس اتھاہ میں چھپائے کہ تعفن اٹھنے لگا۔ اگر دل کی بات کرتے ہو تو اس میں تو سالوں ہوئے خود میں نے بھی جھانک کر نہیں دیکھا اور وہاں ہوگا بھی کیا...... گھن کھائی خواہشیں، گرد سے اٹے خواب، مردہ جذبے......اور جو کچھ زندہ جذبے تھے، وہ ایک جذبے میں ڈھل گئے۔ ممتا کا جذبہ......

ذات کی عورت ہوں، سرتاج جو سب معاف کر بھی دے تو بھلاتی نہیں۔ بھلا دے تو اس کے دل سے مٹتا نہیں۔ جس کے دل کے نہاں خانے کئی رازوں اور جذبوں کے امین ہوتے ہیں۔

ذریت نے رونا شروع کر دیا تھا۔ رحمین نے لپک کے اٹھایا۔ دو خالی آنکھیں تھک ہار کر بند ہو گئیں۔

☆☆

نازیہ کنول نازی

جنہیں راستے میں خبر ہوئی

چھٹی قسط

بچھڑتے وقت جب مجھ سے چھڑا رہے تھے ہاتھ
گھڑی وہ ایک مجھ پہ زندگی سے بھاری تھی
وہ ایک لڑکی جو جیتی زمانے بھر سے مگر
تمہارے پیار میں اک فقط تم سے ہاری تھی
کچھ ایسی بات تھی کہ تم پہ وار دی ورنہ
ہمیں بھی زندگی اپنی یہ بہت پیاری تھی
تمہیں الزام جفا بھی جو دیں تو کیوں دیں ہم
محبتوں میں تھی جو بھی خطاء ہماری تھی
تمہارے دیس سے آئی ہواؤں نے ہے کہا
ہمارے ہجر کی ہر رات تم پہ بھاری تھی
تم ہم کو کھو کے کبھی خوش نہ رہ سکے ورنہ

تمہارے ساتھ جو لڑکی تھی بہت پیاری تھی
ہمارے بعد بھی تم خوش رہو آباد رہو
بچھڑتے وقت یہی اک دعا ہماری تھی

"کہتے ہیں سچے دل سے دعا کی جائے تو خدا ضرور سنتا ہے۔ اس کی دعا بھی سن لی گئی تھی۔ وہ اب مزید سمعان احمد کے گھر اور اس کی قربت میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اللہ نے اسے اس گھر اور اس شخص دونوں سے چھٹکارا دلا دیا تھا۔"

وہ اب سوزان ساحر اور ہادیہ ضمیر چوہدری سے دور چلی جانا چاہتی تھی جہاں کبھی نادانستگی میں بھی اس کا سامنا ان دونوں سے نہ ہو۔ اس کی یہ خواہش بھی پوری ہوئی تھی۔ جس جگہ وہ اب جا رہی تھی وہاں ان دونوں کی گرد بھی اسے نہیں چھو سکتی تھی۔ تبھی بے حد مطمئن سی وہ اپنی تیاری کر رہی تھی جب وہ چلا آیا۔ مکمل بلیک شلوار سوٹ میں اس کی مردانہ وجاہت دیکھنے لائق تھی مگر وہ لڑکی جس کا پہلے ہی دل اجڑ چکا تھا وہ اس کی وجاہت کا کہاں اچار ڈالتی لہٰذا خاموشی سے سر جھکائے وہ اپنے کام میں لگی تھی جب وہ اس کے بالکل قریب آتے ہوئے بولا۔

"ایک گڈ نیوز ہے تمہارے لیے۔"

انجشاء نے اس کے اس قدر قریب آنے پر بے ساختہ گھبرا کر اسے دیکھا۔

"کیا یار بیوی! ایک تو تم ذرا ذرا سی بات پر پریشان بہت ہو جاتی ہو، بھئی شوہر ہوں تمہارا ذرا سا پاس آ کر کھا نہیں جاؤں گا۔" اسے یقیناً اس کی گھبراہٹ پر تپ چڑھی تھی۔ انجشاء دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"کیا گڈ نیوز ہے۔" اس بار رخ پھیرتے

ہوئے اس نے پوچھا۔ وہ مکمل استحقاق سے سیاہ کاٹن کے دیدہ زیب سوٹ میں ملبوس اس کے خوب صورت سراپے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہارے سوزان ساحر پر ہتک عزت کا دعوا دائر کر دیا ہے میں نے، صرف یہی نہیں اس پر تو میں اتنے کیس بنواؤں گا کہ ساری عمر جیل کی چکّی پیستے پیستے گزر جائے گی۔ مگر باہر کی دنیا دیکھنی نصیب نہیں ہوگی اسے، آخر کار رقیب جو ٹھہرا۔''

اس کی آنکھوں کی چمک کی ساتھ ساتھ، اس کے الفاظ اور لبوں کی شرارتی مسکراہٹ نے انجشاء کے سر پر جیسے بم پھوڑ دیا تھا۔ جس راز کو وہ اتنے سالوں سے چھپاتی آئی تھی وہی راز سمعان احمد پر کھل گیا تھا مگر کیسے؟

کیا ہادیہ ضمیر چوہدری نے یہ بات اسے بتائی تھی؟

وہ اسی شش وپنج میں الجھی تھی جب وہ مسکرا کر

اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
''تمہیں کیا لگتا تھا، تم نہیں بتاؤ گی تو مجھے کبھی پتا نہیں چلے گا کہ وہ لڑکا کون تھا جس نے تمہیں دھوکا دیا جس کے ہجر میں آج تک تم نے میری محبت کو جوتی کی نوک پر نہیں رکھا''
انجشاء کو اس لمحے اس کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ نہایت بری لگ رہی تھی۔ تبھی اس نے سر جھکالیا تھا۔
''چلو کوئی بات نہیں، سمعان احمد کو دھوکے میں رکھنا، بہت مشکل ہے، اور اب یہ جو شخص ہے ناں سوزان ساحر، میری دشمنی کی لسٹ میں پہلے نمبر پر آ گیا ہے۔ تمہیں تو پتا ہے میرا، اپنے دشمنوں کو ان کی موت تک پہنچا کر جان چھوڑتا ہوں ان کی۔ ایک دن تم سنو گی سمعان احمد کے زیر انتظام جنگلات میں فاریسٹ آفیسر سوزان ساحر کی لاش گل سڑ کر ختم ہو گئی، مگر اس سے پہلے ساری دنیا میں، میں اس کی عزت کی دھجیاں بکھیروں گا وہ کیا ہے کہ دشمن جتنا زیادہ بڑا ہوتا ہے اس کی موت میں اتنی ہی مشکل چنتا ہوں میں اور اس کام میں تم میرا ساتھ دو گی آئی سمجھ۔''
سمعان احمد کے لبوں کی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی جبکہ اس کے خوب صورت چہرے پر غصے کی سرخی واضح دیکھی جا سکتی تھی۔ انجشاء کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔
''کیسی مدد؟'' وہ بولی تو اس کے لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔
سمعان مسکراتے ہوئے بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔
''تمہارے سوزان ساحر نے کرپشن کا کیس بنوایا ہے مجھ پر، تم عدالت میں یہ بیان دو گی کہ میں کسی غیر قانونی کام میں ملوث نہیں ہوں نہ میں نے کبھی تم پر کسی قسم کا کوئی تشدد کیا، آخر اپنے واحد محافظ کے لیے اتنا تو کر ہی سکتی ہو تم؟ بس اس کے بعد پھر میں جانوں اور وہ جانے تمہاری گواہی اسے وہاں پہنچا سکتی ہے جہاں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔'' گھنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے وہ اپنے ارادوں پر خود ہی مسکرا رہا تھا۔ انجشاء کے اندر تک جیسے خاموشی پھیل گئی۔
''میری گواہی کا تمہاری کرپشن سے کیا تعلق؟'' وہ بولی تو اس کی آواز خاصی دھیمی تھی۔
سمعان نے مسکراتے ہوئے سائیڈ پر پڑا تکیہ اٹھا کر بانہوں میں بھر لیا۔
''میری کرپشن سے نہ سہی میرے کردار سے تو ہے ناں، جب کردار کلیئر ہو گیا تو کرپشن بھی کلیئر ہو جائے گی۔ ویسے بھی اس کا کہنا ہے کہ میں دوسری عورتوں کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی پر بھی ظلم کے پہاڑ توڑتا ہوں۔''
''ٹھیک ہے۔''
''شکریہ، مجھے امید تھی تم میرا ساتھ دو گی، جو کچھ اس نے تمہارے ساتھ کیا اس کے بعد وہ اسی کا حق دار ہے کہ تم اسے سخت سے سخت سزا دلواؤ۔''
''ہوں، صحیح کہہ رہے ہو، مگر فی الحال میں یہاں سے کہیں دور چلی جانا چاہتی ہوں۔''
''ایسا ہی ہوگا تیاری کر لو، شام تک ہم دادا جان کے پاس پہنچ جائیں گے، وہاں تم بالکل محفوظ رہو گی، نہ ہی سوزان ساحر، نہ اس کی ہوشیار منگیتر تمہاری گرد بھی نہیں پا سکیں گے، بس جس دن عدالت میں تمہاری ضرورت ہوئی میں خود آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔'' وہ ساری پلاننگ کر کے بیٹھا تھا انجشاء نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
واقعی وہ اس علاقے اور شہر سے اتنی دور چلی جانا چاہتی تھی جہاں کسی بھی ماضی کی تکلیف دہ یاد اس کے دل کا لہو نہ نچوڑ سکے۔ اور بے شک اس کے رب نے اس کی سن لی تھی۔

☆☆☆

مجھے کنارے کی کب تمنا
تمہیں ہے دریا کے پار جانا
سرخ دریا کی بچھڑی موجیں بتا رہی ہیں
خراج مانگے گا پھر سے دریا
جو میری مانو تو ایسا کر لو

مجھے شریک سفر بنالو
خراج مانگے جو تم سے دریا تو ایسا کرنا
مجھے بھنور میں اتار جانا
تیرا ضروری ہے پار جانا

مغرب سے عشاء ہوگئی تھی جب وہ لوگ گلگت بلتستان پہنچے تھے۔ سرد ٹھنڈی ہوائیں، جیسے ہڈیوں کو چیرتی جسم کے لحاف میں پناہ لینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ سمعان احمد اپنی تمام مصروفیات پس پشت ڈال کر اسے خود گلگت چھوڑنے آیا تھا۔ سرسبز پرسکون وادی اور اس وادی میں اوپر پہاڑی ڈھلان پر بنا سنگ مرمر کا وہ خوب صورت سا گھر جس کی دیواریں پتھروں سے تعمیر کی گئی تھیں۔ اپنے قدرتی حسن میں بلاشبہ گلگت کسی طور سوات سے کم نہیں تھا۔ گاڑی میں اترتے ہوئے سمعان نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"میں تم پہ اعتماد کر کے یہاں چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ اگر تم نے کسی بھی لمحے مجھے یا میرے دادا جی کو دھوکا دے کر یہاں سے فرار کی کوشش کی تو یاد رکھنا، اس علاقے میں تمہاری موت، سینکڑوں سالوں تک آنے والے لوگوں کے لیے ایک عبرت کی داستان بن جائے گی۔"

انجشاء نے اس کی دھمکی سنی پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"میں جانتی ہوں تم اتنے ہی سفاک ہو، مگر تمہیں یاد نہیں رہا میں نے تم سے کہا تھا، میرے لیے پوری دنیا میں اب کوئی جائے فرار نہیں ہے، لہٰذا تم بے فکر رہو، میں اب تمہاری قید سے نکل کر کہیں بھاگنے والی نہیں۔"

"یہی بہتر ہوگا تمہارے لیے۔" تیکھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا پھر انجشاء کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اور ہاں یاد رکھنا، اس سمعان احمد کو کمزور مت سمجھنا، تمہارے لیے پوری دنیا سے لڑ سکتا ہوں میں۔ بس یہ کیس ختم ہو جائے، سوزان ساحر کو ٹھکانے لگا کر اپنا حق وصول کروں گا میں تم سے، اب مزید کوئی رعایت نہیں ہوگی۔" شاید وہ اسے ذہنی طور پر تیار رہنے کی تنبیہ کر رہا تھا۔

انجشاء نے سلگتے دل پر پاؤں رکھتے ہوئے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔

سمعان کے دادا جی چاق و چوبند تندرست آدمی تھے۔ ان کی صحت دیکھتے ہوئے یہ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ پچاس سے اوپر کے ہوں گے۔ جس وقت وہ دونوں ان کے کاٹیج میں پہنچے وہ باہر لان میں کھرپے کے ساتھ، نئے پودوں کے لیے مٹی ہموار کر رہے تھے۔ سمعان نے قریب جاتے ہی انہیں پیچھے سے جھپی ڈال لی تھی۔

"السلام علیکم دادو!" وہ پرجوش تھا۔ جواب میں اس کے دادا کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"وعلیکم السلام، آ گیا میرا بیٹا!"

"جی ہاں، بہو بھی ساتھ آئی ہے آپ کی......" مسکراتے ہوئے اس نے بتایا تھا جب وہ پلٹے۔

"ارے ماشاء اللہ......" پلٹ کر ایک نظر انجشاء کے چہرے پر ڈالتے ہوئے وہ بے تحاشا خوش ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی صبیح پیشانی چوم لی۔

انجشاء نے دیکھا سمعان اس روز بہت خوش تھا۔ سوات والے سمعان احمد سے قطعی مختلف، وہ بہت سادہ اور زندہ دل انسان لگ رہا تھا۔

دونوں دادا پوتے برسوں سے بچھڑی سہیلیوں کی طرح ایک دوسرے کی کمپنی میں بیٹھے رات دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ تھکن سے انجشاء تو جلدی سو گئی تھی مگر وہ دونوں دادا پوتے رات گئے تک بیٹھے شطرنج کھیلتے گزرے ہوئے وقت کی دھول صاف کرتے رہے تھے۔ اگلے دن صبح ناشتے کے بعد سمعان نے رخصت کی اجازت لے لی۔

"ٹھیک ہے دادو، میں اب چلتا ہوں اپنا اور انجشاء کا خیال رکھیے گا، اللہ کے بعد یہ اب آپ

کے سپرد ہے۔ دعا کیجیے گا ابھی جو کیس چل رہا ہے اس کا فیصلہ میرے حق میں ہو جائے، پھر اپنی امانت واپس لے جاؤں گا۔" کن انکھیوں سے انجشاء کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اپنے دادا سے مخاطب تھا۔ جواب میں ذاکر حسین صاحب نے پورے جوش سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"بے فکر رہو، خدا تمہیں تمہارے نیک مقصد میں کامیاب کرے۔" ان کے سرخ چہرے پر الوہی خوشی چمک رہی تھی۔

سمعان مطمئن سا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا جو اس وقت اسے بہت انہماک سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے، بہت توجہ سے دیکھ رہی ہو، اچھا لگ رہا ہوں کیا؟"

"ہاں۔" انجشاء نے اثبات میں سر ہلانے میں ایک لمحہ نہیں لگایا۔ بہت اچھے لگے ہو، سوات والے سمعان احمد سے قطعی الگ۔" وہ مسکرایا۔

"تمہیں پتا ہے، میں سوزان ساحر کا اس معاملے میں شکر گزار ہوں کہ اس نے تمہیں اغواء کر کے تمہارا دل میرے لیے نرم کر دیا ہے۔"

سوزان ساحر کے ذکر پر انجشاء کے لبوں کی مسکراہٹ فوراً غائب ہوئی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا وہ پلٹی اور تیز تیز قدم اٹھاتی اندر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ سمعان احمد کی مسکراتی نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ انجشاء جس وقت کمرے سے باہر آئی پورے بلتستان کو گہرے کالے بادلوں نے گھیر رکھا تھا۔ لاؤنج سنسان پڑا تھا تبھی وہ ڈوپٹا سر پر اچھی طرح سیٹ کرتی باہر لان کی طرف چلی آئی جہاں سمعان کے دادا ذاکر حسین صاحب حسب امید اپنے پھول پودوں کے ساتھ مصروف دکھائی دے رہے تھے۔

"السلام علیکم۔" ان کے قریب پہنچتے ہی اس نے دھیمے لہجے میں سلام کیا۔ جواباً وہ پانی کی پائپ کیاری میں پھینکتے ہوئے اس کی طرف آئے۔

"وعلیکم السلام، کیسی ہے میری بیٹی؟"

"میں ٹھیک ہوں، سمعان چلے گئے۔"

"ہوں، صبح ہی چلا گیا تھا وہ کھانا کھایا تم نے۔ رشیدہ بنا کر رکھ گئی تھی۔"

"نہیں دادا جی! میں ابھی اٹھ کر سیدھی آپ کے پاس چلی آئی۔" اس کے لہجے میں سادگی تھی۔ دادا جی مسکرا دیے۔

"چلو کوئی بات نہیں، ہم دادا پوتی مل کر کھانا کھا لیتے ہیں۔"

وہ اتنے مشفق اور فرینڈلی تھے کہ انجشاء چاہنے کے باوجود ان سے اجنبی بن کر نہ رہ سکی۔ اس وقت بھی دادا کی ہمراہی میں اندر کھانے کی میز تک پہنچ کر اس نے خود برتن لگانا شروع کر دیے تھے۔ برتن سیٹ کرنے کے بعد اس نے خود کھانا نکال کر پہلے ذاکر صاحب کو دیا پھر اپنے لیے پلیٹ میں چاول نکالے۔ ذاکر صاحب اس بار بس خاموشی سے اس کا جائزہ لیتے رہے۔ جانے کیوں یہ لڑکی انہیں اپنے دل کے بہت قریب لگ رہی تھی۔

انجشاء نے ابھی دو نوالے ہی لیے تھے کہ ہاتھ کھینچ لیا۔

"کیا ہوا بیٹی ہاتھ کیوں کھینچ لیا؟" انہیں حیرانی ہوئی تھی جب وہ بولی۔

"بس دل نہیں چاہ رہا دادا جی!"

"کھانا پسند نہیں آیا ناں؟"

انجشاء کو اقرار میں سر ہلانا پڑا۔ وہ لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپ لینے والے زیرک انسان تھے۔

"کوئی بات نہیں، فریج میں گوشت پکا رکھا ہے وہ نکال لاؤ۔" ان کی ہدایت پر انجشاء گوشت کا ڈونگا نکال کر کچن میں لے گئی۔ ہاٹ پاٹ میں صبح والی روٹی رکھی تھی وہی پلیٹ میں رکھ کر اس نے سالن بھی گرم کر لیا۔ اگلے دو منٹ کے بعد وہ ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھی مگر یہ کیا، چاولوں کی طرح اسے سالن کا ذائقہ بھی قطعی پسند نہیں آیا۔

"کیا ہوا؟ کیا یہ بھی اچھا نہیں لگا؟"

صرف ایک لقمے کے بعد اسے پلیٹ پرے کھسکاتے دیکھ کر ذاکر صاحب پوچھے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ جواب میں اس نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں داداجی، کون بناتا ہے کھانا یہاں؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ جب ذاکر صاحب نے بتایا۔

رشیدہ آتی ہے، پنجاب کے شہر خانیوال کی رہنے والی تھی۔ شوہر اور بچے ایک حادثے کی نذر ہو گئے تو بھائیوں نے دوسری شادی کر دی۔ دوسرا شوہر نکما ہے۔ نہ کچھ کماتا ہے نہ دیتا ہے اوپر سے اس کے بچے بھی ہیں بے چاری محنت مزدوری کر کے اپنا بھی پیٹ بھرتی ہے اور اس کے بھوکے بچوں کا بھی۔"

"اوہ، شاید آپ نے ان کے حالات کی وجہ سے انہیں کام پہ رکھ لیا؟"

"نہیں بیٹے، حالات کی وجہ سے نہیں، کیونکہ جاب کے بغیر بھی ہر ماہ میں اس کی مالی مدد تو کر سکتا ہوں۔ مگر اسے کام پر رکھنے کی بڑی وجہ اس کی ایمان داری اور میری مجبوری ہے۔ آج کل حالات اچھے نہیں ہیں۔ میں بوڑھی جان کتنی نگرانی کر سکتا ہوں کسی کی۔ آئے روز گھر کی کوئی نہ کوئی قیمتی چیز گم ہوئی رہتی تھی، کچن کا سامان بھی آدھ مہینے میں ختم ہو جاتا، کب تک برداشت کرتا نقصان، تنگ آ کر اسی کو رکھ لیا۔ اب جیسا بھی پکا کر دیتی ہے چپ کر کے کھا لیتا ہوں دوسرا کوئی آپشن ہی نہیں۔" چشمے کے پیچھے ان کی بوڑھی سیاہ آنکھیں ایک عجیب سا درد لیے مسکرا رہی تھیں۔ انجشاء بے ساختہ انہیں دیکھے گئی۔

"ایک سوال پوچھوں داداجی، برا تو نہیں منائیں گے۔" چند لمحوں کے بعد انہیں دیکھتے ہوئے وہ بولی تھی جب وہ مسکرا دیے۔

"جانتا ہوں کیا پوچھنا چاہتی ہو تم، یہی کہ میں سمعان کے ساتھ کیوں نہیں رہتا؟"

انجشاء ان کے اس درجہ درست قیاس پر حیران رہ گئی تھی۔

"جی......" آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے اقرار کیا۔ وہ بولے۔

"سمعان کے ساتھ طبیعت میل نہیں کھاتی میری، جان سے پیارا پوتا ہے میرا مگر جن کاموں میں وہ پڑا ہے میں اس کے ساتھ ہونٹ سی کر نہیں رہ سکتا۔"

"آپ جانتے ہیں وہ کیا کرتا ہے؟"

"ہاں، اس کے ایک ایک قدم کی خبر ہے مجھے۔"

"تو پھر آپ سمجھاتے کیوں نہیں اسے؟"

اس بار اس کے سوال پر داداجی کے لبوں کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔

"سمجھایا اسے جاتا ہے جو سمجھنے کے لیے تیار ہو، جو کچھ سمجھنا ہی نہ چاہے اس پر اپنی انرجی ضائع کرنا کوئی دانش مندی نہیں۔"

"اس طرح تو وہ تباہ ہو جائے گا داداجی۔"

"ہوں۔"

"کوئی اور رشتہ نہیں ہے آپ کا؟"

"نہیں۔"

"بچے؟"

"دو ہی بچے تھے، ایک سمعان کا بابا اور دوسری وہ بیٹی جس کے بارے اس بدنصیب باپ کو پتا ہی نہیں کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔"

"کیا مطلب؟ کہیں کھو گئیں وہ؟"

"ہوں۔"

انجشاء نے دیکھا سامنے بیٹھے اس بوڑھے شفیق شخص کی آنکھیں ہلکی سی نم ہو گئی تھیں۔ تبھی وہ قدرے شرمندہ ہوئی تھی۔

"ایک بات کہوں داداجی!"

"ہوں۔"

"جب تک میں یہاں ہوں گھر کے سارے کام کر لیا کروں؟"

"نہیں، تم سمعان کی امانت ہو میرے پاس۔"

"جی میں جانتی ہوں مگر کیا آپ اپنا دوست

اپنی بیٹی نہیں بنا سکتے مجھے؟'' اس کے لہجے میں مخفی محبت سامنے بیٹھے اس باریش شخص سے چھپی نہیں رہ سکی تھی تبھی وہ نرمی سے مسکراتے ہوئے بولے۔

''ٹھیک ہے، جیسے تم خوش رہو۔''

انجشاء کے لب ان کی اجازت پر مسکرائے تھے۔ ایک طویل عرصے کے بعد دل سے خوش ہو کر وہ مسکرائی تھی۔

☆☆☆

سمعان کا مینج کے بے حد شاندار گیسٹ روم میں اس کی انگلیاں بہت تیزی سے سوزان کا نمبر پریس کر رہی تھیں۔ دل تھا کہ بے حد بے چین تھا۔

سوزان نے پانچویں بیل پر اس کی کال ریسیو کر لی تھی۔

''ہاں کہو ہادو، سب ٹھیک ہے ناں؟'' اس کا انداز پریشان کن تھا۔ وہ ناخن چباتی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''نہیں سوزان، کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیوں، کیا ہوا ہے؟'' دوسری طرف سوزان یقیناً پریشان ہوا تھا جب وہ بولی۔

''سمعان رہا ہو گیا ہے یہی کیا کم پریشانی کی بات ہے۔''

''تم نے بس یہی بتانے کے لیے کال کی ہے۔'' دوسری طرف وہ خفا ہوا تھا جب وہ جلدی سے بولی۔

''نہیں کچھ اور بتانا تھا۔''

''کیا۔''

''سمعان احمد نے جبار صاحب کو دفن نہیں کیا بلکہ ان کی لاش جنگل میں کہیں پھینک دی ہے تاکہ جنگلی جانور چیر پھاڑ کر کھا جائیں۔ اپنے کسی بھی غدار کو یہ شخص موت تو دیتا ہی ہے ساتھ ساتھ اس کی لاش کی بے حرمتی بھی کرتا ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا یہ سب۔'' سوزان یقیناً پریشان ہوا تھا جب وہ بولی۔

''اس نے خود بتایا ہے مجھے، ابھی رات کے کھانے پر۔''

''ہمم...... ٹھیک ہے میں چیک کروا لیتا ہوں۔ تم پر تو کوئی شک نہیں ہوا ناں اسے۔''

''بظاہر تو یہی لگتا ہے مگر یہ شخص اندر سے بہت گہرا ہے سوزان، پتا نہیں کیسے ہر بات کا پتا چل جاتا ہے اسے، مجھے یہاں بہت ڈر لگ رہا ہے اگر اسے ذرا سا بھی مجھ پر شک ہو گیا تو بہت برا حال کرے گا یہ میرا۔'' وہ خوف زدہ تھی۔ سوزان گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

''حوصلہ رکھو، پریشان مت ہو، تم پر شک نہیں ہو سکتا اسے، ہو بھی گیا تو میں تمہارا بال بیکا نہیں ہونے دوں گا۔ چوڑیاں پہن کر نہیں بیٹھا میں یہاں، سمعان کا مینج کے ایک ایک پل کی خبر ہے مجھے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر اس کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں سوزان، یقیناً وہ تمہاری موت کے لیے بہت خطرناک پلاننگ کر رہا ہے، پلیز تم کچھ وقت کے لیے کہیں روپوش ہو جاؤ پلیز۔'' ہادیہ ضمیر چوھدری کے ملتجی لہجے پر وہ دل کھول کر ہنسا تھا۔

''کمال کرتی ہو یار تم بھی، اتنا بزدل سمجھا ہوا ہے تم نے مجھے؟''

''نہیں، مگر تم اسے......''

''چھوڑو اگر مگر کو، یہ بتاؤ انجشاء کیسی ہے؟'' اس کی بات درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے اس نے بات بدل دی تھی جب وہ پریشانی سے بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے بولی۔

''وہ ٹھیک ہے مگر میں پھر کہہ رہی ہوں احتیاط اچھی چیز ہے لاپروائی مت کرو۔''

''ٹھیک ہے غور کروں گا اس پر فی الحال تم بور کر رہی ہو لہٰذا اللہ حافظ۔'' وہ عجلت میں تھا یا اسے ستانا مقصود تھا تبھی اپنی بات مکمل کرتے ہی کال کاٹ دی تو ہادیہ جھنجلا کر رہ گئی۔

فی الوقت جو وہ دیکھ رہی تھی سوزان اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا اور یہی چیز سوزان ساحر کے خلاف سمعان احمد کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی!

☆☆☆

سمعان نے جنگل میں تلاش شروع کروادی تھی۔ تین دن کی خواری کے بعد بلاآخر انہیں گھنی جھاڑیوں میں جبار احمد کی مسخ شدہ لاش مل گئی تھی۔ ہادیہ ضمیر چوھدری کا خدشہ اور اطلاع درست ثابت ہوا تھا۔ سوزان کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ اس کی ذرا سی غفلت نے اس شخص کو موت کی ابدی نیند سلا دیا تھا۔

کس دل سے اس نے وہاں سے لاش اٹھائی اور اس کی تدفین کی وہی جانتا تھا۔ مگر یہ طے تھا کہ سمعان احمد کے خلاف اس کی نفرت ایک چنگاری سے شعلہ بن گئی تھی۔ اس شخص کو اس کے عبرت ناک انجام تک پہنچائے بغیر اب چین سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔

سمعان گلگت سے واپسی کے بعد اپنے ہی کاموں میں الجھا تھا جب اسے جنگل سے جبار احمد کی لاش اٹھائے جانے کی خبر ملی۔ یقیناً اس کی چال کامیاب رہی تھی۔ ہادیہ ضمیر چوھدری کی حقیقت جاننے کے لیے جو جال اس نے بچھایا تھا اس نے اپنے شکار کو پھانس لیا تھا۔ کال بند کرتے ہی وہ جو ہنسنا شروع ہوا تو پھر ہنستا ہی چلا گیا۔

صغراں جو اس وقت اس کے پاس ہی موجود تھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

''سب ٹھیک تو ہے ناں سائیں؟'' قدرے پریشانی سے اس نے پوچھا وہ مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہوں، سب ٹھیک ہے کیونکہ اپنے ساتھ کبھی کچھ غلط میں ہونے نہیں دیتا۔''

''میں سمجھی نہیں سائیں!''

''ہاہاہا...... سمعان احمد کو سمجھنا اتنا آسان کہاں ہے صغراں بی بی، پھر بھی وہ جو لڑکی ہے ناں سوزان ساحر کی جاسوس ڈبل رول ادا کر رہی ہے میرے ساتھ۔'' وہ ترنگ میں تھا۔ صغراں کا چہرا تن گیا۔

''مجھے تو اس پر شک نہیں ہوا سائیں!''

''ہوں، تمہیں شک نہیں ہوسکا کیونکہ وہ تم سے زیادہ ہوشیار ہے۔''

''غلطی ہوگئی سائیں ...... بہت بڑی غلطی ہوگئی۔ اللہ کے واسطے مجھے معاف کردیں۔'' فوراً اس کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے صغراں نے ہاتھ باندھ لیے تھے۔ جب وہ بے نیازی سے بولا۔

''غلطی کی ہے تو سزا بھی بھگتنی پڑے گی۔''

''نہیں سائیں، آپ کو بڑے سائیں کا واسطہ، مجھے معاف کردیں۔'' وہ رو پڑی تھی مگر اس نے پاؤں کی زبردست ٹھوکر سے اسے پرے دھکیل دیا۔

''تمہیں پتا ہے تم سے شادی کیوں کی تھی میں نے، جبکہ تم کسی لحاظ سے بھی میرے قابل نہیں ہو؟''

اس بار وہ بولا تو اس کا لہجہ بے حد روکھا تھا۔ صغراں ہاتھ باندھے روتی رہی۔

''میں بتاتا ہوں تمہیں، کیوں شادی کی تھی تم سے؟'' جیب سے شکاری چاقو نکالتے ہوئے وہ اسے دیکھ کر بتا رہا تھا۔

''تمہاری ہوشیاری کی وجہ سے، جس طرح دس سال تم نے میرے باپ کی خدمت کی اور اس عرصے میں حویلی کے بگڑے ہوئے معاملات کو اپنی سمجھ داری سے حل کیا، بہت متاثر ہوا تھا میں تمہاری اس صلاحیت سے۔ اپنی بگڑی ہوئی زندگی میں ایک ایسی ہی عورت کی ضرورت تھی مجھے، مگر وہ لڑکی جو سوزان ساحر کی جاسوس ہے تم نے اس کے معاملے میں غفلت دکھا کر ثابت کر دیا کہ تم میں ابھی عقل اور ہوشیاری کی بہت کمی ہے۔ مگر بے فکر رہو، جان نہیں لوں گا میں تمہاری، کیونکہ تمہارا قرض دار ہوں میں، لیکن جو غلطی تم نے کی ہے اس کی سزا تو بنتی ہے ناں۔'' اس وقت اس کے چہرے پر صرف وحشت کا راج تھا۔

صغراں زرد پتے کی مانند کانپتی رہی۔ اگلے پندرہ منٹ کے بعد سمعان کا میچ اس کی دلدوز چیخوں سے گونج رہا تھا۔

ہادیہ سوزان سے بات کر کے ابھی واش روم کی طرف ہی بڑھ رہی تھی جب صغراں کی دل خراش

پنجوں سے دبل کر بے ساختہ دروازے کی طرف بھاگی۔ اپنے کمرے سے باہر نکل کر اس نے اردگرد کے ہر کمرے میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہ کہیں بھی نہیں ملی جانے وہاں اس عقوبت خانے میں ایسا کونسا خفیہ کمرا تھا جہاں وہ جانور نما شخص اسے ظلم و تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا۔

اس نے فوری سوزان کو کال کرنے کی کوشش کی مگر اس کا نمبر پاورڈ آف مل رہا تھا۔ شدید جھنجلا کر انجشاء کے کمرے کی طرف آئی تو وہ بھی لاک ملا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ پوری رات بے حد خوف اور اذیت کے ساتھ آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔

اگلی صبح اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر وہ کمرے سے باہر آئی اور پھر صغراں کی تلاش شروع کر دی۔ ابھی وہ ایک راہ داری سے دوسری راہ داری کی تلاش کر رہی تھی جب کسی نے سرعت سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک کمرے میں کھینچ لیا۔

ہادیہ کو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس کا سیل فون اس سے چھینا جا چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے اوپر والے اچانک حملے سے سنبھال پاتی اس کی نظر سمعان احمد پر پڑی جو بے حد خشمگین نگاہوں سے اسے ہی گھور رہا تھا۔ ہادیہ اس کے تیور دیکھ کر ہی چکرا کر رہ گئی تھی۔ جب وہ پاس آیا۔

''تمہیں کیا لگا تھا سمعان احمد بس ایک معمولی شخص ہے جسے تم اپنی ہوشیاری سے آسانی سے بے وقوف بنا لو گی......ہوں؟''

اس وقت اس کی آنکھوں میں اتنی وحشت تھی کہ وہ کانپ کر رہ گئی۔ تبھی اس نے دائیں ہاتھ سے اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ اس کے نچلے ہونٹ کا کنارہ پھٹ گیا۔

''کیا سمجھتی ہو تم خود کو، ہاں ہر کسی کو آسانی سے دھوکا دے دو گی تم دوست بن کر ڈسں لو گی۔ پہلے انجشاء اور اب اس کا شوہر تمہارا شکار بن جائیں گے؟ واہ......تم سے زیادہ ہوشیار لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔''

وہ دھاڑ رہا تھا۔ ہادیہ کا تیز دھڑکتا دل جیسے سینے سے باہر آنے کو مچل گیا۔

''میں نے کیا کیا ہے؟''

''غداری کی ہے تم نے، سمعان احمد کے ساتھ غداری اور تمہیں پتا ہے غدار کو کبھی معاف نہیں کرتا میں، چاہے عورت ہی کیوں نہ ہو؟'' اس کا لہجہ قہر برسا رہا تھا۔ ہادیہ کو لگا بس زندگی یہیں تک تھی۔ تبھی گہری سانس لے کر اس نے اپنا وجود ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''میں نہیں جانتی، تم کس غلط فہمی کی وجہ سے مجھ پر شک کر رہے ہو، لیکن اگر میری جان لینے سے تمہاری کسی انا کو تسکین ملتی ہے تو لے لو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''بکواس بند کرو اپنی، تمہارا فون میری تحویل میں ہے، اب تماشا دیکھو۔'' کہنے کے ساتھ اس نے کچھ ٹائپ کیا اور پھر موبائل ہادیہ کے سپرد کر دیا۔ وہ حیران سے اس کی اس حرکت کو دیکھتی رہ گئی جب اس کا سیل بجنا شروع ہو گیا۔ سوزان اسے کال کر رہا تھا اس کے کال پک کرتے ہی وہ بے تابی سے بولا۔

''ہاں ہادو! کہاں ہو تم، سمعان کو کیسے شک ہوا تم پر۔'' ہادیہ نے ایک نظر سمعان پر ڈالی پھر تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

''یہ شخص تمہاری سوچ سے بھی زیادہ شاطر ہے سوزان، میری زندگی کی آخری التجا سن لو، شاید اس کے بعد تم کبھی میری آواز نہ سن سکو، آخری اپیل کر رہی ہوں پلیز، اس شخص کی پہنچ سے کہیں دور چلے جاؤ، کچھ عرصے کے لیے کہیں چلے جاؤ پلیز!''

''میری بات سنو ہادو، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں آ رہا ہوں وہاں۔''

اسپیکر آن تھا۔ اس سے پہلے کہ ہادیہ کچھ کہتی سمعان نے ہاتھ بڑھا کر اس سے موبائل چھین لیا۔

''اس کو کہتے ہیں عقل کا صحیح استعمال، کتنا مزا آئے گا جب میں تمہاری آنکھوں کے سامنے اپنے

چیخوں سے دہل کر بے ساختہ دروازے کی طرف بھاگی۔ اپنے کمرے سے باہر نکل کر اس نے اردگرد کے ہر کمرے میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہ کہیں بھی نہیں مل جانے وہاں اس عقوبت خانے میں ایسا کونسا خفیہ کمرا تھا جہاں وہ جانور نما شخص اسے ظلم و تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا۔

اس نے فوری سوزان کو کال کرنے کی کوشش کی مگر اس کا نمبر پاورڈ آف مل رہا تھا۔ شدید جھنجلا کر انجشاء کے کمرے کی طرف آئی تو وہ بھی لاک ملا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ پوری رات بے حد خوف اور اذیت کے ساتھ آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔

اگلی صبح اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر وہ کمرے سے باہر آئی اور پھر صغراں کی تلاش شروع کر دی۔ ابھی وہ ایک راہ داری سے دوسری راہ داری کی تلاش کر رہی تھی جب کسی نے سرعت سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک کمرے میں کھینچ لیا۔

ہادیہ کو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس کا سیل فون اس سے چھینا جا چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے اوپر والے اچانک حملے سے سنبھال پاتی اس کی نظر سمعان احمد پر پڑی جو بے حد خشمگین نگاہوں سے اسے ہی گھور رہا تھا۔ ہادیہ اس کے تیور دیکھ کر ہی چکرا کر رہ گئی تھی۔ جب وہ پاس آیا۔

''تمہیں کیا لگا تھا سمعان احمد بس ایک معمولی شخص ہے جسے تم اپنی ہوشیاری سے آسانی سے بے وقوف بنا لوگی ......ہوں؟''

اس وقت اس کی آنکھوں میں اتنی وحشت تھی کہ وہ کانپ کر رہ گئی۔ تبھی اس نے دائیں ہاتھ سے اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ اس کے نچلے ہونٹ کا کنارہ پھٹ گیا۔

''کیا سمجھتی ہو تم خود کو، ہاں ہر کسی کو آسانی سے دھوکا دے دوگی تم دوست بن کر ڈس لوگی۔ پہلے انجشاء اور اب اس کا شوہر تمہارا شکار بن جائیں گے؟

واہ...... تم سے زیادہ ہوشیار لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔''

وہ دھاڑ رہا تھا۔ ہادیہ کا تیز دھڑکتا دل جیسے سینے سے باہر آنے کو مچل گیا۔

''میں نے کیا کیا ہے؟''

''غداری کی ہے تم نے، سمعان احمد کے ساتھ غداری اور تمہیں پتا ہے غدار کو کبھی معاف نہیں کرتا میں، چاہے عورت ہی کیوں نہ ہو؟'' اس کا لہجہ قہر برسا رہا تھا۔ ہادیہ کو لگا بس زندگی یہیں تک تھی۔ تبھی گہری سانس لے کر اس نے اپنا وجود ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''میں نہیں جانتی، تم کس غلط فہمی کی وجہ سے مجھ پر شک کر رہے ہو، لیکن اگر میری جان لینے سے تمہاری کسی انا کو تسکین ملتی ہے تو لے لو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''بکواس بند کرو اپنی، تمہارا فون میری تحویل میں ہے، اب تماشا دیکھو۔'' کہنے کے ساتھ اس نے کچھ ٹائپ کیا اور پھر موبائل ہادیہ کے سپرد کر دیا۔ وہ حیران سے اس کی اس حرکت کو دیکھتی رہ گئی جب اس کا سیل بجنا شروع ہو گیا۔ سوزان اسے کال کر رہا تھا اس کے کال پک کرتے ہی وہ بے تابی سے بولا۔

''ہاں ہادو! کہاں ہو تم، سمعان کو کیسے شک ہوا تم پر۔'' ہادیہ نے ایک نظر سمعان پر ڈالی پھر تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

''یہ شخص تمہاری سوچ سے بھی زیادہ شاطر ہے سوزان، میری زندگی کی آخری التجا سن لو، شاید اس کے بعد تم کبھی میری آواز نہ سن سکو، آخری اپیل کر رہی ہوں پلیز، اس شخص کی پہنچ سے کہیں دور چلے جاؤ، کچھ عرصے کے لیے کہیں چلے جاؤ پلیز!''

''میری بات سنو ہادو، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں آ رہا ہوں وہاں۔''

اسپیکر آن تھا۔ اس سے پہلے کہ ہادیہ کچھ کہتی سمعان نے ہاتھ بڑھا کر اس سے موبائل چھین لیا۔

''اس کو کہتے ہیں عقل کا صحیح استعمال، کتنا مزا آئے گا جب میں تمہاری آنکھوں کے سامنے اپنے

رقیب کی جان لوں گا، ہے ناں۔" قہقہہ لگاتے ہوئے وہ اس کا ضبط آزما رہا تھا جواب میں ہادیہ نے اس کے چہرے پر تھوک دیا۔

"تم جیسے گھٹیا، عورتوں پر ہاتھ اٹھانے والے، نیچ انسان سے کوئی اچھی امید رکھ بھی نہیں سکتی میں۔"

اس کے لفظ سمعان کو کسی چابک کی طرح لگے تھے۔ تبھی وہ غرایا۔

"چیخ لو جتنا چیخ سکتی ہو، ابھی تھوڑی دیر بعد اسی کمرے میں تمہاری لاش ٹکڑوں میں بٹی پڑی ہوگی۔"

"کوئی افسوس نہیں، حق کے راستے پر موت سعادت والوں کو ملتی ہے۔ تم اپنی فکر کرو، بہت جلد تمہارا انجام بہت بھیانک ہونے والا ہے۔" اس کی غراہٹ کا جواب اس نے مکمل دیدہ دلیری سے دیا تھا۔

سمعان احمد کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔

"یو بچ، تمہاری اتنی ہمت کہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تم مجھے دھمکی دے رہی ہو۔"

ایک ہاتھ میں اس کا جبڑا دبوچ کر دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کا گلا گھونٹنا شروع کر دیا تھا۔ ہادیہ اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہیں تھی۔ لہٰذا سمعان کے حملے پر بوکھلاتے ہوئے اس نے اس کا مضبوط بازو پکڑ کر اپنے بچاؤ کی ہر ممکن کوشش کی مگر اس طاقت ور مرد کے سامنے اس کی ساری قوت ریت کی دیوار ثابت ہوئی اگلے چند لمحوں میں اس کی آنکھیں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

اس رات وادیٔ بلتستان گھرے بادلوں کی لپیٹ میں تھی۔

دن بھر کی تھکن کے باعث انجشاء رات میں کھانا کھا کر جلدی سو گئی تھی۔ اس وقت شاید آدھی رات کا ٹائم تھا، جب بادلوں کی شدید گرج کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرا مکمل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اوپر سے بجلی یوں کڑک رہی تھی جیسے اسی کمرے پر گرے گی۔ اس وقت نا چاہتے ہوئے بھی وہ بے حد خوف زدہ ہو گئی تھی۔

اندھیرے میں دیوار کا سہارا لیتی وہ باہر ہال کمرے میں آئی تو وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ سائیڈ والے کمرے سے روشنی کی پتلی سی لکیر باہر آ رہی تھی۔

انجشاء اسی طرف بڑھ گئی۔ ذرا سا دروازہ کھول کر دیکھا تو اندر ذاکر حسین صاحب دیوار کے ساتھ جائے نماز بچھائے تہجد کی نماز ادا کرتے نظر آئے۔ ان کے چہرے پر اس وقت بے حد سکون اور نور تھا۔ اس نے دروازہ آہستہ سے دوبارہ بند کر دیا۔

بے شک مسلمانوں پر اللہ کا سب سے بڑا احسان اور انعام نماز ہی تو تھی۔ ایک ایسی دولت جس کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے تھے، جن کے دل اللہ نے اس انمول خزانے کو سمیٹنے کے لیے کھول دیے تھے۔

وہ پلٹ کر ابھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی جب اچانک لائٹ آ گئی۔ انجشاء بے ساختہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے ابھی اپنے کمرے کی طرف بڑھنا ہی چاہتی تھی جب اچانک اس کی نظر ذاکر حسین صاحب کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے پر پڑی۔ سامنے دیوار پر کچھ تصویریں آویزاں تھیں۔ انجشاء ان تصویروں پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر آگے بڑھنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک ٹھٹک کر رک گئی۔ وہاں سامنے دیوار پر ایک تصویر اس لمحے اس کے ہوش اڑا گئی تھی۔

ذاکر حسین صاحب نماز سے فارغ ہو کر کمرے سے باہر آئے تو وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے کو دیکھ رہی تھی، تبھی وہ پاس آئے۔

"کیا بات ہے بیٹی...... کیا دیکھ رہی ہو؟"

ان کے سوال پر وہ جیسے ہوش میں واپس آئی تھی۔

"دادا جان! وہ...... وہ سامنے تصویر میں آپ کے دائیں بائیں دونوں شخص کون ہیں؟"

ذاکر حسین صاحب کو اس کے چہرے کی رنگت نے فکر میں مبتلا کیا تھا۔ ذرا سی نظر پھیر کر انہوں نے

سامنے دیوار پر آویزاں تصویر کو دیکھا پھر خاموشی سے سر جھکا کر کچھ ہی فاصلے پر دھرے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"تم ان کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہو؟"

ان کا لہجہ اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ وہ انجشاء کو اپنے ذاتی معاملات میں اتنی جلدی دخل اندازی کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ تب ہی وہ بولی۔

"کیوں کہ ان میں سے ایک شخص کے ساتھ زندگی کے پچیس سال گزار چکی ہوں۔"

ذاکر صاحب کو اس کے لہجے کی مضبوطی نے گویا حیرانی کے سمندر میں غوطہ زن کر دیا تھا۔ وہ بولے تو ان کا لہجہ خاصا بے یقین تھا۔

"کس کی بات کر رہی ہو؟ ساحر کی؟"

"جی ہاں۔"

"مگر ساحر کا تو صرف ایک ہی بیٹا ہے، میں جانتا ہوں اسے۔"

ذاکر صاحب کی پرنور بوڑھی آنکھوں میں شبہات تھے جب وہ مزید بے چین ہوتے ہوئے بولی۔

"آپ کیسے جانتے ہیں انہیں؟"

"میرا منہ بولا بیٹا اور شاگرد تھا ساحر۔ میں نے ہی پالا تھا اسے۔"

ان کی بتائی ہوئی معلومات انجشاء کو چکرا دینے کے لیے کافی تھی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں دادا جان! سائرہ آنی تو ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ ساحر انکل کا دنیا میں کوئی نہیں۔"

"ہوں...... اس کا واقعی کوئی نہیں تھا۔" سر جھکا کر کہتے ہوئے وہ آبدیدہ ہو گئے تھے۔ انجشاء کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔

"آپ ٹھیک ہیں دادا جان؟"

"ہوں، میں ٹھیک ہوں۔ مگر ابھی تھوڑا آرام کروں گا۔"

کچھ یادیں واقعی زخم ادھیڑ دیتی ہیں۔ ذاکر حسین صاحب کے زخم بھی ادھڑ گئے تھے۔

انجشاء انہیں بے بسی سے اٹھتے اور پھر اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھتی رہی۔ کتنے سوالات تھے جو اس وقت اس کے دماغ میں کلبلا رہے تھے مگر کتنی بے بسی تھی کہ اس وقت وہ اپنے کسی سوال کا جواب نہیں پا سکتی تھی۔

وہ پرچھائی جس سے بھاگ کر وہ سوات سے گلگت آئی تھی، اس پرچھائی نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

رات کا پچھلا پہر شدید بے چینی کی نذر ہو گیا تھا۔ خدا خدا کر کے صبح کی اذان ہوئی تو اس نے اٹھ کر وضو کیا پھر نماز پڑھ کر شدت سے دعا کی کہ اب بھی اس کا سامنا سوزان ساحر سے نہ ہو، مگر اس کی دعا مستجاب نہیں ہوئی تھی۔ ہر دعا کے مقدر میں شاید فوری قبول ہونا لکھا بھی نہیں ہوتا۔

☆☆☆

سمعان احمد کے مضبوط مردانہ ہاتھوں کا دباؤ اس کی گردن پر بڑھتا جا رہا تھا۔ تکلیف کی شدت سے آنکھیں پھیلنے کے ساتھ ساتھ اب وجود بھی ڈھیلا پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ جب سمعان کی جیکٹ میں موجود اس کا موبائل بج اٹھا۔

اچانک آنے والی کال نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی، تب ہی وہ اسے نفرت سے پرے ہٹاتا ہوا موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہاں عاقب! کہو، کیا بات ہے؟" اسکرین پر جگمگاتے نمبر پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے تیسری بیل پر کال ریسیو کی تھی، جب دوسری طرف سے اس کے ساتھی نے کہا۔

"اچھی خبر نہیں ہے سر! سوزان ساحر پولیس کی بڑی تعداد کے ساتھ آپ کو گرفتار کروانے کسی بھی وقت وہاں پہنچ رہا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکتا ہے، فوری وہاں سے نکلیں۔ اس وقت یہی بہتر ہے۔"

"ٹھیک ہے، گاڑی اور ڈرائیور بھیجو فوری۔"

وہ بزدل نہیں تھا مگر اس وقت سمعان کا کانچ میں

موجود دو عورتوں کا جو حال وہ کر چکا تھا، ان دو عورتوں کے ساتھ پولیس کے ہاتھ نہیں لگنا چاہتا تھا، تب ہی فی الوقت وہاں سے چلے جانا ہی بہتر سمجھا۔

ہادیہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر ہوش و حواس سے بے گانی پڑی تھی۔ جبکہ صغراں کا جو حال وہ کر چکا تھا، اسے امید نہیں تھی کہ وہ دو تین مہینوں سے پہلے ٹھیک ہو سکے گی۔ اس وقت ان دونوں عورتوں کا سوزان ساحر کے ہاتھ لگنے کا مطلب تھا، عدالت میں اس کا کیس کمزور ہونا اور یہ وہ کسی طور نہیں ہونے دے سکتا تھا۔

تب ہی جیسے ہی اس کی گاڑی اور ڈرائیور پہنچے وہ ان دونوں کو لے کر فوراً سوات سے نکل گیا۔

دنیا میں اس کے خفیہ اڈوں کی کمی نہیں تھی لہٰذا سوات سے نکل کر اس نے کہاں قیام کرنا تھا، اس نے پہلے سے ہی سوچ لیا تھا۔

سوزان جس وقت پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ سوات میں موجود سمعان کا تیج پہنچا، وہاں وحشت ٹپکاتے در و دیوار کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی ملازم، نہ ملازمہ۔ وہ کیسے پکڑتا، کس سے سراغ پاتا؟

ایک طرف انجشاء کی جان اگر خطرے میں تھی تو دوسری طرف ہادیہ کی جان کے ساتھ ساتھ اس کی عزت کو بھی شدید خطرہ لاحق تھا۔ صرف اس کی وجہ سے وہ مخلص لڑکی مصیبت میں پڑ گئی تھی۔

معید اسے کالیں کر رہا تھا کہ ہادیہ کا نمبر کیوں پاور آف ہے؟ اب وہ اسے کیا بتاتا کہ ہادیہ کے ساتھ کیا سانحہ پیش آ چکا ہے۔

زندگی میں دوسری بار وہ اپنے آپ کو بے حد بے بس محسوس کر رہا تھا۔

سوات کا چپہ چپہ چھاننے کے باوجود اسے کہیں سمعان احمد، انجشاء اور ہادیہ کا سراغ نہیں ملا تھا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ انجشاء تو کب کی وہاں اس کی کیچڑ سے نکل چکی تھی مگر چونکہ وہ لاعلم تھا لہٰذا اسے ہادیہ ضمیر چوہدری کے ساتھ ساتھ انجشاء عظیم کی بھی فکر تھی۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، جب اسے سمعان احمد کے خاص آدمیوں میں شامل اپنے خاص بندے کی کال موصول ہوئی۔ سوزان نے دوسری بیل پر ہی کال ریسیو کر لی تھی۔

''ہاں کہو سعد! کیا رپورٹ ہے؟''

''رپورٹ اچھی نہیں ہے سر! سمعان احمد اپنی خاص ملازمہ صغراں اور آپ کی دوست ہادیہ ضمیر کے ساتھ سوات سے نکل چکا ہے۔ کل رات اس نے صغراں بی بی پر بہت تشدد بھی کیا ہے۔ جگہ جگہ سے اس کا جسم چاقو سے کٹ کیا ہے اس نے۔ بہت زخمی حالت میں ہے وہ۔ ہادیہ بی بی بھی بے ہوش تھیں۔ اصل میں وہ یہاں سے فرار ہی اس لیے ہوا ہے کہ اس کے قبضے میں دونوں خواتین ٹھیک نہیں تھیں اور آپ کے یہاں پہنچنے کی اطلاع بھی اسے پہلے ہی مل گئی تھی۔''

''اوہ خدا، کچھ پتا ہے کہاں گیا ہوگا وہ۔''

''نہیں سر! سمعان احمد نے آج تک اپنے کسی پلان کی خبر کسی ملازم کو نہیں دی۔ اپنا ہر کام، ہر سرگرمی خفیہ رکھتا ہے وہ۔''

''اچھا، وہ جو اس کی بیوی ہے انجشاء، وہ کہاں ہیں۔ کیا اسے ساتھ لے کر نہیں گیا وہ؟''

''نہیں سر! وہ تو کچھ روز قبل ہی کہیں چلی گئی تھیں، سمعان کاٹیج سے۔''

''واٹ؟ اکیلی کیسے چلی گئیں۔ سمعان احمد نے اسے اکیلے کیسے جانے دیا؟''

''اکیلی نہیں گئی سر! سمعان احمد نے خود اپنی نگرانی میں کہیں چھپایا ہے انہیں۔''

''اوہ میرے خدا، کیا کروں میں اب؟'' دایاں ہاتھ گھنے بالوں میں پھنسا کر اس نے بے ساختہ اوپر آسمان کی طرف دیکھا تھا جب سیل کی دوسری جانب سے آواز آئی۔

''کیا ہوا سر؟ آپ ٹھیک ہیں؟''

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ تم ایسا کرو جیسے ہی سمعان احمد کے بارے میں کوئی بھی معلومات ملتی ہے،

تم فوراً ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر مجھ سے رابطہ کرو گے، اوکے؟"

"جی، ٹھیک ہے سر!"

کال منقطع ہوگئی تھی۔ پولیس نفری کو اس نے واپس بھجوادیا تھا مگر وہ خود پوری رات وہیں رہا تھا۔ عجیب دوراہے پر زندگی آ کر کھڑی ہوگئی تھی کہ نہ آگے کچھ نظر آرہا تھا نہ پیچھے۔ وہ جاتا تو کہاں جاتا؟ اسی شش و پنج میں الجھا تھا جب اچانک اس کا سیل پھر بج اٹھا۔

"السلام علیکم!"

روشن اسکرین پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس نے سامنے وال کلاک کی طرف دیکھا صبح کے چھ بج رہے تھے۔ تب ہی اس نے فوراً کال پک کی تھی، جب دوسری طرف سے اس کے سلام کے جواب میں پوچھا گیا۔

"کیسے ہو برخوردار! کتنے ماہ ہوگئے، کبھی چکر نہیں لگایا تم نے۔ لگتا ہے بوڑھے دادا کو بھول گئے ہو۔"

"ارے نہیں دادا جی! ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ بس کچھ معاملات ایسے تھے کہ بہت بری طرح سے کام میں پھنسا ہوا ہوں، آپ تو جانتے ہی ہیں میرے کام کو۔"

"ہاں ہاں، سب خبر ہے مجھے۔ اسی لیے تو کبھی گلہ نہیں کیا۔"

"شکریہ دادا جی! یہ بتائیں، آج اس وقت کیسے یاد کرلیا۔ سب ٹھیک تو ہے ناں؟"

"ہاں بیٹے! سب ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کیا تمہارے والد نے کسی لڑکی کو گود لے کر پالا تھا؟"

سوزان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے کبھی یہ سوال بھی کرسکتے ہیں، تب ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"جی دادا جی! لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں، ویسے ہی کہیں سے پتا چلا تھا تو پوچھ لیا۔"

"ہوں، ٹھیک ہے۔" دل کی تکلیف مزید بڑھ گئی تھی۔

ذاکر حسین صاحب نے کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد رابطہ منقطع کردیا تو وہ پھر سے سمعان احمد اور ہادیہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

پتا نہیں اس وحشی انسان نے ہادیہ کا دھوکا ثابت ہونے کے بعد اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا؟ پتا نہیں انجشاء کو کہاں روپوش کیا ہوگا اس نے؟

کتنے سوال تھے جو ناگ بن کر سر اٹھا رہے تھے مگر بے بسی سی بے بسی تھی کہ وہ کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

☆☆☆

ایک لمبی مسافت کے بعد سمعان ہادیہ اور صغراں کے ساتھ جس وقت کاغان پہنچا، سورج ڈھل چکا تھا۔ کاغان میں ابھی پچھلے سال اس نے اپنے لیے ایک خوب صورت سا گھر خریدا تھا لہٰذا اس وقت یہی گھر اس کا مسکن بن گیا تھا۔ سوات کی طرح یہاں اس گھر میں بھی سوائے صفائی ستھرائی اور پہرے داری کے کسی ملازم کو گھر میں قیام کی اجازت نہیں تھی۔

رات تقریباً آٹھ بجے کے قریب ہادیہ کو ہوش آیا تو سمعان احمد کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اپنے قریب ہی اسے کسی کے درد سے کراہنے کی آواز سنائی دی تو وہ فوراً بستر سے اٹھ بیٹھی۔ بڑے سے کشادہ کمرے کے دائیں جانب اس نے صغراں کو دیکھا جو اس وقت پٹیوں میں جکڑی دیکھے جانے کے قابل بھی نہیں تھی۔ ہادیہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ بستر سے اٹھ کر وہ فوراً صغراں کے پاس آئی تھی جس کا وجود درد کی شدت سے بخار میں جل رہا تھا۔

"صغراں......! مجھے سمجھ میں نہیں آرہا، میں تم سے کیا کہوں مگر حقیقت یہی ہے کہ انسانیت کے ناتے تمہیں اس حال میں دیکھ کر مجھے بہت تکلیف ہورہی ہے۔ کیوں رہتی ہو ایسے جانور نما انسان کے

ساتھ، جسے انسانیت کے معنی بھی نہیں پتا۔"

وہ اس وقت حقیقتاً اس کے لیے دکھی تھی مگر صغراں نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

"چلی جاؤ یہاں سے، پہلی بار سائیں کے کسی غدار کو پہچاننے میں غلطی ہوئی مجھ سے، سزا تو ملنی تھی۔"

"واٹ؟ تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو۔ اس شخص نے بنا تمہیں انسان سمجھے پورا جسم ادھیڑ ڈالا تمہارا اور تم اس پر بھی اسے درست کہہ رہی ہو۔ یار! کیسی غلامی ہے یہ؟ کیسی جہالت ہے؟ جتنے پیسے یہ شخص تمہیں ماہانہ دیتا ہوگا اس سے تو کہیں بھی زیادہ پیسے مل جائیں گے تمہیں؟"

اسے اپنی تکلیف اپنے زخم بھول گئے تھے۔ جان جانے کا ڈر بھی نہیں رہا تھا اب اسی لیے چلا کر بولی تو صغراں کے لب پھیل گئے۔ خشک پپڑی زدہ ہونٹوں پر بڑی بے جان سی مسکراہٹ بکھیر گئی۔

"پیسوں کے لیے سائیں کا ساتھ نہیں دیتی میں۔"

"تو پھر...... کوئی مجبوری ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا مجبوری ہے ایسی جو اپنی جان کی پروا بھی نہیں کر رہی ہو تم؟"

"تمہیں کیوں بتاؤں؟ تم کون ہوتی ہو سب جاننے والی؟"

اچانک وہ بدگمان ہوئی تھی، جواب میں ہادیہ نے اپنا ہاتھ اس کے گال پر رکھ دیا۔

"بہن ہوں تمہاری، اگر سمجھو تو......"

اس کے الفاظ پر صغراں کی آنکھوں میں بے ساختہ نمی آئی تھی۔ کچھ تھا ہادیہ ضمیر چوہدری کے لہجے اور چہرے پر جو اسے یقین کرنے پر اکسا رہا تھا۔ تب ہی وہ بولی۔

"مجبوری ہے میری، کیونکہ شوہر ہے وہ میرا۔"

"واٹ؟ یہ کیسا مذاق ہے یار!" ہادیہ کو جیسے یقین ہی نہیں آیا تھا۔

صغراں کے لبوں پر پھر بے جان سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"مذاق نہیں ہے یہ، حقیقت ہے۔"

"کمال ہے یار! اگر وہ شخص تمہارا شوہر ہے تو باندی بنا کر کیوں رکھا ہوا ہے اس نے تمہیں؟ کیوں اتنا حقیر کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"ایسا نہیں ہے۔" ہادیہ کے الزام پر وہ جیسے تڑپ اٹھی تھی۔ "اس شخص نے تو معتبر کیا ہے مجھے اپنا نام دے کر۔ حقیر تو میرے اپنوں نے کیا تھا مجھے۔"

"کیا مطلب...... میں سمجھی نہیں۔"

"کیسے سمجھو گی تم، بہت لمبی کہانی ہے۔"

"مجھے بتاؤ پلیز، کیوں اس شخص کے پلے پڑیں تم؟" وہ بے چین تھی۔

صغراں نے اپنی کراہیں ضبط کر کے گہری سانس لی۔ پھر تکیے پر سر ٹکاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

"اپنے ماں باپ کی ایک ہی اولاد تھی میں، جو شادی کے پندرہ سال بعد رب سائیں نے بڑی منتوں مرادوں کے بعد میرے ماں باپ کی جھولی میں ڈالی۔ سانگھڑ کا سب سے بڑا وڈیرہ تھا میرا باپ۔ خوشاب، بدین، سکھر سارے علاقے میں نام چلتا تھا ان کا۔ پتا ہی نہیں تھا کتنی ایکڑ زمین کے وارث تھے وہ۔ گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں کہ پھر ایک رات اچانک میری ماں کی موت ہوگئی۔ سینے میں اٹھنے والا درد ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ میں ان دنوں کالج میں پڑھتی تھی۔ ماں کی اچانک موت نے ساری خوشیاں چھین لیں میری۔ مجھے اچانک لگا میں دو چار دن میں ہی بچپن سے کود کر سیدھی بڑھاپے میں آگئی ہوں۔ سب میری ذہانت کی تعریف کرتے۔ بابا اپنے اکثر معاملات میں میری رائے لیتے۔ سمعان کے بابا احمد حسن میرے بابا کے بہت اچھے دوست تھے۔ جب بھی وہ بابا سے ملنے آتے، میری بہت تعریف کرتے۔ ان ہی دنوں جب میں اپنی تعلیم مکمل کر رہی تھی چاچا، بابا کے پاس اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آگئے۔ بابا کو اپنا اوباش بھتیجا پسند نہیں تھا لہٰذا انہوں نے سہولت سے انکار کر دیا۔

مگر چاچا اور ان کے بیٹے نے اس انکار کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا اور یوں ایک روز پوری پلاننگ کے ساتھ ان لوگوں نے میرے بابا کی جان لے لی۔ میرے بابا شکار کے شوقین تھے۔ وہ شکار پر گئے اور

وہیں ان لوگوں نے دھوکے سے ان کے وجود میں گولیاں اتار دیں۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ مجھ پر کیسی قیامت ٹوٹ چکی ہے۔ پتا تو اس وقت چلا جب بابا کی لاش گھر سے آنے پہلے ہی چاچا کے بیٹے نے مجھے اپنی ہوس کا شکار بنالیا۔ نہ صرف میری عزت برباد کی بلکہ یہ طعنہ بھی دیا کہ وہ دیکھے گا اب کون اپنی عزت بناتا ہے مجھے۔ میرے لیے تو یہی قیامت بہت بڑی تھی کہ اوپر سے بابا کی موت کی خبر نے گویا حواس ہی سلب کرلیے۔ تب اس مشکل وقت میں احمد انکل نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے حوصلہ دیا۔ بابا کی تدفین کے بعد اپنے بیٹے کو زبردستی منا کر انہوں نے میرے ساتھ نکاح کروایا۔ مجھے نام مل گیا تھا۔ عزت مل گئی تھی اور کیا چاہیے تھا۔ نہ سمعان سائیں نے کبھی مجھے بیوی والی عزت دی، نہ میں نے مانگی۔ مانگ ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ میں جانتی تھی میں ان کے قابل نہیں تھی۔"

صغراں کی کہانی دل چیر دینے والی تھی۔ ہادیہ کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں جبکہ کمرے کے بند دروازے کے اس پار کھڑا سمعان احمد بھی جیسے ساکت رہ گیا تھا۔ اس نے تو کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی کہ زندگی اس کے ساتھ نے کیا کیا کھیلے تھے۔ وہ تو بس یہی جانتا تھا کہ اس لڑکی کی آبرو محفوظ نہیں رہ سکی تھی لہٰذا اپنے باپ کے دباؤ میں اس نے اس کے ساتھ شادی کرلی اور بس کہانی ختم۔ وہ باپ کی منظور نظر تھی، ان کی زندگی میں سمعان اس کے معاملات سے دور رہا مگر باپ کی وفات کے بعد کون روکنے والا تھا اسے؟ بوڑھے دادا کو تو کبھی اس نے اتنا حق ہی نہیں دیا تھا کہ وہ اس کے معاملات میں دخل اندازی کرسکیں۔ لہٰذا اپنے اندر کی ساری بھڑاس، سارا غبار جو بھی زندگی نے اس کے اندر بھرا تھا، وہ اس بے قصور لڑکی پر نکالتا رہا جس نے صرف ایک نام کے عوض ہمیشہ اس کے ساتھ وفا نبھائی تھی۔ بڑے سے بڑے ستم پر بھی اس نے کبھی زبان سے اف نہیں کیا تھا۔

کچھ تھا اس وقت اس کے اندر جس نے اسے وہیں دہلیز سے واپس پلٹ جانے پر مجبور کردیا تھا۔

ہادیہ اب صغراں کا ہاتھ تھامے اس کے بال سہلا رہی تھی۔

"اتنے درد، اتنی بہادری سے کیسے برداشت کرلیے تم نے صغراں؟" وہ رو رہی تھی۔ صغراں نے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔

"بس...... کچھ تھا ہی نہیں پاس۔ کس پر غرور کرتی؟"

"تمہاری زمینیں، گھربار......؟"

"سب سائیں کو دے دیا۔ میں نے اپنے نام رکھ کر کرنا بھی نہیں کیا تھا۔"

"اوہ میرے خدا! یار اتنا کچھ پاکر بھی اس شخص کے دل میں کبھی تمہارے لیے کوئی محبت اور رحم کا جذبہ نہیں آیا؟" وہ دکھی ہو رہی تھی۔ جواب میں صغراں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"مجھے بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے، مانتی ہوں کہ پہلے بھی بہت کچھ سہا ہے مگر تب شاید ہمت زیادہ تھی جسم میں۔ اب ہمت نہیں ہے۔" بار بار ہونٹوں پر زبان پھیرتی، وہ بہت مشکل سے اپنا درد ضبط کررہی تھی۔

ہادیہ کی بے چینی بڑھ گئی۔

"کیوں مارا اس وحشی نے اتنی بربریت سے تمہیں؟"

"تمہارے لیے۔ سائیں کو لگا شاید میں جانتی تھی کہ تم ان کے ساتھ دھوکا کررہی ہو۔ مگر میں نے انہیں نہیں بتایا، لیکن میرا اللہ جانتا ہے میں نہیں جانتی تھی کہ تم ان کے ساتھ دھوکا کررہی ہو۔ نہ ہی میں یہ جانتی ہوں کہ انہیں کیسے پتا چلا تمہاری غداری کا۔"

"ہوں، تم واقعی نہیں جانتیں۔ لیکن میں جانتی ہوں۔"

"کیا؟"

"یہی کہ تمہارے سائیں کو میری حقیقت کا کیسے پتا چلا؟"

"کیسے پتا چلا؟"

"انجشاء عظیم نے بتایا ہے اسے۔ تمہارے شوہر کی دوسری بیوی اور محبوبہ تنے۔"

"تمہیں کیسے پتا؟"

"اسے سب پتا تھا اس لیے۔"

”تم کہنا چاہتی ہو کہ وہ بھی سائیں کے ساتھ دھوکا کررہی ہے۔“
”نہیں، وہ دھوکا کیسے کرسکتی ہے۔ وہ تو پیار کرتی ہے تمہارے سائیں سے۔“
”یہ تم سے کس نے کہا؟“
”کس نے کہنا تھا، میں نے خود دیکھا ہے۔“
”غلط دیکھا ہے پھر تم نے...... کیونکہ سمعان سائیں کے ساتھ اس کی شادی صرف کاغذ کی حد تک ہے بس۔ آج تک سائیں کبھی اس کے کمرے میں ایک رات نہیں سوئے۔“
”واٹ؟ یہ کیا کہہ رہی ہو؟“
”وہی جو سچ ہے۔ سائیں سے پیار نہیں کرتی وہ۔“
”ایسا نہیں ہے۔“
”ایسا ہی ہے۔ تم وہ نہیں جانتیں ہو جو میں جانتی ہوں۔“
صغراں کے لہجے کی مضبوطی نے انجشاء سے متعلق اس کے تمام شبہات کو مٹا دیا تھا مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسے سمعان احمد سے محبت نہیں تھی تو وہ دوبارہ کیوں آئی اس کے پاس۔ جانے اندر کی یہ کیسی کہانیاں تھیں جن کا سراغ اسے نہیں مل رہا تھا۔
صغراں کی تکلیف گزرتے ہر لمحے کے ساتھ بڑھتی جارہی تھی مگر وہ کیا کرتی اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا۔ تب ہی وہ وہاں آیا تھا۔
ہادیہ اسے دیکھتے ہی نفرت سے منہ پھیرتی وہاں سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ جبکہ صغراں کا رنگ اسے دیکھ کر مزید پیلا پڑ گیا۔ اسے لگا جیسے اس شخص نے اس کی ساری باتیں سن لی ہوں اور اب یقیناً اس کی خیر نہیں تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھا تھا جب وہ خوف سے کپکپاتے ہوئے بولی۔
”سائیں میں...... میں اس سے......“
بہت کوشش کی بولنے کی مگر زبان اتنی خشک ہوگئی تھی کہ وہ چاہنے کے باوجود کچھ نہ بول سکی۔ سمعان احمد کی خاموش نگاہیں اسے زندہ درگور کرنے کے لیے کافی تھیں۔ یہ اس کے اندر کا خوف ہی تھا کہ بنا اس کی کوئی بھی بات سنے۔ اس نے اتنا دل پر اثر لیا کہ اچانک اس کی طبیعت بگڑنا شروع ہوگئی۔
سمعان احمد کے لیے یہ قطعی غیر متوقع تھا تب ہی اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔
”صغراں!“
مگر وہ نہیں سن پائی تھی۔ اس کی آنکھیں جیسے کسی گہرے اندھیرے میں ڈوبتی جارہی تھیں۔ وہ ہاتھ جوڑ کر سامنے بیٹھے اس شخص سے معافی مانگنا چاہتی تھی مگر اس کا جسم جیسے سرد پڑتا جارہا تھا۔ زرد چہرے پر پھیلی ہوئی آنکھوں میں سوائے وحشت اور خوف کے اور کچھ نہیں تھا۔
سمعان احمد ندامت کے سمندر میں غرق ہوگیا۔
”صغراں! میری بات سنو...... حوصلہ رکھو پلیز، میں کچھ نہیں کہوں گا۔“
وہ اس کا بازو سہلا رہا تھا۔ مگر اس کے سامنے زخم زخم ہوئی اس لڑکی کی آنکھیں مسلسل اندھیرے میں ڈوبتی جارہی تھیں۔ وقت جیسے کچھ کہنے اور سننے سے بہت آگے نکل گیا تھا۔
ضلع سانگھڑ کی ایک امیر کبیر ماں باپ کی اکلوتی بیٹی کسی بے بس زخمی پرندے کی مانند پھڑپھڑاتی اپنے صیاد کے ہاتھوں میں سانسوں کی متاع ہارتی جارہی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ گوشت پوشت سے بنا خوب صورت وجود مٹی میں تبدیل ہوگیا تھا۔ سمعان احمد کو موقع ہی نہ مل سکا کہ وہ اس سے اپنی ندامت کا اظہار کرسکتا۔ اپنے قد سے چھوٹا ہوکر اس سے اپنے وحشیانہ رویے کی معافی مانگ سکتا۔ اس کی خدمتوں اور وفاداریوں کا اعتراف کرسکتا۔ وہ تو اسے کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر دنیا سے چلی گئی تھی۔
سمعان احمد کو لگا جیسے اس کا اپنا وجود برف کے مجسمے میں تبدیل ہوگیا ہو۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)
☆☆

ہاجرہ عمران

دیسی لڑکی کی بڑی عید

بکرے کی بھیں بھیں کی آواز اسے سونے نہیں دے رہی تھی۔ وہ کبھی کانوں پر تکیہ رکھتی تو کبھی کروٹیں بدلتی مگر چھت سے آنے والی قربانی کے بکرے کی آوازیں اس کے کمرے کی کھڑکی سے سیدھی اندر آتیں اور اس کی سماعتیں دہائی دینے لگتیں۔

بکرے کو بھی شاید اپنے پرانے مالک اور ساتھیوں سے بچھڑنے کا غم ستا رہا ہے یا پھر اسے رات کی تنہائی ہولائے دے رہی ہے۔ مگر اس سب میں میرا کیا قصور ہے؟ یہ بکرا مجھے ہی کیوں جگانے پر تلا ہوا ہے۔ اس نے بے بسی سے سوچا۔ بکرے کی آوازوں سے نیند میں خلل پڑ ہی چکا تھا۔ اسی لیے اس نے جھلا کر تکیہ ایک طرف پھینکا اور دوپٹا اٹھا کر اوڑھ لیا۔ اس کا ارادہ چھت پر جا کر بکرے کی خبر لینے کا تھا۔ "گھر میں تین تین بھائی ہوتے ہوئے سب کام مجھے ہی کیوں دیکھنے پڑتے ہیں وہ تینوں نہ جانے کہاں غائب ہیں؟ گئے ہوں گے اپنے برگر دوستوں کے ساتھ ان کی بکرا شاپنگ میں مدد کرنے بکرا منڈی......"

وہ مندھی مندھی آنکھوں سے بڑبڑاتی ہوئی زینے پر بہت دھیان سے پاؤں رکھ رہی تھی کہ کہیں پاؤں نہ رپٹ جائے۔ چھت پر پہنچی تو زنجیر سے بندھا بکرا مزے سے کھڑا بھیں بھیں کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بھی اس کے راگ الاپنے میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ محتاط انداز میں چلتی ہوئی اس کے قریب جا کر جائزہ لینے لگی کہ کہیں خدانا خواستہ بکرے کو کوئی پریشانی تو نہیں۔ کہیں لوہے کی زنجیر اس کے گلے میں تو نہیں پھنس گئی جو اتنی خوف ناک آوازیں نکال رہا ہے۔ بکرا اسے دیکھتے ہی خاموش ہو گیا تھا جیسے اسی کا انتظار کر رہا ہو۔

"اے میاں بکرے، کیا بات ہے، اتنا اودھم کیوں مچایا ہوا ہے؟ کس بات کی پریشانی ہے، تم تو اتنے خوش نصیب ہو۔ پتا ہے جنت میں جانے والے ہو۔ انسان ہوتے تو پتا چلتا جنت میں جانے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ امی کی کتنی ڈھیر ساری ڈانٹ چپ چاپ کھانی پڑتی ہے۔ ادھر تم ہو ذرا سی چھری گردن پر پھری ادھر جنت کی ٹکٹ کٹی......" اس نے ہاتھ سے فضا میں جہاز اڑایا۔

"دیکھنا بس ایک روز کے بعد پھر تم ہو گے اور جنت کے حسین نظارے۔ بھئی پھر تو جنت میں شہد کی نہر کے قریب ہی ملاقات ہو گی۔ جہاں تم گردن جھکائے میٹھا پانی پی رہے ہو گے اور مابدولت زرق برق لباس میں شہزادی بن کر گھوم رہی ہوں گی۔"

وہ آگے ہو کر بکرے پر تھوڑا سا جھکی۔ اتنے میں ایک زوردار "ہاؤ" کی آواز سے ڈر کر بکرے پر گرنے ہی والی تھی کہ جلدی سے خود کو سنبھال لیا۔ پیچھے ہی اس کا تیسرے نمبر والا دشمن...... بھائی کھڑا تھا۔

"بدتمیز...... تمیز نہیں ہے، ابھی میں بکرے پر گر جاتی۔"

اس نے پلٹ کر اسے ڈپٹا مگر فوراً ہی ٹھٹک کر رک گئی۔ علی کے پیچھے ایک لمبے سے قد کا نوجوان کھڑا دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ...... یہ تمہارے پیچھے کون ہے؟" اس نے گھگھیاتے ہوئے پوچھا۔ کیونکہ ملگجے سے اندھیرے میں وہ اسے کوئی بھوت ہی لگا۔ جو اس کے بھائی کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا گھر میں گھس آیا ہو۔ کیونکہ ان کے گھر کا ماحول اتنا آزاد کبھی بھی نہیں تھا کہ ایک اجنبی یوں دیدہ دلیری سے ان کے گھر داخل ہو جائے۔

"یہ ابو کی کزن شاہانہ پھپھو کے بیٹے شاداب

ہیں، کچھ ماہ سے جاب کے سلسلے میں یہاں لاہور میں مقیم ہیں۔" علی نے جلدی سے اس کا تعارف کرایا کہ مبادا علیمہ اسے بھوت ہی نہ سمجھ لے جو کہ وہ پہلے سے ہی سمجھ چکی تھی۔

"آپ بکروں کی زبان سمجھ لیتی ہیں؟" وہ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر برجستہ بولا۔ اس کی بات سن کر علیمہ نے اسے گھور کر دیکھا کہ شاید وہ مذاق کر رہا ہے۔ مگر وہ سنجیدہ تھا۔

اس کا مطلب اس نے میری بکرے کے ساتھ کی گئی گفتگو سن لی۔ وہ دل میں بہت ہی شرمندہ ہوئی۔ وہ جل بجھ کر ناک بھوں چڑھاتی ہوئی زینہ طے کر کے نیچے چلی گئی۔

"اب یہ کہاں سے آ گیا؟" اس نے بولتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆

روبینہ بیگم نہایت پرتپاک انداز میں شاذب سے ملیں۔

"بیٹا تم اتنے مہینوں سے لاہور آئے ہوئے ہو، تو گھر کیوں نہیں آئے؟ ابھی بھی علی زبردستی تمہیں لے کر گھر آیا ہے۔ عید کا موقع نہ ہوتا تو شاید تم پھر بھی نہ آتے۔ ماموں کا گھر ہے تمہارے اور غیریت تم نے بیگانوں جیسی اپنا رکھی ہے۔ تمہارے ماموں سے بھی کئی بار کہا کہ شاذب کو کہیں ادھر ہی آ کر رہ لے تو کہنے لگے کہ میں نے فون کر دیا ہے جب مناسب سمجھے گا بچہ آ جائے گا۔ لو بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔" وہ تو اسے دیکھتے ہی نہال ہو گئی تھیں۔

"بیٹا کرتے کیا ہو؟"

"ممانی میں سول انجینئر ہوں، ایک ملٹی نیشنل کمپنی سے تین سال کا معاہدہ ہوا ہے۔ مگر ان سالوں کے اندر اندر اپنی کمپنی رجسٹر کروا لوں گا۔ مجھے اپنا بزنس پسند ہے۔" اس نے جواب دے کر چائے کا کپ اٹھا لیا۔

روبینہ تو ششدر ہی رہ گئیں۔ یہ فوزیہ تو کمال بندی نکلی، بہت اچھی تربیت کی ہے بیٹے کی۔ انہوں

نے اپنی نند کو غائبانہ خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کبابوں کی پلیٹ شاذب کی جانب بڑھائی۔

"اس بار فون کروں گی تو فوزیہ باجی سے کہوں گی کہ کبھی وہ بھی گھر سے نکلا کریں، کبھی کبھار رشتے داروں سے بھی ملنا چاہیے۔ عرصہ گزر گیا انہیں لاہور کا چکر لگائے ہوئے۔" انہوں نے محبت سے شکوہ کیا۔

"کیوں نہیں ممانی جان! ضرور۔ ویسے بھی امی

اور ابو کا عید پر لاہور آنے کا پروگرام بن رہا ہے۔ کہہ رہی تھیں دو سال ہو گئے سب سے ملے۔ اس بار عید آپ کے ساتھ ہی کرنے کا پروگرام ہے۔ اسی لیے تو میں گھر نہیں گیا۔''

''ارے، یہ تو بہت بڑی خوش خبری سنائی بیٹا تم نے۔ سو بسم اللہ...... جم جم آئیں۔'' انہوں نے خوشی کا اظہار کیا۔

''ممانی! صبح سے میں بس آپ کو ہی گھر کے کام کرتے دیکھ رہا ہوں۔ یہ علیمہ کام کاج میں آپ کا ہاتھ نہیں بٹاتی؟'' اس کے دل میں مچلتا سوال ہونٹوں پر آ گیا۔ رات اسے دیکھا تھا پھر وہ دکھائی ہی نہیں دی۔ تجسس سے مجبور ہو کر پوچھ ہی بیٹھا۔

''نہیں نہیں بیٹا، سارا گھر وہی دیکھتی ہے۔ طبیعت کچھ خراب ہے تو کمرے میں آرام کر رہی ہے۔ مجھے تو وہ ہل کر پانی بھی نہیں پینے دیتی۔'' ان کے تجربہ کار دل نے شاذب کی شکل میں ایک ہونہار داماد کی خواہش کو ابھرنے سے بالکل نہیں روکا۔ اسی لیے اپنی بیٹی اور دنیا جہاں کی کام چور لڑکی کی جھوٹی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔

''علیمہ! بیٹی، پانی تو دینا۔'' انہوں نے علیمہ کو اپنے کمرے سے نکل کر باورچی خانے کی طرف جاتے دیکھا تو جلدی سے بولیں۔ شاذب کی توجہ کباب پر رہی۔ علیمہ نے ایک ٹرے میں جگ میں پانی اور دو گلاس رکھ کر ان کے سامنے رکھ دی۔

اس کے ہاتھوں کے بڑھے ہوئے تراشیدہ ناخنوں پر سلیقے سے کیا ہوا نیل پینٹ دیکھ کر ایسا لگ تو نہیں رہا کہ ان ہاتھوں نے کبھی کوئی کام کیا ہوگا۔ شاذب کی نظریں اس کے خوب صورت ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں میں الجھیں تو امی نے جلدی سے اسے وہاں سے بھگایا۔

''سالن دیکھ لو، چولہے کی لو ہلکی کر رکھی تھی میں نے۔'' روبینہ بیگم نے شاذب کی نظر میں ابھرتے سوال کو محسوس کر لیا تھا۔ اس لیے اسے جلدی جلدی پیش منظر سے ہٹایا۔

وہ ''جی اچھا۔'' کہتی ہوئی باورچی خانے کی جانب چلی گئی۔

''ابھی ابھی میں نے مینی کیور سے اپنے ہاتھوں کو اس قدر خوب صورت بنایا اور امی نے باہر نکلتے ہی کام سے لگا دیا۔'' اس نے ثمرین کو ٹیکسٹ کیا۔ ساتھ روتا ہوا ایموجی بھی سینڈ کیا۔

''اپنی صفائی ستھرائی کا بہت شوق ہے اسے، گھر کے سارے کام سکھا رکھے ہیں میں نے، مگر کام کرواتی کم ہوں کیونکہ ابھی پڑھائی چل رہی ہے نا تو میں نہیں چاہتی کہ اس کی توجہ ادھر ادھر ہو۔'' وہ جس طرح پانی کو ٹرے میں رکھ کر پیش کر گئی تھی جاذب اس کے سلیقے سے بہت متاثر ہوا۔ اس پر اس کے خوب صورت اور صاف ستھرے ہاتھ بھی اس کے تصور سے محو ہونے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔ شاذب نے مطمئن ہو کر سر جھکا دیا۔

☆☆☆

روبینہ بیگم نے بھی ٹھان لی تھی کہ وہ ایک دن میں اس کا سلیقہ شاذب پر ثابت کر کے رہیں گی۔ اگلے روز عید تھی۔ اسی لیے عید کی صبح آٹھ بجے ہی وہ اس کے سر ہو گئی تھیں۔

''پھوہڑ اور نکمی لڑکیاں دیر تک سوتی ہیں۔ بس اب اٹھ جاؤ۔''

آج کی رات علی اور شاذب نے بکرے کے پاس ہی ٹھکانا بنا لیا تھا۔ گھر میں کچھ سکون دیکھ کر رات اس نے اپنے پسندیدہ ڈرامے کی چند اقساط دیکھیں۔ جس کی وجہ سے اسے سونے میں دیر ہو گئی تھی۔ صبح صبح روبینہ بیگم کی صلواتوں سے اس کی آنکھ کھلی۔ ''کب سے اٹھا رہی ہوں مگر یہ لڑکی تو لگتا ہے گھوڑے گدھے سب بیچ کر سو رہی ہے، اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ پتا بھی ہے دیر تک سونا کتنی بڑی نحوست ہوتی ہے۔'' ان کا لیکچر جاری تھا۔ روبینہ بیگم اسے عید کے روز دیر تک سونے کے نقصانات پر بھاشن دے رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں مل مل کر خود کو جاگنے پر مجبور کیا۔

''اتنی جلدی صبح ہو بھی گئی ...... ابھی تو آنکھ لگی تھی۔'' اس نے جمائی لیتے ہوئے کسل مندی سے سوچا۔ روبینہ بیگم نے پنکھا ہی بند کر دیا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر بولیں۔

بھائی اور بابا عید کی نماز کے بعد سے قربانی میں لگے ہوئے ہیں۔ جلدی سے آ کر ناشتا کرو اور کلیجی چولہے پر چڑھا دو۔ جب وہ قربانی سے فارغ ہوں گے تو انہیں بھوک لگی ہوگی۔ شاذب بھی آیا ہوا ہے کیا سوچے گا بچہ، کیسی تربیت کی ہے میں نے اپنی اولاد کی؟'' روبینہ بے ساختہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔ وہ جو برے برے منہ بنا کر بستر سے اٹھ رہی تھی۔ ٹھٹک گئی۔

''اس کا مطلب میرے دشمنوں میں ایک اور دشمن کا اضافہ ہو چکا ہے۔ پہلے ہی تینوں بھائی مل کر اس کے ناک میں دم کیے رکھتے تھے۔ کسی کو شرٹ استری نہ ملے تو وہ پھوہڑ لڑکی۔ کسی کی بیلٹ نہ ملے تو ...... وہ نکمی۔ کسی کی جرابیں گم ہو جائیں تو'' وہ ذمہ دار۔'' بقول اس کے '' پہلے ہی اس کا مقابلہ ان تین اود بلاؤ سے رہتا ہے۔ اب یہ نیا دشمن کہاں سے پیدا ہو گیا؟''

وہ فریش ہو کر باہر نکلی اور سب سے نظر بچا کر باورچی خانے میں گھس گئی۔ باورچی خانے کی صاف ستھری حالت دیکھ کر اس کی جان میں جان آ گئی۔

''شکر ہے، امی نے ناشتے کے برتن سمیٹ لیے۔ اس نے سوچا، ورنہ باورچی خانہ گندا ہونے کے خیال سے ہی اسے ابکائی آ رہی تھی۔ کیونکہ اسے ناشتے کے برتن دھونے سے سخت الرجی تھی۔ اسے بے ساختہ اپنی ماں پر پیار آیا۔

ناشتے کے بعد مسالا تیار کر کے، کلیجی دھو کر تیار کردہ مسالے میں ڈالی۔ کلیجی کو ہلکی آنچ پر رکھ کر کچن سے نکلی کہ جلدی سے عید کے کپڑے پہن لے۔ ابھی وہ کچن سے نکل کر اپنے کمرے کی دہلیز تک پہنچی ہی تھی کہ اسی وقت دروازہ بجا۔ گھر کے سب مرد چھت پر قربانی میں مصروف تھے تو اسے ہی دروازہ کھولنے جانا تھا۔ گیٹ کھولتے ہی سامنے دیکھا تو ساتھ والی آنٹی کا بیٹا گوشت کی پلیٹ تھامے کھڑا تھا۔ اس نے غصے سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''یہی وقت ملا تھا تمہیں گوشت دینے آنے کے لیے۔''

''لائیں، گوشت واپس کر دیں، کل پرسوں دے جاؤں گا۔'' وہ بھی کوئی ڈھیٹ تھا۔

کیا مطلب کل پرسوں دے جاؤں گا...... زیادہ نا...... جگتیں مارنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے تیوری چڑھائی اور جلدی سے پلیٹیں لے کر اندر بڑھ گئی۔

ہمسایہ آنٹی کے بیٹے سے نبٹ کر۔ جلدی سے کمرے میں گئی اور کپڑے بدل کر ابھی اس نے چہرے پر بیس اپلائی کی ہی ہوگی کہ امی کی چنگھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''کلیجی جل رہی ہے۔''

اس کے سر پر جیسے بم پھٹا تھا۔ ''میں تو کلیجی بھول ہی گئی۔'' وہ کچن کی طرف بھاگی مگر راستے میں امی کے پاس بیٹھے شاذب کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر پوری طرح جل کر راکھ ہو گئی۔

''حد ہوتی ہے کمینے پن کی۔'' اس نے جلے دل سے سوچا۔ چولہا پہلے سے بند تھا۔ اس نے شکر ادا کیا کہ کلیجی جلنے سے بچ گئی تھی۔

''چولہا میں نے بند کر دیا تھا۔'' شاذب نے اسے باورچی خانے سے باہر آتے دیکھ کر جلدی سے کہا۔

''اگر چولہا بند کر دیا تھا تو پھر مجھے آواز دینے کی کیا ضرورت تھی۔'' اس نے احتجاجاً امی کی طرف دیکھ کر پھسپھسے انداز میں کہا۔ جانتی تھی کہ وہ اپنے ماں کی اکلوتی بیٹی ہے مگر اکلوتی ہونے کا اسے کبھی کوئی فائدہ نہیں ملا تھا۔

''اگر شاذب بروقت کچن میں پانی پینے نہ جاتا تو آج ساری کلیجی جل جانی تھی۔ ایک سال کے بعد یہ بابرکت موقع آتا ہے وہ بھی تمہارے پھوہڑ پن کی

نظر ہو جاتا۔'' انہوں نے دبی آواز میں اسے گھر کا۔
اس نے ''سوری امی۔'' کہتے ہوئے پھر سے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ امی کا پھوہڑ پن پر لیکچر شروع ہو چکا تھا۔

ایک تو امی کے کام ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے۔ بیلا آنے والی ہوگی۔ ابھی تو ہم دونوں نے مل کر فوڈ پانڈا سے کھانا منگوانا ہے۔ پھر مل کر ہارر فلم دیکھنی ہے۔ وہ شانے جھٹک کر دوبارہ انہماک سے تیار ہونے لگی۔ آئی شیڈز کے بعد کنٹورنگ کرنے میں مگن تھی کہ دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔
علی دستک دیتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

''امی نے کہا ہے کہ قربانی ہوگئی ہے۔ گوشت بانٹنے میں مدد کرو۔''

''کسی کو احساس نہیں کہ اس وقت گوشت سے زیادہ میرے چہرے کو توجہ کی ضرورت ہے۔'' اس نے برش زور سے ڈریسنگ ٹیبل پر پھینکا اور نہ چاہتے ہوئے بھی کمرے سے نکل آئی۔

اس گھر میں میرے پہلے دشمن کم تھے جو اب یہ ایک نیا دشمن پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے شاذب کو امی کے کانوں میں گھستا دیکھ کر کوفت سے سوچا۔ سامنے سرخ گوشت کا ایک انبار اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''امی! یہ سب میں کروں گی؟'' اس نے خوف سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں تو اور کیا تمہارے فرشتے کریں گے؟ ابھی نہیں سیکھو گی تو کب سیکھو گی؟ سسرال جا کر ماں کی ناک کٹواؤ گی کیا؟''

''لو جی شروع ہو گئیں امی کی غیر منطقی باتیں۔'' گوشت کے سامنے نشست سنبھالتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔

امی اور ابا کے درمیان گوشت بانٹنے پر مکالمہ جاری تھا۔

''سنو، چھنو باجی کو اچھا اچھا گوشت بھجوانا وہ کہہ رہی تھیں کہ پچھلی بار بھی گوشت میں چھیچھڑے ہی چھیچھڑے تھے۔'' انہوں نے اپنی بڑی بہن کا نام لیا۔

''آپ کے رشتے داروں کے شکوے تو کبھی ختم نہیں ہو سکتے ان کا تو بس نہیں چلتا کہ ہمارا گوشت بنا کر کھا لیں۔ امی نے دبی آواز میں دانت کچکچا کر جواب دیا مبادا کہیں شاذب نہ سن لے۔

''توبہ بیگم! کیسی باتیں کرتی ہو آپ؟ اپنی بہن کو اس بار گوشت دیتے ہوئے دوسرے رشتے داروں کا بھی خیال کر لینا، پچھلی بار بھی آدھے سے زیادہ بکرا تم نے ان کے ہاں بھجوا دیا تھا، ان کا فریزر پہلے ہی گوشت سے لدا ہوا تھا۔'' ابا نے انہیں تنبیہی انداز میں گھورتے ہوئے کہا۔

امی نے اپنا غصہ اس پر نکالا۔

''چار چار کلو کے پیکٹ بنا لو۔''

وہ اخبارات چھریاں اور ٹرے سنبھالے، کپڑے بچاتے ہوئے گوشت کے حصے کرنے لگی۔ امی ہاتھ چلانے کے ساتھ ساتھ اسے ہدایت دیتی جاری رہی تھیں۔ شاذب اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

بہت دیر گوشت سے جوجنے کے بعد اس نے سکھ کا طویل سانس لیا۔ سارا گوشت یا تو بانٹا جا چکا تھا یا پھر فریزر میں منتقل ہو چکا تھا۔

''سب ہو گیا۔'' اس نے اپنے ارد گرد صاف ستھرے کچن کو دیکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔ کھانے کے برتن شادو دھو گئی تھی۔ گوشت کی تقسیم بہ خیر و خوبی اپنے انجام تک پہنچی۔ ابھی وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھنے ہی لگی تھی کہ اسے کچھ خواتین کے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے کچن سے منہ نکال کر دیکھا تو اس کے سر پر بم کا گولا پھٹا۔ اس کے ابا مہمانوں کو لے کر اندر آ رہے تھے۔ اس کے بڑے بھائی کے ہونے والے سسرالی تھے جو عید ملنے اور گوشت دینے آئے تھے۔

''ہائے، یہ بھی کوئی موقع ہے کسی کے گھر آنے کا۔'' ابھی وہ انہیں جھانک کر سیدھی ہوئی ہی تھی کہ پیچھے سے اس کو منجھلے بھیا کی آواز سنائی دی۔

''آدم بیزار لڑکی اگر ماتم ہو گیا ہو تو مہمانوں کو سلام ہی کر لو۔'' وہ ہکلا کر رہ گئی۔

''مم...... میں...... میں بس جا ہی رہی تھی۔''

اس نے منجھلے کو گھورا مگر دل میں جز بز ہوئی کہ کہیں منجھلا بڑے بھیا کو اس کی بیزاری کے بارے میں نہ بتا ہی دے۔ کافی زنانہ قسم کی عادات ہیں اس منجھلے کی۔

''اچھا...... جلدی آؤ۔'' وہ کہہ کر چلا گیا۔

''جی بس آئی۔'' اس نے جلدی جلدی ٹھنڈی بوتل گلاسوں میں ڈالی تاکہ مہمانوں کو پیش کر کے اور ان سے مل کر جلدی جلدی اپنے کمرے میں جا سکے۔ منافقانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ ان سے ملی اور ایک منٹ کا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ اس نے سب سے پہلے ہاتھ اچھی طرح دھوئے۔ پھر دوبارہ میک اپ شروع کیا۔ جو پہلے ہی ادھورا رہ گیا تھا۔

اس بار اس نے تیار ہو کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ جیسے ہی سیلفی لینے کے لیے منہ کا زاویہ سیٹ کیا اور بہت احتیاط سے اسکرین پر انگلی دبائی ہی تھی کہ علی دندناتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

''امی پوچھ رہی ہے کہ نیلے گوشت کا پیکٹ کہاں سے آیا ہے؟'' اس کا جواب سنے بغیر ہی وہ چلا گیا مگر اسے زور سے چکر آیا۔ وہ سر پکڑ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اسے علم تھا کہ اب جب تک فریزر میں گوشت رہے گا امی یوں ہی اس کی یادداشت کا امتحان لیتی رہیں گی۔

''خدا کسی کو اکلوتی بیٹی بھی نہ بنائے۔'' اسے دن میں تارے نظر آ رہے تھے۔ اس نے سوچا گوشت کی تقسیم کے بعد وہ اب فارغ ہے مگر یہاں تو نیا محاذ کھل چکا تھا۔ گوشت کا کون سا لفافہ کہاں سے آیا ہے۔ گوشت کا کون سا لفافہ کس کے گھر جانا ہے۔ اس کا دماغ گھمن گھیریاں کھا رہا تھا۔ اس نے شکوہ بھری نظروں سے کمرے کی چھت کو گھورا۔

''جلدی آ جاؤ...... میرے پاگل ہونے میں بس تھوڑی سی کسر باقی رہ گئی ہے۔'' اس نے بیلا کو ٹیکسٹ کیا۔ ''عید پر ہر کوئی خوش تھا اس کے سوا۔ اس نے چکراتے دماغ سے سوچا۔

امی کو گوشت کے لفافے کا بتانے باہر نکلی۔ کسی کو وہاں موجود نہ پا کر اس نے سیلفی لینے کے لیے کیمرہ اپنے سامنے فضا میں بلند کیا اور جیسے ہی کلک کیا اس کی سیلفی میں شاذب بھی آ چکا تھا۔ اس نے مڑ کر اسے گھورا اور غصے میں وہاں سے جانے لگی۔

''آج آپ کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اس کے لیے معذرت خواہ ہوں مگر مجھے ذمہ دار لڑکیاں پسند ہیں۔''

''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی۔ آپ کی پسند ناپسند سے میرا کیا تعلق؟'' اس نے اپنی کاجل سے بھری آنکھیں پھیلائیں۔

اسی وقت مہمانوں کے آنے کا شور مچا۔

''یہ تو کچھ دیر بعد پتا چل جائے گا۔ میری امی، آپ کے ابو کی کزن یعنی آپ کی چھوٹی پھپھو کو میں نے آج اسپیشلی بلایا ہے کیونکہ یہاں اس گھر میں ایک ذمہ دار اور سمجھ دار لڑکی رہتی ہے۔ جو مجھے اچھی لگنے لگی ہے۔''

وہ مطلب بتاتا ہوا باہر کی جانب چلا گیا۔

وہ خود پر قابو پاتی ہوئی باہر نکلی۔ بھیا کے سسرالی جا چکے تھے اور پھپھو کی آمد کا اعلان ہو گیا تھا۔

اسی شام اسے شاذب کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی۔ پھپھو نے ایک خوب صورت جھلملاتا دوپٹا اس کے سر پر ڈالا۔ اسے شاذب کی شوخ آواز سنائی دی۔

''ممی! اگلی بڑی عید سے پہلے اپنی بہو گھر لے جائیے گا کیونکہ آپ کی بہو قربانی کا گوشت بہت اچھا سنبھالتی ہے۔''

سب کی ایک ساتھ ہنسنے کی آواز آئی مگر علیمہ نے جھٹ سے اپنے دونوں ہاتھوں سے دوپٹا الٹا کر ان سب کو حیرت سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ''اوہ نو۔'' کی کیفیت درج تھی۔

☆☆

سیدہ عروج فاطمہ

سینے کا گھاؤ

"تم ٹھیک تو ہو نا؟ تمہارا پسندیدہ کجریلا لے کر آیا ہوں۔ آج بہت کم کھایا ہے۔" عاصم نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے نور کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تھا۔
"ارے یار...... تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ چلو شاباش، جلدی سے اٹھو۔ ہم ڈاکٹر کے پاس جارہے ہیں۔" عاصم نے گاڑی کی چابی میز سے اٹھاتے ہوئے کہا۔
"آپ ابھی تو آفس سے آئے ہیں۔ صبح چلے جائیں گے۔"
"میں نے کہہ دیا ہے نا کہ ہم جارہے ہیں تو اس کا مطلب ہے ہم جارہے ہیں۔ اس بارے میں تو میں انکار سن ہی نہیں سکتا ہوں۔" عاصم نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا تھا۔ نور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد گیراج میں آئی اور پھر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ عاصم پہلے سے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔
"شادی سے پہلے ڈاکٹر کے سامنے مجھ سے تو کچھ بولا ہی نہیں جاتا تھا۔ میں صرف اپنا نام بتاتی تھی باقی کا کام امی کا تھا۔ وہ ڈاکٹر کو میری طبیعت کے متعلق تفصیل سے بتا دیتی تھیں۔ ڈاکٹر کو بس یہ بتانا ہے کہ کھانسی اور بخار ہے۔ آپ بتا دیں گے نا؟ سچ پوچھیں تو مجھے ڈاکٹروں سے بہت ڈر لگتا ہے۔" نور کے بولنے کے انداز سے گھبراہٹ عیاں ہو رہی تھی۔
"میری پیاری نور! اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ ڈاکٹر صاحب زیادہ سے زیادہ دو چار ٹیسٹ لکھ کر دے دیں گے۔" عاصم نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔
"اللہ نہ کرے۔ پلیز عاصم! مجھے ڈرائیں تو نا۔" نور نے سنجیدگی سے کہا۔
"مذاق کر رہا تھا۔ میں تمہارا بہت خیال رکھوں گا دیکھنا تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔"
ہسپتال پہنچنے کے بعد اُن دونوں کو کافی انتظار کرنا پڑا تھا۔ جب اُن کی باری آئی نور کا نام بھی عاصم نے خود ہی ڈاکٹر کو بتا دیا تھا اور اُس کی حالت کے بارے میں بھی آگاہ کر دیا تھا۔ ویٹنگ ایریا میں نور کو کرسی پر بٹھانے کے بعد عاصم نور کی دوا لینے کے لیے مردوں کی لمبی قطار میں کھڑا ہو گیا تھا۔ عورتیں تھوڑی تھیں۔ نور کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ عورتوں کی قطار میں جا کر کھڑی ہو جائے۔ ایک بار وہ اپنی جگہ سے کھڑی بھی ہو گئی تھی پر عاصم نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے وہاں آنے سے منع کر دیا تھا۔ دوا کے حصول کے بعد جب وہ دونوں گھر واپس جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھ گئے تھے تب نور نے عاصم سے پوچھا کہ اُس نے اُسے وہاں آنے سے روک کیوں دیا تھا۔
"ساری زندگی یہ بات میرے ذہن میں رہتی تھی میری بیوی بیماری کی حالت میں قطار میں کھڑی ہوئی اور ویسے بھی تم میری زندگی ہو۔ اپنے زندگی تو

ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے۔" عاصم کے لبوں پر مسکراہٹ محورقص تھی۔

"عاصم! آپ بہت اچھے ہیں۔" نور کو خوشی خود میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

عاصم نور کو دوا کھلانے کے بعد سویا تھا۔

☆☆☆

عاصم نے نور کا حد سے زیادہ خیال رکھا تھا۔ وہ چند دنوں میں ہی صحت یاب ہوگئی تھی۔ اس دوران نور کو اپنے گھر والوں کی بہت یاد آئی تھی۔ سیل فون پر تو بات ہوجاتی تھی پر اُداسیاں تو مل کر ہی دور ہوتی ہیں۔

ماں کا لمس انسان میں جینے کی نئی اُمنگ پیدا کر دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پریشانیوں کو ہم دور کہیں بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

سعید صاحب کو اللہ نے اپنی رحمت اور نعمت دونوں سے نوازا تھا۔ بیٹی کا نام نور اور بیٹے کا نام زوہیب تھا۔ بیٹے کی شادی اپنے دوست جاوید صاحب کی بیٹی صنوبر سے کردی تھی اور بیٹی نور کی شادی اپنی بیوی سکینہ بیگم کے بھانجے عاصم سے کی تھی۔ عاصم کے والدین ایبٹ آباد میں رہتے تھے وہ نوکری کے سلسلے میں لاہور آیا تھا اور پھر یہیں کرائے کا گھر لے لیا تھا۔

گھر کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد نور نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں پر دن گنے۔ آج اُسے اپنے میکے گئے ہوئے پورے پندرہ دن گزر چکے تھے۔ شام پانچ بجے جب عاصم گھر آیا اُسے اندازہ ہوگیا تھا کہ نور اُداس ہے۔

"کیا بات ہے نور؟ لگتا ہے گھر والے یاد آرہے ہیں۔ یہی بات ہے نا؟" عاصم نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

"جی بہت یاد آرہے ہیں۔ کیا میں دو دنوں کے لیے چلی جاؤں؟"

"تمہارے جانے کے بعد میرا کیا بنے گا؟ مجھ سے یہ کون پوچھا کرے گا اُٹھ جائیں کب تک سوئیں گے؟ ناشتا کرلیں ٹھنڈا ہوجائے گا۔"

"ایک شہر میں شادی کا یہ ہی نقصان ہوتا ہے۔ میکے میں رہنے کی اجازت نہیں ملتی ہے۔"

"ارے یار......! مجھے تمہارے بغیر رہنے کی عادت نہیں ہے۔ میں کل آفس جانے سے پہلے تمہیں وہاں ڈراپ کردوں گا۔ پورا دن رہ لینا۔ رات گیارہ بجے آکر لے جاؤں گا۔ بولو منظور ہے؟" عاصم نے محبت سے لبریز سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"جی منظور ہے۔" نور بے حد خوش دکھائی دے رہی تھی۔

"یہ کچھ پیسے رکھ لو۔ اگلے ہفتے میرے دوست فرقان کی شادی ہے۔ صنوبر بھابھی کے ساتھ جاکر بیوٹی پارلر سے فیشل کروالینا۔" عاصم نے رقم نور کی ہتھیلی پر رکھ دی تھی۔

"جی ٹھیک ہے۔" نور نے نوٹوں کو اپنے پرس میں ڈالتے ہوئے کہا۔

عاصم اپنے سسرال والوں سے ملنے کے بعد آفس چلا گیا تھا۔ نور کا پورا دن بہت اچھا گزرا تھا۔ عاصم کے آنے سے پہلے نور نے منہ ہاتھ دھونے کے بعد کریم اپنے چہرے پر لگالی تھی۔ لپ اسٹک لگانے کے بعد مزید کسی بناؤ سنگھار کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ عاصم نے اپنے سسرال میں رات کا کھانا کھایا اور پھر وہ نور کے کمرے میں آگیا تھا جہاں شادی سے پہلے وہ رہا کرتی تھی۔

"ماشاءاللہ فیشل کے بعد تو اور بھی پیاری لگ رہی ہو۔ ہر ماہ کروالیا کرو۔"

"شکریہ عاصم...... خوشی کی بات تو یہ ہے کہ مفت میں فیشل ہوگیا۔"

"اچھا...... پر وہ کیسے؟" عاصم نے استفہامیہ استفسار کیا۔

"یہ میکے کا نکھار ہے اور اسے کسی فیشل کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔" نور نے مسکراتے ہوئے عاصم کے پیسے اُسے واپس کردیے تھے۔

"اس کا مطلب ہے اگر میں اپنی بیگم کو ہر ہفتے یہاں لے آیا کروں تو یہ نکھار حاصل کیا جاسکتا ہے۔" دونوں نے مل کر قہقہہ لگایا تھا۔

☆☆

شعاع عمیر

القرآن

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

☆ بے شک لوگوں کے واسطے جو سب سے پہلا گھر مقرر ہوا یہی ہے جو مکہ میں برکت والا ہے۔ اور جہان کے لوگوں کے لیے راہ نما ہے۔ اس میں ظاہر نشانیاں ہیں (اور) مقام ابراہیم ہے۔ اور جو اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا ہو جاتا ہے اور لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا اللہ کا حق ہے جو شخص اس تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو، اور جو انکار کرے تو پھر اللہ جہان والوں سے بے پرواہ ہے (سورہ آل عمران 97-96)

☆ خدا تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون اس تک تمہارے دل کا ادب پہنچتا ہے (سورۃ الحج ...... 37)

قربانی

☆ حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس میں وسعت ہو اور اس کے باوجود وہ قربانی نہ کرے، تو وہ ہماری عید گاہ کے قریب نہ آئے۔ (ابن ماجہ)

☆ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛ یوم النحر (دسویں ذوالحجہ) میں ابن آدم کا کوئی عمل اللہ کے نزدیک خون بہانے (قربانی کرنے) سے زیادہ پیارا نہیں اور قربانی کا جانور قیامت کے دن اپنے سینگ، بال اور کھروں کے ساتھ آئے گا اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے قبل خدا کے نزدیک مقام قبولیت کو پہنچ جاتا ہے۔ لہٰذا اسے خوش دلی سے کرو۔ (سنن ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

☆ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جو مال عید کے دن قربانی میں خرچ کیا گیا، اس سے زیادہ کوئی مال اللہ کو محبوب نہیں (طبرانی)

فکریات

☆ گناہ یہ نہیں ہے کہ آپ نے قتل کیا بلکہ گناہ یہ ہے کہ آپ نے منصف کو رشوت دے کر گناہ کو ثواب میں بدل دیا۔

☆ عقل مند آدمی خوش ہونے کے لیے ہمیشہ کسی نہ کسی بے وقوف کا محتاج ہوتا ہے۔

☆ عبادت میں اگر خلوص نیت نہ ہو تو وہ تجارت بن جاتی ہے۔

☆ سیاسی لیڈر اگر سچ بولنا شروع کر دے تو اس نے یا سیاست میں آنے کی غلطی کی یا سچ بولنے کی۔

☆ عشق ان معنوں میں بھی اندھا ہوتا ہے کہ جس لڑکی سے عشق کر و اسی سے شادی کر لو۔

بشریٰ یامین ...... ضلع دریا خان بھکر

عوام اور خواص

ایک فاضل استاد کسی شہزادے کی تعلیم پر مقرر تھا۔ اس کے پاس چند اور لڑکے بھی پڑھا کرتے تھے مگر استاد ہمیشہ شہزادے کو ہی سب سے زیادہ تنبیہہ کرتا اور اسی کو زیادہ جھڑکتا تھا۔ شہزادے نے باپ سے شکایت کی تو اس نے استاد کو بلا کر پوچھا۔ "اس کی کیا وجہ ہے کہ تم دوسروں کی نسبت ہمیشہ شہزادے کو ہی زیادہ تنبیہہ کرتے ہو؟"

استاد نے کہا۔ "اگر اچھا کلام اور پسندیدہ کام عام مخلوق کے لیے عموماً ہو تو بادشاہوں کے لیے خصوصاً ہے کیونکہ ان کی زبان اور ہاتھ سے جو کچھ بھی نکل جائے۔ وہ شہرت پا کر مثال کے طور پر گنا جاتا ہے اور عام لوگوں کے قول و فعل سے تو کوئی واقف بھی نہیں ہوتا۔"

بادشاہ کو استاد کا جواب اتنا پسند آیا کہ ان کو انعام

سے سرفراز فرما کر کچھ تنخواہ بھی بڑھا دی۔
ماریہ نذیر...... بھاگتا نوالہ

چاہ کندہ راچاہ درپیش

خلیفہ منصور کا حاجب ربیع امام ابوحنیفہؒ کا بڑا دشمن تھا۔ ایک روز حضرت امام ابوحنیفہؒ کو خلیفہ نے بلایا اور آپ تشریف لے گئے تو ربیع نے خلیفہ سے کہا۔

اے امیر المومنین! یہ ابوحنیفہ آپ کے دادا حضرت ابن عباسؓ کی مخالفت کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول تھا کہ کسی معاملہ میں حلف کرنے والا اگر اس حلف سے ایک یا دو دن بعد بھی ان شاء اللہ کہہ دے تو وہ حلف قائم نہیں رہتا۔ اور امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول ہے کہ حلف کے ساتھ متصلاً ہی ان شاء اللہ کہے تو حلف پر اثر انداز ہوگا بعد میں معتبر نہ ہوگا۔

امام اعظم نے فرمایا۔

اے امیر المومنین! ربیع یہ چاہتا ہے کہ آپ کے لشکر کی گردن کو آپ کی بیعت واطاعت سے آزاد کردے۔"

منصور نے پوچھا: یہ کیسے؟

آپ نے فرمایا کہ لوگ آپ کے سامنے تو حلف اٹھا جائیں گے کہ ہم آپ کی اطاعت کریں گے اور گھر جا کر ان شاء اللہ کہہ دیں گے اور آپ کی اطاعت سے آزاد ہو جائیں گے۔

منصور سن کر ہنسنے لگا اور ربیع سے کہا: اے ربیع ابوحنیفہ کو کبھی نہ چھیڑنا۔

پھر جب امام ابوحنیفہؒ باہر آئے تو ربیع نے آپ سے کہا کہ آج تو آپ مجھے مروانے ہی لگے تھے۔

آپ نے فرمایا ابتدا تو تم نے ہی کی تھی۔
فوزیہ ثمر بٹ...... گجرات

اقوال ہٹلر

☆ جب ایک ملک کی فوج چھ ماہ سے زیادہ اپنی افواج کا جائزہ لے اور دشمن پر حملہ نہ کرے تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ اس ملک کی عوام کے لیے خطرہ ہے۔

☆ جنگ محبت سے بہتر ہے کیونکہ جنگ کے آخر میں یا تو تم زندہ رہتے ہو اور یا مر جاتے ہو لیکن محبت کے آخر میں نہ تم مرتے ہو نہ جیتے ہو۔

☆ جوانی کے دنوں میں جو اپنا سہارا خود بنتا ہے وہی اپنا آنے والا مستقبل محفوظ بنا سکتا ہے۔

☆ رکاوٹیں تسلیم کرنے کے لیے نہیں صرف توڑنے کے لیے ہوتی ہیں۔

☆ اگر زندگی آپ کو سو بار رونے کا موقع دیتی ہے تو آپ زندگی کو بتاؤ آپ کے پاس خوش رہنے کے ہزار موقع ہیں۔

☆ سوئی کے ناکے میں سے ایک اونٹ کے گزر جانے کی زیادہ امید ہے بجائے الیکشن میں کسی عظیم آدمی کے انتخاب کی۔

صبا راجپوت...... سدوجا

پریشانی کا حل

ایک دانا سے کسی نے پوچھا: "میں بہت پریشان رہتا ہوں کوئی حل بتا دیجیے۔"

دانا نے کہا: "مصیبت پر پریشان ہو جانا انسان کے انسان ہونے کی دلیل ہے مگر پریشان رہنا اللہ پر توکل نہ ہونے کی دلیل ہے۔ اس لیے پریشانی کو روگ مت بناؤ، ہمیشہ کامیاب رہو گے۔"
زرینہ خانم لغاری...... مظفر گڑھ

پہرا

"تم دو سال سے اس تھانے میں ہو لیکن آج تک ایک بھی مجرم نہیں پکڑا تمہاری اس کارکردگی پر تبادلہ کر سکتا ہوں۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے میں تمہیں یہ آخری موقع دے رہا ہوں سرکاری باغ سے روزانہ آم چوری ہو رہے ہیں اگر تم نے تین دن کے اندر آم چوری کو نہ پکڑا تو میں سچ مچ تمہارا تبادلہ کر دوں گا۔"

تبادلے کے خوف سے سپاہی نے رات کو پہرا دینا شروع کیا آخر کار دوسری رات اس نے ایک شخص کو باغ کے کونے میں دھر لیا۔ جس کے پاس ایک بھرا

ہوا تھیلا تھا۔ سپاہی کے کہنے پر اس آدمی نے تھیلا الٹ کر دکھایا تو اس میں کچھ زیورات اور روپے تھے یہ دیکھ کر سپاہی نے ہنس کر کہا۔

"معاف کرنا بھائی مجھ سے غلطی ہوگئی اب تم اپنا یہ سامان اٹھا کر جاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہارے تھیلے میں سے آم برآمد نہیں ہوئے۔"

اقصیٰ امان......بھکر

عید قرباں

فقط گیس بجلی کے نرخوں پہ نہ جا
ابھی صبر کے امتحان اور بھی ہیں
تو بکرے کی قیمت پر مسیار رہا ہے
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

زوبیہ مظہر......کوٹلی فیاض

نئے ٹھکانے

نادر شاہ ایک بار اپنی فوج کے ساتھ کہیں جا رہا تھا تو ایک جگہ اس نے الوؤں کی آواز سنی، اس نے اپنے ایک صاحب سے جسے پرندوں کی زبان سمجھنے کا دعویٰ تھا؟ پوچھا:

"یہ الو کیا کہہ رہے ہیں؟"

مصاحب بولا: "حضور کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر رہے ہیں۔ خوش ہو ہو کر کہہ رہے ہیں کہ آپ جہاں سے بھی گزریں گے۔ ان کے لیے نئے نئے ٹھکانے بنائے جائیں گے۔"

سحر وقاص......لاہور

رعایا بہت ڈھیٹ ہے

کسی ملک کا بادشاہ بہت انصاف پسند تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا ملک میں کپاس کی کمی ہوگئی دوسرے ملک سے منگوانے کے لیے نیا ٹیکس لگانا تھا۔ بادشاہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی رعایا اس کے خلاف بات کرے۔

اس کے وزیر نے کہا: بادشاہ سلامت آپ نیا ٹیکس لگا دیں آپ کی رعایا بہت ڈھیٹ ہے وہ کبھی بھی آپ کے خلاف بات نہیں کرے گی اور اس بات کو ثابت کرنے کے لیے مجھے کچھ دن کا وقت دیں۔

وزیر نے ایک پل جو دوسروں کو ملاتا تھا بند کروا دیا۔ اب لوگوں کو گھوم کر چار کلومیٹر کا سفر کرتے جانا پڑتا۔ کچھ دن گزرنے کے بعد وزیر نے پل کھول دیا۔ اور گزرنے پر ٹیکس لگا دیا۔ لوگ آسانی سے آتے پیسے دیتے گزر جاتے وزیر نے کرتے کرتے ٹیکس کو تین گنا کر دیا۔ کوئی بھی بندہ شکایت لے کر حاضر نہ ہوا۔ پھر وزیر نے اس پل کے دونوں طرف ایک ایک سپاہی کھڑا کر دیا کہ جب بھی کوئی گزرے اسے ایک ایک جوتا مارا جائے۔ لہٰذا لوگ آتے ٹیکس دیتے جوتا کھاتے اور گزر جاتے۔

بادشاہ نے سوچا میں کیسی ان پڑھ اور جاہل قوم کا سربراہ ہوں جس کو اپنے اچھے اور برے کا بھی کوئی پتا نہیں۔

کچھ دن بعد وزیر نے ایک کے بجائے تین جوتے مارنے شروع کر دیے سارے لوگ احتجاج کرتے ہوئے دربار میں حاضر ہو گئے۔

بادشاہ نے وزیر سے کہا۔ دیکھو میری رعایا کب تک ظلم سہتی آخر ان کو میرے دربار میں آنا ہی پڑا۔

وزیر نے کہا: پہلے ان کی بات سن لیں پھر فیصلہ کیجیے گا۔

لوگوں نے کہا۔ بادشاہ سلامت! ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔

بادشاہ نے کہا کہ تم اب کیا چاہتے ہو؟

لوگوں نے کہا: آپ صرف جوتے مارنے والے سپاہی زیادہ کر لیں کیونکہ ہم کو دوسرے شہر جانے میں دیر ہو جاتی ہے۔ سپاہی زیادہ کر لیں وہ جلدی جلدی جوتے لگائیں اور ہم جلدی جلدی کام کاج کی طرف چلے جائیں۔

بادشاہ یہ سن کر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

صبا ایوب......اٹک

☆☆

زرینہ خانم لغاری، کی ڈائری میں تحریر

راحت اندوری کی غزل

اجنبی خواہشیں سینے میں دبا بھی نہ سکوں
ایسے ضدی ہیں پرندے کہ اُڑا بھی نہ سکوں

پھونک ڈالوں گا کسی روز میں دل کی دُنیا
یہ ترا خط تو نہیں ہے کہ جلا بھی نہ سکوں

میری غیرت بھی کوئی شے ہے کہ محفل میں مجھے
اس نے اس طرح بلایا ہے کہ جا بھی نہ سکوں

پھل تو سب میرے درختوں کے پکے ہیں لیکن
اتنی کمزور ہیں شاخیں کہ ہلا بھی نہ سکوں

اک نہ اک روز کہیں ڈھونڈ ہی لوں گا تجھ کو
ٹھوکریں زہر نہیں ہیں کہ میں کھا بھی نہ سکوں

زوبیہ مظہر، کی ڈائری میں تحریر

سلیم کوثر کی غزل

دل تجھے ناز ہے جس شخص کی دلداری پر
دیکھ اب وہ بھی اتر آیا اداکاری پر

میں نے دشمن کو جگایا تو بہت تھا لیکن
احتجاجاً نہیں جاگا میری بے داری پر

آدمی، آدمی کو کھائے چلا جاتا ہے
کچھ تو تحقیق کرو اس نئی بیماری پر

کبھی اس جرم پر سر کاٹ دیے جاتے تھے
اب تو انعام دیا جاتا ہے غداری پر

تیری قربت کا نشہ ٹوٹ رہا ہے مجھ پر
اس قدر سہل نہ ہو تو مری دشواری پر

مجھ میں یوں تازہ ملاقات کے موسم جاگے
آئینہ ہنسنے لگا میری تیاری پر

کوئی دیکھے بھرے بازار کی ویرانی کو
کچھ نہ کچھ مفت ہے ہر شے کی خریداری پر

بس یہی وقت ہے سچ منہ سے نکل جانے دو
لوگ اتر آئے ہیں ظالم کی طرف داری پر

انجشل خان انجی، کی ڈائری میں تحریر

مبارک صدیقی کی غزل

خزاں کی رُت میں گلاب لہجہ بنا کے رکھنا کمال یہ ہے
ہوا کی زد پہ دیا جلانا، جلا کے رکھنا، کمال یہ ہے

ذرا سی لغزش پہ توڑ دیتے ہیں سب تعلق زمانے والے
سو ایسے ویسوں سے بھی تعلق بنا کے رکھنا، کمال یہ ہے

کسی کو دینا یہ مشورہ کہ وہ دُکھ بچھڑنے کے بھول جائے
اور ایسے لمحے میں اپنے آنسو چھپا کے رکھنا، کمال یہ ہے

خیال اپنا، مزاج اپنا، پسند اپنی، کمال کیا ہے
جو یار چاہے وہ حال اپنا بنا کے رکھنا، کمال یہ ہے

کسی کی راہ سے خدا کی خاطر، اُٹھا کے کانٹے، ہٹا کے پتھر
پھر اس کے آگے نگاہ اپنی جھکا کے رکھنا، کمال یہ ہے

ہزار طاقت ہو، سو دلیلیں ہوں پھر بھی لہجے میں عاجزی سے
ادب کی لذت، دُعا کی خوشبو، بسا کے رکھنا، کمال یہ ہے

عائشہ کیانی، کی ڈائری میں تحریر
سلیم عباس کی غزل

مہکتے گیسوؤں میں خم، تجھے اچھا نہیں لگتا
تمہاری زندگی میں غم مجھے اچھا نہیں لگتا

بچھڑنا ہو تو تم یکلخت مجھ سے دور ہو جانا
ادا قسطوں میں ہو ماتم، مجھے اچھا نہیں لگتا

تمہارے مسکرانے سے خزاں میں پھول کھلتے ہیں
تمہاری آنکھ ہو پُرنم، مجھے اچھا نہیں لگتا

تمہارے بعد تو اتنا اکیلا ہو گیا کہ اب
یہ جو اک لفظ ہے نا "ہم"، مجھے اچھا نہیں لگتا

تمہارا زخم تو جاناں امانت ہے محبت کی
کوئی اس پہ رکھے مرہم، مجھے اچھا نہیں لگتا

میں دنیا کے سبھی رشتے تعلق توڑ دوں لیکن
وہ میرا یار ہو برہم، مجھے اچھا نہیں لگتا

ثمرہ، اقراء، کی ڈائری میں تحریر
ناصر ملک کی غزل

اپنی تردید کا صدمہ ہے نہ اثبات کا دُکھ
جب بچھڑنا ہی مقدر ہے تو کس بات کا دُکھ

اب کوئی اور تمنّا ہے عذابِ دل و جاں
اب کسی حرف میں کچھ ہے نہ تری ذات کا دُکھ

میز پر جائے کہ دو بھاپ اُڑاتے ہوئے کپ
اور کیسے سامنے رکھا ہے ملاقات کا دُکھ

مضمحل جسم سے ناراض سرکتی ہوئی شال
کیوں چھپانے سے چھپایا نہ گیا بات کا دُکھ

اب مرے دل میں نہیں تیرے بچھڑنے کی کسک
اب کے بیگانہ روی میں ہے مناجات کا دُکھ

خشک جنگل سے کسی دن تو دُھواں اُٹھتا ہے
اور جہالت بھی اٹھاتی ہے فسادات کا دُکھ

اپنی چُپ چاپ نہ رہ موجِ فراتِ ماضی
تو نے دیکھا ہے سِسکتے ہوئے سادات کا دُکھ

افشاں سمیع، کی ڈائری میں تحریر
شکیل بدایونی کی غزل

میری زندگی پہ نہ مسکرا مجھے زندگی کا الم نہیں
جسے تیرے غم سے ہو واسطہ وہ خزاں بہار سے کم نہیں

مرا کفر حاصلِ زہد ہے مرا زہد حاصلِ کفر ہے
مری بندگی وہ ہے بندگی جو رہینِ دیر و حرم نہیں

مجھے راس آئیں خدا کرے یہی اشتباہ کی ساعتیں
انہیں اعتبارِ وفا تو ہے مجھے اعتبارِ ستم نہیں

وہی کارواں وہی راستے وہی زندگی وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں

نہ وہ شانِ جبرِ شباب ہے نہ وہ رنگِ قہرِ عتاب ہے
دلِ بے قرار پہ ان دنوں ہے ستم یہی کہ ستم نہیں

نہ فنا مری نہ بقا مری مجھے اے شکیلؔ نہ ڈھونڈیے
میں کسی کا حسنِ خیال ہوں مرا کچھ وجود و عدم نہیں

کچھ موتی چنے ہیں ...... ادارہ

عاجزی وانکساری

میں نے پڑھا ہے اور بار بار میرے تجربے مشاہدے میں آیا ہے کہ اچھوں، نیکوں اور حاجیوں نمازیوں سے کہیں زیادہ گنہگاروں، خطا کاروں اور بروں کی بات میں اثر ہوتا ہے۔ وہ زیادہ دل پذیر اور دل نشیں ہوتی ہیں۔ بظاہر برے، بدمعاش، اجڑے ہوئے اور شرابی کبابی لوگ اچھوں، نیکوں سے کہیں بڑھ کر وفادار اور وقت پر کام آنے والے ہوتے ہیں۔ اکثر اچھوں اور نیکوں کے ہاں اپنی پاک طینتی اور دین داری کا زعم وہان ہوتا ہے اور بروں، بدکاروں، گنہگاروں کے ہاں عجز ہی عجز شرمندگی ہی شرمندگی اور ہر وقت خود پر لعن طعن اور توبہ استغفار ہوتی ہے۔

بس یہی شرم اور خود کو مٹی سمجھنا ہی میرے اللہ کو پسند ہے۔ کہتے ہیں کہ اتنے خالی پیٹ والے بیمار نہیں ہوتے جتنے کہ خوب بھرے ہوئے پیٹ والے بیمار ہوتے ہیں یا مرتے ہیں۔ اس طرح کبھی کسی کو اپنے سے کمتر نہ سمجھو۔ خود کو نیک، اچھا، عبادت گزار، ولی اللہ اور دوسروں کو برا نہ سمجھو کہ کون جانے، کوئی آج کیا ہے اور کل کیا ہوگا؟ بقول شخصے ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔

(محمد یحییٰ ...... پیار رنگ کالا)
قاضی صبا ایوب ...... اٹک

ادیب

بچہ دو سال میں بولنا سیکھ جاتا ہے لیکن انسان ساٹھ سال بعد جا کر کہیں ہی جان پاتا ہے کہ زبان کیسے بند رکھی جائے۔ نہ میں دو سال کا بچہ ہوں نہ ساٹھ سال کا بوڑھا۔ میں اپنی زندگی کی درمیانی منزل میں ہوں۔ لیکن نسبتاً آخری منزل سے زیادہ قریب ہوں۔ اسی لیے وہ لفظ، جو ابھی میری زبان سے نہیں نکلا، میرے نزدیک ان تمام الفاظ سے زیادہ قیمتی ہے جو زبان سے نکل چکے ہیں۔

(رسول حمزہ توف ...... میرا داغستان)
زرینہ خانم لغاری ...... مظفر گڑھ

O قوالی O

کہا جاتا ہے کہ راگ علماء کے نزدیک نامقبول سی شے ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ قوالی اس فتوے کی زد سے کیسے بچ گئی اور فقط بچ ہی نہیں گئی بلکہ اسلام بی بی بیٹھی ہے اور جب چاہے امیر خسرو سے لے کر علامہ اقبالؒ کے کلام تک ہر ایک کے اشعار پر دست درازی بلکہ زبان درازی کر سکتی ہے۔ اقبال کے کلام پر تو اس کا ڈاکٹر جاوید اقبال سے بھی زیادہ حق معلوم ہوتا ہے۔ اب اس کی دسترس سے فقط کلام پاک ہی محفوظ ہے کہ خود ذات باری اس کی محافظ ہے۔ ورنہ کئی قوال آج بھی سورہ رحمٰن پر للچائی ہوئی نظر ڈالتے رہتے ہیں۔

(کرنل محمد خان ...... بنام دوستاں)
بشریٰ یامین ...... ضلع دریا خان بھکر

اچھا یا برا

ہمارے معاشرے میں ان پڑھ کو برا سمجھا جاتا ہے اور تعلیم یافتہ لوگوں کے پراپیگنڈے میں آ کر لوگ تعلیم کو اچھا جانتے ہیں اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ کل ایسے ہی ایک صاحب کو ہم نے ایک سوال کر کے خاموش کر دیا۔ وہ یہ کہ اکبر بڑا تھا کہ بہادر شاہ ظفر؟

اکبر بالکل ان پڑھ تھا نہ بہادر شاہ ظفر کی طرح دل گداز غزلیں کہہ سکتا تھا نہ استاد ذوق کا صحبت یافتہ تھا، نہ طغرہ نویسی میں خوش خطی دکھا سکتا تھا۔ بایں ہمہ کوہ ہمالہ تا راس کماری حکومت کر گیا۔ اس نے مرتے وقت اتنی بڑی سلطنت مغلیہ چھوڑی اور عالم فاضل بہادر شاہ ظفر نے "نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں۔"

(ابن انشاء)
صائمہ ریاض ہاشمی ...... فیصل آباد

بشریٰ یامین ملک، دریا خان ضلع بھکر

ٹائٹل اتنا خاص پسند نہیں آیا اتنی گرمی میں کھلے بال اف! معذرت کے ساتھ گرمی میں تیز کلر بالکل اچھے نہیں لگتے۔ ٹائٹل گرل کو دسمبر تک وائٹ، پنک، پیچ یا گرے کلر پہنائیں تاکہ دیکھ کر اچھا لگے یقیناً آپ کو برا نہیں لگے گا کیونکہ میں بلاوجہ تنقید نہیں کرتی، اور اللہ نہ کروائے کبھی۔ ماڈل کا پینڈنٹ بہت اچھا لگا ایمان سے، اور میری چاچی کی بیٹی والا ایمان نہیں۔ اداریہ میں کراچی کے حالات پڑھ کر دلی افسوس ہوا اور اس سے بھی زیادہ افسوس یہ پڑھ کر ہوا کہ شاہین رشید کے پیارے بھائی فوت ہو چکے ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے آمین۔ حماد فاروقی کی دلچسپ باتیں سنیں پھر سن کر سوچا کہ کاش سوالات کچھ زیادہ ہوتے کیونکہ مجھے جڑواں بہن بھائی بہت اچھے لگتے ہیں فہمیدہ جاوید! گڈ لکنگ، فوراً ذہن میں آیا آئینے میں آپ کا عکس دیکھ کر گڈ لکنگ اینڈ بیوٹی فل، آپ کے لیے ایک خوب صورت بات "کوشش کرو کہ تمہیں وہ شخص روزانہ مسکراتا ہوا ملے جیسے آپ روز آئینے میں دیکھتے ہو۔"

"دامن سحاب۔" "ویری بیٹر"، "نمکین پانیوں کا سفر" منعم ملک مائی پرنس کیا منظر نگاری ہے آپ کی یو رائٹ ویل"، "جنہیں راستے میں خبر ہوئی" کے صفحات کچھ ٹھیک تھے مزید بڑھائیں۔ سدرہ حیات، ام ایمان قاضی، ام اقصیٰ اینڈ صدف آصف، کیا بات ہے آپ سب کی۔ آپ چاروں کو جون کے شمارے میں دیکھ کر اچھا لگا اور پڑھ کر اس سے بھی زیادہ۔ ویسے قسط وار ناولز زیادہ نہیں ہو گئے۔ افسانوں کی لسٹ میں ٹاپ آف دی لسٹ رہیں تمام رائٹرز دل تھام لیں۔ مسکان احزام، عمارہ خان، عمارہ امداد خان اینڈ عذرا فردوس، سیکنڈ پوزیشن کی حق دار ٹھہریں عنبرین ابدال، مینال ہادی، نفیسہ سعید اینڈ عندلیب زہرہ، زبردست یار ایسے ہی محنت کرتے رہو۔ مسکان احزام! میرے کزنز کے نام ہیں عاصم اور قاسم، جاسم نام پڑھ کر ایک شریر سا خیال آیا وہ یہ کہ اگر ماسٹر صاحب کا چوتھا بیٹا ہوتا تو اس کا نام ہوتا کھل جا سم سم ہاہاہا "نامے میرے نام" ہانیہ تبسم ہنی اور صائمہ کو موسٹ ویلکم ٹو کرن، زرتاشیہ نعمان الحمدللہ خیریت سے ہوں یار، کالجز آف ہو چکے تھے اس لیے لیٹر پوسٹ نہیں کروا پائی۔ لکھ کر لاکر میں ضرور رکھتی ہوں اور ہاں آپ کے ہزبینڈ کی ایجوکیشن جان کر سوچا ٹیوشن رکھ لی جائے۔ پیپرز بھی قریب ہیں پھر کیا خیال ہے ارے ارے غصہ کر گئیں یار میں بہت شریف سی لڑکی ہوں اور آل ریڈی انگیجڈ بھی، مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا آپ کو ہاہاہا۔ مسکان نور تم بلاؤ اور میں نہ آؤں...... لو میں آ گیا ہاہاہا۔ افسانے کی اشاعت پر دلی مبارک باد، اتنی خوشی ہوئی کہ بتا نہیں سکتی ٹریٹ تو پکی ہے نہ بریانی والی، بڑی سسٹر کو پیار اور دعائیں ان کا نام تو بتاؤ یار سسٹر کا، الفت اقصیٰ اور عائشہ ویلکم۔ اقصیٰ اور عائشہ! خود خط کیوں نہیں لکھتی ہو، جلدی سے قلم اور پیج اٹھاؤ اور خط لکھو سست اور نکمی لڑکیوں ہری اپ، سنی کو پیار، اقصیٰ امان! یار میں نے خود بھی اپنی کمی بہت محسوس کی جب کرن کی محفل میں سب کے نام دیکھتی تو اپنا نام نہ پا کر اتنی دکھی ہو جاتی تھی کہ بس، اچھا اب تم اور شائستہ آ آ آ آ کرو، گانے کے لیے نہیں بھئی نوڈلز کھانے کے لیے۔ ہاہاہا مزے کے ہیں ناں شائستہ تمہارے تو کان مروڑنے پڑیں گے شاید پھر تم خط لکھ لو، تم بھی نکمی ہو۔ آپ کے لیے ایک پیاری سی بات "دوستی سچی ہونی چاہیے پکی تو سڑکیں بھی ہوتی ہیں۔" فوزیہ پرنسز آپ کی عید کیوں دکھی گزری۔ پپی پپی رہا کرو یار، میری دعا ہے اللہ آپ کو بقرعید پر ڈھیروں خوشیاں اور گوشت کی ڈشز عطا کرے ہاہاہا میں تمام فرینڈز کو بقرعید کے دوسرے دن لنچ پر انوائٹ کرتی ہوں کون کون کیا کھائے گا ابھی

بتادو اور آتے ہوئے میرے لیے کیا لاؤ گے یہ بھی ہاہاہا، نام بھی لکھ دو۔ اقصیٰ امان، شائستہ، سحر وقاص، زرتاشیہ، ماریہ نذیر، زرینہ، ثمینہ اکرم، ہانیہ عمران، فوزیہ ثمر بٹ، انجشل، ساجدہ جاوید، جلدی سوچو کیا لاؤ گی میرے لیے، ''بیوٹی باکس'' سے کورین خواتین کا بیوٹی کٹ، اچھا لگا پڑھ کر، سن گلاسز کا زمانہ، کبھی ہوگا نہ پرانا کون کہتا ہے دیوانہ ہاہاہاہا۔ یہ ٹاپک بھی مزے کا تھا میں بھی گلاسز لگا کر بہت خوب صورت لگتی ہوں ہی ہی ہی ٹھہرئیے (ٹھہر گئیے)، کیا آپ سیل سے خریداری کرتی ہیں۔ جی کبھی کبھی وہ بھی جلتے بھنتے ہوئے۔ امی کی فرمائش پر ایویں وقت کا ضیاع ہے۔ شاپ کیپرز کے لوٹنے کا نیا انداز ''صحت'' کیا واقعی آپ کو اپنے دل کا خیال ہے۔ جی بالکل، تبھی تو ہر وہ چیز جس پہ دل آجائے فوراً خرید لیتی ہوں ہاہاہا۔ بہت امپارٹنٹ ٹاپک اور زبردست بھی، نگل ریحان کا کچن اچھا لگا، ویسے آپ نے کہا بالٹی میں ڈوب مرنے کو دل چاہتا ہے تو کیا آپ جیسی پہلوان نما لڑکی بالٹی میں آسکتی ہے ہاہاہا، ڈرم پائپ لکھتیں۔ ''کرن کا دسترخوان'' فل سجا ہوا تھا۔ منہ میں واٹر آ گیا بقول فہمیدہ جاوید، کالی مرچ والے چکن کی دہی پڑھی پڑھ کر عظمیٰ سے ایویں مذاق میں پوچھا۔ ''عظمیٰ! کالی مرچ کو انگلش میں کیا بولتے ہیں'' جھٹ بولی۔ ''بلیک مرچ'' ہاہاہا۔ بچوں کو انٹرنیٹ سے دور رکھنا مشکل...... مشکل ہی نہیں ناممکن۔ یار! بچوں سے سیل فون چھین لو، ایسے منہ کھول کر بھاں بھاں کرتے ہیں، جیسے بندر سے کیلا چھین لیا ہو، ہاہاہا۔ ''کرن کرن خوشبو'' میں سحر وقاص، صبا ایوب، ہانیہ عمران، انجشل خان اور زرتاشیہ کے انتخابات مزے کے تھے اور دانش ور بھی۔ میری بیسٹ فرینڈ کی بھابھی کی طبیعت خراب ہے جو بھی یہ سطر پڑھے ثوبیہ منور کی بھابھی کے لیے شفائے کاملہ کی دعا کرے مشکور رہوں گی۔ انجشل خان! آپ کہاں غائب ہیں آپ نے انشراح کو اغوا کرنا تھا ناں کہیں انشراح نے ہی آپ کو اغواء تو نہیں کر لیا ہاہاہا آجائیں کم بیک۔

ج: بشریٰ! اللہ تعالیٰ آپ کی دوست کی بھابھی کو صحت عطا فرمائے آمین۔ بشریٰ، اگر آپ کسی ماہ خط پوسٹ نہ کرواسکیں تو ایک ہی خط میں دو ماہ کی کہانیوں پر تبصرہ کر دیا کریں۔ دو خط نہیں شائع کر سکتے۔

عظمیٰ یامین ملک، دریا خان ضلع بھکر

میں بشریٰ یامین ملک کی چھوٹی سسٹر ہوں میری ایج فورٹین ایئرز ہے۔ ابھی حال ہی میں آٹھویں کلاس کا ایگزام دیا ہے۔ میں کہانیاں اتنی خاص نہیں پڑھتی جو پڑھی ہیں ان کے بارے میں رائے حاضر ہے۔ مسکان احزام کا ناول، ''تیری راہ ہے میری منزل'' بہت اچھا ناول تھا ان سے مزید کچھ لکھوائیں۔ ''مقابل ہے آئینہ'' شہرین اسلم کے جواب پسند آئے۔ انٹرویو نہیں پڑھتی دانش تیمور اور عائزہ خان کا انٹرویو کیجیے پھر ضرور پڑھوں گی۔ ''نامے میرے نام'' میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ ''اقصیٰ امان'' کچن اور آپ میں مزیدار جواب لیے آئی ہوئی تھیں جواب پسند آئے۔ (گرمیوں کا تحفہ خربوزہ، فوائد جان کر اچھا لگا پہلے صرف یہی معلوم تھا کہ خربوزہ فائدہ مند ہوتا ہے لیکن اب معلومات میں اضافہ ہوا ہے فیشن) فرنچ ٹوئسٹ کی پکس دیکھیں اور معلوم ہوا کہ میرے گھنے بالوں پر بہت سوٹ کرے گا فرنچ ٹوئسٹ، مہندی کے ڈیزائن بھی اچھے لگے۔ اگر مزید سمپل ہوتے تو زیادہ پسند آتے۔ خطوط میں سب کے بارے میں جان کر اچھا لگتا ہے۔ انجشل آپی! ویلکم ٹو کرن، میں نے لیٹ ہی سہی پر آپ کو ویلکم کر دیا ہے مسکان نور، اقصیٰ امان اور آپی شائستہ! آپ لوگ ہر ماہ خط لکھا کریں میں بہت شوق سے آپ کو پڑھتی ہوں۔ زرتاشیہ نعمان، ساجدہ جاوید، ماریہ نذیر، فوزیہ ثمر بٹ بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ زرتاشیہ آپی! نعت کی لکھاری بننے پر مبارکباد، فائزہ بھٹی کو شادی کی مبارکباد، اور محمد علی کو میری طرف سے ہنی منی ہیپی برتھ ڈے، اللہ آپ کو لمبی عمر دے اور بہت سارے بچے۔ ہی ہی ہی، کیک میری طرف سے ہوگا او کے۔ اللہ حافظ۔ عظمیٰ نے خط مجھ سے لکھوایا ہے کہہ رہی ہے میری رائٹنگ بھی اچھی نہیں اور مجھے شرم آرہی ہے ہاہاہا۔

ج: عظمیٰ! ہم آپ کو اس محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ خط کوئی بھی لکھے لیکن رائے اپنی ہونی چاہیے۔ یہ ضروری ہے۔

اقراء سرور...... ڈی جی خان

وقت کا کام ہے گزر جانا، سو گزر جاتا ہے بیتے غموں پر "آہ" کیا۔ گزری خوشیوں پر، "واہ" کیا۔ ہر مہینے کرن کا شمارہ ہاتھ میں آتے دل خوشی پکڑتا ہے اور معصوم سی خواہش دل میں انگڑائی لیتی ہے کہ "میں بھی لکھوں" نامے میرے نام کی بہنوں کو فوزیہ ثمر بٹ (پنجابی کڑی) کا اداسیوں کو قہقہوں میں چھپاتا نامہ، لفظ نہ ہو گویا غموں سے رستا خون کا عکس ہو۔ فوزیہ مجھے تم سے فون پر بات کرنی ہے کرن کے دفتر فون کر کے میرا نمبر لے لینا۔ اگر دل کرے تو! میرا تو خوب دل کر رہا ہے تم سے بات کرنے کو اسی لیے تو ڈائریکٹ "آپ" سے تم پر آ گئی ہوں میں۔ ماہا اور تبسم دونوں کی فکر لگی ہوئی ہے مجھے ماہا اور تبسم جہاں کہیں بھی ہوں میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ پلیز جیسے ہی میرا پیغام پڑھو خط لکھنا۔ مجھے اپنی خیریت کی اطلاع دو۔ فائزہ بھٹی! شادی مبارک ہو (آمین) تمہاری شادی کا احوال پڑھنے کو دل بے تاب ہے۔ تمہاری پہلی تحریر پڑھی تھی "بیٹی کے نام" بہت متاثر ہوئی میں انداز تحریر سے۔ موضوع بھی خوب تھا لیکن تمہاری دوسری تحریر مجھے خاص پسند نہیں آئی۔ صفیہ مہر اور ماریہ نذیر کے طویل خطوط بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ اقصیٰ شہزادا! آپ کے بھائی کی وفات کا سن کر بہت زیادہ دکھ ہوا۔ ایک شعر آپ کے دکھ کی نظر

ہمارے واسطے بس ایک شخص تھا
وہ ایک شخص بھی تقدیر لے گئی

اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا کرے (آمین) زرینہ خانم لغاری مجھے آپ بہت اچھی لگتی ہیں ثانیہ بلال کیا تم ڈی جی خان کے عالی والا سے ہو۔ آپ نے مجھے دوستی کا کہا تھا پیاری ثانیہ آج سے آپ میری دوست ہو۔ میری بھانجی ثانیہ مرید بھی میری، بہترین دوست ہے تم سمجھو میری بھانجی ہو (ہاہاہا) نئی قاری بہن انجی فرام چونیاں، آپ کا خط بہت اچھا لگا۔ آتی رہیے گا۔ میں تو کرن میں مہمانوں کی طرح کبھی کبھار، چکر لگاتی ہوں یہی پوسٹ والا مسئلہ گھر والوں کے مطابق انتہائی غیر ضروری کام ہے ڈائجسٹوں میں ڈاک بھیجنا...... ہاہاہا۔

میری وہ بہنیں جو میرا خط پڑھ رہی ہیں لیکن خط نہیں لکھ سکتیں، میرا ان کو پیار، سلام اور دعائیں۔ ہمارے پورے علاقے میں اکثر لڑکیاں ڈائجسٹ پڑھتی ہیں لیکن ان کو کبھی یہ شوق نہ ہوا کہ بندہ تبصرہ ہی لکھ ڈالے۔ مزے کی بات وہ تو رائٹر کا نام تک نہیں دیکھتیں۔ بس کہانی پڑھتی ہیں۔ مجھے پتا نہیں کیوں جوش سا آ جاتا ہے کہ لکھوں...... لکھوں...... لکھوں۔ پھر مجھ سے لکھے بغیر رہا نہیں جاتا۔

"منعم ملک" کا سلسلے وار ناول بہت مزا آ رہا ہے ایسے لگ رہا ہے جیسے منعم نے ہمارے گاؤں کا منظر پیش کیا ہو۔ ثانیہ جب او پلے تھاپ رہی تھی پڑھ کر خوب ہنسی...... جزاک اللہ منعم، بھوکا ٹنے کا ٹوٹکا کیا خوب دیا۔ میں نے سب کو بتا دیا۔ "نازیہ کنول نازی" بہت شکریہ، آپ کی شاعری دل کو بھاتی ہے اور ناول تو بہت خوب...... "جنہیں راستے میں خبر ہوئی" وہ آدھے نقصان سے بچ جاتے ہیں لیکن افسوس آدھی خوشیاں بھی ان سے چھن چکی ہوتی ہیں۔ اب جلدی سے انجشاء کی غلط فہمی دور ہو۔ پھر سوزان سے راضی نامہ...... افسانہ "حضرت انسان" سوچ کے کئی در واہ کر گیا۔ آپ جب بھی دکھ میں ہوں۔ تو سوچے کہ ایسا کون سا شخص ہے جو مجھ سے زیادہ دکھی ہے یقین کریں آپ کو اپنا غم بھول جائے گا۔ ناشکری کام اور خراب کر دیتی ہے۔ "دامن سحاب" مجھے پسند نہیں آ رہا۔ لیکن آسیہ مرزا کا "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" بہت زیادہ پسند آ رہا ہے تحریر میں ایک پختگی ہے سبھاؤ اور روانی ہے حقیقت سے قریب تر ہے خیر حقیقت تو اس سے زیادہ تلخ ہے۔ ہمارے گاؤں میں ایک بیوی نے شوہر کو پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ وجہ یہ بتائی کہ خرچا نہیں دیتا۔" مسئلہ پتا ہے کیا ہے قرآن سے دوری خدا نے قرآن یونہی تو نہیں اتارا انسان جی! تو قرآن کو پڑھ، عربی نہیں آتی تو ترجمہ پڑھ، تیرا سب سے بڑا خیر خواہ قرآن ہے۔

فہمیدہ فرخندہ جاوید کا "موتی" بہت اچھا لگا بے شک اللہ کا فضل نہ ہو تو...... ہم کس کام کے...... اسی کی رحمت ہے کہ مٹی کا بنا انسان اشرف المخلوقات" کہلایا اشفاق احمد رست فرماتے ہیں۔ واقعی مرد اور عورت برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ نے مرد کو عورت پر ایک درجہ فضیلت دی۔ مرد کو عورت کا نگہبان بنایا ہے۔ عورت کو اس بات پر

فخر کرنا چاہیے کہ اللہ جی نے ان کا اتنا خیال رکھا۔ زرتاشیہ نعمان کا صبر کے حوالے سے بیان بہت اچھا ہے۔ حدیث بہت خوب ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا کرے۔

آخر میں شاہین جی! منعم ملک، منشاء محسن اور نازیہ رزاق سے ہماری ملاقات کروائیں۔

ج: اقرا! آپ کی فرمائش ان شاء اللہ ضرور پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ گھر والوں کو سب قارئین کے خطوط پڑھوادیا کریں پھر فضول کام نہیں سمجھیں گے۔

زرینہ خانم لغاری...... مظفر گڑھ

اپریل کا شمارہ لیٹ ملا درمیان میں کسی عزیزوں نے کیچ کرلیا اور ان کے بچوں نے سرورق شہید کردیا ننگا بچہ رسالہ موصول ہوا، شکر ہے کہانیاں محفوظ تھیں۔ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' پڑھ کر سکتے میں آگئے سوچا ہائے آسیہ بہن کم بخت لالچی ارسلہ کو ماریں تو نا۔ چار دن کی زندگی ہے اسے عیش کرنے دیں ناشکری کو۔ مئی کا شمارہ پڑھ کر تو حیران ہوگئے اتنا بڑا نقصان ہوگیا بامشکل ارسلہ کی جان بچی لیکن اس کا تنتنا برقرار ہے۔ رسی جل گئی بل نہ گیا اتنے ڈھیٹ بندے بھی دنیا میں ہوتے ہیں۔ پیاری سی حسینہ سرورق پر وائٹ جیولری پہنے براجمان تھی۔ دل کو بہت بھائی۔ اداریہ پڑھا، دس مئی ظالم موت محمود ریاض کو لے گئی تھی۔ انہیں ہم سے بچھڑے بیس سال ہوگئے۔

''خاص دن'' پیارا سروے تھا، خوشی ہوئی اکثر والدین کے جوابات نئی نسل کے مثبت رویوں کی عکاسی کررہے تھے۔ نئی نسل سے ہم مایوس نہیں ہیں۔ جنید خان سے ملاقات ہوئی جنید خان تو ماشاء اللہ ٹی وی پر چھائے ہوئے ہیں۔ ''دامن سحاب'' اس دفعہ زمینداروں کے جھگڑوں کا قصہ تھا۔ ''برانڈڈ عیدی'' میں دامادوں کو سبق دیا گیا ہے کہ عزت پکڑیں سسرال والوں سے چیزیں بٹورنے کی آس نہ لگائیں۔ ''میٹھی کھیر'' شکر ہے میٹھی بن گئی جیلسی کرنے والی کا منہ کالا ہو۔ ''بھیا بھابھی اور باجی'' اس کہانی کو میں نے ویری گڈ کہا ہے۔ بعض دفعہ سگے رشتے بھی ظالم بن جاتے ہیں جہاں ظالم ہوتے ہیں وہاں دلہن جیسے ہمدرد انسان بھی بستے ہیں شکر ہے شمو کی مصیبتیں ٹل گئیں۔ رسالے کی سب سے بیسٹ کہانی تھی ''ففٹی پرسینٹ ڈسکاؤنٹ'' کورونا نے بڑے بڑوں کے دماغ درست کردیے ''عید پر سعید'' بھی شاندار کہانی تھی شکر ہے گلے شکوے ختم ہوگئے ممانی نے کتنے پیار سے صارم کو گلے لگالیا ''احساس'' اچھا سبق تھا بعض مائیں چاہتی ہیں کہ عید کے دن ہماری بہویں میرے ہمارے گھر آئیں اور بیٹیاں بھی آجائیں یہ غلط رجحان ہے اپنی بہویں سنبھالو بیٹیوں کو اپنے سسرال رہنے دو یہ خوب صورت ریت ہونی چاہیے۔

''جنہیں راستے میں خبر ہوئی'' ابھی کہانی بن ہی رہی ہے۔ آگے پتا چلے گا۔ ''حضرت انسان'' ہر انسان ہی دنیا میں ناشکرا ہے اب ہر نعمت تو ہر ایک کو نہیں ملتی کہیں تو کمی بنتی ہوتی ہے۔ حالات سے سمجھوتا کرنا چاہیے۔ پھر ایک اور شاندار کہانی سامنے آگئی ''تو نصیب ہے کہ نصاب ہے'' مشرقی روایت سے گندھی کہانی تھی۔ عائشہ کا شرمانا، نعمان کے سامنے نہ آنا بہت خوب صورت لگا۔ سنان کا نادیہ کو پسند کرنا، پسند آیا۔ کچھ فرق نہیں پڑتا اگر چند ایک سال بیوی شوہر سے بڑھی بھی ہو، کوئی بات نہیں۔ خوب صورتی سے نبھ جاتی ہے۔

''روشن عید'' بور کہانی تھی سر کے اوپر سے گزر گئی ''اگلا گھر'' واقعی مائیں اگلے گھر کے ڈراوے دے کر لڑکی خوف دلادیتی ہیں۔ مائیں خود بھی تو اگلے گھر آئی بیٹھی ہوتی ہیں اور عیش کررہی ہوتی ہیں لڑکیوں مت ڈرا کرو یہ صرف گیدڑ بھبکی ہوتی ہے۔ ''کرن کرن خوشبو'' میری کفایت شعار ملکہ بھی وہاں تشریف فرما تھیں شکریہ۔ اقصیٰ شہزاد آپ جیلی مرحوم کا ذکر کرکے ہمیں بھی غم زدہ کردیتی ہیں بھائی کسی کے نہ مریں لیکن رب تعالیٰ کی مرضی ''یادوں کے دریچے'' میں میری غزل کو پسند کرنے کا شکریہ۔ بس کرتی ہوں بہت لمبا تبصرہ ہوگیا ہے۔ چونیاں کی پیاری انجی نے بھی میری بھیجی غزل کو پسند کیا ان کا بھی شکریہ۔

ج: زرینہ! کہانیوں کو پسند کرنے کا بہت شکریہ۔

بختاور انور صدیقی...... کراچی

آج پہلی بار کرن کے ''نامے میرے نام'' میں شرکت کررہی ہوں۔ میرا نام بختاور انور صدیقی ہے میری عمر 18 سال ہے میں تین سال سے کرن، شعاع پڑھ رہی ہوں کرن کی کہانیوں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ اب آتی ہوں جون کے کرن کی جانب۔ اس دفعہ کرن 8 جون کو میں خود جا کر لائی۔ جاتے ہی دھچکا لگا۔ یہ کیا پیسے بڑھ گئے یہاں ہم سوچ رہے تھے کہ کاش پیسے کم ہو جاتے مگر یہاں تو بڑھ گئے۔ ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ حمد و نعت نے دل کو چھو لیا۔ فرح نادر سے مل کر اچھا لگا۔ (میری بھی سنیے) میں حماد فاروقی سے ملاقات اچھی رہی۔ (مقابل ہے آئینہ) فہمیدہ فرخندہ جاوید کے جوابات بہت اچھے لگے۔ اس کے بعد جی میں نے چھلانگ ماری ''جنہیں راستے میں خبر ہوئی۔'' نازیہ کنول نازی کے ناولٹ پر (نازیہ جی برا نہ مانیے ناولٹ کم موری زیادہ لگ رہا ہے مجھے تو) ''دامن سحاب'' مہوش افتخار کی کہانی بھی اچھی چل رہی ہے اور باقی کا تبصرہ آخری قسط پر ہوگا۔ آسیہ مرزا جی کی اس دفعہ کمی محسوس ہوئی۔ ''خبر ہونے تک'' سدرہ حیات جی کی کہانی بہت زبردست تھی۔ (صحیح بات ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی) ''ام ایمان قاضی''، ''محبت ابھی باقی ہے'' بہت اچھی کہانی تھی۔ ''بازگشت'' اس شمارے کی بیسٹ تحریر تھی۔ ''صدف آصف جی'' افسانے نے سارے اچھے لگے کس کی تعریف زیادہ کروں۔ ''کچن اور آپ'' گل ریحان کے جوابات اچھے لگے۔ ''ام طیفور صاحبہ آپ کہاں ہیں جلدی سے آجائیں ''ساگر کنارے'' جیسی اچھی سی تحریر کے ساتھ۔ اور تمام قارئین بہنوں کو میرا اسلام۔

ج: بختاور! ''نامے میرے'' نام کی محفل میں خوش آمدید۔ کرن کی کہانیوں کو پسند کرنے کا شکریہ۔

ماریہ نذیر...... بھاگٹانوالہ۔

کرن کا ٹائٹل بہت خوب صورت لگا۔ کچھ لوگ ماشاء اللہ بہت پیارے ہوتے ہیں۔ ''اداریہ'' گرمی تو واقعی بہت ہے اللہ سب کے حال پر رحم فرمائے (آمین) ''حمد اور نعت'' ہمیشہ کی طرح بہت اعلیٰ زبردست۔ فرح نادر سے ملاقات سو سو رہی۔ رقص بسمل میں یہ ذرا اچھی نہیں لگی بوڑھی عورت۔ حماد فاروقی کی سرسری سی۔ ''مقابل ہے آئینہ'' فرخندہ جاوید تو ہر شمارے میں چھائی ہوئی ہیں۔ اچھے جوابات تھے آپ کے ''دامن سحاب'' بہت سلو جا رہا ہے، زیادہ زیادہ لکھا کریں ناں پلیز۔ یہی تو سارے رسالے کی جان ہے۔ مہوش افتخار ویلڈن ''خدمت خلق'' عنبرین ابدال کا افسانہ سبق آموز تھا۔ بزنس کی آڑ میں لوگ دوسروں کے لیے تباہیاں لے کر آتے ہیں افسوس ان کو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا۔ اللہ ہی رحم فرمائے ''محبت اب بھی باقی ہے۔'' ام ایمان قاضی فیورٹ لسٹ میں شامل ہوگئی ہیں۔ بہت اچھا لکھا آپ نے۔ مبارکاں۔ ''دل مل گیا'' ام اقصیٰ کا ناولٹ بھی شان دار رہا۔ گرمی کے موسم میں دسمبر کا ذکر پڑھ کر دماغ ٹھنڈا ہو گیا۔ ''محبت زندہ باد'' عذرا فردوس کا ہلکا پھلکا افسانہ اچھا لگا۔ محبت کے نام پر عورت مرد کو بے وقوف بھی بنا لیتی ہے۔ تلخ حقیقت ہے یہ بھی۔ ''نمکین پانیوں کا سفر'' منعم ملک میں نے پورے صفحہ کا تبصرہ لکھا تھا آپ کے ناول پر مگر آہ یہ ادارے والوں کی غلطی ان بھائی کو اللہ پوچھے جو واٹس ایپ پر بیٹھے ہیں (ہاہاہا) ابھی تو کردار بہت ہیں آگے آگے ناول کا پتا چلے گا۔ ویسے لکھا بہت اچھا ہے۔ صفحات بھی زیادہ ہیں۔ شکریہ منعم ملک۔ ''فلسفہ حیات'' عمارہ امداد خان کا افسانہ سبق آموز تھا۔ ''بازگشت'' صدف آصف کا ناولٹ ابھی نہیں پڑھا۔ سوری صدف اگلے ماہ بھرپور تبصرہ کروں گی۔ ''خبر ہونے تک'' ہائے سدرہ حیات خاک ہو جائیں گے تمہیں خبر ہونے تک۔ بہت بہت اچھا ناول تھا آپ کا بہت زیادہ مبارک قبول کریں شائع ہونے پر۔

''جنہیں راستے میں خبر ہوئی'' نازیہ کنول نازی کا ناول اب مزا نہیں دے رہا پلیز زیادہ صفحات لکھا کریں۔ سوزان نے دھوکا دیا ہے انجشا کو ماضی میں شاید آگے۔ واللہ اعلم ہم نے تو قیاس کے گھوڑے دوڑا کے دیکھ لیے کوئی سرا ہاتھ نہیں لگا۔ ''ہم نہیں سدھریں گے'' مسکان احزام کے افسانے نے تو لبوں پر ہنسی بکھیر دی۔ دکھوں کے دور میں ایسی ہلکی پھلکی تحریر ہونے چاہیے ناں دماغ پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ عاصم، قاسم اور جاسم کی نوک جھوک

کہ میں اس محفل کی رونق ہوں۔ اہاہاہا کچھ زیادہ ہی ہو گیا اب چلو کوئی نئی خیر ہوسی۔ دوستوں پچھلے دو ماہ خط نہیں لکھ سکی پہلی وجہ جن کے ذریعے میں خط بھیجتی تھی انہیں ہارٹ کا پرابلم ہو گیا اور دوسری میری پھوپھو کی ڈیتھ۔ سب دوستوں کو بہت MISS کیا۔ زرتاشیہ، ماریہ، فوزیہ، فائزہ بشریٰ سب کے خط پڑھ کر بہت خوش ہوں کہ سب کی سب زندہ ہیں (ہاہاہاہا) اپریل اور مئی کے ماہناموں پہ تبصرہ کر رہی ہوں غور فرمایئے۔ اتنی بھی غور فرمانے کو نہیں بولا۔ لڑکیوں تم سب تو ایسے غور کر رہی جیسے تبصرہ نہ ہو شوہر کو قابو کرنے کا کوئی وظیفہ ہو (ہاہاہاہ) اب ہنسو نہیں۔ آگے دیکھ کے پڑھو۔ دونوں ماہناموں کی ماڈلز ایک جھکی نگاہوں سے دلکش نظر آرہی تھی۔ اور دوسری لیزر کی وجہ سے "حمد ونعت" کے بعد سیدھا گئی (نامے میرے نام) سب دوستوں کو محفل میں حاضر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ پھر پہنچی (میرے ہم نفس میرے ہم نوا) ارسلہ کا کردار واہ بھئی واہ! حمزہ اور نادیہ بھی ناول کی جان ہیں۔ بہت اچھا جا رہا ہے۔ ناول۔ افسانے دونوں ماہناموں میں اچھے تھے مگر سب سے زیادہ جو اچھے لگے وہ یہ ہیں۔ (کوئی مجھے سمجھ) "زارا انجم" ہر طرف وراثت کا ہی رولا نظر آرہا ہے آج کل۔ لیکن جب اسلام کے بیٹوں کا حق ادا کرنے کا حکم دیا ہے تو ہمارا معاشرہ اس بات کو کیوں نہیں مانتا۔

(گنجائش) "فرح انیس" بہت اچھا ناول تھا۔ فائزہ جی بالکل ٹھیک کہا آپ نے اس سبق کا نام A great Virtue تھا۔ مجھے بھی بہت اچھا لگا تھا یہ چیپٹر (بہو رانی) ہاجرہ عمران صاحبہ نے بھی جو کچھ آج کل ہو رہا ہے اسی کو قلم بند کیا ہے۔ مگر مجھے ایک بات کی سمجھ میں نہیں آئی کہ ساس بہو کی آپس میں کیوں نہیں بنتی؟ میں نے تو ایک ہی بات نوٹس کی ہے کہ آج ہم لڑکیوں میں برداشت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ہم اگر کچھ باتوں کو درگزر کر دیں اور کچھ کو برداشت کر لیں تو ساس بہو کی کبھی نہ بگڑے ہم ساس کی ڈانٹ کو ماں کی ڈانٹ سمجھ کر ایک کان سے ڈالیں دوسرے سے نکال دیں کوئی مسئلہ ہی نہیں ہو۔ میں تو ایسے کروں گی (ہاہاہا) اب آتے ہیں (تمکین ایموشنل ہے۔ پر (اسی کلے میں خراب) اووف بہت ہنسی آئی۔ لیکن منعم ملک you are the best ایسے ہی لکھتی رہیں اور ہمیں ہنساتی رہیں۔ (راج کماری) "میمونہ صدف" کیا یاد کروا دیا آپ نے یاد۔ کزنز کی لڑائی۔ گپ شپ بہت مزا آیا اس ناول کو پڑھ کر۔ (پکار کا موسم) "قرۃ العین" بہت بہت اچھا لکھا ہے آپ نے بس ایک ہی بات کہنی ہے۔ قراۃ العین تسی چھا گئے۔ زیادہ خوش نہ ہوں میں اپنے الفاظ واپس بھی لے لیتی ہوتی ہوں۔ (ہاہاہا)۔ (جنہیں راستے میں خبر ہوئی) نازیہ کنول کیا خوب لکھتی ہیں۔ اور وہ غزل میرے ہم سفر تجھے کیا خبر بہت اچھی لگی۔ پانچویں قسط کا بے قراری سے انتظار رہے گا۔

(کرن کا دسترخوان) کیا لذیذ ڈشز تھیں۔ میں سب کھا لیتی ہوں دوستوں۔ پر بنا کر کون دے (ہاہاہاہا) "کچن اور آپ" میں بشریٰ یامین اور اقصیٰ امان دونوں ہی کے جواب زبردست تھے (اس ماہ کا پھل) "امرود اور خربوزہ" دونوں کے بارے میں پڑھ کر بہت معلومات ملی۔ خربوزے کے حیران کن فوائد جان کر حیرانی ہوئی۔ میں خربوزہ نہیں کھاتی تھی لیکن اب کھاتی ہوں۔ (مقابل ہے آئینہ) میں شہرین اسلم ثانیہ بلال کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ شہرین اسلم مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ آپ میری کلاس فیلو رہ چکی ہو۔ ذرا مجھے کلیئر کر دیجیے گا۔ سلیمان سعید سے ملاقات اچھی رہی۔ (میری بھی سنیے) میں جنید خان اور احمد طٰہٰ غنی کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح بہت اعلیٰ۔ شاعری بہت زبردست۔ شوہر کو تو قابو کرنے کا وظیفہ پھر بھی (ہاہاہاہا) ابھی میری بہن میرب عرف بم پھوڑ آواز دے رہی ہے جو ہر وقت کچھ نہ کچھ پھوڑتی رہتی ہے۔

میری پھوپھو کی بخشش کے لیے دعا اور ہمارے سکیورٹی گارڈ انکل کی صحت یابی کے لیے دعا کی اپیل ہے۔ سب دوستوں سے گزارش ہے۔

ج: عائشہ! اللہ تعالیٰ آپ کی پھوپھو کو جنت میں اعلیٰ مقام اور آپ کے انکل کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔

کرن میری زندگی میں واقع روشنی کی طرح چمک رہا ہے کیونکہ زندگی شوہر بچوں اور ساس سسر کے ساتھ بزی ہے۔ لیکن پھر چاہے دو ماہ بعد ہی کرن کیوں نہ ملے پڑھنے کی روٹین دوبارہ سے بنالی ہے۔ اتنی تیز اور افراتفری والی لائف میں اگر میرے ساتھ کرن نہ ہوتا تو نا جانے زندگی نا امیدی کے اندھیروں میں گھس جاتی۔ میں بچوں کی پیدائش کے بعد ڈپریشن کی پیشنٹ بن گئی تھی پھر شوہر اور امی کی کاوشوں سے اور اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت سے آہستہ آہستہ ریکور کرنے لگی۔ میں پہلے بھی خط کتابت کرتی تھی اور اب پھر شکر ہے زندگی نے ایک بار مجھے کرن کی روشنی نصیب کی۔ تمام قارئین کو سلام۔ کافی مسائل کی بنا پر مجھ تک ڈائجسٹ ٹھیک ایک ماہ تک یا دو ماہ تک پہنچتا ہے لیکن میں کرن کو پانے کے لیے ہمیشہ مضطرب رہتی ہوں۔ محفل میں ماریہ نذیر، سحر وقاص، اقصیٰ شہزاد کا تبصرے نے کافی اچھا تاثر پیش کیا۔ اپریل کا شمارہ شوہر صاحب کے ہاتھوں حسب توقع مئی میں ملا تو فٹافٹ نازیہ کنول نازی کا ناولٹ پڑھا۔ کیا خوب لکھا انہوں نے دل ہی موہ لیا کرداروں کی جادوئی شخصیت اور منظر کشی خاص کر شاعری یعنی نظم خوب لگی۔ "میرے ہم نفس میرے ہمنوا" واہ واہ بس کیا لکھ چھوڑا ہے آسیہ جی آپ نے تھوڑا تھوڑا کرکے پڑھ رہی ہوں۔ اس قسط کو پڑھ مزا آ گیا۔ افسانوں میں "محبت معتبر میری، کوئی سمجھے مجھے" زارا ہنجرا، واقعی بیٹی کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے افسوس اپنی ہی کہانی لگی "سوچو ذرا" اچھا لکھا پر لیکن راؤ سمیرا ایاز کیا دبے دبے لفظوں میں کہہ گئیں۔ چلیں خیر پڑھ ڈالا لیکن مجھے لگا کہ وہ واضح میسج تو دے گئیں لیکن لفظوں کو بس گھوماتی رہیں بس۔ مختصر کرن سارا ہی اچھا لگا۔

کرن کتاب بھی پڑھ ڈالی۔

ج: صائمہ! خط لکھنے کا شکریہ۔ اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے آپ کو ڈپریشن سے نجات دی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ کا کرم آپ پر اسی طرح رہے، آمین۔

سحر وقاص راجپوت...... لاہور

اس بار کا ٹائٹل سادہ سا تھا ہاں ماڈل کا ہیئر کلر اچھا تھا سب سے پہلے کہنی سنی اور پھر فہرست پر نظر ڈالی۔ اس بار آسیہ مرزا جی کی کہانی نہیں لگائی کہ اس کا انتظار رہتا ہے دوسرا ناول "دامن سحاب" پر تبصرہ ادھار ہے اکٹھی تین اقساط پر تبصرہ کروں گی مکمل ناول تینوں لاجواب منعم ملک جی کیا لفظ بنتی ہیں لفظوں سے کھیلنا اور منظر نگاری کرنا خوب اچھا لگتا ہے آپ کو۔ حاکم تو روایتی داماد نکلا مجھے نہیں پسند۔ نہ اچھا شوہر، نہ اچھا داماد، نہ اچھا بہنوئی بیٹا تو ہر کوئی اچھا بن لیتا ہے جیسا کہ صدام، کمینہ انسان سارا کیا دھرا اسی کا ہے اور خود ہی شریف بنا بیٹھا ہے۔ نیلم سے اس بات کی امید نہیں تھی جو بدتمیزی وہ اپنے چچا سے کرکے گئی ہے شمائلہ اور خضر کی ملاقات کیا رنگ لائے گی اور اس کا کسی پر کیا اثر پڑنے والا ہے یہ تو وقت ہی بتائے گا شکیلہ ہم تمہاری لیے دستگیر کے مل جانے کی دعا کریں گے۔ "محبت اب بھی باقی ہے" کافی دیر بعد ام ایمان قاضی کا ناول پڑھا ہلکا پھلکا ناول اچھا لگا سعدی کا کردار اچھا تھا اور صلہ نے اپنی بے وقوفی سے پھپھو کے پلان میں شامل ہوکر اچھا نہیں کیا۔ "خبر ہونے تک" سدرہ حیات جی سسپنس، محبت، حسد اور قربانی سے لبریز آپ کی کہانی اچھی لگی۔ تائی اپنے مکافات کو پہنچیں ڈاکٹر ناز کو ان کے صبر کا پھل مل گیا۔ کیا تھا جو وقار صاحب کو نا مارتیں اور ماہا بھی باپ کے گلے لگ کر اس کی شفقت محسوس کر لیتی۔ ماہا سلمان، میرب منیب اور دہاج کو ربیعہ سے ملا دیا، زبردست کہانی تھی اس ماہ کی مبارک باد۔ انٹرویو میں فرح نادر سے پہلے بھی ملاقات کر چکے ہیں، اچھی نیچر کی لگیں۔ حماد فاروقی کی سن کر اچھا لگا۔ اس بار "مقابل ہے آئینہ" میں فہمیدہ فرخندہ جاوید سے مل کر اچھا لگا کافی گہرائی سے آئینہ کا مقابلہ کیا۔ بڑے سنجیدہ اور میچور جوابات دیے اس بار سوالات بھی تبدیل تھے ان کے کتے والے واقعے سے مجھے بھی ایک واقعہ یاد آ گیا "جنہیں راستے میں خبر ہوئی" کہانی ماضی اور حال کا سفر بڑی خوب صورتی سے کر رہی ہے مگر انجشاء سوزان سے اتنی بدگمان کیوں ہے ذرا جلدی یہ راز کھولیں سوزان کی حالت دیکھی نہیں جاتی ہادیہ ضمیر تم گریٹ ہو تم جیسی دوستیں کہاں سے ملتی ہیں دوستی میں ہر خطرہ مول لینے والی "دل مل گیا" ام اقصیٰ اتنی پیاری کہانی لکھنے پر مبارک باد۔ دھان کی فصل، خوشے تازہ بھٹے صبح کا

سحر انگیز دیہاتی ماحول بہت پسند آیا اور سب سے زیادہ ہیرو دل محمد۔ انتہائی سادہ رومانٹک اور دل موہ لینے والا نام کی طرح خود بھی خوب صورت ویسے کہانی میں اچھا سبق تھا کہ ہر پڑھا لکھا شخص اچھا انسان نہیں ہو سکتا کبھی کبھی کم پڑھے لکھے بھی عورت کو عزت اور مان دینا جانتے ہیں اور سلجھی ہوئی لڑکیوں کو بالکل ایسے ہی لڑکے پسند ہوں گے (میری ذاتی رائے ہے اتفاق ضروری نہیں) ''بازگشت'' صدف آصف کی کہانیوں کی بہو مجھے بہت پسند ہے۔ زندگی کی امنگ بھی پسند آئی۔ بازل جیسا شوہر تو اس کو واقعی اس کی خوش قسمتی سے ملا جو کہ معاملات کو سلجھا لینے والا اور بیوی کی دوسروں کے نظر میں عزت رکھنے والا لونگ مختصر الفاظ میں لونگ کیئرنگ اور ریسپکٹنگ شوہر (بالکل میرے شوہر کی طرح) آہم...... نفیسہ سعید بھی کافی عرصے سے غیر حاضر ہیں مائرہ بھابھی کا کوئی نیا کارنامہ بتائیں اور ثناء اور جازب کے چھوٹے موٹے رومانٹک سین بھی۔ ان کا ''پہلا قدم'' بھی اچھی کہانی تھی پرانے رسم ورواج کو توڑ کر (جو کہ دوسروں کے لیے تکلیف اور خواہش میں رکاوٹ کا باعث بنے) نئے رواج کو قائم کیا اور خاندان کی دوسری لڑکیوں کے لیے تعلیم کے دروازے کھول دیے۔ ''خدمت خلق'' اف...... اتنی تلخ حقیقت نہ جانے ہمارے ملک میں کتنی ہی ایسی این جی اوز ہیں جو غیر ملکی کرنسی کے حصول میں اپنے ہی وطن کے باشندوں کو استعمال کر رہی ہیں اور ان کے جذبات سے کھیل رہی ہیں۔ عندلیب زہرا کی کہانی ''پرچھائیں'' نام کے برعکس نکلی عائلہ نہ اپنی ماں کی پرچھائی تھی نہ باپ کی۔ خدا ہر کسی کی ماں باپ کی طرف سے ملنے والی عادتوں میں یکسانیت نہیں رکھتا اور عائلہ میں جو چیز انوکھی تھی وہ ''احساس'' تھی جس کے تحت اس نے شفاء کے لیے اپنی محبت قربان کر دی۔ ارے اس کا ذکر کرنا تو بھول ہی گئی ''محبت زندہ باد'' ہاں جی عائزہ کی محبت زندہ باد جو معمولی شکل وصورت والے شارق سے ہوئی مگر وہ کیا ہے کہ دولہا وہی جو بیوی کے من کو بھائے !!!!!! یہ صرف میری سوچ ہے ہر کسی کی اپنی نیچر ہے۔ عمارہ امداد خاں کا ''فلسفہ حیات'' اچھا لگا۔ بہترین ڈائیلاگ۔ زندگی میں ہر چیز ہر کسی کے لیے نہیں ہوتی اور جو میسر ہو وہ کسی نعمت سے کم نہیں۔''

''بھیا راجا'' واہ مینال ہادی بہن بھائی کی محبت دکھائی ہے قسم سے رونا آ گیا۔ بھائی چھوٹے ہوں یا بڑے بہنوں کے مان ہوتے ہیں۔ ارم کی سمجھ بوجھ نے پھر سے اپنا بھیا راجا پا لیا جو روشنی میں اپنی آنکھیں چندھیا بیٹھا تھا۔ ''ہم نہیں سدھریں گے'' ارے واہ بھئی مسکان جی زبردست کہانی تینوں بھائی کی نوک جھوک اور ماسٹر جی کا ان سب کو اٹھانے بلکہ جگانے والا ہتھیار بڑا ہی کوئی اعلیٰ ہتھیار تھا اور قاسم، جاسم، عاصم صاحب میرا مشورہ ہے کہ واقعی نہ سدھرنا تم ایسے ہی اچھے لگتے ہو مسکان اگر ہو سکے تو اس کا پارٹ ٹو بھی لکھنا۔

فوزیہ ثمر جی میری کہاوت پسند کرنے کا شکریہ شاہین رشید کے بھائی کے بارے میں جان کر افسوس ہوا رسالہ بھی تھوڑا مہنگا کر دیا اور ''کرن کتاب'' کی کیا ہی بات تھی جس کے صفحات مزید کم کر دیے گئے ہیں۔ خالدہ جیلانی کا دسترخوان لاجواب بریڈ گلاب جامن سستی اور آسان ترکیب پسند آئی۔ ''کچھ موتی چنے ہیں'' آج کا مہینوال اچھا لگا۔ ''کرن کرن خوشبو'' اقوال یوسفی پسند آیا۔ پلیز عثمان مختار، حبا بخاری اور درخشاں سلیم کا انٹرویو کریں نا پلیز پلیز پلیز۔

ج: سحر وقاص! کچھ اداکاروں کے پاس وقت نہیں ہوتا اور کچھ کے نخرے ہوتے ہیں کہ وہ انٹرویو کے لیے ٹائم نہیں دیتے۔ پھر بھی ہم کوشش کریں گے کہ آپ کی فرمائش پوری کر سکیں۔ کرن کتاب کے صفحات اس لیے کم ہیں کہ کہانیاں زیادہ لگا سکیں۔

مثل یاقوت...... انگلینڈ

امید واثق ہے کہ سب خیریت ہوگی۔ آپ کے رسالوں سے تو بہت پرانا رشتہ ہے جب مطلب سمجھ بھی نہیں آتا تھا تب سے پڑھتی ہوں۔ اللہ بخشے میرے ابو کبھی کبھار اپنے ایک دوست کے گھر سے (ان کی بیٹی پڑھتی تھی) تکیے کے غلاف میں بھر کر آپ کے ادارے کے تینوں رسالے لاتے تھے اور اس دن میرے خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا تھا ایسے لگتا تھا کہ دنیا قدموں تلے آ گئی

ہو۔ کیا دن تھے وہ بھی بے فکری کا دور اور ہر چیز سے خوشیاں کشید کرنے کا زمانہ، لیکن ایک جھجک بھی ہوتی تھی اور ابو کے سامنے نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر کام کرتے ہوئے رسالہ پڑھنا بڑا ضروری تھا حتیٰ کہ جھاڑو لگاتے وقت بھی ہاہاہا اور خاص طور پر کھانا کھاتے ہوئے میرا کھانے کا مزا دوبالا ہو جاتا تھا۔ ٹنڈے بھی مرغ مسلم لگتے تھے۔ ہاہاہا کبھی کبھی ہی امی غصہ کرتی تھیں ورنہ میں ہر کام ٹائم پر کرکے انہیں شکایت کا کوئی خاص موقع نہیں دیتی تھی۔ (میرا تو یہی خیال ہے اب آگے کچھ کہہ نہیں سکتے ہاہاہا) کیا نمونے تھے ہم بھی، میری امی نے مجھے اسکول جانے سے پہلے اردو ہجے کرکے پڑھنا شروع کروا دیا تھا ان کو بہت شوق تھا کہ اسکول جاؤں کیونکہ وہ خود بھی پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ ان کا احسان ہے کہ انہوں نے میرے روتے دھونے کے باوجود پہلے سال سختی کرکے مجھے اسکول بھیجا اس کے بعد میں خود چل پڑی بلکہ الحمدللہ دوڑ پڑی۔ اس کے بعد ابو کا احسان کہ میں نے جتنا پڑھنا چاہا انہوں نے منع نہیں کیا اور بچوں کی کہانیوں کی کتابیں اور بچوں کے رسالے لا کر دیتے رہے۔ اللہ کے کرم کے بعد ہم سب بہن بھائی اپنے ماں باپ خاص طور پر امی جان کے شکر گزار ہیں کہ چند حرف لکھ اور سمجھ جاتے ہیں۔ کچھ عرصے سے انگلینڈ میں ہونے کی وجہ سے باقاعدہ رسالہ تو نہیں مل پاتا اس لیے آن لائن پڑھ لیتی ہوں مگر اکثر دیر سے ملتا ہے۔ اب کل ملا ہے تو ختم کرکے بہت دل کیا کہ کچھ لکھوں۔ ان شاء اللہ اگلی بار کہانیوں پر تبصرہ کروں گی اگر وقت پر ملا اور آپ نے میرے الفاظ کو اتنی اہمیت دی کہ اپنے موقر جریدے میں شامل کر دیے۔ ابھی فی الحال میں نے رسالے میں بہن زرینہ خانم کا خط پڑھا ان کے بھائی کی بیماری کا پڑھ کر دکھ ہوا اللہ ان کو صبر اور حوصلہ دے۔ ان کا ایک جملہ "جب دعائیں دوائیں کچھ بھی کام نہیں آتیں" پر کہنا چاہوں گی کہ دعائیں کبھی ضائع نہیں جاتیں۔ اگر اس وقت آپ کی دعا اللہ نے اس مقصد کے لیے جس کے لیے آپ نے مانگی قبول نہیں کی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کام نہیں آئے گی اور رائیگاں چلی گئی۔ وہ اللہ کے پاس محفوظ ہے اور آپ کی زندگی میں یا مرنے کے بعد کام آئے گی احادیث کے مطابق تو میں یہی سمجھتی ہوں باقی واللہ اعلم۔

اردو ادب پڑھنے کے باوجود بہت بے ادب ہوں یا کالج میں میری سہیلیوں کا کہنا تھا اور اب تو ادھر انگریزوں کے منہ دیکھ دیکھ کر مزید "چار چاند" لگ گئے ہیں اس کے باوجود آپ کی کہانیوں میں مسجع و مقفیٰ اردو پڑھ کر بہت اچھا لگتا ہے کہ بہت سے الفاظ استعمال نہ ہونے کی وجہ سے ذہن کے پچھلے گوشے میں چلے گئے ہیں۔ اچانک نظر کے سامنے آتے ہیں تو اچھا لگتا ہے اگر زندگی رہی اور آپ کی طرف سے قدر افزائی ہوئی تو ان شاء اللہ اس مخلص محفل دوستاں کا چکر لگے گا سب بہنوں کو میری طرف سے سلام۔

ج: مشل یاقوت! ہمیں بڑی خوشی محسوس ہوئی کہ آپ نے اتنی دور سے خط لکھا۔ یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے کہ پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی ہمارے ڈائجسٹ شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ آئندہ بھی "نامے میرے نام" کی محفل میں شریک ہوں گی اور کرن کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کریں گی۔ آپ کو جس ماہ کا ڈائجسٹ ملے، آپ اس پر اپنی رائے کا اظہار کر دیجیے گا۔

نورین...... گولڑہ شریف اسلام آباد

سب کرن پڑھنے والی بہنوں کو آداب، میں کرن کی بہت پرانی قاری ہوں لیکن پہلی دفعہ شرکت کر رہی ہوں مجھے "کرن" کے تمام سلسلے بہت پسند ہیں خاص کر خطوں والا سلسلہ میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں قسط وار ناول افسانے ناولٹ اور مکمل ناول سب بہت بہترین ہیں میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے مہربانی فرما کر میرا خط ضرور شامل کیجیے۔

ج: سمیرا! بہت مختصر سا خط ہے آپ کا امید ہے آئندہ آپ کرن کی کہانیوں پر پھر سیر حاصل تبصرہ کریں گی۔

☆☆

کھلتے گلاب ہونٹ

ایسی بہت سی خواتین ہیں جو قدرتی طور پر بھرے بھرے ہونٹ پسند کرتی ہیں لیکن ان کے پاس اتنا بجٹ نہیں ہوتا کہ وہ مہنگی سرجریز اور فلرز اور انجکشن کا سہارا لے سکیں۔ ان طریقوں کو چند مہینے بعد دوبارہ کروایا جاتا ہے تاکہ ہونٹوں کی ساخت ٹھیک رہے۔ اگر چند ماہ بعد دوبارہ

نہ کروایا جائے تو ہونٹ پہلے جیسے ہی ہوجاتے ہیں۔ تو انہیں چاہیے کہ وہ اس مضمون میں بتائے جانے والے چند طریقوں اور پروڈکٹس کو اپنے گھر پر ہی آزما کر دیکھیں اور اپنے ہونٹوں کو خوب صورت بنائیں۔

2009ء میں کی جانے والی ایک ریسرچ کے مطابق وہ خواتین جن کے ہونٹ بڑے اور خوب صورت دکھائی دیتے ہیں، وہ اپنی اصل عمر سے کم دکھائی دیتی ہیں۔ یاد رکھیں کہ چند گھریلو ٹوٹکوں کو آزما کر آپ ہونٹوں کو کچھ دیر کے لیے پھولا اور بھرا ہوا سا دکھایا جاسکتا ہے۔

دو چمچے دار چینی کا تیل، ایک چائے کا چمچہ ناریل کا تیل یا وٹامن ای کے ساتھ ملائیں۔ خصوصی میک اپ برش سے اپنے ہونٹوں پر ایک پتلی تہ لگائیں اور پندرہ منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔

کسی بھی اچھے برانڈ کا لپ اسکرب خرید لیں۔ اس لپ اسکرب کو صبح کے وقت ہونٹوں پر لگائیں، اس کا کچھ دیر تک مساج کریں، اس کے استعمال سے ہونٹ بڑے لگنے لگتے ہیں۔ دیرپا نتائج حاصل کرنے کے لیے اس اسکرب کو روزانہ باقاعدہ سے ہلکے ہاتھوں سے ہونٹوں پر رگڑنا ہوگا۔

مارکیٹ میں مختلف کمپنیوں کے تیار کردہ ہائڈ ریٹنگ لپ پلمپر گلوس مل جاتا ہے۔ یہ گلوس باقاعدگی سے استعمال کرنے کی وجہ سے بھی ہونٹوں کو فلرز کے بغیر ہی بھرے ہوئے اور خوب صورت دکھایا جاسکتا ہے۔

پیپرمنٹ سیڈ آئل کو بھی ہونٹوں پر استعمال کر کے انہیں خوب صورت بنایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ جب اسے ہونٹوں پر لگایا جاتا ہے تو اس کی وجہ سے ہونٹوں پر سنسناہٹ سی ہوتی ہے لیکن یہ سنسناہٹ تھوڑی دیر میں ختم ہوجاتی ہے۔ تاہم اسے لگانے کے بعد لپ اسٹک لگائی جائے تو ہونٹوں کی ساخت بھری بھری سی محسوس ہوتی ہے اور لپ اسٹک بہت نمایاں ہوتی ہے۔

آج کل الیکٹرک لپ پلمپر آسانی سے مل رہے ہیں، خواتین چاہیں تو اسے آن لائن بھی منگوا سکتی ہیں۔ یہ چارج کر کے بار بار استعمال کیا جاسکتا ہے۔ پلاسٹک اور سیلیکون سے تیار کردہ یہ لپ پلمپر کو ہونٹوں پر لگا کر مشین چلائی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں ہی ہونٹ بڑے سے لگنے لگتے ہیں۔

اگر آپ کو چند منٹوں میں اپنے ہونٹوں کو بھرا بھرا دکھانا ہے تو اس کے لیے لپ وینم خرید لیں۔ اس پروڈکٹ کو عموماً پیپرمنٹ، دار چینی اور ادرک کی مدد سے

تیار کیا جاتا ہے۔ لپ وینم کو ہونٹوں پر لگا کر گولائی میں اس کا مساج کریں، اس طرح دو منٹ تک کریں، اس کے بعد میک اپ کر کے تیار ہوجائیں اور پارٹی میں جائیں۔ آپ کے ہونٹ بھرے بھرے اور خوب صورت لگیں گے۔

فیشن

ہر چہرے پر کھلتی ہیں

"چاند بالیاں"

آپ کے چہرے کی ساخت خواہ کیسی ہو اور رنگت بھی جیسی ہو، اگر آپ نے خوشی کی تقریبات کے لیے موزوں لباس اور جیولری کا انتخاب کرلیا تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ چندے آفتاب چندے ماہتاب نہ نظر آئیں۔ مارکیٹ میں مختلف انداز کی چاند بالیاں دستیاب ہیں جنہیں مختلف تقریبات کے حساب سے پہنا جاسکتا ہے۔

☆**چھوٹے موتیوں والی چاند بالیاں:** اس انداز کی چاند بالی کے نیچے کی جانب یہ چھوٹے چھوٹے موتی ایک ساتھ لگے ہوتے ہیں۔ اس طرح کی چاند بالی ہر قسم کے لباس یا کسی بھی رنگ کے لباس کے ساتھ پہنی جاسکتی ہیں۔

☆**میناکاری چاند بالیاں:** یہ بھاری بھرکم زیور نہیں اور نوجوان خاص کر غیر شادی شدہ لڑکیوں پر خوب جچنے والی بالیاں ہیں۔ کندن اور میناکاری سے تیار کردہ ان چاند بالیوں کی میچنگ کا تین لڑیوں والا ہار پہن کر ان کے لک کو چار چاند لگادے گا۔ خاص کر اگر آپ نے ہلکے رنگ کا لباس پہنا ہے تو اس انداز کی چاند بالیاں پہننا بہترین رہے گا۔ یہ بالیاں آپ کو نفیس ظاہر کرتی ہیں۔

☆**لیئرز والی چاند بالیاں:** اس انداز کی چاند بالیاں مختلف لیئرز کی صورت میں بنائی جاتی ہیں، تہ در تہ چاند انداز میں بنائی گئی ان بالیوں میں مختلف رنگوں یا ایک ہی رنگ کے موتی اور کندن جڑے ہوتے ہیں۔ یہ بڑے سائز کی چاند بالیاں ہوتی ہیں۔ یہ کامدار ہی نہیں سادے سوٹ کے ساتھ بھی جاذب نظر معلوم ہوتی ہیں۔

☆**جال والی بالیاں:** اگر آپ گلے میں کچھ نہیں پہننا چاہتیں تو کانوں کے آویزوں پر دھیان دیجیے۔ سنہری یا روپہلی کسی بھی رنگ میں جال والی چاند بالیاں بہترین انتخاب ثابت ہوسکتی ہیں۔ اس انداز کی چاند بالیاں گولڈن ہی اچھی لگتی ہیں کیونکہ سنہری جال والا ڈیزائن پھر زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس انداز کی چاند بالی کسی بھی لباس کے ساتھ باآسانی پہنی جاسکتی ہے کیونکہ اس میں میچنگ کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔

☆**رنگ برنگی چاند بالیاں:** ویسے تو

مختلف رنگوں کی چاند بالیاں مل جاتی ہیں تاہم نورتن انداز کی بنائی جانے والی چاند بالی میں مختلف رنگوں کے موتی لگائے جاتے ہیں۔ کچھ جیولری میکرز اسے پنج رنگی، کچھ نورتن اور کچھ رنگ برنگی چاند بالی کے نام سے اسے پکارتے ہیں۔ دیکھنے میں خاص پرکشش لگتی ہیں۔ پانچ رنگوں میں سرخ، زردی، مائل پیلا، نیلا، جامنی، خاکی یا ہرے رنگ کے موتی لگائے جاتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اس طرح کا چوکر نیکلس بھی لے سکتی ہیں۔ یہ چاند بالی سیٹ بہت خوب صورت لگتے ہیں۔

☆**کندن سفید موتی چاند بالی:** ایسی چاند بالیاں سب سے زیادہ پہنی جاتی ہیں اور آسانی سے مل جاتی ہیں۔ یہ سائز میں زیادہ بڑی اور بھاری نہیں ہوتیں۔ اس انداز کی چاند بالی جب بھی خریدیں تو کوشش کریں کہ اس کے ساتھ ٹیکا بھی خریدیں۔ سفید پرل موتی اور کندن سے تیارہ کردہ چاند بالی اور ٹیکا کسی بھی لڑکی کے لیے بہترین انتخاب ثابت ہوسکتا ہے۔

☆**جھمکیوں والی چاند بالیاں:** مارکیٹ میں ایسی چاند بالیاں بھی دستیاب ہیں جن کے نیچے کی جانب چھوٹی چھوٹی جھمکیاں بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان جھمکیوں کے نیچے کی جانب موتی لگا کر اسے مزید خوب صورت بنایا جاتا ہے۔ موتیوں والی یہ جھمکیاں روایتی طرز کے ملبوسات جیسے لہنگا، چولی اور فراکس، چوڑی دار پاجامے کے ساتھ پہنی جائیں تو زیادہ اچھی لگتی ہیں۔

☆**گلابی موتی چاند بالیاں:** گلابی موتی لگی ہوئی یاروبی والی چاند بالیاں دیکھنے میں بے حد خوب صورت لگتی ہیں۔ گلابی رنگ کی ان بالیوں کو ضروری نہیں کہ صرف گلابی رنگ کے ملبوسات کے ساتھ ہی پہنا جائے، انہیں کسی بھی رنگ کے لباس کے ساتھ پہنا جاسکتا ہے۔ اس انداز کی بالیاں پہننے کے بعد چہرے پر سوفٹ لک آتا ہے، چاہیں تو اس کے ساتھ بلیک اسموکی آئی میک اپ کرلیں، آپ یقیناً حسین لگیں گی۔

☆ **سلور چاند بالیاں:** ویسے تو زیادہ تر چاند بالیاں سنہری رنگ کی ہی ملتی ہیں، تاہم سلور یا چاندی کی چاند بالیاں بھی کئی لڑکیوں کی اولین پسند ہوتی ہیں۔ اگر آپ کے پاس اپنی امی کی چاندی کی چاند بالیاں ہیں تو آپ اسے دن کی بھی کسی تقریبات میں پہن سکتی ہیں۔ ویسے تو ہمارے یہاں تاثر عام ہے کہ اگر کسی لڑکی نے سنہری رنگ کا لباس پہن رکھا ہو تو وہ سلور رنگ کی جیولری نہیں پہن سکتی کیونکہ یہ میچنگ نہیں ہوگی۔ یہ تاثر غلط ہے، اگر کسی نے سنہرے رنگ کے سوٹ کا انتخاب کیا ہے یا کسی کے سوٹ پر سنہری رنگ کی کڑھائی کی گئی ہے تو اس کے ساتھ چاندی کی سلور رنگ کی چاند بالی اچھی لگے گی۔

☆ **سلک کے دھاگے والی بالیاں:** وہ لڑکیاں جنہیں مختلف رنگوں کی بالیاں پہننے کی خواہش ہوتی ہے، وہ سلک کے دھاگے سے تیار کردہ بالیاں خرید کر اپنے جیولری باکس میں رکھ سکتی ہیں۔ ان بالیوں کو تیار کرنے میں دھاگے کے ساتھ ساتھ موتی اور نگینے وغیرہ کا استعمال بھی کیا جاتا ہے تاکہ یہ مزید خوب صورت لگیں۔ اگر کسی کو مہندی کی تقریب کے لیے چاند بالی خریدنی ہے تو پیلے اور ہرے رنگ کے دھاگے سے تیار کردہ چاند بالیاں خرید لیں۔ اسے تقریب کے دوران پہنیں اور خوب صورت دکھائی دیں۔

بقرہ عید

اور کچھ احتیاطی تدابیر

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ عید الاضحیٰ پر قربانی کی روایت پر عمل کرنا ہمارے لیے ایک بہت بڑی سعادت ہے لیکن اس موقع پر قربانی ادا کر دینا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ دیگر اہم باتوں کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

آپ نے یقیناً کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ قربانی کے گوشت کا ذائقہ اچھا نہیں ہوتا۔ اس میں ایک ناگواری مہک یا بو آتی ہے اور یہ جلدی گلتا یعنی پکتا بھی نہیں۔ تو کبھی سوچا ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے جانور کو صحیح طریقے سے ذبح نہیں کروایا۔ ذبح کرنے کی چھری اچھی طرح تیز ہونی چاہیے۔ ذبح کرنے سے قبل جانور کو خوب کھلا پلا لیں اور جانوروں کو ایک دوسرے کے سامنے ذبح کر کے خوف کا شکار مت کریں۔ ان تمام صورتوں میں جسم میں ایک کیمیکل "ہسٹامین" خارج ہونا شروع ہو جاتا ہے جو خون کی نالیوں کو پھیلا دیتا ہے، جس کی وجہ سے خون سست رفتار ہو کر مکمل طور پر جسم سے خارج نہیں ہو پاتا اور یوں گوشت کی کوالٹی متاثر ہو جاتی ہے۔

سب سے اہم بات جو آپ نے دھیان میں رکھنی چاہیے وہ یہ کہ ذبح کرنے والے کو کبھی مذبوح میں حرام مغز کو نہیں کاٹنے دینا۔ چھری کو ریڑھ کی ہڈی کے مہروں تک نہیں پہنچنے دینا۔ حرام مغز کو کاٹنے سے جسم کا تڑپنا یک دم رک جائے گا اور یوں گوشت میں موجود باریک رگوں سے خون خارج نہیں ہو پائے گا جس کا نتیجہ گوشت کی خرابی کی اور ذائقے کی تباہی کی صورت میں نکلے گا۔

اکثر خواتین کی عادت ہوتی ہے کہ وہ گوشت کو مہینوں کی ریفریجریٹر میں محفوظ رکھتی ہیں، تاہم کچھ خواتین جو گوشت کو محفوظ رکھنے کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ انہیں پتا نہیں ہوتا کہ کس طرح اس گوشت کو خراب ہونے سے بچایا جائے، میں ایسی خواتین کے لیے یہاں ایک ایسا طریقہ بتایا جا رہا ہے جس پر عمل کر کے وہ گوشت کو کئی مہینوں تک محفوظ رکھ سکتی ہیں۔

☆ ایک پتیلی میں پانی لیں۔ اس میں نمک ڈال کر گوشت کو ابال لیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو ایک مرتبان میں تیل لگا کر اس میں ابلا ہوا گوشت ڈال دیں اور مرتبان کا ڈھکن اچھی طرح بند کر دیں۔ اس عمل سے آپ کا گوشت مہینوں تک محفوظ رہے گا اور جلدی خراب نہیں ہوگا۔

ہمارے یہاں زیادہ تر لوگ سبزیوں کے بجائے گوشت کو زیادہ رغبت سے کھاتے ہیں۔ جب عید قربان کا موقع آتا ہے تو اس موقع پر گوشت کی فراوانی بھی ہوتی ہے تو پھر سب کا دل چاہتا ہے کہ روز مزے دار کھانے پکائے جائیں اور گھر والوں کو کھلائے جائیں۔ لیکن یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ قربانی کا گوشت اعتدال میں رہ کر استعمال کریں اور ان چند باتوں کو اس موقع پر خاص خیال رکھیں۔

☆ ایک ساتھ بہت زیادہ گوشت نہ کھائیں۔
☆ کولڈ ڈرنکس کم سے کم استعمال کریں۔
☆ مرچوں کا استعمال کم کریں۔
☆ کھانے کے دوران وقفہ مناسب رکھیں۔
☆ زیادہ گوشت کھانے سے وزن بھی بڑھتا ہے اور کولیسٹرول بھی بڑھ جاتا ہے لہٰذا اپنی صحت کا خیال رکھیں۔
☆ کوشش کریں کہ گوشت کو باربی کیو کی صورت میں استعمال کریں اور گوشت کے ساتھ لیموں اور سلاد وغیرہ ضرور رکھیں کیونکہ گوشت ثقیل ہوتا ہے اور دیر سے ہضم ہوتا ہے تو ہاضمے کے لیے گوشت کھانے کے بعد گرین ٹی یا لیموں پانی پینا فائدہ مند رہتا ہے۔
☆ ان دنوں میں واک بھی لازمی کرنی چاہیے تاکہ کھانا وقت پر ہضم ہو جائے۔
☆ ادرک ایک گرام، میتھرے پندرہ دانے، پودینہ سبز دس پتے، سبز چائے دس پتے ایک کپ پانی میں اچھی طرح پکا کر لیمن کے چند قطرے شامل کر کے نوش فرمائیں۔
☆ سونف 1/4 گرام، ادرک ایک گرام، الائچی پانچ دانے اور شکر سرخ نصف چمچہ کو ڈیڑھ کپ پانی میں پکا کر بطور قہوہ استعمال کریں۔

پودینہ پچیس پتے۔ بڑی الائچی کے بیج دس عدد۔ میٹھا سوڈا (چاول کے دانے کے برابر)۔

ان سب چیزوں کا پاؤڈر بنا کر ایک چٹکی کھائیں۔ زیادہ گوشت کھانے کی وجہ سے خراب ہونے والا ہاضمہ ٹھیک ہو جائے گا اور ڈکاریں بھی نہیں آئیں گی۔

فالسہ......

براعظم ایشیا کا مقبول پھل

فالسہ موسم گرما میں شوق سے کھایا جانے والا پھل ہے۔فالسے میں وٹامن بی اور سی کی وافر مقدار موجود ہوتی ہے جبکہ آئرن اور نمکیات اس کے اہم غذائی اجزاء ہیں۔ اس میں اکیاسی فیصد پانی کے علاوہ پروٹین اور کاربوہائیڈریٹس بھی موجود ہوتا ہے۔

فالسہ کے طبی فوائد:

☆ فالسہ مقوی دل ہوتا ہے۔☆ فالسہ معدہ اور جگر کو طاقت دیتا ہے۔☆ یہ پیاس بجھاتا ہے۔☆ پیشاب کی سوزش کو ختم کرتا ہے۔☆ یہ مبرد اور قابض ہوتا ہے۔☆ گرمی کے بخار کو فائدہ دیتا ہے۔

☆ اختلاج القلب اور خفقان کو بے حد مفید ہوتا ہے۔

☆ فالسے کا رُب بھی بنایا جاتا ہے جس کو معدہ کی قوت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

☆ فالسے کی جڑ کا چھلکا سوزاک اور ذیابطیس میں استعمال کرانا مفید ہوتا ہے۔

☆ فالسے کے پانی سے غرارے کرنے سے خناق کو فائدہ ہوتا ہے۔

☆ تپ دق میں فالسے کا استعمال بے حد مفید ہوتا ہے۔

☆ معدے اور سینے کی گرمی اور جلن کو دور کرتا ہے۔

☆ ذیابطیس کے لیے فالسے کے درخت کا چھلکا پانچ تولے اور کوزہ مصری تین تولے لے کر چھلکے کو رات پانی میں بھگودیں اور صبح مصری ملا کر مریض کو ایسی ہی خوراک پانچ روز تک پلانا بے حد مفید ہوتا ہے۔اس سے ذیابطیس شوگر پر کنٹرول ہوجاتا ہے۔

☆ جگر کی گرمی کو دور کرنے کے لیے فالسے کو جلا کر کھار بنائیں اور تین رتی صبح وشام استعمال کریں۔

☆ فالسہ مصفی خون بھی ہے۔

فالسے کا شربت بنانے کا طریقہ درج ذیل ہے۔

آدھ سیر پختہ فالسہ، ایک سیر چینی، پہلے فالسے کو پانی میں خوب رگڑ کر چھان لیں اور چینی ملا کر قوام تیار کریں۔ جب قوام گاڑھا ہوجائے تو شربت تیار ہے۔ ٹھنڈا کر کے بوتلوں میں بند کرلیں۔ یہ شربت مقوی معدہ و دل ہوتا ہے۔ جگر کی حرارت کو تسکین دیتا ہے۔ قے، دستوں اور پیاس کو فائدہ دیتا ہے۔

☆ جن کا معدہ بوجھل رہتا ہو، طبیعت متلاتی ہو اور کھانے کی نالی میں جلن محسوس ہوتی ہو، ایک پاؤ فالسہ کا پانی نکال کر تین پاؤ چینی ملا کر گاڑھا شربت تیار کریں۔ یہی شربت تین بڑے چمچے ہر کھانے کے بعد چاٹنے سے بے حد فائدہ ہوتا ہے۔

☆ پھوڑے پھنسیوں پر فالسے کے پتے رگڑ کر لگانے سے فوراً فائدہ ہوتا ہے۔

☆ اس کی جڑ کی چھال کا جوشاندہ بنا کر پینا جوڑوں کے درد میں بے حد مفید ہوتا ہے۔

☆ فالسے کا شربت فساد خون کو بے حد مفید ہوتا ہے۔

نگین اشفاق

س: ''آپ کیا سمجھتی ہیں کھانے کے لیے جیا جاتا ہے یا جینے کے لیے کھایا جاتا ہے؟''

ج: ''میرا خیال ہے کہ جب کھانا اچھا بنا ہو تو انسان کھانے کے لیے جی لے۔ نہیں تو ہر کوئی جینے کے لیے کھاتا ہی ہے۔''

س: ''گھر کے کام خصوصاً کچن میں آپ کی دلچسپی کس حد تک ہے یا پڑھنے کا شوق آپ کو ان کھانوں سے دور رکھتا ہے؟''

ج: ''جی میں تو اسٹوڈنٹ ہوں لیکن پھر بھی کچن میں میری دلچسپی بہت زیادہ ہے۔ ہر اتوار کے دن میں کچھ نہ کچھ خاص بناتی ہوں۔''

س: ''پہلی ڈش کون سی بنائی اور گھر والوں کے کیا تبصرے تھے اس ڈش پر؟''

ج: ''پہلی ڈش میں نے گوشت بنایا تھا۔ وہ بھی بغیر پیاز کے۔ اس وقت میں چھٹی کلاس میں تھی اور مت پوچھیں جناب گھر والوں کے کیا تبصرے تھے۔ تعریفیں ہی تعریفیں موصول ہوئی تھیں لیکن گھر والوں کو یہ نہیں پتا تھا کہ پیاز تو ڈالی ہی نہیں، پھر میرا جو مذاق بنا، مت پوچھیے۔''

س: ''کون سی رائٹر کو پڑھتے وقت کھانا دھواں ہوا؟''

ج: ''کھانا تو دھواں نہیں ہوا البتہ ایک دفعہ ہم خود دھواں دھواں ہو گئے تھے۔ وہ ایسے کہ ہم جب ناول ''جو چلے تو جاں سے گزر گئے'' پڑھ رہے تھے اور جب عالم شاہ مر گیا تو ہمارا تو کوئی حال ہی نہیں رہا۔ کھانا تو دھواں نہیں ہوا۔ ایک دفعہ ''شب تاب'' ناول پڑھتے ہوئے چائے ابل گئی تھی۔''

س: ''ہمیشہ ایسا تو نہیں ہوتا کہ کھانا مزے کا بنے، کبھی کبھی نتائج برعکس بھی ہوتے ہیں۔ ایسے میں کھانے والوں کے کیا تبصرے ہوتے ہیں؟''

ج: ''نہیں جی، کبھی ایسی صورت حال کا سامنا نہیں ہوا کہ کھانا اچھا نہ بنا ہو۔ اگر کبھی کبھار کھانے میں مرچیں زیادہ ہو تو پھر ڈانٹ پڑ جاتی ہے۔''

س: ''ایسے کون سے آپ کے رشتے دار یا شوہر کے دوست، احباب ہیں جن کی خاطر تواضع کے لیے کچن میں جانا ناگوار لگتا ہے؟''

ج: ''نہیں جی، ایسا تو ابھی تک نہیں ہوا کہ کوئی مہمان آئے تو ہم کو ناگوار گزرے بلکہ ہم تو خوش ہوتے ہیں۔''

س: ''عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ''ان'' کے دل میں اترنے کا راستہ معدہ سے ہو کر گزرتا ہے، آپ اس خیال سے کس حد تک اتفاق کرتی ہیں؟''

ج: ''لو جی، یہ آپ نے کیا بات پوچھ لی۔ ابھی تو ہم ''ان'' سے ناواقف ہیں۔ یہاں تک اس سوال سے اتفاق کرنے کی بات تو ہمارے ہاتھ میں ذائقہ ہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

س: ''کون سی ڈش دیکھ کر آپ کے والد، بھائی یا شوہر کو غصہ آ جاتا ہے اور پھر ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟''

ج: ''ابھی تک میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا کہ ایسی ڈش بناؤ تو دیکھ کر بھائی یا ابو کو غصہ آ جائے۔ ہاں اگر کوئی ڈش مجھ سے اچھی نہ بنی ہو تو میرا خود ہی کھانے کو دل نہیں کرتا۔ دوسروں کا تو آپ سمجھ گئی ہوں گی۔''

س: ''سسرال میں پہلی چیز کیا بنائی؟''

ج: ''سسرال کا تو ابھی دور دور تک نام و نشان نہیں۔ اس لیے نو کمنٹس۔''

س: ''گھر والوں کی پسند کی کوئی ایسی ڈش جو آپ کو ناگوار گزرتی ہے؟''

ج: ''جی، میں کوکنگ بہت کم کرتی ہوں لیکن پھر بھی جب گھر والے مجھے آلو گاجر پکانے کا کہتے ہیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا، کیونکہ وہ مجھ سے صحیح نہیں بنتی۔''

س: ''لوگ زیادہ تر کس چیز کی فرمائش کرتے ہیں؟''

ج: ''لوگوں کا تو مجھے پتا نہیں لیکن میرے گھر والے مجھ سے بریانی کی فرمائش کرتے ہیں کیونکہ وہ میں بہت اچھی بناتی ہوں۔''

س: ''آپ کے خاندان کی کوئی اسپیشل ڈش؟''

ج: ''ہمارے خاندان کی اسپیشل ڈش بہت بہت سی ہیں۔ ہمارے خاندان میں زیادہ تر کریلے گوشت، کڑاہی گوشت، ساگ، پکوڑے اور میری امی جان کے ہاتھ کی مچھلی کے پکوڑے زندہ باد۔''

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

کلیجی پراٹھا رول

اجزاء:۔

کلیجی	آدھا پاؤ (چھوٹی بوٹی)
دہی	دو کھانے کے چمچے
پسا ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
کٹی لال مرچ	دو کھانے کے چمچے
پسا زیرہ	چوتھائی چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
پانی	حسب ضرورت

پراٹھے کے اجزاء:۔

فائن آٹا	دو کپ
پانی	حسب ضرورت
تیل	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ

پراٹھے کے لیے:۔

ایک بڑے تسلے میں آٹا، دو چمچے تیل اور نمک ڈال کر پانی سے نرم آٹا گوندھ لیں اور آدھے گھنٹے کے لیے ڈھک کر رکھ دیں۔ اس کے بعد اس آٹے کے پیڑے بنا کر بیل لیں۔ پین کو گرم کر کے اس پر پراٹھے کو ڈال کر سینک لیں اور دونوں طرف سے تیل لگا کر پراٹھے فرائی کر لیں۔

ترکیب:۔

کلیجی پر دہی، نمک، پسا لہسن ادرک، کٹی لال مرچ اور پسا زیرہ لگا کر ایک گھنٹے کے لیے میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔

فرائی پین میں تیل گرم کر کے میرینیٹ کی ہوئی کلیجی ڈال کر بھون لیں اور ہلکا سا پانی ڈال کر گلا لیں اور چولہے سے اتار لیں۔

تیار پراٹھے کے درمیان فرائی کلیجی رکھ کر رول کی شکل میں لپیٹ لیں اور درمیان سے ترچھا کاٹ کر سرونگ پلیٹ میں کیچپ اور گرین ساس کے ساتھ سرو کریں۔

سوکھا گوشت

اجزاء:۔

گوشت (بغیر ہڈی کا)	ایک کلو
نمک	حسب ذائقہ
خشک ادرک کا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
خشک لہسن کا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
سرکہ	چار کھانے کے چمچے
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:۔

گوشت کو صاف دھو کر باریک اسٹرپس کاٹ لیں۔ ایک پیالے میں نمک، پسا ادرک لہسن، لال مرچ اور سرکہ ڈال کر ملائیں۔ گوشت کو اس مسالے میں ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور ایک گھنٹے کے لیے میرینیٹ کرنے رکھ دیں۔ پھر ان اسٹرپس کو ڈوری میں پرو کر دھوپ میں لٹکا دیں، سہولت نہ ہونے کی صورت میں گوشت کو پھیلا کر جالی دار برتن میں رکھ کر دھوپ میں رکھ کر اوپر سے ململ کے کپڑے سے ڈھک دیں۔ اچار کی طرح سے روزانہ دھوپ میں رکھ کر شام میں اٹھالیں۔ تین سے چار دن میں گوشت کا پانی مکمل طور پر خشک ہو جائے۔ اب اسے ائیر ٹائٹ ڈبے میں بھر کر محفوظ کر لیں۔ حسب ضرورت تیل میں سنہری فرائی کر لیں۔